شہادت گاہ بالاکوٹ
پیام شاہجہانپوری

پیام شاہجہانپوری
کی دیگر تصانیف

کتاب	قیمت
مقام حسین رض	۷ — ۵۰
علی رض اور ان کی خلافت	۷ — ۵۰
حیات حسن رض	۵ — ۰۰
عثمان رض اور خلافت عثمان	۷ — ۵۰
عائشہ رض اور خلافت علی رض	۳ — ۰۰
آفتاب ہجویر رح	۳ — ۰۰
تذکرۂ شاہ محمد غوث رح	۳ — ۰۰
ہماری تاریخ (بچوں کے لئے)	۱ — ۵۰
روح نگارش (مصنف کے علمی و ادبی مقالات کا مجموعہ)	۴ — ۰۰
جنوبی ہند میں اُردو	۲ — ۵۰
میخانۂ عجم (ایران کے فارسی ادب کا جائزہ)	۲ — ۰۰
شعلۂ احساس (مصنف کی قومی نظموں کا مجموعہ)	۵ — ۰۰
تاریخ نظریۂ پاکستان	۱۷ — ۰۰

(علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ :—

ادارۂ تاریخ و تحقیق

گیلانی۔اسٹریٹ نمبر – ۶۲ – چاہ میراں – لاہور

شہادت گاہِ بالاکوٹ

امیرالمومنین حضرت سیّد احمد شہید رح کے سوانح
سیرت و کردار، تحریکِ اصلاح و جہاد اور جنگِ
بالاکوٹ کی مکمل و مستند تفاصیل کا تحقیقی مرقع

مولف :۔ پیام شاہجہانپوری

نام کتاب	شہادت گاہِ بالاکوٹ
مولف	پیام شاہجہانپوری
بارِ اوّل	ایک ہزار (۱۰۰۰)
ضخامت	۳۵۶ صفحات
مطبع	کنول آرٹ پریس انارکلی لاہور جان محمد روڈ
طابع	قاضی محمد اسماعیل
زیرِ اہتمام	ادارہ تاریخ و تحقیق لاہور
تاریخِ طباعت	۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء
ناشر	محمد رضی الدین خاں

قیمت

کتابت : ادارہ پروینِ کتابت ریلوے روڈ ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

۲؍مئی ۱۹۶۷ء کو میں اپنے اہل وعیال کے ہمراہ تبدیلِ آب وہوا کی غرض سے کاغان جانے کے لئے روانہ ہوا۔ بالاکوٹ پہلی منزل تھی لیکن یہاں پہنچ کر میں نے اس فضا میں ایسی کشش محسوس کی کہ آگے جانے کو دل نہ چاہا اور میں نے اپنی رخصت کے ایام میں سے ۲۰ دن اسی تاریخی اور پُرکشش بستی میں گزار دیئے۔

۲؍جولائی ۱۹۷۰ء کو میں پھر بالاکوٹ آیا، اس بار ۲۴ روز قیام رہا۔

امسال ۴؍جولائی ۱۹۷۱ء کو میں نے بالاکوٹ کا تیسرا سفر کیا اور آج ایک ماہ ۴ یوم سے یہاں مقیم ہوں۔

حضرت سید احمد شہیدؒ اور بالاکوٹ کے نام سے میں آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے واقف ہوں جب میرا تاریخی شعور بیدار ہوا، اور اکابرِ اسلام کے کارناموں کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۷، ۱۸ سال قبل جب میں نے اپنے ابتدائی مضامین کا مجموعہ "روحِ نگارش" مرتب کیا تو ایک باب حضرت سید احمد شہیدؒ پر بھی سپرد قلم کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے سید شہیدؒ کے سوانح اور کارناموں کا قدرے تفصیل سے مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اپنی کتاب "تاریخ نظریہ پاکستان" میں تحریکِ پاکستان کا پس منظر بیان کرتے ہوئے بھی حضرت سید صاحبؒ کی تحریک اور کارناموں کا جائزہ لینا پڑا۔ اس طرح سید صاحبؒ سے ذہنی قرب پیدا ہوتا چلا گیا اور جب میں پہلی بار بالاکوٹ آیا تو اس سفر نے سمندِ شوق کے لئے تازیانہ کا کام کیا۔ سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کے مزارات پر حاضری دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان مقامات کو دیکھا جہاں سید صاحبؒ اور آپ کے مجاہدین نے قیام کیا تھا۔ اس مسجد کو دیکھا جس میں سید صاحبؒ نماز پڑھاتے اور نصائح فرماتے تھے۔ میدانِ جنگ کو دیکھا جہاں مٹھی بھر کفن بردوش مجاہد دشمن کے ٹڈی دل لشکر سے ٹکرائے اور جریدۂ عالم پر نقشِ دوام ثبت کر گئے۔ ان مناظر نے طبیعت میں گداز پیدا کیا اور میں نے اس معرکہ کی تاریخ قلمبند کرنے کا فیصلہ کر لیا جو آج سے ۱۴۰ سال قبل بالاکوٹ کی سرزمین پر لڑا گیا۔

میری یہ کاوش اس موضوع پر نہ پہلی کتاب ہے نہ آخری۔ حضرت سید صاحبؒ پر اردو زبان میں تین قابلِ ذکر مصنفوں کی کتابیں موجود ہیں۔ ان میں سب سے پہلی کتاب مولانا محمد جعفر تھانیسری کی ہے جس کا نام "سوانح احمدی" ہے۔

یہ اردو میں سید صاحبؒ کا پہلا تذکرہ ہے۔ اگرچہ یہ کتاب بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کے مقابلے میں مختصر ہے لیکن میری ناچیز رائے میں یہ سب سے زیادہ مستند ہے۔ دوسری قابل ذکر کتاب مولانا ابوالحسن علی ندوی کی "سیرت سید احمد شہیدؒ" ہے۔ علی صاحب سید صاحبؒ کے خاندان کے چشم و چراغ اور نہایت فاضل انسان ہیں۔ موصوف نے نہایت محنت و قابلیت سے یہ کتاب مرتب کی ہے اور بہت سی خاندانی روایات اور مستند معلومات جن کا آپ کے سوائے اور کسی کو علم نہ تھا اس کتاب کے ذریعہ پہلی بار ہم تک پہنچیں۔ تیسری اور آخری کتاب ہمارے عہد کے نامور فاضل اور محقق و مورخ جناب مولانا غلام رسول مہر کی ہے جو "سید احمد شہیدؒ" کے نام سے شائع ہو کر اہلِ علم سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ مولانا نے اس کے علاوہ اس سلسلے کی دو کتابیں اور سپردِ قلم کی ہیں، ایک "جماعتِ مجاہدین" اور دوسری "سرگذشتِ مجاہدین" یہ دونوں کتابیں بھی پہلی کتاب کی طرح نہایت تحقیقی، جامع اور پُر از معلومات ہیں۔

ان کتابوں کی موجودگی میں بظاہر کسی نئی کتاب کی ضرورت نہ تھی لیکن نہ تو کسی موضوع پر کسی کتاب کو حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی شخصیت کسی خاص مصنف یا تذکرہ نگار کے لئے مخصوص ہے۔ بلکہ میرے خیال میں اور خاص طور پر اس زمانے میں ضرورت ہے کہ تاریخ اسلام کے اُن اکابر کے کارناموں کو بار بار اجاگر کیا جائے جنہوں نے اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کے لئے اپنی عمرِ عزیز صرف کر دی حتیٰ کہ اپنی جان بھی نہایت مردانگی سے اس مقصد کے حصول کے لئے قربان کر دی۔ لیکن زیرِ نظر کتاب کی تصنیف کا مقصد صرف یہی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور مقاصد بھی تھے۔

(۱) حضرت سید صاحبؒ پر اب تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب میں جن ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کے علاوہ کچھ نئے ماخذ میری نظر سے گزرے۔ ان میں بعض ایسے واقعات تھے جو اس موضوع پر سپردِ قلم کی جانے والی کتابوں میں درج نہیں ہو سکے۔ ان واقعات سے حضرت سید صاحبؒ اور معرکۂ بالاکوٹ کے بعض نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس لئے میں نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جسارت کی تاکہ قارئین کرام کو ان نئے پہلوؤں سے روشناس کیا جا سکے۔ آئندہ صفحات میں ایک الگ باب میں ان نئے ماخذوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

(۲) اس سے قبل کسی کتاب میں بالاکوٹ کی تاریخ قلمبند نہیں کی گئی۔ میری ناچیز رائے میں یہ بڑی کمی تھی کہ جس سرزمین نے حضرت سید صاحبؒ اور آپ کے نیک نفس ساتھیوں کا مقدس خون جذب کیا اس کی تاریخ سے لوگ اب تک ناواقف ہیں۔ چنانچہ میں نے کوشش کی ہے کہ بالاکوٹ کی تاریخ کے آغاز سے اس وقت تک تمام قابلِ ذکر پہلوؤں کا احاطہ کر لیا جائے۔

(۳) اس کتاب کا نام "شہادت گاہ بالاکوٹ" ہے۔ اس نام کی مناسبت سے ضروری تھا کہ معرکۂ بالاکوٹ کی تمام قابلِ ذکر اور ضروری تفاصیل پیش کر دی جائیں اور اس معرکہ میں سید صاحبؒ کی ناکامی کے اسباب سے بھی بحث کی جائے۔

میرے خیال میں یہ بھی ایک نئی چیز ہے۔

(۴) سید صاحبؒ کی شخصیت پر آپ کے مخالفین نے جو اعتراضات کئے ہیں خصوصاً مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا غلام رسول مہر کی کتابوں کی اشاعت کے بعد جو بعض نئے اعتراضات عائد کئے گئے ہیں ان کا تاریخ کی روشنی میں جواب دینا نہایت ضروری تھا تاکہ متعصب مخالفین نے آپ کی عظمت کو داغدار کرنے کی جو افسوسناک کوشش کی ہے اسے ناکام بنا کر سید صاحبؒ کی حقیقی عظمت کو اُجاگر کیا جاسکے۔ میں نے کتاب کے آخر میں مختلف ابواب کے تحت سید شہیدؒ پر عائد کیے جانے والے اعتراضات کے جواب دے کر ایک خوشگوار فرض ادا کیا ہے۔

(۵) سید صاحبؒ کے جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف تھا یا سکھوں کی طرف ؟ یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ افسوس کہ اسے تاریخ کی روشنی میں دیکھنے کی بجائے "خواہشات" کے آئینے میں دیکھا گیا اور اکثر مورخ اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے جذبات کے دھارے میں بہ گئے۔ میں نے اس مسئلہ پر خاص تاریخ اور حقائق کی روشنی میں گفتگو کی ہے۔ مجھے اس حقیقت کا احساس ہے کہ میں نے جو موقف اختیار کیا ہے جذباتیت کا شکار ہونے والے لوگ اسے پسند نہیں کریں گے اور مجھے لوگوں کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن حقائق کسی کی خوشی یا ناخوشی سے بے نیاز اور بالا ہوتے ہیں۔ تاریخ نویس کا یہ کام نہیں کہ وہ لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے اور ان کے غیظ و غضب سے محفوظ رہنے کی سعی میں مصروف ہے۔ جس تاریخ نویس میں اتنی بھی جرأت نہ ہو کہ اپنی تحقیق کے صحیح نتائج لوگوں کے سامنے پیش کرسکے اسے یہ خدمت ترک کرکے کوئی منفعت بخش کام تلاش کرنا چاہیئے۔

اسی طرح سید صاحبؒ کی شخصیت کے بعض اور پہلو تھے جن پر اظہارِ خیال کی ضرورت تھی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان پہلوؤں پر اپنی تحقیق کے نتائج پیش کردوں۔ یہ کام معمولی نہ تھا۔ اس کے لئے مجھے جو ہفت خواں طے کرنے پڑے ان کا اندازہ صرف انہی لوگوں کو ہوسکتا ہے جو اس راستے کے مسافر ہیں۔ بہر حال اب جبکہ میں یہ کام مکمل کرچکا ہوں اپنے اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار ہوں جس نے مجھ عاجز و بے علم کو یہ عظیم خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائی۔

اس مرحلے پر میں خاص طور پر ممنون ہوں اپنے کرم فرما خان محمد نسیم خان صاحب (خان آف گڑھی حبیب اللہ) کا جنہوں نے حضرت سید صاحبؒ کے دوسرے مرکز "راج دواری" جانے کے لئے میرے سفر کا انتظام کیا اور مجھے اپنے ساتھ اپنے گرمائی صدر مقام "بیلی ٹنگ" لے گئے۔ راستے میں میں نے شار کول اور ستھانہ گلی کے وہ مقامات دیکھے جن سے گزر کر سید صاحب سچہ اور بالاکوٹ تشریف لے گئے تھے۔ مضافاتِ بالاکوٹ کے مقام "پت سیری" کے مولوی عبدالقادر صاحب کا میں خاص طور پر شکر گزار ہوں جنہوں نے میری خاطر بڑی زحمت اٹھائی اور بالاکوٹ کے مضافات کے جغرافیائی حالات قلمبند کرنے میں میری اعانت فرمائی۔ اس طرح ڈھوڈیال کے مولوی سمیع اللہ جان صاحب نے اپنا وقت عزیز صرف کرکے میری کتاب کے لئے قیمتی نقشے تیار کئے اور مضافاتِ بالاکوٹ سے متعلق مفید معلومات بہم پہنچائیں۔ میرے عزیز دوست

ڈاکٹر عزیز صاحب آف بالاکوٹ برادرم معزاللہ خان صاحب آف مردان طالب علم اسلامیہ کالج پشاور اور خان عبدالرشید خان صاحب مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بالاکوٹ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ تاریخی مقامات کی تصاویر انہی کی توجہ سے حاصل ہوئیں۔ بالاکوٹ کے اُن تمام اصحاب کا میں دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میرے ساتھ نہایت محبت و اخلاق کا سلوک کیا اور اس علمی کام میں میری اعانت فرمائی۔

ناشکر گزاری ہوگی اگر میں اپنے کرم فرما پروفیسر شہرت بخاری صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے میری خاطر پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا کارڈ بنوایا اور پھر یہ کارڈ مجھے عنایت فرما کر اختیار دے دیا کہ اس سے جتنا عرصہ چاہوں فائدہ اٹھاؤں۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے شعبہ مشرقیات کے نائب سربراہ سید جمیل حسین رضوی صاحب نے قدم قدم پر میرے ساتھ تعاون کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کا تعاون میرے شاملِ حال نہ ہوتا تو میں یہ خدمت سرانجام نہ دے سکتا تھا۔ اسی طرح پنجاب پبلک لائبریری کے شعبۂ مشرقیات کے سربراہ چوہدری محمد حنیف صاحب شاہدؔ نے بھی مجھ پر بڑا کرم فرمایا اور بعض نہایت نادر کتابیں عنایت فرمائیں۔ اللہ تعالےٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر سے نوازے۔ آمین!

پیامؔ شاہجہان پوری
محلہ پوڑی۔ بالاکوٹ
۸ راگست ۱۹۷۱ء

نوٹ

"شہادت گاہِ بالاکوٹ" میں اردو اور فارسی کی جن مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کے اقتباسات درج کئے گئے ہیں ان میں کتابت کی بعض غلطیاں موجود ہیں مگر ہم نے انہیں اس لئے من وعن نقل کر دیا ہے تاکہ ہم پر تحریف کا الزام عائد نہ ہو۔ (مولف)

نئے ماخذ

اس کتاب کی تالیف کے دوران راقم الحروف کو کچھ نئے ماخذوں کا علم ہوا۔ ان میں بہت سی بیش قیمت روایات اور نادر معلومات ہیں۔ جو حضرت سید احمد شہیدؒ یا معرکۂ بالاکوٹ پر لکھی جانے والی کتابوں میں سے اب تک کسی کتاب میں درج نہیں ہوسکیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان نئے ماخذوں کا کچھ اجمالی تذکرہ کر دیا جائے۔

(۱) تاریخ منشی مہتاب سنگھ

افغانوں اور سید صاحبؒ کی جنگوں، افغانوں اور سکھوں کی معرکہ آرائیوں اور خصوصاً جنگ بالاکوٹ پر یہ نہایت مفید کتاب ہے۔ ایک دو روایتوں کے علاوہ اس کی بیشتر روایات ثقہ اور مستند ہیں۔ کتاب قلمی ہے اور فارسی زبان میں ہے۔ اس کا مصنف منشی مہتاب سنگھ موضع مری پور ضلع کانپور کا باشندہ، قوم کا کائستھ اور فارسی زبان کا اچھا انشا پرداز تھا۔ تلاش معاش میں لاہور آیا اور کنور کھڑک سنگھ ابن رنجیت سنگھ کی سرکار میں ملازم ہوگیا اور پانچ سال تک سکھ حکومت کے دفتر میں خدمات انجام دیتا رہا۔ اس کے بعد سردار فتح سنگھ حاکم مانکیرہ سے منسلک ہوگیا اور یہاں دس ماہ گزارے۔ بعد ازاں سردار ہری سنگھ نلوہ کا ملازم ہوا۔ ۱۸۹۱ء بکرمی میں علاقہ ہزارہ کے دفتر میں مامور کیا گیا جب سکھ حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور میجر چیمبرلین ہزارہ میں اسسٹنٹ کمشنر ہوکر آئے تو اس نے چیمبرلین کی فرمائش پر یہ کتاب سپرد قلم کی۔ منشی مہتاب سنگھ نے اپنی اس کتاب میں بیشتر وہ حالات و واقعات درج کئے ہیں جو اس نے بچشم خود دیکھے یا معتبر افراد سے سنے۔ اس کتاب کی تصنیف کے وقت اسے ہزارہ میں رہتے ہوئے تیس سال ہوچکے تھے۔ راقم الحروف کو اس کتاب کا علم ڈاکٹر شیر بہادر خان ریٹائرڈ سول سرجن ایبٹ آباد سے ہوا۔

اس کتاب کا اصل نسخہ ایبٹ آباد کے تحصیلدار لالہ حکم چند کے پاس تھا جن سے ایک صاحب حسین احمد نامی نے ۲۴ جنوری ۱۹۲۹ء کو نقل کیا۔ صفحۂ اول پھٹا ہوا تھا۔ ڈاکٹر شیر بہادر خان صاحب نے مولانا غلام ربانی لودھی ساکن سرائے صالح کی نشاندہی پر یہ نسخہ عبدالرحمٰن صاحب لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج ہری پور کی معرفت قاضی عبدالمالک صاحب کلرک انٹرمیڈیٹ

کالج ہری پور سے حاصل کیا اور ۱۱ اگست ۱۹۶۷ء کو اس کی نقل کر کے مولانا غلام رسول مہر کی خدمت میں بھیجا۔ مولانا موصوف کی کتاب "سید احمد شہیدؒ" اس سے قبل ہی شائع ہو چکی تھی اس لئے وہ اپنی کتاب میں اس نادر ماخذ سے استفادہ نہ فرما سکے۔ میں موصوف کا بہ صمیمِ قلب شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس سے استفادہ کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔

مکتوباتِ مولوی

اس سلسلے کا دوسرا ماخذ وہ مجموعہ مکاتیب ہے جو مجھے میرے دوست حافظ عبد الرشید ارشد صاحب سے ملا۔ یہ نادر نسخہ پاکستان کے نامور خطاط جناب نفیس رقم صاحب کی ملکیت ہے۔ انہوں نے یہ نسخہ سیالکوٹ کے ایک بزرگ سے حاصل کیا۔ یہ بھی قلمی مجموعہ ہے۔ اس میں حضرت شاہ عبد العزیزؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے متعدد مکاتیب، فرامین، امان نامے، اجازت نامے، خطباتِ جمعہ اور اعلان نامے شامل ہیں۔ بعض مکاتیب تو وہی ہیں جو دوسرے مکاتیب کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ مگر بہت سے مکاتیب اور فرامین ایسے بھی ہیں جو دوسرے مجموعوں میں نہیں ملتے۔ بعض خطوط عربی میں اور بیشتر فارسی میں ہیں۔ کچھ خطوط دوسرے اصحاب کے بھی ہیں جو انہوں نے حضرت سید صاحبؒ اور آپ کے بعض رفقا کو لکھے تھے۔ مثلاً "خط منجانب مطیع اللہ خاں بنام حافظ قطب الدین صاحب" یا "اقرار صحیح بدست حضرت امیر المومنین از طرف پائندہ خاں" یا "خط منجانب حبیب اللہ قندھاری بنام امیر المومنین"۔ یہ مجموعہ ۲۲×۱۸ سائز کے ۱۵۷ اوراق پر مشتمل ہے۔ نمبر صرف سامنے کے صفحہ پر درج کئے گئے ہیں۔ دائیں طرف کے صفحات بغیر نمبروں کے ہیں۔ اس لحاظ سے صفحات کی تعداد ۳۱۴ ہے۔ کاغذ سیالکوٹی اور ہر صفحہ کرم خوردہ ہے۔ خط نہایت پاکیزہ ہے۔ جن صاحب نے اس مجموعے کے خطوط تحریر کئے ہیں ان کا نام ابو المظفر عبید اللہ غلام حسین ہے۔ اس مجموعے میں سید صاحبؒ کے بعض ایسے خطوط، امان نامے اور فرامین ہیں جن سے جنگِ بالاکوٹ اور آپ کے طرزِ سیاست کے بعض اہم گوشے سامنے آتے ہیں۔

(۳) تاریخِ حسن

اس سلسلے کا تیسرا ماخذ "تاریخِ حسن" ہے جو کشمیر کے ایک اہلِ علم بزرگ پیر غلام حسن صاحب مرحوم کی تصنیف ہے۔ اس میں کشمیر کی تاریخ زمانۂ قدیم سے فاضل مصنف کے زمانے تک بڑی شرح و بسط سے بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی فارسی میں ہے اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں سید صاحبؒ کا مختصر سا ذکر ہے۔ اس اختصار کے باوجود دو باتیں نہایت کام کی مل گئیں۔ اس کتاب کا اصل نسخہ (دو جلدوں میں) قلمی ہے اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ کاغذ سیالکوٹی جگہ جگہ سے بوسیدہ اور شکستہ ہے۔ اس کا دوسرا نسخہ مطبوعہ ہے اور پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ صاحب پرنسپل پی ایف کالج پشاور نے اسے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔ یہ بھی دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ راقم الحروف نے اسکے

دونوں نسخے دیکھے۔ پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ صاحب سے مجھے اس کتاب کا سراغ ملا۔ اس عنایت کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ اس کا مطبوعہ نسخہ پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب سابق ڈائرکٹر ہسٹاریکل ریسرچ سوسائٹی پنجاب کے ذاتی کتبخانے میں ہے۔ موصوف نے ازراہِ عنایت مجھے اس نسخے سے استفادہ کرنے کی اجازت دی۔ میں اس عنایت کے لئے ان کا بھی شکرگزار ہوں۔

(۴) دی پٹھانز

اس سلسلے کا چوتھا ماخذ "دی پٹھانز" ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ کتاب انگریزی میں ہے صوبہ سرحد کا سابق علم دوست گورنر سر اولف کیرو اس کا مصنف ہے۔ اس کتاب میں پٹھانوں کی تاریخ بڑی تلاش و تحقیق سے قلمبند کی گئی ہے۔ ایک باب حضرت سید صاحبؒ پر بھی ہے۔ بعض باتیں تاریخی لحاظ سے نہایت غلط اور بعض نہایت صحیح ہیں۔ بہرحال اس کے مطالعے سے سید صاحبؒ کے متعلق ایک غیر مسلم اور غیر ملکی حاکم اور دانشور کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب لنڈن میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا جو نسخہ راقم الحروف کے مطالعے سے گزرا اس کا سنہ طباعت ۱۹۶۲ء ہے۔ یہ کتاب بھی مجھے میرے کرم فرما پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب (سابق پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی) نے عنایت فرمائی۔

(۵) تواریخ ہزارہ

اس سلسلے کا پانچواں ماخذ "تواریخ ہزارہ" ہے یہ اردو میں ہے۔ اب تک حضرت سید صاحبؒ پر جتنی کتابیں لکھی گئیں افسوس کہ ان میں سے کسی کتاب میں اس ماخذ سے استفادہ نہیں کیا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ کتاب کمیاب ہے۔ ضلع ہزارہ کے اسسٹنٹ کمشنر محمد اعظم بیگ اس کے مؤلف ہیں ۱۸۷۴ء میں مرتب کی گئی۔ اس لحاظ سے اس کا شمار قدیم ماخذوں میں ہونا چاہیے۔ اس میں سید صاحبؒ اور مجاہدین پر ایک طویل باب ہے۔ گو مصنف سید صاحب کا معتقد نہیں بلکہ کسی حد تک معاند معلوم ہوتا ہے مگر اس نے جو حالات و کوائف بیان کئے ہیں اس زمانے کا رنگ اور وسائلِ معلومات کی کمی کو دیکھتے ہوئے وہ بہت ہیں۔ کتاب بڑی ضخیم اور بہت بڑے سائز پر مشتمل ہے۔ کاغذ نہایت خستہ اور نازک ہے۔ کتابت و طباعت دونوں بہت نفیس اور پاکیزہ ہے۔ راقم الحروف نے اس کا نسخہ پنجاب پبلک لائبریری سے حاصل کیا تھا۔

(۶) ایک نادر خط

حضرت سید صاحبؒ کے مکاتیب کے جتنے مجموعے اس وقت موجود ہیں، وہ تقریباً سب نقول پر مشتمل ہیں۔ سید صاحبؒ کا اپنا خط شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ حال ہی میں راقم الحروف کو سید صاحبؒ کے ایک اصل خط کا سراغ ملا۔ یہ خط

سلطان زبردست خان ، سلطان نجف خان کھوڑی والا اور سلطان احمد خان کے نام ہے۔ اس میں جنگ تورد کے متعلق بعض ایسے اعداد و شمار درج ہیں جن سے ہمارے بعض مورخین و محققین کی تحقیق درست ثابت نہیں ہوتی ۔ مثال کے طور پر جنگ تور دیا مایار میں شہدا کی تعداد اٹھائیس بتائی گئی ہے ۔ زخمیوں کی تعداد کا تعین کیا ہی نہیں گیا ۔ سید صاحبؒ کے اس خط سے معلوم ہوا کہ اس جنگ میں اٹھائیس نہیں بلکہ صرف بیس مجاہدوں نے شہادت پائی اور اتنے ہی زخمی ہوئے ۔ دشمن کے بڑے بڑے سردار کام آئے اور بہت سے گھوڑے بھی ہلاک ہوئے ۔ اسی طرح امب اور چتربائی کی جنگ کے کوائف بھی درج ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان جنگوں کے وہی کوائف زیادہ صحیح اور قابلِ تسلیم ہوں گے جو سید صاحبؒ نے بیان کئے ہیں ۔ سید صاحبؒ نے یہ خط ، ربیع الاول ۱۲۴۶ھ کو تحریر کیا تھا ۔ یہ خط فارسی میں ہے اور نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے ۔ اس کی نقل مرزا نظام بیگ صاحب رکن نیشنل میوزیم (کراچی) کی عنایت سے مجھے حاصل ہوئی ۔ بعد میں اس کا عکس بھی مل گیا ۔ یہ زحمت میرے برادرِ مکرم قریشی عبدالرشید صاحب نے میری خاطر برداشت کی جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں ۔ یہ خط اور اس کا عکس پہلی بار کسی کتاب کی زینت بن رہا ہے ۔

آخر میں ایک بات ضروری عرض کرنی ہے اور وہ یہ کہ اس کتاب میں حضرت سید صاحبؒ کے سوانح ، آپ کے تبلیغی دوروں ، سفرِ حج ، سفرِ جہاد اور مہماتِ جہاد کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ضمنی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس لئے تفاصیل سے گریز کیا گیا ہے ۔ چونکہ تسلسل قائم رکھنے کے لئے سید صاحبؒ کی زندگی کے ہر دور کی جھلکیاں دکھانی ضروری تھیں ۔ اس لئے یہ ابواب سپردِ قلم کرنے پڑے مگر اختصار سے ۔ ورنہ جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں اصل اہمیت تاریخ بالاکوٹ جنگِ بالاکوٹ ، اس کے پس منظر اور اس کی تفاصیل کو حاصل ہے یا ان غلط فہمیوں کے ازالے کو جو سید صاحبؒ اور آپ کی شخصیت کے متعلق پیدا کی گئی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان ابواب میں تفصیل سے کام لینا پڑا مگر یہاں بھی خواہ مخواہ بات بڑھا کر طول دینے کی کوشش نہیں کی گئی ۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لئے پیش آئی تاکہ نقاد صاحبان کے ذہن میں کوئی اُلجھن پیدا نہ ہو ۔

پیام شاہجہانپوری

فہرست مضامین

سیّد صاحبؒ کی مہماتِ جہاد

سیّد صاحبؒ کے عہد میں ہزارہ کی سیاست

سید صاحبؒ کا سفر "راج دواری"

آزادیٔ کشمیر کیلئے سید صاحبؒ کی مساعی

بالاکوٹ

جنگِ بالاکوٹ

پشاور سے سید صاحبؒ کی ہجرت

سید صاحبؒ کا رخِ جہاد

سید صاحبؒ، نواب امیر خاں اور انگریز

سید صاحبؒ کی علمی استعداد

سید صاحبؒ کی شخصیت

بحضور سیّد احمد شہیدؒ

کٹا کے تیغِ ستمگار سے گلو تو نے
بچالی ملّتِ بیضا کی آبرو تو نے

خزاں زدہ تھا چمن، ہر طرف تھی ویرانی
پھر اس چمن کو دیا آب و رنگ و بو تو نے

ترس رہے تھے بہت دن سے تشنہ لب میخوار
شرابِ عشق سے پُر کر دیے سبو تو نے

دریدہ دیکھ کے دامانِ امّتِ مظلوم
ہزار جان سے کی کوششِ رفو تو نے

لہو سے اپنے بنایا وہ عشق کا شہکار
زمیں پہ کھینچ دی تصویر ہو بہو تو نے

چلا کہاں سے، کہاں خیمہ زن ہوا آکر
دیا جنوں کو عجب جوشِ آرزو تو نے

جواں ہو شوق تو ہیں گرد صحرا و کہسار
سکھائے عشق کو آدابِ جستجو تو نے

چلو کہ خونِ مسلماں دہائی دیتا ہے
ندا یہ قریہ بہ قریہ دی، کو بہ کو تو نے

جھپٹ پڑے صفِ اعدا پہ تیرے دیوانے
کچھ اس ادا سے لگائی صدائے "ہو" تو نے

رہے گی یاد ہمیشہ عدو کی نسلوں کو
زبانِ تیغ سے کی تھی جو گفتگو تو نے

مری نظر میں مقدّس ہے ارضِ بالاکوٹ
کہ اپنے خون سے کیا اس کو سُرخ رو تو نے

(پیام شاہجہان پوری)

سیّد احمد شہیدؒ

تین الفاظ کا یہ مجموعہ برِصغیر کے مسلمانوں کی دینی اور قومی تمناؤں کی علامت ہے جس نے قالبِ خاکی اختیار کر لیا تھا۔ یہ آرزو تھی حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی جو انسانی پیکر میں نمودار ہوئی۔ غیرتِ اسلام، جہدِ مسلسل، جرأت و شجاعت، ثبات و استقلال اور جوہرِ کردار کے موزوں ترین امتزاج کا نام سید احمد شہیدؒ تھا جس کی زندگی ابتداء ہی سے اُن خصائص کی آئینہ دار تھی جن سے ماموریں من اللہ کی زندگی عبارت ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسے پُر ہول اور تاریک زمانے میں پیدا ہوا جس میں قندیلِ ربانی کی سخت ضرورت تھی۔ وہ ایسا پانی تھا جو آسمان سے وقت پر نازل ہوا اور بلا شبہ ملتِ اسلامیہ کی خشک کھیتی کو سیراب کر گیا۔ اس نے ریگ زاروں میں چمن کھلا دیئے۔ کانٹوں کو پھولوں میں تبدیل کر دیا۔ وہ ایسا امیرِ کارواں تھا جس نے سنگلاخ چٹانوں میں راستہ بنایا۔ ایسا راستہ جس کے نشانات آج تک موجود ہیں بلکہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اور نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ عیسیٔ دوراں تھا مگر چرخِ چہارم سے نہیں بلکہ اسی خاکدانِ عالم سے ظاہر ہوا، اور اس نے بنگال سے صوبہ سرحد و افغانستان کے دور دراز علاقوں تک اپنی مسیحا نفسی سے مردہ قلوب میں زندگی کی حقیقی روح پھونک دی۔ اس نے ملتِ اسلامیہ کی کشتِ تپاں کو نم کرنے کے لئے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر دیں اور جب دیکھا کہ اس کی زرخیزی کے لئے مزید نمی کی ضرورت ہے تو اپنا اور اپنے سینکڑوں رفقاء کا خون دے کر اس میں فصلِ انقلاب کی تخم ریزی کی اور پھر اپنے مرکزِ حقیقی کی طرف اس حالت میں واپس چلا گیا کہ اس کا جسم زخموں سے چھلنی تھا۔ بُریدہ حلقوم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے مگر قلب مطمئن تھا، روح جذبۂ شکر گزاری سے سرشار تھی کہ اسے جو خدمتِ عظمیٰ تفویض کی گئی تھی اسے سرانجام دینے کی توفیق بھی عطا ہوئی۔ چونکہ اس کتاب کے موضوع سے سید شہیدؒ کا بڑا گہرا تعلق ہے کہ جنگ بالاکوٹ کا سب سے بڑا ہیرو تھا۔ اس لئے ذیل میں آپؒ کے خاندانی حالات، سوانح، سیرت و کردار اور اصلاحی و عسکری تربیت کے مختلف پہلو پیش کئے جاتے ہیں۔

خاندانی حالات

حضرت سید احمد شہیدؒ کا خاندان برصغیر کا مشہور و ممتاز خاندان ہے۔ اس خاندان میں بڑے بڑے متقی و پرہیزگار،

جید علماء و مشائخ اور اہلِ اللہ گزرے ہیں جن سے ہر دور کے ہزاروں ہزار افراد نے کسبِ فیض کیا اور جنہوں نے علم و فضل کے دریا بہا دیئے۔ اس خاندان کا سلسلۂ نسب متعدد واسطوں سے امیر المومنین سیدنا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

سید احمد بن سید محمد عرفان بن سید محمد نور بن سید محمد ہدیٰ بن سید علم اللہ نقشبندی بن سید محمد فضیل بن سید محمد معظم بن سید احمد بن قاضی سید محمود بن سید علاؤالدین بن قطب الدین محمد ثانی بن سید صدر الدین بن سید زین الدین بن سید احمد بن سید علی بن سید قیام الدین بن سید صدر الدین بن سید رکن الدین بن سید نظام الدین بن سید قطب الدین کرمی۔ بن سید احمد مدنی بن سید یوسف بن سید عیسیٰ بن سید حسن بن سید حسین بن سید جعفر بن سید قاسم بن سید عبداللہ بن سید محمد ثانی بن سید عبداللہ الاشتر بن سید محمد صاحب النفس الزکی بن سید عبداللہ محض بن حسن مثنیٰ بن سید حسن مجتبیٰ بن امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ [۱]

جیسا کہ اس نسب نامے سے معلوم ہوتا ہے حضرت سید احمد شہیدؒ کے بزرگوں کا تعلق سرزمینِ حجاز سے تھا۔ اس خانوادے میں سید قطب الدین ابن سید رشید الدین ایک بڑے صاحبِ علم و فضل بزرگ گزرے ہیں۔ آپ عارف باللہ بھی تھے اور نہایت صاحبِ ہمت اور شجاع بھی۔ ۶۰۶ھ میں مدینہ منورہ سے مجاہدین کی ایک جماعت لے کر دہلی آئے اور پھر قنوج، مانک پور اور کڑا الہ آباد پر حملہ کیا۔ جو ابھی تک اسلامی قلمرو میں شامل نہ ہوئے تھے۔ یہ علاقے آپ کے ہاتھ پر فتح ہوئے اور اسلامی سلطنت کا حصہ بنے۔ سید قطب الدین نے دہلی اور آخر میں کڑا الہ آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ نے سلطان شمس الدین التمش اور سلطان غیاث الدین بلبن کا زمانہ پایا اور عرصے تک دہلی میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز رہے۔ [۲]

سید قطب الدین کی اولاد میں بڑی نادرۂ روزگار شخصیتیں پیدا ہوئیں جن میں آپ کے فرزند سید تاج الدین، فرزند زادے سید رکن الدین اور آگے چل کر شاہ علم اللہ بڑے پائے کے بزرگ گزرے ہیں۔ سید قطب الدین کے وصال کے ایک صدی بعد یہ خاندان کڑا الہ آباد سے رائے بریلی کے قصبہ جائس میں منتقل ہوگیا۔ پھر جائس سے چار میل کے فاصلے پر واقع ایک قصبہ نصیر آباد کو اپنا مسکن بنا لیا۔

جدِ امجد

اسی نصیر آباد میں ۱۲ ربیع الاول ۱۰۳۳ھ کو شاہ علم اللہ کی ولادت ہوئی۔ یہی شاہ علم اللہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے

---

[۱] مخزنِ احمدی ص۱۲ مؤلفہ سید محمد علی مطبوعہ مطبع مفید آگرہ

[۲] سیرتِ سید احمد شہید ص۴۵ ۴۴ حصہ اول مؤلفہ سید ابوالحسن علی ندوی (طبع سوم)

جدِ امجد اور اس خاندان کے باکمال مورثِ اعلیٰ تھے۔ دو بار حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ دوسرے حج سے واپسی پر کعبۃ اللہ کا نقشہ، اس کی پیمائش اور آبِ زمزم ساتھ لے کر آئے۔ اسی نقشے اور پیمائش کے مطابق اپنی اقامت گاہ رائے بریلی کے قریب اپنی اولاد کے ساتھ مل کر اپنے ہاتھوں سے مسجد تعمیر کی۔ بنیاد میں آبِ زمزم ڈالا۔ ۸ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ کو اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں وفات پائی اور اپنی تعمیر کردہ مسجد میں سپردِ خاک کیے گئے۔ حضرت شاہ علم اللہ اپنے عہد میں صحیح اسلامی زندگی کا نمونہ تھے۔ شرک و بدعت کے خلاف انہوں نے پوری قوت سے علمِ جہاد بلند کیا۔ طبیعت میں غیر معمولی استغنا تھا۔ کسی امیر یا سردار حتیٰ کہ بادشاہ وقت (اورنگ زیب) کا بھی احسان لینا گوارا نہ کیا۔ نہایت صابر و شاکر بزرگ تھے۔ ۳۲ سال کا جوان بیٹا (سید ابو حنیفہ)، جو نہایت لائق اور ذی علم تھا وفات پا گیا مگر ان کے گھر سے آہ و بکا کی معمولی سی بھی آواز نہ آئی۔ گویا آپ نے اپنے متعلقین کو بھی اپنی تربیت سے اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ دعا کیا کرتے تھے کہ "میری اولاد فقر و فاقہ میں زندگی گزارے تاکہ سامانِ آرائش مہیا ہو جانے کی وجہ سے دنیا کی محبت میں اس قدر مبتلا نہ ہو جائے کہ دین ہی سے کنارہ کشی اختیار کر لے۔"[1]

ان صفحات میں حضرت شاہ علم اللہ کے احوال و کوائف کی اس سے زیادہ تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ یہ تذکرہ ضمنی ہے اور صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ جس خانوادے میں حضرت سید احمد شہیدؒ نے آنکھ کھولی اور پروان چڑھے اس کا مورثِ اعلیٰ کس پائے کا بزرگ تھا۔

سیّد شہیدؒ کے والد

حضرت شاہ علم اللہ اپنے متعلقین میں دین سے محبت اور تقویٰ و پرہیزگاری کی جو روح پھونک گئے تھے، اس کی برکت سے اس خاندان میں ایسے ایسے نفوسِ قدسیہ پیدا ہوئے جن کے فیضِ تربیت نے ہزاروں گم کردہ راہ لوگوں کو راہِ راست دکھائی اور اس دَور کے غیر اسلامی معاشرے میں ایک چھوٹا سا اسلامی معاشرہ قائم کر دیا۔ شاہ علم اللہ کی نسل میں سید آیت اللہ، سید محمد مہدی، شاہ ابو سعید، سید قطب الہدیٰ محدث، سید نعمان اور سید عرفانؒ نے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور اصلاحِ خلق کے اعتبار سے بڑا نام پایا۔ حضرت سید احمد شہید انہی سید عرفان رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر فرزند تھے۔ سید عرفانؒ شاہ علم اللہ کے پڑپوتے اور نہایت عابد و زاہد بزرگ تھے۔ توکل کے بلند مقام پر فائز تھے۔ قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہتا تھا۔ ۱۲۱۱ھ میں لکھنؤ سے رائے بریلی جا رہے تھے کہ راستے میں فوت ہو گئے۔ پہلی بیوی سے ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں۔ مولوی سید محمد علی مولفِ "مخزنِ احمدی" انہی کے فرزند تھے۔ دوسری بیوی سے سید محمد ابراہیم، سید محمد اسحاق اور سید احمدؒ پیدا ہوئے۔ سید ابراہیم نے حصولِ علم کی طرف توجہ نہ کی۔ حاکم ریاست ٹونک نواب امیر خاں کے لشکر سے وابستہ تھے۔

---

[1] مخزنِ احمدی صفحہ ۱۴

دوسرے بھائی سید محمد اسحاق نے تحصیل علم میں بڑی دلچسپی لی اور اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ رکھا حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شاہ عبدالعزیز سے استفادہ کیا۔ عربی اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔ ساری زندگی درس و تدریس اور اصلاحِ خلق میں گزار دی۔ ۷ رجمادی الآخر ۱۲۳۴ھ کو وفات ہوئی۔

سید صاحبؒ کی ولادت اور ابتدائی تعلیم

سید محمد عرفان رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے چھوٹے فرزند سید احمدؒ ۶ صفر ۱۲۰۱ھ[1] مطابق ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ صاحبِ "مخزنِ احمدی" نے جو سید شہیدؒ کے بھانجے اور ہم عمر ہونے کے علاوہ سفر و حضر میں آپ کے رفیق تھے لکھا ہے کہ جب سید صاحبؒ کی عمر چار سال چار ماہ اور چار یوم ہوگئی تو شرفائے ہندوستان کے طریقے کے مطابق آپ کے والد بزرگوار نے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آپ کو مکتب میں بٹھا دیا۔ لیکن باوجود پوری کوشش کے آپکا دل تعلیم میں بالکل نہ لگا تین سال تک محنت کرنے کے باوجود قرآن حکیم کی چند سورتوں سے زیادہ اور کچھ آپ کو یاد نہ ہوا۔ مولانا عبدالحئی صاحب مرحوم نے اپنی کتاب "نزھتہ الخواطر" میں لکھا ہے کہ علم متداولہ کی طرف آپ کو شوق نہ تھا۔ قرآن حکیم کی چند سورتوں کے سوائے اس میں سے بھی کچھ یاد نہ ہوا۔ تحریر کا یہ حال تھا کہ صرف مفردات اور مرکبات لکھ لیتے۔ یہ حالت ابتدائی تین سال تک رہی۔ آپ کے بڑے بھائی اسحاق بن عرفانؒ بریلوی کو اس کا بڑا دکھ ہوتا تھا۔ وہ آپ کی تعلیم میں کوشاں رہتے لیکن آپ کے والد نے فرمایا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور خدا پر توکل کرو۔ چنانچہ انہوں نے اس طرف سے توجہ ہٹالی[2]۔ اس کے بعد سید صاحب کا سلسلۂ تعلیم وقتی طور پر منقطع ہوگیا۔

---

[1] برصغیر کے ممتاز عالم اور سید صاحبؒ کے ایک مشہور سوانح نگار مولانا عبدالحئی صاحب مرحوم نے اپنی گراں قدر عربی تصنیف "نزھتہ الخواطر" میں سید صاحبؒ کی پیدائش کا صرف سنہ درج کیا ہے یعنی ۱۲۰۱ ہجری۔ مہینے کا تعین نہیں کیا (ملاحظہ ہو نزھتہ الخواطر صفحہ ۲۳ جلد ۷) سید صاحبؒ کے بھانجے اور آپ کے سب سے مستند سوانح نگار مولانا سید محمد علی صاحب مرحوم نے صرف اتنا لکھا ہے کہ "ولادت باسعادت حضرت سید المجاہدین در شہر صفر بعد گذشتن یک ہزار و دو صد سال در سن اوّل" (مخزن احمدی صفحہ ۱۲) یعنی مہینے کا تعین کر دیا گیا مگر تاریخ کا تعین نہیں کیا۔ ماہ صفر کی ۶ تاریخ کا تعین مولانا غلام رسول مہر نے سید صاحبؒ کے بھتیجے سید محمد یعقوب صاحبؒ کی والدہ کے ایک بیان سے کیا ہے (ملاحظہ ہو سید احمد شہیدؒ صفحہ ۵۶) مولانا جعفر تھانیسری نے ایک اور ہی تاریخ لکھی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ "یکم محرم ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء قصبہ رائے بریلی ممالک اودھ میں جناب سید احمد صاحب سید محمد عرفان کے گھر پیدا ہوئے۔" (تواریخ عجیبہ صفحہ ۳) مرزا حیرت نے بھی سید صاحب کی ولادت ماہ محرم میں لکھی ہے (حیاتِ طیبہ صفحہ ۲۷)

[2] نزھتہ الخواطر جلد ہفتم صفحہ ۲۳ مولفہ مولانا سید عبدالحئی طبع اوّل بمطبعہ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۵۹ء ۱۳۷۸ھ "مخزنِ احمدی" میں اتنا اضافہ ہے کہ "تاکید ظاہری مفید نیست" یعنی ہماری اس ظاہری کوشش کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا (مخزنِ احمدی صفحہ ۱۴)

مشاغلِ طفولیت

سید صاحبؒ کے تمام تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں کہ ان کی کم سنی کی زندگی عام بچوں سے مختلف تھی شوخیوں، شرارتوں اور والدین سے بے جا ضدوں سے سید صاحبؒ کا دامنِ طفولیت پاک تھا۔" ایک دہشت آمیز تفکر بچپن ہی سے آپ کو لاحق رہتا تھا۔[1]" عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ جو بچے تعلیم سے دلچسپی نہیں رکھتے وہ اپنا وقت آوارگی اور فضول کھیلوں میں ضائع کرتے ہیں۔ مگر ہمیں سید صاحبؒ کے عہدِ طفلی میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ انہوں نے لہو و لعب اور فضول کھیلوں میں وقت ضائع کیا ہو۔ انہوں نے کھیلوں میں دلچسپی ضرور لی مگر یہ کھیل فضول نہ تھے بلکہ ان سے سید صاحبؒ کے پوشیدہ عزائم اور فطری جوہروں کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے اکثر تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ سید صاحبؒ کا رجحان کھیلوں کی طرف تھا۔ سپاہیانہ کھیل اور کبڈی آپ نہایت شوق سے کھیلتے تھے۔ آپ کے ایک تذکرہ نویس لکھتے ہیں :-

"جب آپ تھوڑے سے بڑے ہوئے تو آپ کا کھیل بھی یہی ہوتا تھا کہ بستی کے ہم سن لڑکوں سے ایک لشکر جمع کر کے بطور جہاد باآوازِ بلند تکبیریں کہتے ہوئے ایک فرضی لشکر کفار پر حملہ کیا کرتے تھے اور" وہ مارا ــــ یہ فتح ہوا" یہی صدائیں آپ کے لشکرِ اطفال سے بلند ہوتی تھیں"۔ [2]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوقِ جہاد اور غلبۂ اسلام کا جذبہ آپ کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا اور آگے چل کر آپ نے جو کارنامے سر انجام دیئے ان کے محرکات میں وقتی اور ہنگامی واقعات کے علاوہ آپ کے اس فطری جوھر کو بھی بڑا دخل تھا۔

ورزشِ جسمانی کا شوق

چونکہ اللہ تعالےٰ آپ کو ایک بلند مقصد کے لئے تیار کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے آپ کے مزاج اور فطرت میں ویسے ہی مادے جمع کر دیئے تھے۔ آئندہ زندگی میں آپکے جو عظیم کارنامے سرانجام دینے تھے ان کے لئے قوتِ جسمانی سب سے ضروری تھی اور آپ نے عہدِ جوانی میں قدم رکھنے کے بعد اس قوت کی نشو و نما کی طرف پوری توجہ دی۔ چنانچہ آپ کے بھانجے سید عبدالرحمٰن سپہ سالارِ افواج ٹونک کا بیان ہے کہ سید صاحبؒ کا معمول تھا کہ طلوعِ آفتاب سے لے کر کئی کئی گھنٹے ورزش کرتے۔ کشتی لڑتے، اپنے پیروں پر کھڑا کر کے پانچ سو ڈنڈ لگاتے۔ تھوڑا سا توقف کر کے پانچ سو ڈنڈ اور لگاتے بیس سیر سے لے کر ایک من تک وزنی مگدر گھماتے۔ مگر تعداد کے لحاظ سے نہیں بلکہ وقت کے اندازے کے مطابق

---

[1] حیاتِ طیبہ صفحہ ۲۷ و صفحہ ۱۷۱ مولفہ مرزا حیرت دہلوی مطبع فاروقی دہلی۔

[2] تواریخِ عجیبہ صفحہ ۳ مولفہ مولوی محمد جعفر تھانیسری مطبوعہ باہتمام ملک محمد الدین ایڈیٹر رسالہ "صوفی" منڈی بہاؤالدین۔

گھماتے تھے۔ یہ وقت دو سے چار گھنٹے تک ہوتا تھا۔ شہ زوری کا یہ عالم تھا کہ ایک روز پتھر کے ایک ستون کے پاس سے گزر رہے تھے۔ بڑے بڑے شہ زور اس کے ساتھ زور آزمائی کرتے تھے۔ یہ ستون اتنا بڑا اور وزنی تھا کہ بڑے سے بڑا زور آور اسے نیچے سے اٹھا کر زیادہ سے زیادہ کمر تک بلند کر سکتا تھا اور پھر رکھ دیتا تھا۔ سید صاحبؒ نے اسے دیکھا تو ان کا جذبۂ شہ زوری بیدار ہو گیا اور فرمایا کہ اسے اٹھانا چاہیئے۔ اتنا کہہ کر کرتہ اتارا اسے شانے پر رکھ کر جھکے اور یہ ستون اٹھا کر شانے پر رکھ لیا اور بیس قدم بے جا کر اسے اس قدر قوت سے زمین پر دے مارا کہ ہاتھ بھر کے قریب زمین میں گڑھا پڑ گیا۔ دوسرے دن جب لوگ اس ستون کو اس جگہ سے اتنی دُور اس گڑھے میں پڑا دیکھتے تو حیرت سے کہتے کہ یہ کون دیو تھا جس نے اتنے وزنی ستون کو اٹھا کر اتنی دُور لا پھینکا۔[1]

ورزش اور شہ زوری کے علاوہ آپ کو تیراکی کا بھی شوق تھا اور اس میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ ریاست ٹونک کے حکمران نواب وزیر الدولہ آپ کی تیراکی کے بڑے مداح تھے۔ بڑے بڑے تیراک آپ کے اس کمال کا لوہا مانتے تھے۔ دہلی میں اس فن کے بہت بڑے اُستاد تھے مولوی علیم اللہ انہوں نے سید صاحبؒ کے کمالِ فن کی ان الفاظ میں داد دی ہے کہ

"میں نے یہ خوبی سید صاحبؒ کے سوا کسی میں نہیں دیکھی کہ وہ شدید بہاؤ میں تیرتے تھے اور بہاؤ کے رخ کے مخالف تیرتے تھے۔ میں نے اس فن میں بڑی مشق بہم پہنچائی ہے اور اتنا طویل عرصہ اسی فن میں گزر گیا ہے مگر اس کے باوجود مجھ میں یہ وصف پیدا نہیں ہو سکا۔"

نواب وزیر الدولہ فرماں روائے ریاستِ ٹونک نے جو عرصے تک زمانۂ ولی عہدی میں سید صاحبؒ کی صحبت میں رہے۔ اپنی کتاب "وصایا الوزیر" میں سید صاحبؒ کی جسمانی طاقت کا ایک حیرت انگیز واقعہ درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ آپ کے وطن میں بزرگوں کے تکیہ کے قریب ایک تناور درخت تھا۔ جسے باورچی خانے کے مصارف کے لئے کاٹا گیا۔ تکیہ کے قریب دریا بہتا تھا۔ بہت سے آدمیوں نے مل کر کوشش کی کہ اس درخت کو اٹھا کر دریا میں ڈال دیں تاکہ اس راستے سے اسے تکیہ تک پہنچا دیا جائے مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ جب یہ ماجرا سید صاحبؒ کو معلوم ہوا تو آپ نے کلمہ طیبہ اور بسم اللہ پڑھ کر اسے اٹھایا اور دریا میں ڈال دیا۔ اس وقت آپ کے عقیدت مندوں کی ایک جماعت بھی موجود تھی جس نے سید صاحبؒ کی اس شہ زوری اور آپ کی جسمانی قوت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔[2]

خدمتِ خلق

سید صاحبؒ اس خانوادے کے فرد تھے جس کے جوتے اٹھانا بھی لوگ باعث فخر سمجھتے تھے۔ بڑے بڑے

---

[1] سیرت سید احمد شہید صہ ۴۲ مولفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی [2] وصایا الوزیر علی طریقۃ البشیر والنذیر وصیت صہ ۲۷ سنہ ۹۰ نصف ثانی مولفہ وزیر الدولہ نواب محمد وزیر خان فرماں روائے ریاست ٹونک۔ مطبوعہ در مطبع محمدی محمد آباد عرف ٹونک۔

صاحبانِ علم اس خاندان کے لوگوں کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے خصوصاً اس دَور میں سیدزادوں اور پیرزادوں کا جس درجہ احترام کیا جاتا تھا اس سے کون واقف نہیں، عام طور پر سیدزادے اور مرشدزادے اپنے ماحول کی وجہ سے دوسروں سے خدمت لینے کے عادی ہو جاتے تھے مگر چونکہ سید صاحبؒ کی فطرت ایک خاص سانچے میں ڈھلی تھی اور انہیں ایک خاص مقصد کے لئے دُنیا میں بھیجا گیا تھا۔ اس لئے ان کے طور طریقے اور فکر کا انداز بالکل جُدا اور منفرد تھا، انہوں نے اپنے ماحول سے ہٹ کر سوچا اور ایک نئی روایت کا آغاز کیا جو اگرچہ اس ماحول میں نئی تھی مگر تھی چودہ سو سال قدیم، جب عرب کی ایک شریف ترین ہستی نے جو مکہ کے سب سے ممتاز خاندان سے تعلق رکھتی تھی، غریبوں ضعیفوں اور بیواؤں کی خدمت و دستگیری کر کے طرح نو ڈالی تھی اور عالمِ انسانیت کو خدمتِ انسانیت کا عملی درس دیا تھا، اب اسی پاک و معزز ترین ہستی کی نسل سے ایک شخص اسی کا علَمِ خدمت لے کر اٹھا اور مسلم معاشرے کو پھر اسی طرزِ عمل اور طرزِ فکر کی طرف دعوت دی، چنانچہ آپ کے تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ سنِ شعور میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی سید صاحبؒ کا جو وصف سب سے زیادہ نمایاں ہوا اور ان کے جوہرِ کردار کا جو پہلو سب سے زیادہ تاباں و درخشاں نظر آیا وہ تھا غریبوں ضعیفوں اور معذوروں کی خدمت۔ اس فرض کی ادائیگی میں آپ اس بات کا مطلق خیال نہ فرماتے کہ جن لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں وہ شریف ہیں یا رذیل، چھوٹے ہیں یا بڑے۔ ضعفاء، یتامیٰ اور مساکین کی خدمت میں اس طرح ہمہ تن مصروف رہتے کہ بڑے بڑے بزرگ اور خدا پرست بھی تعجب کرتے۔ ہر صبح و شام غریبوں خصوصاً عورتوں کے گھروں میں جاتے ان کا حال دریافت کرتے اور ان سے کہتے کہ اگر جلانے کی لکڑی، پانی یا آگ کی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہو میں خدمت کے لئے حاضر ہوں، ہمسایہ اور اہلِ محلہ آپ کے جدِ بزرگوار کے مرید و عقیدت مند تھے۔ باوجودیکہ وہ اپنی عُسرت اور تنگدستی کی وجہ سے اس قسم کی خدمات کے محتاج تھے مگر وہ سید صاحبؒ سے یہ خدمت لینا گوارا نہ کرتے اور کہتے کہ یہ کیسی الٹی بات ہے کہ ہم اور ہمارے آباؤ اجداد آپ کے خاندان کے قدیم الایام غلام ہیں، ہم آپ سے خدمت لیں یہ کیسے ہو سکتا ہے مگر اس کے باوجود آپ ان کے خالی برتن اٹھا لیتے اور پانی بھر کر لے آتے جسے جلانے کے لئے لکڑی کی ضرورت ہوتی اس کے لئے لکڑیاں لینے شاداں و فرحاں جنگل میں چلے جاتے اور لکڑیاں کاٹ کر ان کا گٹھا بناتے اور سر پر رکھ کر ان کے گھر پہنچا دیتے، آپ کے اعزہ و اقربا آپ کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر سخت طعن و تشنیع کرتے اور کہتے کہ یہ شخص ہمارے خاندان کی عزت کو بٹہ لگا رہا ہے۔ مگر سید صاحبؒ ان باتوں کی قطعاً پروا نہ کرتے۔[۱]

سید صاحبؒ کے والدِ ماجد سید محمد عرفان ۱۲۱۴ھ میں وفات پا گئے۔ ان کے انتقال کے وقت سید صاحبؒ کی عمر ۱۳، ۱۴ سال کے درمیان تھی۔ والد ماجد کے انتقال کے بعد سید صاحبؒ تین چار سال وطن میں رہے۔

---

[۱] مخزن احمدی ص ۱۲، ص ۱۳

اس کے بعد بہ ظاہر تلاشِ معاش میں اپنے چند ہم سِن اصحاب کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہوئے کہ اس زمانے میں بھی یہ اودھ کا مرکزی شہر اور دار السلطنت تھا۔ روزگار اور ملازمت کے مواقع دوسرے شہروں کی نسبت یہاں زیادہ تھے۔

صاحبِ "مخزن" نے اس قافلے کے افراد کی تعداد سات بیان کی ہے جو سید صاحبؒ کی رفاقت میں روانہ ہوا تھا۔ اس میں "مخزنِ احمدی" کے مؤلف اور سید صاحبؒ کے بھانجے مولوی سید محمد علیؒ بھی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ اس قافلے کے ارکان کے پاس صرف ایک سواری تھی جسے ہر آدمی باری باری استعمال کرتا تھا۔ مگر جب سید صاحبؒ کی باری آتی تو آپ خود سوار نہ ہوتے بلکہ منت سماجت کرکے ان لوگوں کو سوار کرا دیتے جو جسمانی لحاظ سے کمزور ہوتے۔ ایک سواری سے سات آدمیوں کا سفر طے ہونا ناممکن تھا۔ اس لئے ہر مسافر کو خاصا طویل فاصلہ پا پیادہ طے کرنا پڑا۔ پھر ہر مسافر کی پیٹھ پر اس کا بستر اور ضروریاتِ زندگی کا سامان لدا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نصف منزل طے کرنے کے بعد قافلے کے لوگ ہمت ہار بیٹھے اور مزدور کی تلاش شروع کی مگر باوجود کوشش کے کوئی مزدور میسّر نہ آیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر سید صاحبؒ کا جذبۂ ہمدردی و خدمتِ خلق موجزن ہو گیا اور انہوں نے اپنے مضمحل ساتھیوں سے بہ کمالِ عجز سے کہا کہ "میری ایک درخواست ہے اگر آپ لوگ قبول کریں۔ سب نے بیک زبان کہا کہ شوق سے کہئے۔ آپ نے فرمایا کہ آپ سب لوگ اپنا سارا اسباب کمبل میں باندھ کر میرے سر پر رکھ دیں۔ میں اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دوں گا۔"

چونکہ لوگ قول و قرار کر چکے تھے۔ اس لئے پابندیٔ عہد سے مجبور ہو کر سب نے اپنا اپنا سامان اکٹھا کیا اور بڑا سا گٹھا باندھ کر سید صاحبؒ کے سر پہ رکھ دیا۔ سید صاحبؒ اپنے سامان کے علاوہ یہ سارا سامان اٹھا کر پیدل چل دیئے اور تقریباً ۲۵ میل کا سفر اسی حالت میں طے کیا۔ راستے میں کہتے جاتے تھے کہ بھائیو آج آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ اگر بقیہ ساری عمر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہوں تو ادا نہیں کر سکوں گا۔[۱] اس واقعہ سے سید صاحبؒ کے جذبۂ خدمتِ خلق کے علاوہ ان کی ہمت اور طاقتِ جسمانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس امر کا بھی کہ دوسروں کی خدمت کرنے میں انہیں کسی قسم کا عار محسوس نہیں ہوتا تھا۔

جذبۂ ایثار

مولانا جعفر تھانیسری کا بیان ہے کہ "اس طرح گٹھا اسباب کا اٹھائے اور شکر کرتے ہوئے تین منزل راہ طے کرکے داخلِ شہر لکھنؤ ہوئے۔ لکھنؤ پہنچ کر سب ساتھی تلاشِ روزگار میں ادھر ادھر پھرنے لگے لیکن روزگار کہاں جو کچھ تھوڑا بہت خرچ ان کے پاس موجود تھا وہ بھی تمام ہو گیا۔

سوائے سید صاحبؒ کے ہر متنفس حیران اور پریشان تھا .... سید صاحبؒ کے واسطے ایک امیر

---

[۱] مخزنِ احمدی صہ۱۱

محبِ سادات کی سرکار سے دونوں وقت کا کھانا مقرر ہو گیا تھا۔ جہاں سے دونوں وقت گوشت پلاؤ وغیرہ عمدہ عمدہ کھانے آپ کے واسطے آجاتے مگر آپ کے ساتھیوں کا کھانا سوائے نان و نمک یا دال روٹی کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ مگر آپ اپنا عمدہ کھانا اپنے ساتھیوں کو کھلا دیتے تھے۔ بلکہ بار بار ایسا بھی اتفاق ہوا کہ ساتھیوں پر نوبتِ فاقہ پہنچ جاتی۔ اس دن کچھ عذرِ سوء ہضمی وغیرہ کرکے بجائے ان کے آپ فاقہ کھینچتے اور اپنا کھانا ساتھیوں کو کھلا دیتے۔" ؎

سیّد صاحبؒ لکھنؤ میں چار ماہ مقیم رہے۔ اس دوران میں آپ کے ہمراہیوں پر بڑی تکلیف اور نہایت تنگدستی کے وقت گزرے۔ جسم اور روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ جب کوئی ملازمت نہ مل سکی تو ان میں سے بعض نے "کریما" وغیرہ کی کتابت کرکے اور بعض نے ٹوپیاں سی کر فروخت کرنا شروع کیں۔ اس سے بمشکل اتنی یافت ہوتی کہ دو وقت کی روٹی کا خرچ نکل آتا۔ اسی دوران میں حاکم اودھ کی طرف سے سیّد صاحبؒ کے میزبان امیر کے نام سواروں کی بھرتی کا حکم آیا۔ بیروزگاری اتنی تھی کہ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی ایک ہزار سوار اسلحہ سے لیس ہوکر آموجود ہوئے۔ امیر نے ہر دس سواروں میں سے ایک کو منتخب کر لیا اور دو آسامیاں پُر کرنے کا اختیار سیّد صاحبؒ کو دیدیا۔ سیّد صاحبؒ خود روزگار کے متلاشی تھے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو ان میں سے ایک خود قبول کر لیتا اور دوسری اپنے کسی ہمراہی کو دے دیتا۔ مگر یہ سیّد صاحب کے ایثارِ نفس اور بلندیٔ کردار کا ایک اور ثبوت ہے کہ انھوں نے ان دونوں اسامیوں پر اپنے ہمراہیوں میں سے دو کا تقرر کر دیا اور خود اللہ تعالیٰ کے فضل کے طالب رہے۔

خدا ترسی

اسی دوران میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس سے سیّد صاحبؒ کی رحم دلی، غربا پروری اور ان کے دل میں مصیبت زدہ انسانوں کی ہمدردی کا جذبہ جس شدت سے موجزن رہتا تھا اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک روز حاکم اودھ کی طرف سے اطلاع آئی کہ وہ شکار کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔ سیّد صاحبؒ کے میزبان امیر بھی ہم رکاب ہوئے۔ ان کی وجہ سے سیّد صاحبؒ کو بھی شریکِ سفر ہونا پڑا۔ ان کے ساتھی جو رائے بریلی سے ہمراہ آئے تھے اس خیال سے ہمراہ ہو لئے کہ راستے میں مزدوری کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ اثنائے سفر میں سیّد صاحبؒ قافلے سے بچھڑ گئے۔ محمدی کا یہ جنگل نہایت خوفناک تھا اس میں شیر، بھیڑیئے، ریچھ اور ہاتھی بکثرت تھے۔ ایک دو آدمی ہر روز ان کی نذر ہو جاتے تھے۔ اس لئے لوگ سیّد صاحبؒ کی طرف سے نہایت متفکر ہوئے۔ مولوی سیّد محمد علی مولف "مخزنِ احمدی" کا جو اس سفر میں سیّد صاحبؒ کیساتھ تھے، بیان ہے کہ سب کو یقین ہو گیا کہ سیّد صاحبؒ پر ضرور کوئی آفت آئی ہے اور وہ اس جنگل میں لقمۂ اجل ہو گئے ہیں۔ تین یوم اسی رنج و غم اور پریشانی میں گزر گئے کہ چوتھے دن ایک آدمی لشکر میں آیا اس نے ایک شخص کا حلیہ بیان کیا

؎ تواریخ عجیبہ ص۵

جو سید صاحبؒ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا اور کہا کہ وہ راب کا ایک گھڑا سر پر اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ پیچھے پیچھے ایک سپاہی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ شخص شکل و صورت سے تو شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔ پھر یہ کیا معاملہ ہے۔ اس پر سپاہی نے مجھے عجیب ماجرا سنایا۔ اس نے بتایا کہ جب میں نے سفر کا قصد کیا اور مزدور کی ضرورت محسوس ہوئی تو مجھے ایک بوڑھے اور کمزور آدمی کے علاوہ اور کوئی نہ ملا۔ چونکہ وہ فاقے سے تھا اس لئے متکلم پُری کے لالچ میں اس نے یہ بوجھ اٹھا لیا اور لرزتا، لڑکھڑاتا اور روتا چل دیا کہ ناگاہ وہ جوان (سید صاحبؒ) مل گیا۔ اس نے مزدور کی یہ حالت دیکھی تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور مجھے مخاطب کر کے کہا کہ اے جوان اس ضعیف مزدور پر ظلم وستم کیوں کر رہا ہے۔ تجھے خدا سے خوف نہیں آتا۔ اس پر میں نے کہا کہ میں نے اسے بیگار میں نہیں پکڑا ہے۔ بلکہ اجرت پر اس کی خدمات حاصل کی ہیں۔ یہ سن کر وہ شخص (سید صاحبؒ) مزدور کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے حقیقت حال معلوم کی۔ اس نے بتایا کہ میں فاقے سے ہوں۔ اس لئے لاچار ہو کر یہ بوجھ اٹھا لیا تھا۔ اس کی بپتا سن کر اس (سید صاحبؒ) نے مجھ (سپاہی) سے بڑی منت وزاری سے کہا کہ اگر تمہارے پاس پیسے ہوں تو اسے اس کی مزدوری دے دو اور خدا کے غضب سے ڈرو۔ میں نے فوراً چند سکے جو اس سے طے کئے تھے اس (سید صاحبؒ) کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس کے بعد اس (سید صاحبؒ) نے مزدور سے کہا کہ تم کچھ دیر کے لئے اس درخت کے نیچے بیٹھ کر سستا لو۔ بعد ازاں اس نے وہ سکے مزدور کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور مجھ سے کہا کہ اس بلاکش (مزدور) کو رخصت کر دو اور مجھے خدمت کا موقع دے کہ مجھ پر احسان کر دو۔ اس پر میں (سپاہی) نے کہا کہ اے جوان، تمہارے چہرے بشرے سے تو شرافت، نیکی اور فہم و فراست ظاہر ہوتی ہے اور باتیں بچوں جیسی کرتے ہو۔ یہ تو ایسا خوفناک جنگل ہے کہ رستم بھی ہو تو اس کا دل شق ہو جائے، یہاں سے ہمارا بخیریت گزر جانا ہی کیا کم ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم یہ بوجھ اٹھا کر منزل پر کیسے پہنچو گے۔ اس پر اس شخص (سید صاحبؒ) نے بڑی منت سماجت سے کہا کہ اگر تم یہ بوجھ میرے سر پر رکھ دو گے تو میں تاحیات تمہارا احسان مند رہوں گا۔ آخر بدرجۂ مجبوری میں نے اس کے ارشاد پر عمل کیا اور وہ بوجھ اٹھا کر اس (سید صاحبؒ) کے سر پر رکھ دیا۔ وہ شخص گھڑا لے کر چل پڑا اور رات کو منزل پر پہنچ گیا۔[1]

یہ واقعہ سن کر سید صاحبؒ کے دوستوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ وہ زندہ و سلامت موجود ہیں۔

سفرِ دہلی اور ایثارِ نفس

لکھنؤ کا ماحول سید صاحبؒ کو پسند نہ آیا۔ وہاں کی تکلفانہ زندگی، لہو ولعب اور درباری داری سے ان کی پاکیزہ اور بلند فطرت کو دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں کو ایک نیک دل امیر کے سپرد کر کے دہلی روانہ ہو گئے

---

[1] مخزنِ احمدی ص۱۷

روانگی کے وقت ان کے والد ماجد کے ایک مخلص دوست نے کچھ زرِ نقد اور ایک گھوڑا سواری کے لئے ان کی نذر کیا۔ سید صاحبؒ نے ہر چند معذرت کی اور کہا کہ میں فقیر آدمی میرا ان چیزوں سے کیا تعلق۔ مگر اس نے نہایت منت سماجت کر کے روپیہ اور گھوڑا دونوں چیزیں سید صاحبؒ کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ سید صاحبؒ گھوڑے پر سوار ہو کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔ مگر ابھی تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تھا کہ چند ایسے اشخاص سے ملاقات ہوئی جن میں سے ایک زخمی، دوسرا بیمار اور دو ضعیف آدمی تھے جو تین دن سے فاقہ کشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ سید صاحبؒ جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہمدردِ خلائق دل اور خدا ترسی کا جذبہ لے کر آئے تھے ان مصیبت زدہ افراد کی حالتِ زار دیکھ کر بے قرار ہو گئے۔ اپنا گھوڑا زخمی اور بیمار کے حوالے کیا اور زرِ نقد جو ان کے والد ماجد کے عقیدت مند نے دیا تھا، ان فاقہ کش ضعیفوں کی نذر کر دیا اور خود پا پیادہ اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے روانہ ہو گئے کہ اس نے اپنے فضل سے انہیں مصیبت زدہ افراد کی خدمت کی توفیق عطا فرمائی[1]۔ راستے میں متعدد موقعوں پر آپ نے پریشان حال افراد کی خدمت کی۔ چنانچہ اسی سفر کا واقعہ ہے کہ ایک ضعیف شخص کو اپنے کندھے پر بٹھا کر تیرہ میل کا فاصلہ پا پیادہ طے کیا اور اسے اس کے گھر پہنچایا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے "تاریخِ احمدیہ" کے حوالے سے اس مجاہدِ نفس کے ایثار اور خدا ترسی کا ایک اور واقعہ بیان کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ سید صاحبؒ پا پیادہ دہلی روانہ ہوئے۔ چلتے چلتے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ ایک مقام پر کچھ دیر کے لئے رکے۔ ایک پیسے کے ستو لیے اور گڑ میں گھول کر چاہتے تھے کہ پی لیں اتنے میں ایک غریب آدمی نے آواز دی کہ چار روز سے فاقے سے ہوں۔ سید صاحبؒ کو اس کی حالت پر ترس آیا۔ ستو اٹھا کر اسے دیدیئے اور خود یہ رات فاقے سے گزاری[2]۔

سفرِ دہلی اور اس کا مقصد

سید صاحبؒ کے ترکِ وطن کا مقصد بہ ظاہر تلاشِ معاش تھا اور ان کے بہت سے تذکرہ نویسوں نے بھی یہی مقصدِ سفر بیان کیا ہے مگر واقعات شہادت دیتے ہیں کہ ان کے ترکِ وطن کا حقیقی مقصد طلبِ علم تھا۔ چنانچہ جب وہ لکھنؤ سے دہلی پہنچے اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے معانقہ و مصافحہ اور مزاج پرسی کے بعد اس سفرِ دور دراز کا مقصد دریافت کیا۔ اس کے جواب میں سید صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ کی ذاتِ گرامی کو مغتنماتِ زمانہ میں سے سمجھ کر اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ اللہ تعالےٰ کا عرفان حاصل ہو جائے۔

"مخزن احمدی" کے مصنف نے سید صاحبؒ سے یہ الفاظ منسوب کئے ہیں۔

"ذاتِ مقدس حضرت را غنیمت دانستہ برائے طلب او تعالیٰ جل شانہٗ بر ایں جا رسیدم[3]"

---

[1] حیات طیبہ صـ۲۸ [2] سیرت سید احمد شہید مولفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی صـ۷۲ [3] مخزن احمدی صـ۱۸

اس کے جواب میں شاہ صاحب نے فرمایا:۔

"بوراثت پدری و مادری شما اگر فضل خدا شامل حال است فائز خواہد شد" [1]

یعنی اگر فضل خداوندی شامل حال رہا تو تمہارے دادہال اور ننہال کی وراثت (علمی اور روحانی دولت مل جائیگی)

بیعت اور اجازتِ بیعت

جب سید صاحبؒ میں اسرارِ دین اور رموزِ معرفت سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے سید صاحبؒ سے بیعت لی اور شاہ صاحب سے صوفیاء کے تین سلسلوں نقشبندیہ، قادریہ اور چشتیہ کے طریقوں کی تربیت آپ نے حاصل کی۔ اس اثناء میں انہوں نے ذکر و اشغال اور ریاضت کی بڑی دشوار گذار منزلیں طے کیں اور نفس کشی کے تمام مراحل سے کمال خوش اسلوبی سے گزر گئے۔ اس کے بعد انہیں بیعت لینے کی بھی اجازت مل گئی۔ سید صاحبؒ کی تربیتِ تصوف اور اجازت بیعت کا پس منظر بھی بڑا دلچسپ اور تاریخی نوعیت کا ہے اور اس میں اطاعتِ مرشد کا سبق بھی پوشیدہ ہے۔ اس لئے ذیل میں اس کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

مولوی امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ "شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے خاندان میں کسی کے یہاں شادی کی تقریب ہوئی اس تقریب میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ تینوں بھائی موجود تھے۔ اور شامیانہ تانا جا رہا تھا۔ اس مقام پر ایک نیم تھا جس کی وجہ سے شامیانہ اچھی طرح سے نہ تنتا تھا بلکہ اس میں جھول رہتا تھا۔ اتنے میں سید صاحبؒ بھی مسجد میں تشریف لے آئے۔ جب آپ نے یہ رنگ دیکھا تو کرتہ کو کمر سے باندھ کر نیم پر چڑھ گئے اور نیم پر چڑھ کر جو شامیانہ کو کھینچا تو شامیانہ بالکل ٹھیک تن گیا اور جھول بالکل نکل گیا۔ سید صاحبؒ کی وضع شاہ عبدالقادر صاحبؒ کو پسند آگئی اور انہوں نے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے عرض کیا کہ سید احمدؒ کو مجھے دیدیجئے۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ لے جاؤ اور سید صاحبؒ سے کہہ دیا کہ میاں عبدالقادر کے ساتھ جاؤ۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ ان کو اپنے پاس اکبری مسجد میں لے آئے اور ایک حجرہ میں رکھ دیا اور اشغال کے لئے فرمایا کہ میری سہ دری کے پاس بیٹھ کر ذکر کیا کرو۔ سید صاحبؒ نے اس حکم کی تعمیل کی اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے حکم کے مطابق ذکر و شغل کرتے رہے۔ شاہ صاحب نے سید صاحبؒ کو ڈھائی برس اپنی خدمت میں رکھا اور ڈھائی برس کے بعد ان کو لیکر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں آئے اور شاہ صاحبؒ سے عرض کیا کہ سید احمدؒ حاضر ہیں ان کو پرکھ لیجئے۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میاں عبدالقادر تم جو کچھ کہتے ہو ٹھیک کہتے ہو۔ اب ان کو بیعت کی اجازت دے دو۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے عرض کیا کہ حضرت اجازت تو آپ ہی دیں گے اور ان سے آپ ہی کا سلسلہ چلے گا۔ شاہ صاحبؒ نے بیعت کی اجازت دے دی"۔ [2]

---

[1] مخزن احمدی ص۱۸

[2] ارواح ثلاثہ ص۱۲۴

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علوم باطن کو سمجھنے کی سید صاحبؒ میں اعلیٰ درجے کی استعداد تھی اور انہوں نے نہایت تیز ذہن پایا تھا۔ اس زمانے کے دو جید عالم اور آسمانِ روحانیت کے آفتاب و ماہتاب ان پر ضوفگن تھے۔ سید صاحبؒ نے براہ راست ان سے کسبِ نور کیا۔ اس واقعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ کا خمیر سعادت مندی کے مادے سے تیار ہوا تھا۔ اسی سعادتِ طبع نے انہیں اس بلند مقام پر فائز المرام کر دیا کہ ان کے اساتذہ اور مرشد ان پر فخر کرنے لگے۔ ان کی ذکاوتِ طبع نے بہت سے مشکل مرحلوں کو آسان کر دیا اور انہوں نے روحانیت کے مقامات بلند کو چھو لیا۔ ان کی ان صلاحیتوں کا ان کے استاد اور مرشد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے بھی اعتراف کیا اور فرمایا کہ اس سیدِ عالی مرتبت میں علم باطن کا ایسا مادہ فہم ہے کہ ادنیٰ اشارے پر مقاماتِ عالیہ کا ادراک حاصل کر لیتا ہے۔

وطن کو واپسی اور شادی

کئی سال دہلی میں قیام کرنے اور علم کی تشنگی بجھانے کے بعد ۱۲۱۲ھ میں سید صاحبؒ اپنے مرشد سے اجازت لیکر پا پیادہ وطن روانہ ہوئے اور رائے بریلی پہنچ کر اپنے مورثِ اعلیٰ حضرت شاہ علم اللہؒ کی مسجد میں قیام کیا۔ جب آپ وطن سے روانہ ہوئے تھے تو بے ریش و بروت تھے مگر جب واپس ہوئے تو چہرے پر ریش نمایاں تھی۔ لباس بھی فقیرانہ تھا یعنی کمبل کا کرتہ اور درویشوں والی ٹوپی تھی۔ اس لئے پہلی نظر میں اعزہ و اقربا بھی نہ پہچان سکے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ سید احمدؒ ہیں تو عزیزوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس بار سید صاحبؒ رائے بریلی میں دو سال رہے۔ اب سید احمدؒ پہلے والے سید احمدؒ نہ تھے۔ اب ان میں حیرت انگیز تغیر آچکا تھا۔ دل میں ایک تڑپ اور لگن پیدا ہو چکی تھی۔ زبان ذکر الٰہی سے آراستہ رہتی تھی۔ بیان میں بلا کی تاثیر تھی۔ رائے بریلی میں واپسی کے بعد اہل وطن پر آپ کی ربانی شخصیت کا نہایت گہرا اثر پڑا۔ لوگ آپ کے پاس آتے اور فیوض روحانی حاصل کرتے۔ شاہ علم اللہؒ کی مسجد میں آپ نے قیام فرمایا اور یہ مسجد حقیقی معنی میں درس گاہِ روحانیت بن گئی۔

قرآن و حدیث کا وعظ آپ کا شغل تھا جو شب و روز جاری رہتا۔ وہ جو کچھ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے سیکھ کر آئے تھے اسے حاضرین کے آگے اس خوبی اور عمدگی سے ادا کرتے تھے کہ لوگوں پر خیال سے زیادہ اثر ہوتا تھا۔ سید صاحبؒ کے اعمال قابلِ توصیف تھے اور آپ کی عملی زندگی حقیقی شرعی زندگی ہو گئی تھی۔ اس لئے لوگوں پر آپ کے افعال کا زیادہ اثر پڑنے لگا اور وہ ایسے معتقد ہوئے کہ مرید بننے کی آرزو کی۔” [1]

اس بار سید صاحبؒ دو برس رائے بریلی میں رہے۔ اس دوران میں عزیزوں نے آپ کو شادی کی بابت تحریک کی۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جب سید صاحبؒ خانگی زندگی کی منزل میں قدم رکھیں گے اور ذمہ داریوں کا بار شانوں

---

[1] حیات طیبہ ص ۲۹۸ نسخہ مطبوعہ مشتاقی برقی پریس امرتسر۔

پر آپڑے گا تو یہ درویشانہ طور طریقے ختم ہو جائیں گے اور فکر معاش دامن گیر ہو جائے گی۔

خاندان ہی کی ایک لڑکی سے سید صاحبؒ کی منگنی ہو چکی تھی۔ مگر جب لڑکی کے سرپرستوں نے دیکھا کہ سید صاحبؒ دُنیا کی طرف مائل نہیں اور نہ ان کا کوئی ذریعہ آمدنی ہے تو انہیں رشتہ دینے میں تامل ہوا مگر خاندان کے بزرگوں نے سمجھا بجھا کر انہیں رضامند کر لیا۔ ۱۲۲۳ھ میں اس سیدزادی سے جن کا اسم گرامی سیدہ زہرہ تھا سید صاحبؒ کی شادی ہو گئی۔ یہ عفیفہ شاہ علم اللہؒ کے عمِ محترم سید محمد اسحاقؒ کی نسل سے تھیں۔ ایک سال بعد یعنی ۱۲۲۴ھ میں ان کے بطن سے سید صاحبؒ کی پہلی صاحبزادی پیدا ہوئیں جن کا نام سیدہ سائرہ رکھا گیا۔

عسکری زندگی کا آغاز

اللہ تعالےٰ نے سید صاحبؒ کو جن بلند مقاصد کی تکمیل کے لئے پیدا کیا تھا ان میں سے ایک مقصد کے حصول کے لئے ان کی تربیت مکمل ہو گئی تھی۔ اب دوسرے مقصد کی تعمیل کا مرحلہ درپیش تھا چنانچہ اس کے اسباب بھی اسی ہستی نے پیدا کر دیئے اور ایک غیر مرئی طاقت انہیں رائے بریلی سے وسط ہند کے دور دراز علاقے میں لے گئی جس کے راستے اس زمانے میں انتہائی مخدوش تھے۔ بلکہ سیاسی حالات کی وجہ سے اس راہ کا ہر قدم خطرات کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ یہ ۱۸۱۱ء کا واقعہ ہے کہ سید صاحبؒ کو رائے بریلی میں جنابِ الٰہی سے اشارۂ غیبی ہوا کہ "نواب امیر خاں کے لشکر میں جاؤ وہاں ہمیں تم سے کچھ کام لینے ہیں"۔

چنانچہ سید صاحبؒ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تعمیل میں رائے بریلی سے روانہ ہوئے۔ چند روز دہلی میں قیام کر کے راجپوتانہ کی طرف رختِ سفر باندھا اور نواب امیر خاں کے لشکر میں پہنچ کر فوجی ملازمت اختیار کر لی۔ شروع میں نواب یا اس کے لشکر کے لوگوں کو آپ کی شخصیت اور اس کے پوشیدہ جوہروں کا علم نہ ہو سکا اور آپ نے ایک سوار کی حیثیت سے نواب کے لشکر میں رہ کر فوجی خدمات انجام دیں۔

نواب امیر خان سنبھل ضلع مراد آباد کے ایک شمشیر زن افغان تھے ان کا آبائی وطن ریاست بونیر تھا۔ ان کے باپ اور دادا بھی سپاہی پیشہ تھے اور روہیلوں اور مرہٹوں کی جنگ میں دادِ شجاعت دے چکے تھے۔ امیر خان نے بھی اپنے آبا کا پیشہ اختیار کیا۔ اس وقت ہندوستانی طوائف الملوکی کا شکار تھا اور سارا ملک چھوٹی بڑی آزاد اور خودمختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان ریاستوں کے حکمران ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہتے تھے۔ اس جنگ وجدل میں انہیں ایسے لوگوں کی ضرورت رہتی تھی جو ان کی طرف سے جنگ میں شریک ہوں، عام طور پر لوٹ کا مال ہی ان پیشہ ور جنگ آزماؤں کی تنخواہ ہوتی تھی۔ چنانچہ امیر خان نے ان حالات سے فائدہ اٹھایا اور تھوڑے سے جی دار اور شمشیر زن افغانوں کی جمعیت فراہم کر کے مختلف راجوں اور نوابوں کی طرف سے اس مہم جوئی میں شریک ہو گئے۔

ان جنگوں میں انہیں زرِ کثیر اور بہت سا اسلحہ میسر آگیا۔ رفتہ رفتہ ان کی جمعیت اور طاقت اتنی بڑھ گئی کہ بڑے بڑے راجہ ان سے خم کھانے لگے۔ کبھی ایک ریاست پر حملہ کیا کبھی دوسری پر، کبھی اس سے خراج وصول کیا کبھی اُس سے۔ جس وقت سید صاحبؒ امیر خان کے لشکر میں پہنچے اس وقت ان کی طاقت بہت مضبوط ہو چکی تھی اور قرب و جوار کے راجاؤں سے ان کی لڑائیاں جاری تھیں۔ سید صاحبؒ کو امیر خان کے وجود میں ایک ایسا حکمران نظر آیا جو مسلمانوں کی گرتی ہوئی دیوارِ عظمت کا سہارا بن سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے اپنے سانچے میں ڈھالنے کا منصوبہ بنایا۔ ادھر اس امیر کے پاس رہ کر انہیں اپنے عسکری ذوق کی تربیت کا بھی موقع میسر آگیا تھا۔ چنانچہ امیر خان کے لشکر میں انہوں نے فنونِ حرب میں پوری دستگاہ حاصل کر لی۔ شمشیر زنی، شہسواری اور بندوق چلانے کے علاوہ فوج کی قیادت، دشمن پر حملہ کرنے اور فتح پانے، غرض میدانِ جنگ کے سارے نشیب و فراز سے واقفیت حاصل کر کے سید صاحبؒ ایک تجربہ کار جرنیل بن گئے۔ وہ امیر خاں کے لشکر میں سات سال رہے۔ انہوں نے امیر خاں کے ساتھ متعدد جنگوں میں حصہ لیا اور ایک بار پنڈلی میں گولی لگنے سے زخمی بھی ہوئے۔

اس دوران میں سید صاحبؒ کی عبادت گزاری، پرہیزگاری اور پاکیزہ اطوار کا نواب امیر خاں نے بار بار مشاہدہ کیا۔ یہ تو اسے پہلے ہی معلوم تھا کہ سید صاحبؒ ایک شریف اور معزز خاندان کے سیدزادے ہیں۔ اب ان کے بلند کردار نے نواب امیر خاں کو سید صاحبؒ کا معتقد بنا لیا۔ علاوہ ازیں اس نے سید صاحبؒ کی قبولیتِ دعا کے بعض عجیب و غریب نشانات دیکھے۔ ان تمام امور نے اس کی طبیعت پر بڑا اثر کیا۔ وہ ان کی روحانیت اور اصابتِ فکر کا بھی قائل ہو گیا اور انہیں اپنے ہمراہ رکھنے لگا۔ رفتہ رفتہ سید صاحبؒ اس کے مشیر اور ہمدم و ہمراز بن گئے۔ سید صاحبؒ کے وجودِ مسعود سے اہل لشکر کے اوضاع و اطوار میں بھی بڑا تغیر پیدا ہو گیا اور لوگوں کی کثیر تعداد ان کی معتقد ہو گئی۔ وہ ناتراشیدہ افغان جن کو لوٹ مار کرنے اور خون بہانے کے علاوہ اور کسی چیز سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ جن کا دینی جذبہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔ سید صاحبؒ کی برکت سے ان میں پاکیزہ تبدیلی آگئی۔ ان کی سرکش گردنیں معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں جھکنے لگیں۔ خود امیر خاں کے افکار و انداز بھی بہت حد تک بدل گئے اور لوگ تاریخ کو خواہ کسی رنگ میں پیش کریں حقیقت یہ ہے کہ امیر خان کا لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی زندگی ترک کر کے ایک ریاست پر قناعت کر لینا اور باوقار و پر امن زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جانا سید صاحبؒ ہی کی تربیت کا کرشمہ تھا۔ سات سال تک امیر خاں کے لشکر میں رہ کر اور اپنا مشن مکمل کر کے سید صاحبؒ نے نواب کی اجازت سے رختِ سفر باندھا۔

دہلی کو واپسی اور دعوت اصلاح

امیر خان سے رخصت ہو کر سید صاحبؒ دہلی آئے اور اکبر آبادی مسجد میں فروکش ہوئے۔ آپ کی دہلی میں آمد

سے ایک ہفتہ قبل حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شہر کی جامع مسجد میں تشریف لائے ہیں اور مخلوقِ خدا ہر طرف سے بغرض زیارت جوق در جوق چلی آرہی ہے ملن میں سے سب سے پہلے حضورؐ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو شرفِ دست بوسی عطا فرمایا۔ آپ نے اپنا عصا ان کے ہاتھ میں دے کر حکم دیا کہ یہ لے کر مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور جو لوگ زیارت کی غرض سے آنا چاہتے ہیں مجھ سے آکر ان کا حال بیان کرو اور جسے میں اجازت دوں اسے اندر آنے دو۔ صبح اٹھ کر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ شمس الدینؒ شہید (مشہور بہ مرزا مظہرؒ) کے خلیفہ حضرت شاہ غلام علیؒ سے ملے اور ان سے یہ خواب بیان کر کے اس کی تعبیر چاہی۔ شاہ صاحبؒ نے اس کی یہ تعبیر کی کہ آپ کے یا آپ کے مریدوں میں سے کسی کے ذریعے مخلوق خدا کی رشد و ہدایت کا فیض جاری ہوگا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے یہ تعبیر سن کر کہا کہ میرا ذہن بھی اسی تعبیر کی طرف گیا تھا۔ مگر صرف اپنے اطمینان اور تصدیق کی غرض سے میں نے آپ سے تعبیر چاہی۔ اس واقعہ پر ایک ہفتہ نہ گزرا تھا کہ حضرت سید احمد صاحبؒ داخل شاہجہان آباد (دہلی) ہوئے۔[1]

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے جو خواب دیکھا تھا اور حضرت مرزا مظہر جانؒ جاناں کے خلیفہ حضرت شاہ غلام علیؒ نے اس کی جو تعبیر بیان کی تھی وہ سو فیصد درست ثابت ہوئی اور حضرت شاہ صاحبؒ کے مرید رشید حضرت سید احمد صاحبؒ نے دہلی تشریف لا کر اصلاحِ خلق کے اس کارنامہ عظیم کا آغاز کیا جو تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور جس کے نتیجے میں ادھر دہلی سے لیکر بہار و بنگال تک اور ادھر یوپی کے مغربی اضلاع سے لے کر صوبہ متوسط پنجاب کشمیر، سندھ، افغانستان اور صوبہ سرحد تک لاکھوں انسان ان کے ذریعے سے حقیقی مسلمان بن گئے۔ دہلی تشریف لانے کے بعد سید صاحبؒ کی پاکبازی اور روحانیت کی شہرت دور دور تک پھیلنے لگی۔ بڑے بڑے علماء جن کی حیثیت اس وقت قطب اور ابدال سے کم نہ تھی ان کے ارادتمندوں میں شامل ہو گئے۔ حضرت شاہ محمد اسماعیل دہلویؒ، حضرت مولانا عبدالحیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے برادر زادے (ابن حضرت شاہ اہل اللہؒ)، حضرت مولانا یوسفؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے خاندان کے بہت سے افراد بیعت کر کے سید صاحبؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ شہر دہلی کے بہت سے لوگ جن میں غرباء اور امراء دونوں شامل تھے سید صاحبؒ سے بیعت ہوئے۔ آپ نے رشد و ہدایت کے سلسلے کو وسیع کرنے اور زیادہ سے زیادہ افراد کو فیض پہنچانے کی غرض سے حضرت شاہ اسماعیلؒ اور حضرت مولوی عبدالحیؒ کو بھی درس و وعظ کی ہدایت کی۔ ان دونوں بزرگوں کی زبان میں بلا کی تاثیر تھی اور بلاشبہ دونوں علم و فضل کے بحر ذخار تھے۔ چنانچہ ان کے مواعظ حسنہ نے لوگوں کے قلوب میں حیرت انگیز تغیر پیدا کر دیا۔ دہلی کے دوران قیام میں مختلف شہروں سے دعوت نامے موصول ہوئے جن میں ان شہروں کے اکابر علماء اور امراء نے

---

[1] مخزن احمدی صفحہ ۳۴

سید صاحبؒ سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کے علاقوں میں تشریف لاکر اپنی زبانِ فیض ترجمان سے فسق و فجور کی طرف مائل افراد کی اصلاح فرمائیں۔ یہ ایک خدائی تحریک تھی جو سید صاحبؒ کے مقدس مشن کی تکمیل کے لئے غیب سے رونما ہوئی تھی۔ آپ نے اس پر لبیک کہی اور اپنے مریدانِ خاص اور کچھ عقیدت مندوں کو لے کر اصلاحِ خلق کا مقدس فریضہ ادا کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ آپ نے یہ تبلیغی اور اصلاحی دورہ محرم ۱۲۳۳ھ میں شروع کیا۔ دہلی سے سہارنپور میرٹھ، سردھنہ، مظفر نگر، دیوبند، گنگوہ، نانوتہ اور انبیٹھ سے ہوتے ہوئے آپ پھر سہارنپور آئے اور یہاں چند روز قیام کے بعد دہلی واپس تشریف لے آئے۔ آپ کو وطن سے نکلے دس سال کے قریب زمانہ گزر چکا تھا۔ اقربا کی یاد بھی ستا رہی تھی، چنانچہ کچھ عرصے کے بعد آپ دہلی سے رائے بریلی روانہ ہوئے۔ غازی آباد تک پہنچے تھے کہ اپنے عزیز اور فاضل بھائی حضرت سید اسحاقؒ کے انتقال کی خبر سنی۔ سخت مغموم ہوئے مگر صبر و ضبط سے کام لیا اور دوسروں کو بھی تلقینِ صبر فرمائی۔ اس سفر میں آپ ہاپوڑ، گڑھ مکتیشر، امروہہ، مراد آباد، رام پور، بریلی اور شاہجہان پور سے گزرے اور ستر اسی افراد کے قافلے کے ساتھ رائے بریلی میں داخل ہوئے۔ ان سب مقامات پر آپ نے قیام فرمایا اور وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہر شہر میں وہاں کے علماء مشائخ امراء و رؤسا اور بعض فوجی سرداروں نے آپ کا استقبال کیا۔ بعض علاقوں مثلاً بریلی کے نواب نے آپ کو مدعو کیا۔ آپ کی تقریر سنی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اسی طرح رام پور کے دوران قیام میں لوگ جوق در جوق زیارت کے لئے حاضر ہوئے اور بیعت کی۔ ان میں میاں مقیم اور حکیم غلام حسین نائب والئ ریاست رام پور کے بڑے بھائی عطاء اللہ بھی تھے۔

کوئی شہر اور قصبہ ایسا نہ تھا جہاں آپ کی تشریف آوری سے عجیب چہل پہل نہ ہوگئی ہو۔ بعض مقامات پر لوگوں کے جمِ غفیر آپ کے استقبال کے لئے آبادی سے کئی کئی میل باہر آئے ہوئے تھے۔ دیہات کے لوگ بیل گاڑیوں میں سوار ہو کر سید صاحبؒ کی زیارت کرنے اور ان کی زبانِ مبارک سے کلماتِ رشد و ہدایت سننے کے لئے آتے۔ بڑے بڑے رؤسا اپنے متوسلین سمیت آپ سے بیعت ہوئے۔ لوگوں نے انفرادی طور پر بھی اپنے اپنے گھروں میں آپ کی دعوت کی۔ اکثر و بیشتر مقامات پر مستورات کی کثیر تعداد نے آپ کی بیعت کی۔ اس دورے میں آپ نے ہر جگہ شرک و بدعت کے خلاف نہایت موثر تقریریں کیں۔ جن لوگوں سے بیعت لی ان سے فسق و فجور سے بچنے، دیانت و امانت کی زندگی گزارنے، مشرکانہ رسوم ترک کرنے اور صوم صلوٰۃ کی پابندی کرنے کا عہد لیا۔ اس طرح سید صاحبؒ کی کوشش سے لاکھوں افراد جن میں عوام، سپاہی پیشہ، تاجر، اہل حرفہ، امراء، عورتیں اور مرد غرض ہر طبقے کے لوگ شامل تھے، سچے اور حقیقی مسلمان بن گئے مسلمان تو مسلمان تھے، بہت سے غیر مسلم بھی سید صاحبؒ کو دیکھ کر اور ان کی پر اثر تقریریں سن کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

لہ وصایا الوزیر وصیت نمبر ۲۴ صہ ۴۲ نصف ثانی

رائے بریلی کا قیام

سید صاحبؒ نے رائے بریلی پہنچ کر اپنے وطنِ مالوف میں آرام یا فراغت کی زندگی نہیں گزاری بلکہ ہر روز تبلیغ اور اصلاح وارشاد کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزاروں ہزار افراد آپ کے دیدار اور مواعظِ حسنہ سے فیضیاب ہوئے۔ رائے بریلی کے اسی دورانِ قیام میں آپ نے دو مسجدیں بھی تعمیر کروائیں۔ ان کی تعمیر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ خود بھی مزدوروں کی طرح کام کیا۔ جب یہ مسجدیں مکمل ہوگئیں تو ان میں اپنے خرچ سے امام مقرر کئے اپنے رشتہ داروں میں وعظ کہے اور ان کی تربیتِ اخلاق میں پوری تندہی سے کوشش فرمائی

ایک انقلابی اقدام

اب تک آپ کے عقیدت مند اپنا بیشتر وقت عبادتِ الٰہی اور ذکر وفکر میں گزارتے تھے۔ رائے بریلی پہنچ کر آپ نے انہیں ہدایت فرمائی کہ اپنا زیادہ وقت فنونِ جنگ سیکھنے اور ان کی مشق کرنے میں صرف کیا کرو۔ یہ گویا پہلا اعلان تھا اس کارنامۂ عظیم کے لئے تیاری کرنے کا جو آپ کو مستقبل میں سرانجام دینا تھا۔ سید صاحبؒ کی یہ ہدایت اور یہ حکم بعض لوگوں کے لئے بڑا غیر متوقع تھا اور وہ لوگ جو سال ہا سال سے مراقبوں اور ذکر وفکر کے عادی چلے تھے ان کے لئے یکدم تلوار اور بندوق لے کر جنگی مشق کرنے میدان میں نکل آنا آسان نہ تھا یہی وجہ ہے کہ شروع میں انہوں نے اس معاملہ میں کچھ سرگرمی نہ دکھائی۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالرحیم کاندھوی کے ذریعے سے یہ معاملہ سید صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا:۔

"ان دنوں دوسرا کام اس سے افضل ہمارے درپیش ہے۔ اب اس کی طرف ہمارا دل مشغول ہے۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔ اس کے سامنے حال کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ اس واسطے کہ وہ کام یعنی علم سلوک اس جہاد کے تابع ہے۔ اگر کوئی تمام دن روزے رکھے، تمام رات زہد وریاضت میں بسر کرے یہاں تک کہ نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں پر ورم آجائے اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک ساعت دن یا رات کو رنجک اٹھائے تاکہ مقابلہ کفار میں بندوق لگاتے وقت آنکھ نہ جھپکے تو وہ عابد اس مجاہد کے مرتبے کو ہرگز نہ پہنچے گا۔"[1]

سید صاحبؒ کی اس تقریر کا نہایت خوشگوار اثر ہوا۔ ان کے دوسرے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے عقیدتمندوں نے سید صاحبؒ کے منشائے مبارک سے آگاہی حاصل کرکے مراقبہ اور ہر وقت ذکر وفکر کا شغل ترک کرکے ورزشِ جسمانی، تیر اندازی اور بندوق زنی کی مشق شروع کر دی اور چند ہی روز میں صوفیوں کا یہ گروہ مجاہدوں کے چاق وچوبند

---

[1] سید احمد شہید صفحہ ۱۴۱

دستے میں تبدیل ہوگیا۔ چنانچہ چند روز کے بعد سید صاحبؒ نے اپنے ایک مرید سے فرمایا کہ:

"وہ کام (سلوک) اس وقت کا ہے جب اس کا کام (جہاد) سے فارغ البالی ہو اور اب جو پندرہ سولہ روز سے دوسرے انوار کی ترقی نماز یا مراقبہ میں زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس کاروبار کے طفیل ہے۔ کوئی جہاد کی نیت سے تیر اندازی کرتا ہے کوئی بندوق لگاتا ہے کوئی پھری گدکا کھیلتا ہے کوئی ڈنٹر پیلتا ہے۔ اگر ہم اس (سلوک) کی اس وقت تعلیم کریں تو ہمارے یہ بھائی لوگ کام سے جاتے رہیں"۔ [۱]

دوسرا تبلیغی سفر

سید صاحبؒ رائے بریلی میں دو سال سے کچھ زیادہ مقیم رہے۔ اس دوران میں آپ نے جو اصلاحی و تبلیغی کارنامے سرانجام دیئے ان کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں۔ سطور بالا میں ان کی ایک جھلک پیش کر دی گئی ہے۔ اسی دوران قیام میں آپ نے اپنے دوسرے تبلیغی اور اصلاحی دورے کا منصوبہ بنایا اور ایک سو ستر عقیدت مندوں کے قافلے کے ساتھ الہ آباد، بنارس، کانپور اور سلطان پور کا دورہ کیا اور پھر رائے بریلی واپس تشریف لے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد لکھنؤ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ لکھنؤ اودھ کا دارالسلطنت اور علماء، فضلاء، امراء اور شرفا کا مرکز تھا۔ سید صاحبؒ کے بزرگوں کے بے شمار عقیدت مند لکھنؤ میں موجود تھے جن میں بعض بڑے بڑے علماء اور امراء بھی شامل تھے۔

"قندھاریوں کی چھاؤنی میں اور دوسرے رسالہ داروں کی چھاؤنی میں بہت سے لوگ پہلے سے آپ کے خاندان کے بزرگوں کے مرید اور آپ کے خاندانی معتقد تھے۔ عبدالباقی خان "قندھاری اور (نواب) فقیر محمد خاں بہادر ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں"۔ [۲] یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ میں سید صاحبؒ کا نہایت پُرجوش استقبال ہوا۔ بڑے بڑے علما اور امرا نے آپ کے اعزاز میں ضیافتیں دیں۔ نمازِ جمعہ کے علاوہ بھی بڑے بڑے اجتماعات ہوئے جن میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ ایک بار جمعہ کے اجتماع میں چار ہزار آدمی سے کم نہ تھے ان اجتماعات سے سید صاحبؒ کے علاوہ آپ کے مریدانِ خاص مولانا عبدالحئی صاحبؒ اور شاہ اسماعیل صاحبؒ

---

[۱] سید احمد شہید ص۱۴۰-۱۴۱ [۲] سیرت سید احمد شہیدؒ مولفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی ص۱۲۲۔ یہ نواب فقیر محمد خان لکھنؤ کے نامور رئیس بہادر سپہ سالار اور ہمارے زمانے کے مشہور اور باکمال شاعر حضرت جوش ملیح آبادی کے پردادا تھے۔ نہایت خوشگو شاعر تھے اور گویا تخلص کرتے تھے۔ عرصے تک نواب امیر خاں والئ ٹونک کے لشکر میں رہے اور متعدد جنگوں میں حصہ لیا۔ وہیں سے سید صاحبؒ سے ارادت مندی کے تعلقات قائم ہوگئے جو آخر تک قائم رہے۔ چنانچہ صاحب مخزنِ احمدی کا بیان ہے کہ "فقیر محمد خان منجملہ مریدانِ حضرت ایشاں بود" (مخزن احمدی ص۵)

نے بھی خطاب کیا۔ متعدد لوگوں نے سید صاحبؒ سے مختلف مسائل کے بارے میں سوالات کئے ۔آپ نے ان کے کافی وشافی جوابات دیئے ۔ شیعہ وسنی دونوں آپ کے پُر تاثیر وعظ کی محفلوں میں بڑے جوش وخروش سے شریک ہوتے۔ تقریباً ہر روز بیعت کرنے والوں کا اژدھام ہوتا۔ سنی اور شیعہ دونوں بیعت کرتے ۔ صرف ایک جمعہ میں سید صاحبؒ کے پُراثر اور دل نشین وعظ کے بعد جن لوگوں نے ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کی ان میں مندرجہ ذیل علماء اور اہل اللہ شامل تھے ۔

مولانا محمد اشرف صاحب ، مولانا مخدوم صاحب ، مولوی امام الدین صاحب لکھنوی ۔ مولوی عبدالباسط صاحب مولوی ابوالحسن صاحب نصیر آبادی ، مولوی عبداللہ صاحب ، مولوی رحیم اللہ صاحب فرنگی محلی ، مولوی نجیب اللہ بنگالی ، شاہ یقین اللہ صاحب ، مولوی عبدالوہاب صاحب ابن شاہ یقین اللہ صاحب اور میر اُمید علی صاحب ۔ ان کے علاوہ تین ہندو بھی جو آپ کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے آپ کے دستِ مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوگئے ۔ آپ نے ان کے نام عبدالباری ، عبدالرحمٰن اور احمداللہ تجویز کئے ۔ ان میں سے اول الذکر دو حقیقی بھائی تھے ۔

سید صاحبؒ کی لکھنؤ تشریف آوری سے حاکم اودھ کے لشکریوں میں بھی انقلاب آگیا ۔ سید صاحبؒ کے بعض عقیدت مند سپہ سالاروں کے اثر اور پھر سید صاحبؒ کی زیارت وکلماتِ پر تاثیر سے متاثر ہوکر سینکڑوں فوجیوں نے آپ کی بیعت کی ۔ چنانچہ ایک رسالہ کے بعض افسروں کی درخواست پر سید صاحبؒ چھاؤنی میں تشریف لے گئے اور تین چار سو سواروں اور افسروں نے آپ کی بیعت کر لی ۔

تبلیغی دوروں کے نتائج

سید صاحبؒ نے دہلی سے رائے بریلی اور رائے بریلی سے کانپور ، الہ آباد اور لکھنؤ تک جو سفر کئے ان کے بڑے حوصلہ افزا نتائج نکلے ۔ ان دوروں کا اصل مقصد مخلوقِ خدا کی اصلاح تھا ۔ خدا کے بندوں کو خدا کی طرف بلانا تھا جو اس سے بہت دور جا پڑے تھے ۔ اس دور میں مسلم سوسائٹی کا نقشہ بُری طرح بگڑا ہوا تھا ۔ عوام سے لے کر امراء اور شاہانِ وقت تک سب فسق وفجور میں مبتلا تھے ۔ زناکاری ، شراب خوری ، بددیانتی اور بے ایمانی رگ وپے میں رچ بس گئی تھی ۔ حرام وحلال میں امتیاز ختم ہوگیا تھا ۔ سرکاری حکام رعایا پر بے دریغ ظلم کرتے ۔ کھلے بندوں لوٹ مار کرتے اور عوام کا مال غصب کر لیتے تھے ۔ سید صاحبؒ نے اپنی تقریروں میں مسلمانوں کو ان خرابیوں کی طرف توجہ دلائی ۔ ان کے مضر اثرات سے متنبہ کیا ۔ اسلام کی حقیقی اور سچی تصویر پیش کی اور انہیں اصلاحِ اخلاق ونفس پر آمادہ کیا ۔ سید صاحبؒ کی نورانی صورت ۔ اعلیٰ کردار ، پاکیزہ اخلاق ۔ مؤثر اور دل نشین اندازِ بیان ، اسلام کے لئے سچی لگن اور لہجے کا خلوص ان سب باتوں نے لوگوں کے قلوب پر غیر معمولی اثر کیا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سینکڑوں فاسق وفاجر

بداعمالیوں سے تائب ہو گئے۔ کتنی ہی طوائفوں نے اپنے شرمناک پیشے سے توبہ کرلی اور سید صاحبؒ کے ذریعے نیک دل مسلمانوں کے حبالۂ عقد میں آکر پاکیزہ زندگی گزارنے لگیں۔ ہزاروں مسلمان جو نام کے مسلمان تھے۔ کام کے مسلمان بن گئے۔ بیسیوں چور اور ڈاکو آپ کی ہدایت سے ان افعال بد سے تائب ہو کر آپ کی بیعت میں داخل ہو گئے اور حلال کی روزی کمانے لگے۔ جن لوگوں نے کبھی مسجد کا منہ بھی نہ دیکھا تھا نہایت پابندی سے نماز باجماعت ادا کرنے لگے ہزاروں گھروں سے شرک و بدعت اور رسوم بد کے بت نکال دیئے گئے اور گھر سچی اسلامی زندگی کی تصویر پیش کرنے لگے۔ سید صاحبؒ نے اپنے ان دوروں میں عورتوں سے خاص طور پر یہ عہد لیا کہ وہ شرک نہیں کریں گی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بزرگ سید زادلی اور روائتی پیر نہ تھا بلکہ سوسائٹی کی خرابیوں کے اسباب پر بھی نہایت گہری نظر رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان برائیوں کا سوتا کہاں سے پھوٹتا ہے چنانچہ اس نے اس سوتے کو بند کرنے کیطرف توجہ دی تاکہ خرابیوں کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ وہ جانتا تھا کہ گھر کے معاملات کا انحصار عورتوں پر ہوتا ہے اگر ان کی روش اور افکار درست ہوں تو گھر کی ساری فضا درست ہو جاتی ہے۔ یہ حکیم نکتہ شناس اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ عورتوں میں اثر پذیری کا مادہ مردوں سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ ضعیف الاعتقاد بھی زیادہ ہوتی ہیں اور رسوم و رواج کے بندھنوں میں بھی تیزی سے جکڑ جاتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مرد نہایت قوی الارادہ ہونے کے باوجود عورتوں کے اثر میں آجاتے ہیں۔ مردوں کی اسی فطری کمزوری کے پیش نظر سید صاحبؒ نے عورتوں کی اصلاح کی طرف زیادہ توجہ دی اور گھر کی فضا کو شرک و بدعت اور مشرکانہ رسوم سے پاک کرنے کے لئے انہوں نے عورتوں سے یہ عہد لیا کہ وہ شرک و بدعت اور رسوم بد سے اجتناب کریں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں نے مردوں سے وہ مطالبات کرنا ترک کر دیئے جن کی بنا پر ایک طرف روپیہ کا اسراف ہوتا تھا اور دوسری طرف مسلمانوں کا گھر مشرکوں کا گھر معلوم ہوتا تھا۔ غرض سید صاحبؒ کے ان دوروں کی وجہ سے مسلم سوسائٹی کا نقشہ بالکل بدل گیا اور ایسے پاکیزہ کردار اور نیک اخلاق لوگوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جس کے دلوں میں اسلام کا درد تھا اور جو سارے معاشرے کو اپنے رنگ میں رنگ دینا چاہتی تھی۔

اپنے ان دوروں میں سید صاحبؒ جہاں بھی تشریف لے گئے اور جس مجلس وعظ میں شریک ہوئے انہوں نے ایک بات کا ہمیشہ اہتمام کیا۔ وہ یہ کہ تلوار، بندوق یا پستول میں سے کوئی نہ کوئی ہتھیار ہاتھ میں ہوتا یا کمرے آویزاں ہوتا تھا بعض علماء نے اس پر اعتراض بھی کیا کہ یہ شان اہل اللہ کی نہیں ہوتی۔ دراصل اس طرح سید صاحبؒ اپنے طرز عمل سے عام مسلمانوں، علماء، صوفیاء اور پیروں کو خانقاہی زندگی سے نکال کر عملی اور مجاہدانہ زندگی کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کا نمونہ دیکھ کر تعیش کی زندگی ترک کر دیں اور جو لوگ ہتھیار باندھتے شرماتے ہیں وہ وقت کے اس سب سے بڑے قطب، غوث اور مجدد کی تقلید میں ہتھیار باندھنا اور انہیں استعمال کرنا شروع کر دیں۔ دراصل اس طرح سید صاحبؒ لوگوں کو اس بلند مقصد کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے جو ان کے پیش نظر تھا

اور جس کے حصول کے لئے انہیں مصائب و شدائد کی خارزار وادیوں میں سے گزر کر شہادت کے منصب پر فائز المرام ہونا تھا۔

سفرِ حج

سطور بالا میں ہم نے اختصار کے ساتھ سید صاحبؒ کے عہد کی سوسائٹی کا سرسری نقشہ پیش کر دیا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس دور میں ہر طرف لہو و لعب اور تعیش کا دور دورہ تھا اور ضروریاتِ دین کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ فرائض کی ادائیگی سے بچنے کے لئے رخصت کی راہیں تلاش کر لی گئی تھیں۔ ان فرائض میں حج بھی تھا جو ہر صحت مند اور صاحبِ استطاعت مسلمان پر فرض ہے لیکن جس معاشرے کے مسلمان ان فرائض کو ادا کرنے سے پہلو تہی کرتے تھے جن کے ادا کرنے میں کوئی مشقت نہیں کرنی پڑتی اور نہ روپیہ صرف ہوتا ہے وہ اس فرض کی ادائی کیلئے کیسے تیار ہو سکتے تھے جس کے لئے کثیر رقم بھی صرف کرنی پڑتی ہے۔ سفر دور دراز کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ گھر بار اور اہل و عیال سے مفارقت بھی گوارا کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے ہندوستانی مسلمان عام طور پر فریضۂ حج کی ادائی سے غفلت برت رہے تھے۔ علمائے سو جن کی اس زمانے سے کثرت ہو گئی تھی ان آرام طلب مسلمانوں کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ان نام نہاد علماء نے اپنے آقایانِ ولی نعمت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے حالات کی ناسازگاری کا عذر تراش کر حج کو ساقط العمل قرار دے دیا تھا۔ عذر یہ تھا کہ حالات مخدوش ہیں، راستے پُرخطر اور غیر محفوظ ہیں۔ اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز اور بزدلانہ عذر ان "علمائے حقانی" اور "محافظینِ اسلام" نے یہ تراشا تھا کہ حج کا سفر جہاز سے کرنا ہو گا اور جہاز اکثر ڈوب جایا کرتے ہیں۔ اس لئے مسلمانانِ ہند پر حج فرض نہیں۔ جب یہ فتویٰ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی خدمت میں پیش ہوا تو انہوں نے اسے پڑھ کر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور اس کے جواب میں لکھا کہ :-

"انتظار باید کشید کہ اشخاصِ معلوم در عرصۂ قریب فتوئ معافی صوم وصلوٰۃ برائے ہندوستانیاں خواہند نوشت بدلیل ایں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم در ہند تشریف فرما نشدہ اند و برائے زکوٰۃ بدرجۂ اولیٰ"۔

(ترجمہ) اس دن کا انتظار کرنا چاہیئے کہ یہ لوگ (اشارہ ہے سقوطِ حج کا فتویٰ دینے والوں کی طرف) عنقریب اہل ہندوستان کے لئے ایک دلیل کی بنا پر صوم و صلوٰۃ کی معافی کا فتویٰ جاری کر دیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہندوستان میں مبعوث نہیں ہوئے تھے اور زکوٰۃ ختم کرنے کا فتویٰ تو بدرجہ (اتم) اولیٰ قرار دیدیں گے۔

جہاز ڈوب جانے کے عذر کا جواب دیتے ہوئے آپ نے لکھا کہ :-

"ہر چند جہاز را گاہے نوبت بہ تباہی ہم عارض شود۔ اما بیشتر اوقات بہ سلامت می رسد پس اور اختلافِ

امن نتواں شود "۔

(ترجمہ: اگرچہ کبھی کبھار جہاز تباہی سے دوچار ہو جاتا ہے لیکن اکثر اوقات سلامتی کے ساتھ کنارے تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی لئے اس اتفاقاً غرقابی کو طریقِ امن کے خلاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سید صاحبؒ جو مجددِ وقت تھے اور جو دنیا میں مامور ہی اس لئے کئے گئے تھے کہ اسلام کے پُر نور چہرے سے نفسانیت کی گرد و غبار کو دور کریں، ان حالات میں خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے زبانی یا قلمی فتوؤں پر اکتفا نہ کیا کیونکہ آپ اپنے عہد کے لئے نمونہ تھے حقیقی اسلام کا، اس لئے ضروری تھا کہ منکرات اور منہیات دونوں کی صحت اور درستی اپنے عمل سے ثابت کریں۔ اس لئے آپ نے حج بیت اللہ کو جانے کا اعلان فرما دیا اور دہلی، پھلت اور سہارنپور میں اپنے ارادتمندوں کو اطلاع بھیج دی کہ آپ حج کو جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ جو لوگ آپ کے ہمراہ جانا چاہیں تیار ہو کر آ جائیں۔ "مخزنِ احمدی" کے مصنف کا بیان ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مولوی محمد اسماعیلؒ (دہلوی) اور مولوی عبدالحئیؒ کو بھی ہدایت فرمائی کہ آپ لوگ اپنے وطن جا کر حج کی تیاری کریں، اور اپنے متعلقین میں سے جن جن لوگوں کو ہمراہ لے جانا چاہیں انہیں ساتھ لے آئیں۔ آپ نے اپنے ان دونوں خلفاء کو اپنے ارادت مندوں کے نام خطوط بھی عنایت فرمائے۔ جن لوگوں کو یہ خط ملے۔ انہوں نے اپنے باغات اور جائیدادیں فروخت کر دیں اور آپ کے خلفاء (مولوی محمد اسماعیلؒ صاحب اور مولوی عبدالحئیؒ) کی خدمت میں جو دہلی میں سفرِ حج کے لئے تیاری کر رہے تھے حاضر ہو گئے[1]۔

اسی دوران میں کہ آپ سفرِ حج کی تیاری فرما رہے تھے علاقہ کانپور سے مشتاقانِ زیارت کی درخواستیں پہنچیں کہ آپ ہمارے علاقوں میں تشریف لا کر ہمیں راہِ ہدایت دکھائیں۔ چنانچہ آپ رائے بریلی سے کانپور تشریف لے گئے اور کوڑہ، جہان آباد، کھجوہ، فتح پور وغیرہ میں کہ مضافاتِ کانپور میں ہیں مختلف لوگوں کے یہاں قیام فرمایا۔ متعدد اجتماعات سے خطاب فرمایا اور ہزاروں افراد کی بیعت لے کر رائے بریلی واپس آ گئے۔ ایک ماہ حج کی تیاری میں گزر گیا۔ شوال ۱۲۳۶ھ کی آخری تاریخ کو چار سو مردوں اور عورتوں کے قافلے کے ہمراہ بارادۂ حج آپ رائے بریلی سے روانہ ہوئے۔ روانگی سے قبل ہی آپ نے اپنے ساتھ جانے والوں کو بتا دیا تھا کہ ہم خالی ہاتھ محض اللہ کے بھروسے پر روانہ ہو رہے ہیں۔ راستے میں طرح طرح کے مصائب پیش آئیں گے۔ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ اگر ضرورت پیش آ گئی تو محنت مزدوری بھی کرنی ہو گی۔ جو شخص یہ تکالیف برداشت کر سکتا ہو وہ ہمارے ساتھ چلے۔ اس اعلان و اطلاع کے باوجود بھی لوگوں نے آپ کا ساتھ نہ چھوڑا اور نہایت تکلیف دہ سفر، موسم کی خرابی، شدید بارش، کبھی قیامت کی دھوپ، کبھی ندی نالوں سے گرتے پڑتے گزرنا، غرض لوگ ہر مشکل پر قابو پاتے جوق در جوق آپ

---

[1] مخزنِ احمدی صفحہ ۵۸

کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے رہے۔ الہ آباد، مرزاپور، بنارس، غازی پور، چھپرا اور مدناپور ہوتے ہوئے عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے۔ راستے میں جن جن مقامات سے آپ کا گزر ہوا ان سب قصبوں اور شہروں میں آپ کی آمد سے قبل ہی آپ کی تشریف آوری کی خبر پہنچ چکی تھی۔ لوگ نہایت عقیدت و احترام سے آپ کے استقبال اور ملاقات کو آتے۔ ضیافتیں کرتے اور نذرانے پیش کرتے۔ الہ آباد کے ایک شخص شیخ غلام علی نے پندرہ روز تک سید صاحبؒ اور آپ کے چار سو اہل قافلہ کو اپنا مہمان رکھا اور ایک ہزار روپیہ یومیہ صرف خوراک پر خرچ کیا[1]۔ مرزا پور کے ایک تاجر شیخ عبد اللطیف نے چار ہزار روپیہ نقد پیش کیا[2]۔ اس سارے سفر میں تبلیغ و ہدایت کا سلسلہ جاری رہا اور آپ نے جس شہر میں قیام فرمایا وہاں کے لوگوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کر کے شرک و بدعت اور فسق و فجور سے توبہ کی۔

اکابرِ عظیم آباد کی عقیدت

عظیم آباد (پٹنہ) زمانۂ دراز سے اہلِ علم کا گہوارہ ہے۔ نہایت مردم خیز خطہ ہے۔ اہل اللہ کا مرکز رہا ہے۔ اس زمانے میں بھی یہ سرزمین اہلِ علم اور مشائخ عظام سے آباد تھی۔ یہی امر سید صاحبؒ کی عظمت کے ثبوت کے لیے کیا کم ہے کہ جب آپ عظیم آباد پہنچے تو یہاں کے علماء و مشائخ نے آپ کے لئے آنکھیں فرشِ راہ کر دیں۔ بکثرت علماء اور اکابرِ شہر نے آپ کی ضیافتیں کیں، تقریریں کروائیں، خود بیعت ہوئے اور اپنے اہل خانہ کو بیعت کروایا۔ ان لوگوں میں مولوی الٰہی بخش صاحب صادق پوری بڑے پایے کے بزرگ تھے۔ انہوں نے سید صاحبؒ کو اپنے گھر بلوایا اور واعظ کہلوایا[3]۔

مولوی الٰہی بخش صاحبؒ کے ایک فرزند ولی اللہ نامی تھے کہ اکثر حالتِ جذب طاری رہتی تھی۔ پابندِ سلاسل کر دیئے گئے تھے۔ جب انہیں عالمِ ہوش میں آنے پر سید صاحبؒ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو زیارت کے لئے بیتاب ہو گئے۔ سید صاحبؒ کی خدمت میں لایا گیا۔ دیکھتے ہی آپ کا مقام پہچان لیا اور معاً بیعت سے مشرف ہو گئے۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ اب انہیں زنجیروں سے آزاد کر دو۔ اس کے بعد ان کے والد سے فرمایا کہ اگرچہ دنیاوی اعتبار سے یہ قابلِ احترام نہ ہوں مگر آپ کی کل اولاد میں یہی اکرم اور بہتر ہیں[4]۔

سید صاحبؒ نے ان کے متعلق جو رائے ظاہر کی وہ بالکل درست ثابت ہوئی اور ولی اللہ صاحب پر اسرار عالم منکشف ہونے لگے جن پر بعد کے واقعات مہر تصدیق ثبت کرتے تھے۔

---

[1] مخزنِ احمدی ص۶۸۔ [2] مخزن احمدی ص۸۹۔ [3] الدر المنثور ص۲۷
[4] الدر المنثور ص۶۰

عظیم آباد کے ایک اور بزرگ مولوی فتح علی صاحب کہ اہل اللہ میں سے تھے حضرت یحییٰ منیریؒ کے سلسلے میں بیعت تھے اور خود بھی صاحب ارشاد و ہدایت تھے۔ سید صاحبؒ کے ارادتمندوں میں شامل ہو گئے۔ سید صاحبؒ کی تشریف آوری عظیم آباد کی خبر سن کر اپنے مکان پر آپ کو مدعو کیا۔ خود بیعت کی اپنی اہلیہ اور خاندان کے جملہ افراد کو بیعت کرایا اور تین صاحبزادوں مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور مولوی طالب علی کو کہ تینوں جوان العمر تھے سید صاحبؒ کی نذر کر دیا۔[1]

ان میں سے مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی نے بڑی شہرت پائی اور سید صاحب کے ساتھ جہاد میں بڑے عظیم الشان کارنامے سرانجام دیئے۔

قیامِ کلکتہ کی برکات

عظیم آباد کے بعد کلکتہ آپ کی آخری منزل تھی جس کے بعد بحری سفر شروع ہونا تھا۔ اس شہر میں آپ کی تبلیغ و ہدایت کے اثرات بڑے ہمہ گیر ثابت ہوئے۔ سلطان ٹیپو شہیدؒ کے خاندان کے بہت سے شہزادے کلکتہ میں مقیم تھے اور سید صاحب کے نانا ابو سعیدؒ ان کے خاندانی مرشد تھے۔ جب انہوں نے سنا کہ سید صاحبؒ تشریف لائے ہیں تو ایک خواجہ سرا کو بھیج کر درخواست کی کہ ہمیں بھی دست بوسی کا شرف عطا فرمائیں۔ سید صاحبؒ ان کی درخواست پر شہزادوں کے پاس تشریف لے گئے۔ یہ شہزادے الگ الگ نہایت خوشنما بنگلوں میں مقیم تھے۔ آپ ہر بنگلے میں گئے ان شہزادوں کی اکثریت لہو و لعب اور بدعقیدگی میں مبتلا ہو چکی تھی۔ سید صاحبؒ نے انہیں تبلیغ کی اور اسلام کی حقیقی تعلیم پیش کی۔ ان لوگوں پر سید صاحبؒ کے مواعظِ حسنہ کا نہایت خوشگوار اثر ہوا اور سب نے سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ بیگمات نے بھی آپ کو مدعو کیا اور بیعت ہوئیں۔ برما، سلہٹ اور چاٹگام کے بعض لوگوں نے بھی جو اپنے کاروبار کے سلسلے میں کلکتہ میں مقیم تھے سید صاحبؒ کی بیعت کی۔ اس طرح آپ کا پیغام ان علاقوں تک پہنچا جہاں تک آپ تشریف نہ لے جا سکتے تھے۔ سید صاحبؒ کے ایک تذکرہ نگار کا بیان ہے کہ

"شہر کلکتہ میں سید صاحب کی بیعت کرنے والوں کی یہ کثرت تھی کہ ہزار پانچ سو آدمیوں کو ایک جگہ جمع کر کے سات آٹھ پگڑیوں کو اس مجمع میں پھیلا کر ہر ایک بیعت کنندہ کو حکم دیتے تھے کہ ایک کنارہ کسی پگڑی کا منجملہ ان پگڑیوں کے پکڑ لیوے۔ پھر آپ ان پگڑیوں کا ایک کنارہ اپنے ہاتھ میں تھام کر کلماتِ بیعت کو باواز بلند تلقین کرتے تھے اور یہ کیفیت دن بھر رہتی تھی۔ آپ کے تشریف لانے کے پہلے ہزارہا بے نکاحی عورتیں وہاں کے لوگوں کے گھروں میں تھیں اور ہزارہا مسلمان غیر مختون اس شہر میں موجود تھے۔ شراب تو ایک عام بات تھی۔ اس سے شاذ و نادر کوئی خالی

---

[1] الدر المنثور ص ۱۰۹

ہوگا۔ اگر کوئی نماز روزے کو کہتا تو جواب دیا کرتے تھے کہ نماز روزہ کے لئے نہ کوئی کمپنی کا حکم ہے اور نہ کونسل کا آرڈر ہے۔ پھر بلا حکم ہم اس کو کیسے کریں۔ اب آپ (سید صاحب) کی برکت سے وہی کلکتہ رشکِ ارم ہوگیا۔ ہر ایک بیعت کرنے والے سے نکاح اور ختنہ کا حال پوچھا جاتا تھا اگر غیر مختون اور بے نکاحی جورو والا ہوتا تو فوراً یہ سنت ادا کر دی جاتی بلکہ ان دونوں امور کی شناخت کے واسطے ہر محلے اور گلی کے چودھری تعینات تھے تاکہ ایسے لوگوں کا نشان دیتے جاویں۔ ہر روز دس پندرہ ہندو بھی مسلمان ہوتے تھے۔ ان کا بھی ختنہ کرا کے ایک علیحدہ مکان میں ان کو رکھا جاتا تھا۔ اس کثرت سے مختون آدمی اس مکان میں جمع ہوگئے تھے کہ دس پندرہ آدمی اہل قافلہ سے ان کی خدمت کے واسطے تعینات تھے تب تو کلکتہ اور اس کے نواح میں اس قدر کثرت آپ کے مریدوں کی ہوئی کہ جو کوئی آپ سے بیعت نہ کرتا تھا اس کو برادری سے فارغ کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے بائعین کی اور بھی کثرت ہوگئی۔ مولوی عبدالحیؒ اور مولوی محمد اسماعیلؒ شہید ہر منگل اور جمعہ کو ظہر سے شام تک وعظ فرمایا کرتے تھے اور ان بزرگوں کے وعظ کی یہ تاثیر ہوئی کہ خلقت مثل پروانہ گردیدہ ہوگئی۔ ہر ایک بیعت کنندہ کے شراب نوشی سے تائب ہونے پر شراب کی دوکانیں بند ہوگئیں اور ٹھیکیدارانِ شراب نے حاکمانِ ضلع کو استعفے داخل کر دیئے۔"[1]

سید صاحبؒ کی شانِ توکل

اس مرحلے پر سید صاحب کے توکل اور ان پر اللہ تعالیٰ کے بے حساب فضلوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ سید صاحبؒ جب وطن سے روانہ ہونے والے تھے۔ اس وقت انہوں نے اپنے ساتھ جانے والے ہر شخص کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ خالی ہاتھ محض اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہدایت فرما دی تھی کہ اس کل قافلے کا خرچ ان کے ذمہ ہوگا۔ رائے بریلی سے روانہ ہونے کے بعد آپ نے دریائے سئی عبور کی، یہاں اطراف وجوانب کے بہت سے لوگ بیعت وزیارت کے لئے جمع تھے۔ ان میں رائے بریلی کے بہت سے نائی، دھوبی اور خاکروب بھی تھے۔ اس وقت آپ کے خزانچی مولوی محمد یوسف صاحب کی تحویل میں سو روپے سے کچھ زائد رقم تھی۔ سید صاحبؒ نے اس میں سے سو روپے ان غرباء اور خدمت پیشہ افراد میں تقسیم فرما دیئے۔ ایک میل کا فاصلہ طے کر کے آپ ایک باغ میں فروکش ہوئے اور اپنے خزانچی مولوی محمد یوسف صاحب سے پھر استفسار کیا کہ مولوی صاحب اب آپ کے پاس کتنی رقم ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ :-

"فلوس کجا بجز ہفت عدد روپیہ در کیسہ موجود نیست"[2]

اس توکل کا اندازہ لگائیے کہ خزانچی جواب دیتا ہے کہ جناب سات روپے کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں اور آپ

---

[1] تواریخ عجیبہ ص ۵۵، ۵۶

[2] مخزن احمدی ص ۶۲

فرماتے ہیں کہ "مولوی صاحب! اس رقم سے تو قافلے کا ایک دن کا خرچ بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ رقم بھی رائے بریلی کے ان غربا کو دے دو جو پہلی تقسیم میں محروم رہ گئے ہیں۔" اس طرح چار سو سات افراد کا یہ قافلہ بالکل تہی دست ہو کر صرف اللہ کے بھروسے پر روانہ ہوتا ہے مگر جب کلکتہ سے جہازوں میں سوار ہوتا ہے تو وہی رب الارباب جس کا نام لے کر اور جس پر توکل کر کے یہ قافلہ سالار روانہ ہوا تھا اسے اتنا عنایت کر دیتا ہے کہ صرف ایک شہر یعنی اہلِ کلکتہ کے تحائف اور نذرانوں سے اس کا خرچ پورا ہو جاتا ہے۔ اہلِ کلکتہ کے ہدایا کی تفصیل یہ ہے۔

"منشی امین الدین کی طرف سے پانچ ہزار نقد، تین سو جوڑے جوتے، چار گٹھڑی کپڑے ایک میں لٹھا اور ململ وغیرہ دوسری میں سوسی اور چھینٹ کے تھان۔ باقی گٹھڑیوں میں موٹا کپڑا، دو نہایت خوبصورت گھڑیاں، پانچ سو احرام۔

امام بخش صاحب سوداگر کی طرف سے تین سو روپے، بیس اشرفیاں، پندرہ تھان سفید کپڑے اور چھینٹ کے دو شیشیاں عطر کی جن میں پانچ پانچ تولے عطر تھا۔ ایک بنگلہ، جسے سید صاحبؒ نے باصرار واپس کر دیا۔

غلام حسین تاجر کی طرف سے چار جہاز، ان کے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی دیا۔ چونکہ سامان کا انتظام ہو چکا تھا اس لئے سید صاحبؒ نے یہ چیزیں بہ شکریہ واپس کر دیں۔

شیخ رمضانی، سعد الدین ناخدا، منشی حسن علی اور امام بخش تاجر نے چار سو احرام پیش کئے۔ ایک پیرزادے نے سو روپے پیش کئے۔ اس درجے کی دوسری نذروں کا حساب کرنا مشکل ہے۔[1]"

یہ نذرانے اور تحائف صرف کلکتہ کے ہیں اور وہ بھی جن کا علم ہو گیا۔ رائے بریلی سے ہگلی تک بڑے بڑے رؤسا اور سید صاحبؒ کے ارادتمندوں نے جو رقمیں اور ضروریات کی چیزیں پیش کیں وہ ان کے علاوہ تھیں۔

حجاز کو روانگی

آخر وہ مبارک دن آگیا جب گیارہ جہازوں کا قافلہ راہِ الٰہی کے ان مسافروں کو لے کر کلکتہ سے جدہ کو روانہ ہو گیا۔ قافلے کی روانگی سے قبل آپ نے سنتِ نبوی کی پیروی میں ہر جہاز میں سوار ہونے والے مسافروں پر ایک امیر مقرر فرمایا اور باقی افراد کو اس کی کامل اطاعت کی تاکید فرمائی۔ جس وقت یہ قافلہ رائے بریلی سے روانہ ہوا تھا تو اس کے لشکر کی تعداد چار سو سات تھی مگر کلکتہ سے روانگی کے وقت اس کی تعداد میں دو گنا اضافہ ہو چکا تھا اور اب یہ تعداد آٹھ سو تک پہنچ گئی تھی۔ اثنائے سفر میں بھی آپ نے تلقین و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ نمازِ فجر اور نمازِ ظہر کے بعد جہاز ہی میں لوگ آپ کے اردگرد جمع ہو جاتے اور مختلف مسائل دریافت کرتے۔ آپ انہیں ان کے سوالات کے جواب دیتے اور قرآن و حدیث کے نکات بیان فرماتے۔ لنکا اور عدن وہ بڑے بڑے مقامات تھے

---

[1] سید احمد شہید ص ۲۲۳

جہاں جہازوں نے قیام کیا۔ یہاں کے لوگوں کو بھی آپ کی تشریف آوری کی اطلاع ہوگئی تھی۔ چنانچہ لوگ کثیر تعداد میں آپ کے استقبال کو آئے۔ بہت سے لوگوں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ میقات پہنچ کر آپ نے غسل کیا۔ احرام باندھا اور دو رکعت نماز ادا کر کے تلبیہ[1] کیا۔ اس موقع پر آپ نے نہایت تضرع اور زاری سے دعا کی۔ جدہ میں حیدر آباد دکن کے دو رئیس نواب محمود خان اور سلطان حسین خان کو آپ کی تشریف آوری کی اطلاع ہوگئی تھی۔ چنانچہ جب جہاز نے جدہ پہنچ کر لنگر ڈالا تو یہ دونوں رئیس استقبال کو حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ مع قافلہ کے ہماری دعوت قبول فرمایئے۔ آپ نے تین چار دن ان رئیسوں کے پاس قیام کیا اور چوتھے روز عصر کی نماز پڑھ کر مکہ معظمہ کو روانہ ہوگئے۔ ۲۸ شعبان ۱۲۳۶ھ کو سید صاحبؒ مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ سب سے پہلے آپ نے آبِ زمزم نوش فرمایا۔ پھر ذی طوی میں جا کر غسل کیا اور جنت المعلیٰ کی طرف سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے کعبہ تشریف میں حاضری دیتے وقت آپ نے بابِ اسلام کا راستہ اختیار کیا۔ طوافِ کعبہ سے شرفیاب ہوئے۔ اس کے بعد مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کر کے دعا کی پھر چاہِ زمزم پر گئے۔ یہ متبرک پانی نوش کیا، غسل فرمایا اور باب الصفا سے سعی کے لئے گئے۔ سعی کرنے کے بعد سر کے بال منڈوائے۔ رمضان اور عید الفطر آپ نے مکہ مکرمہ ہی میں گزارے۔ ۲۰ رمضان کو حرم شریف میں اعتکاف کے لئے بیٹھے اور ہلالِ عید نمودار ہونے پر اعتکاف سے باہر آئے۔ مکہ میں بھی درس و ہدایت کا سلسلہ جاری رہا۔ علمائے مکہ اور شیوخِ عرب آپ کی خدمت میں حاضری دیتے اور زیارت و ملاقات سے سرفراز ہوتے۔ ان میں محدث شیخ عمر بن عبدالرسول حنفی (مفتی مکہ) شیخ مصطفیٰ، شیخ عبداللہ سراج، سید عقیل، سید حمزہؒ شیخ حسن آفندی (نائب السلطنت فرماں روائے مصر) جیسے اکابر شامل تھے۔ ان میں سے شیخ عمر بن عبدالرسول کے علاوہ باقی تمام علما و اکابر نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کے علاوہ اور بہت سے علمائے عرب نے بھی آپ کی اطاعت و ارادت کا جوا اپنے کندھوں پر رکھنا باعثِ عزت و نجاتِ اُخروی خیال کیا۔

۸ ذی الحجہ سے ۱۰ ذی الحجہ تک آپ مناسکِ حج کی ادائی میں مصروف رہے۔ ۱۰ صفر کو سید صاحبؒ نے مدینہ منورہ کے لئے رختِ سفر باندھا۔ قریب پونے دو سو اونٹوں پر مشتمل یہ قافلہ بارگاہِ نبویؐ میں حاضری دینے کے لئے روانہ ہوا۔ مدینہ پہنچ کر سب سے پہلے آپ باب السلام کے راستے مسجد نبویؐ میں حاضر ہوئے۔ نماز فجر و اشراق سے فراغت کے بعد روضۂ اقدس کی زیارت سے فیض یاب ہوئے۔ مدینہ میں سید صاحبؒ کا قیام پچیس روز رہا۔ آپ ان چند خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جنہیں ایک پوری رات روضۂ اقدس کی جالیوں کے اندر گزارنے کا موقع ملا۔ یہاں آپ نے مراقبے کئے اور کئی بار حضورؐ کی زیارت سے شرفیاب ہوئے۔ مدینہ کے دوران قیام میں سید صاحبؒ بیمار ہوگئے مگر اس بیماری کے باوجود آپ نے متبرک اور تاریخی مقامات کی زیارت کی۔ مسجد قبا، جنت البقیع، مسجد قبلتین اور کوہِ اُحد پر حاضری دی۔ سید الشہدا

---

[1] تواریخ عجیبہ صفحہ ۶۱ و سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۶۷

سیدنا حضرت حمزہؓ، سیدنا حضرت عثمانؓ اور سیدنا حضرت امام حسن علیہ السلام کے مزارات پر جاکر فاتحہ پڑھی اور دعا کی۔
اسی اثنا میں سردی کا موسم آگیا، ساتھیوں کے پاس گرم کپڑے کافی تھے۔ "مخزن احمدی" میں ہے کہ ۲۶ ربیع الاول کو سید صاحبؒ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو مخاطب کرکے فرما رہے ہیں کہ "اے احمد اب تو مکہ واپس ہو جا کیونکہ موسم سرما تیرے اہل قافلہ کو تکلیف دے رہا ہے[1]"۔ جب آپ بیدار ہوئے تو اپنا یہ خواب رفیقان سفر کو سنایا اور واپسی کی تیاری شروع کر دی[2]۔ ۲۹ ربیع الاول ۱۲۳۷ھ کو یہ قافلہ مدینہ منورہ سے روانہ ہوا مکہ معظمہ پہنچ کر عمرہ و طواف کیا دوسرے ہی دن مکہ کے علماء اور چاروں مصلوں کے ائمہ کرام حاضر خدمت ہوئے۔ ان سے ملاقات فرمائی۔

دیارِ حبیبؐ سے واپسی

رمضان اور شوال کا نصف ماہ مکہ معظمہ میں گزرا۔ ۱۵ شوال کے بعد دیارِ حبیبؐ سے طواف وداع کرکے سید صاحبؒ مع اہل قافلہ اشکبار آنکھوں اور مجروح دلوں کے ساتھ رخصت ہوئے، جدہ سے جہازوں میں سوار ہوئے جس جہاز میں آپ سوار تھے اس میں کچھ مسافر بمبئی کے بھی تھے، اس لئے جہاز نے بمبئی کا راستہ اختیار کیا۔ سید صاحبؒ کی بھی دلی آرزو تھی کہ بمبئی کے مخلصین سے بھی ملاقات ہو جائے، اس طرح سید صاحبؒ کی تکمیل آرزو کے سامان غیب سے پیدا ہو گئے، بمبئی پہنچے تو سید صاحبؒ کا بڑی گرمجوشی سے استقبال ہوا، یہاں کے لوگوں نے آپ کی مجالس میں بڑی کثرت اور ذوق و شوق سے شرکت کی، بمبئی کے رؤسا اور ارادتمندوں نے ضیافتیں دیں اور ہزاروں افراد بیعت کرکے آپ کے حلقۂ نیازمنداں میں داخل ہوئے۔ انیسویں روز جہاز نے لنگر اٹھایا اور یہ قافلہ بخیر و عافیت کلکتہ کے ساحل پر اترا۔ وہاں سے مرشد آباد، مونگیر، پٹنہ، داناپور، چھپرا، بکسر، غازی پور، بنارس، مرزا پور اور الہ آباد ہوتے ہوئے شعبان ۱۲۳۹ھ میں سید صاحبؒ بخیریت تمام رائے بریلی پہنچے۔ اس طرح یہ مقدس سفر دو سال دس ماہ جاری رہا۔
سید صاحبؒ کے توکل کی برکت دیکھئے کہ جب وطن سے روانہ ہوئے تو ایک سو سات روپے خزانچی کے پاس تھے وہ فقراء میں تقسیم کرا کے خالی ہاتھ ہو گئے۔ مگر جب حبیبؐ پاک کے دیار سے واپس اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا تو سارے خرچ اخراجات کے بعد دس ہزار روپے آپ کے خزانچی کے پاس موجود تھے۔ سچ ہے جو اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اسے مایوس نہیں کرتا۔

نتائجِ سفرِ حج

سید صاحبؒ کا سفرِ حج بظاہر ایک فریضۂ دین کی تکمیل کے لئے تھا اور ان غلط فتووں کی تردید کے لئے کہ

---

[1] مخزن احمدی ص ۱۰۵ [2] مخزن احمدی ص ۱۰۶

حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے فرضِ حج ساقط ہو چکا ہے مگر اس کا ایک بڑا مقصد تبلیغ دین اور تربیتِ اخلاق بھی تھا۔ چنانچہ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا جیسا کہ سطورِ بالا میں اس سفر کی پیش کردہ اجمالی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ جن مقامات سے گزرے وہاں کے لوگوں میں عظیم الشان اخلاقی اور فکری انقلاب آگیا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد جو جہالت اور بد اعتقادی کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے انہیں علم وعمل کی روشنی میسر آگئی۔ ایک راہنما مل گیا جس کا ہاتھ پکڑ کر وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہو گئے۔ اس طرح ان کا لاکھوں افراد سے ذاتی تعلق اور رابطہ پیدا ہو گیا۔ یہ سفر ان کی آئندہ تحریک کے لئے تخم ریزی کا موجب ثابت ہوا اور ایسے افراد کی ایک جماعت تیار ہو گئی۔ جس کے افراد اخلاقِ عالیہ کا پیکر ہونے کے ساتھ ساتھ ایثار وقربانی کے مجسمے بھی تھے۔ ان لوگوں سے سید صاحبؒ کو تحریکِ جہاد میں بڑی مدد ملی اور ان کے بعد بھی یہ جماعت ان کے پاکیزہ اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے سرگرم کار رہی۔ اس سفر میں ان کی ملاقات بنگال، آسام، برما، چین اور تبت کے لوگوں سے بھی ہوئی جن میں سے بیشتر لوگوں نے ان کی بیعت کی۔ سید صاحبؒ نے انہیں اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ ان حضرات نے اپنے علاقوں میں جا کر سید صاحبؒ کی تعلیمات وافکار سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ اس طرح ہندوستان کے انتہائی مشرقی کناروں اور ممالکِ غیر یعنی چین اور تبت تک ان کا پیغام پہنچ گیا جہاں خود جانا سید صاحبؒ کے لئے ممکن نہ تھا۔ پھر یہی وہ مبارک سفر ہے جس کے نتیجے میں ان کا سرزمینِ حجاز کے ایسے لوگوں سے تعلق پیدا ہوا جو سندھ، افغانستان اور صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے اور جب سید صاحبؒ فریضۂ جہاد ادا کرنے کے لئے ان علاقوں میں تشریف لے گئے تو ان کے انہی ارادتمندوں نے ان کی پیشوائی کی، ان کی آمد سے قبل ہی لوگوں کو سید صاحبؒ کا مشتاق بنا دیا اور جہاد کے بعض نازک مرحلوں میں سید صاحبؒ کے لشکر کی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا جو مقامی راستوں سے ناواقف تھا۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سید صاحبؒ کا یہ سفر ان کے لئے بڑا نتیجہ خیز اور بابرکت ثابت ہوا۔ اس سفر سے ان کی پرکشش شخصیت کی اثر آفرینی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان میں لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے اور اپنا گرویدہ بنا لینے کی کیسی مقناطیسی قوت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ قوت ان کے بلند پایہ اخلاق، اعلیٰ کردار اور اس بے مثل تعلیم کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی جس سے ان کے قلب ونظر آراستہ تھے۔ بلاشبہ اس کشش میں ان کی نورانی شکل وصورت اور وجاہت کو بھی دخل تھا مگر ان کی نورانی شکل وصورت بھی دراصل ان کی باطنی پاکیزگی کا عکسِ جمیل تھا۔

جیسا کہ اس کتاب کے دیباچے میں تصریح کی جا چکی ہے کہ شہادت گاہِ بالاکوٹ کا اصل موضوع بالاکوٹ کے حالات اور جنگِ بالاکوٹ کی تفصیلات ہیں۔ سید صاحبؒ کا تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ اس جنگ کے ہیرو تھے۔ ایک بہت بڑی اور انقلاب آفریں تحریک کے بانی تھے اور ان کے ذکر کے بغیر یہ کتاب نامکمل رہتی۔ اسلئے کوشش کی گئی ہے کہ اس ذکر میں غیر ضروری تفاصیل سے گریز کیا جائے اور صرف وہی واقعات بیان کئے جائیں جن سے سید صاحبؒ کے خاندان، سید صاحبؒ کی سیرت، سید صاحبؒ کے اوضاع واطوار، سید صاحبؒ کی شخصیت اور سید صاحبؒ کے رجحانات کی

تصویر ابھر سکے۔ اب ہم چند ایسے واقعات بیان کر کے یہ باب ختم کرتے ہیں جن سے سید صاحبؒ کی اس تصویر کے کچھ نقوش نمایاں ہوں گے۔

عبادت وریاضت

ایک سچے اور حقیقی مسلمان کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور اس کی مقرر کردہ شرائط کے ساتھ سر جھکاتا ہے۔ یہ وہ معیار ہے جو اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مقرر فرمایا ہے۔ سید صاحبؒ کی سیرت وکردار کے پہلوؤں میں عبادت وریاضت اور توجہ الی اللہ کا پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جو قدم اٹھایا اس کا مقصد ایک ہی تھا کہ اللہ کو راضی کیا جائے۔ جو شخص اپنی زندگی رضائے الہٰی کے حصول کے لئے وقف کر دے اس کا سب سے بڑا سرمایہ عبادت اور توجہ الی اللہ ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عبادتِ الہٰی سے انہیں سب سے زیادہ شغف تھا۔ سفر ہو یا حضر زمانۂ امن ہو یا عرصۂ جنگ۔ انہوں نے ہر حالت میں نماز کو قائم رکھا اور سال ہا سال راتوں کا بڑا حصہ اللہ تعالےٰ کی نذر کر دیا۔ نہایت خطرات اور بے سروسامانی کی حالت میں فریضۂ حج ادا کیا اور اپنے عہد کے لوگوں کے لئے قابلِ تقلید مثال قائم کی۔ نواب وزیر الدولہ سید صاحبؒ کی کثرتِ عبادت اور شغفِ نماز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "جناب امیر المومنین وامام المسلمین سید احمد مجاہد غازی علیہ الرحمہ کا آغازِ تربیتِ سلوک میں معمول تھا کہ عشاء اور فجر کی نماز ایک وضو سے ادا کرتے (یعنی ان دونوں نمازوں کے درمیان ایک لحظہ کے لئے نہ سوتے تھے) اور ان کے درمیان کا وقت ذکر وفکر اور عبادت میں گزارتے تھے۔"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی عبادت پانچ وقت کی ان نمازوں تک محدود نہ تھی جو ہر مسلمان پر فرض کی گئی ہیں بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیروی کرنے اور قربِ الہٰی کے حصول کی غرض سے آپ تہجد کی نماز اس شغف سے ادا کرتے تھے کہ ساری رات اللہ تعالیٰ کے حضور قیام وسجود میں بسر کر دیتے تھے۔ جب آپ اپنے مرشد حضرت شاہ عبد العزیزؒ محدث دہلوی کی خدمت میں تعلیم تصوف کے لئے حاضر ہوئے تو ان ایام میں آپ نے جو سخت ریاضتیں کیں ان کا ذکر اس سے قبل گزر چکا ہے۔ اس کثرتِ عبادت وریاضت نے آپ میں عجیب روحانی شان پیدا کر دی تھی۔ آپ کی زبان میں حیرت انگیز تاثیر پیدا کر دی تھی۔ اللہ تعالےٰ آپ کی دعائیں بڑی کثرت سے قبول فرماتا تھا۔ دُعا سے آپ کو قلبی لگاؤ تھا۔ کثرت سے دعائیں کرتے تھے بلکہ دعا کے مواقع تلاش کرتے تھے کہ یہ بھی اپنے ربّ سے ہم کلام ہونے کا ایک طریقہ اور ذریعہ ہے۔ دعا کرتے وقت آپ پر جذب وکیف کی عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی

---

[1] وصایا الوزیر وصیت نمبر ۱۵ صفحہ ۲۵۶ (نصف اول)

عام طور پر دعا کرتے وقت اپنا سر ننگا کر لیتے تھے کہ یہ عاجزی کی ایک علامت ہے۔ نواب وزیر الدولہ حکمرانِ ریاست ٹونک بیان کرتے ہیں کہ :۔

"جب آپ کسی مجلس میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے تھے اور بآوازِ بلند جناب باری میں اپنا مدعا بیان کرتے تھے تو آپ کی زبان میں ایسی تاثیر اور درد پیدا ہو جاتا تھا کہ اہلِ مجلس میں سے ہر شخص اپنے ذوقِ ایمانی کے مطابق اپنے دل و دماغ پر ایک نورانی کیفیت طاری ہوتی ہوئی محسوس کرتا تھا۔ اس دوران میں ہر شخص کے دل سے شیطانی خطرات اور نفسانی ہوا و حرص کے جذبات یکسر معدوم ہو جاتے تھے۔ اکثر کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے اور بعض لوگ باطنی کیفیت سے ظاہری حواس کھو بیٹھتے اور مدہوش ہو جاتے تھے"۔[1]

اتباعِ سنتِ نبویؐ

سید صاحبؒ کی ساری زندگی اتباعِ سنتِ نبوی میں گزری۔ ان کی سیرت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھاتے تھے جو سنتِ نبوی کے خلاف ہو۔ ان کا سیرت نگار ان کی زندگی کے ابتدائی دور ہی سے ان کا یہ وصف گوہر آبدار کی طرح چمکتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی اس میں اتباعِ سنت کی بجائے اتباعِ رسوم کا غلبہ تھا۔ خصوصاً اس عہد اور معاشرے کی تہذیب بالکل ہی سنتِ نبوی کے خلاف تھی۔ لوگوں نے تہذیب کے کچھ سانچے خود ہی وضع کر لئے تھے اور اپنے آپ کو ان سانچوں میں ڈھال کر ہی کوئی شخص مہذب کہلانے کا مستحق قرار پاتا تھا مگر سید صاحبؒ کی فطرت نے شروع ہی سے ان سانچوں قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے لئے وہ سانچہ پسند کیا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضع کیا تھا۔ چنانچہ ان کا ایک تذکرہ نگار لکھتا ہے کہ :۔

"ہندوستان میں السلامُ علیکم کا رواج بالکل متروک ہو گیا تھا حتیٰ کہ شاہ صاحبؒ (شاہ عبدالعزیزؒ) کے خاندان میں بھی اس کا رواج نہ تھا اور جب وہ سلام کرتے تو کہتے تھے عبدالقادر تسلیمات عرض کرتا ہے رفیع الدین تسلیمات عرض کرتا ہے۔ سید صاحبؒ پہلے پہل شاہ ولی اللہ[2] صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سب سے پہلے انہوں نے شاہ صاحبؒ کو سلام کرتے ہوئے السلامُ علیکم کہا۔ جب شاہ صاحبؒ نے ان کا سلام سُنا تو بہت خوش ہوئے اور آپ نے حکم دے دیا کہ آئندہ بطریقِ مسنون سلام کیا جائے"۔[3]

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنت نبوی کی اتباع کرنے کا جذبہ سید صاحبؒ میں ابتدائے عمر ہی سے پیدا ہو گیا تھا

---

[1] وصایا الوزیر وصیت ۱۷ صفحہ ۲۷۳ (نصف اول) [2] راوی کو تسامح ہوا یہ شاہ ولی اللہؒ کا نہیں شاہ عبدالعزیزؒ کا واقعہ ہے۔ شاہ ولی اللہ اس وقت زندہ ہی نہ تھے۔ [3] ارواحِ ثلاثہ صفحہ ۱۲۲

اور یہ کسی خارجی تحریک کی وجہ سے پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ آپ کی فطرت کو سنت نبوی سے ایک قدرتی مناسبت تھی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ بھی ترقی کرتا رہا اور اس میں اتنی شدت پیدا ہوگئی کہ سید صاحبؒ کے تمام دوسرے فطری جوہر اس جوہرِ تاباں کی تابانی کے سامنے ماند پڑ گئے۔ آپ اپنی تقریروں اور عام گفتگو میں ارادتمندوں کو جن امور کی تلقین فرماتے۔ ان میں سے سب سے زیادہ زور سنتِ نبویؐ کی پیروی پر دیتے۔ چنانچہ آپ کے ایک ارادتمند کا بیان ہے کہ "سید صاحبؒ توحید، رسالت اور اتباعِ سنت پر بیعت لیتے تھے اور بس۔ سید صاحبؒ اتباعِ سنت کے لئے از حد تاکید فرمایا کرتے تھے اور بدعت کے ماحی اور مخالف تھے[1]۔"

اپنے آپ کو نمایاں کرنے اور دوسرے میں ممتاز ہو کر رہنے سے سید صاحبؒ کو سخت نفرت تھی کہ یہ طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقِ مبارک کے خلاف تھا۔ آپ اپنے ارادتمندوں کے ساتھ اس طرح رہتے جیسے ان میں سے ایک معمولی فرد ہوں۔ لباس، غذا، نشست و برخواست غرض اپنے طور طریقوں کو بالکل عام سطح پر رکھتے حتیٰ کہ بظاہر ادنیٰ درجے کے کاموں یعنی اینٹ گارا اٹھاتے اور پھاوڑا کسّی چلانے میں بھی ان کا ساتھ دیتے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت یہی تھی اور سید صاحبؒ کو حضورؐ سے عشق و محبت کی وجہ سے اتباعِ سنت کا جنون تھا۔ آپ کے ایک سوانح نگار لکھتے ہیں کہ جن دنوں سید صاحبؒ کی ہدایت کا بہت شہرہ ہو رہا تھا اور زیارت کے لئے آنے والوں کی اس قدر کثرت ہوگئی کہ آپ کا مکان ناکافی ثابت ہوا تو آپ نے حسبِ سنتِ نبوی کچی اینٹوں سے ایک مکان تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس میں مہمان قیام کر سکیں۔ ایک روز آپ نے چند کدال اور پھاوڑے منگوائے اور اپنے مریدوں کو ساتھ لے کر مٹی کھودنے تشریف لے گئے۔ جب آپ نے گڑھے میں اتر کر اپنے دستِ مبارک سے مٹی کھودنی شروع کی تو ارادتمندوں نے عرض کیا کہ آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ ہم خادم اس خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ:-

"بروقتِ تعمیر مسجدِ نبوی کے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذاتِ خود اینٹیں وغیرہ مصالحہ تعمیر کا اپنے سر مبارک پر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور صحابہ کرام بھی اس کام میں شریک تھے، سو تم بھی میرے شریک ہو کر کام کرو لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے ہاتھ سے کام نہ کروں[2]۔"

تصرفِ نگاہ

سید صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو اعلیٰ درجے کی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں ان میں سے ایک صلاحیت تصرفِ نگاہ کی تھی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ آپ نے فنِ سحر میں کوئی کمال پیدا کیا تھا یا مسمریزم کے ماہر تھے۔ ان امور سے

---

[1] ارواحِ ثلاثہ ص ۱۳۲ [2] تواریخ عجیبہ ص ۳۷

آپ کی فطرت کو کوئی مناسبت ہی نہ تھی اور نہ آپ کا کوئی تذکرہ نگار آپ کی ساری زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پاتا ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ آپ نے اس قسم کے لاحاصل علوم سیکھنے کی طرف کبھی توجہ دی۔ درحقیقت عشقِ الٰہی عرفانِ قرآن و حدیث اور خود اعتمادی نے آپ کے چہرے اور آنکھوں میں ایسی کشش اور طاقت پیدا کر دی تھی کہ جب آپ کسی پر ارادہ کر کے نگاہ ڈالتے اور اس کے قلب میں ایمان کی تھوڑی سی بھی رمق باقی ہوتی تو وہ آپ کی طرف کھنچتا چلا جاتا۔ اس قسم کے بہت سے واقعات آپ کی زندگی میں ملتے ہیں مگر آپ نے اپنی اس صلاحیت کو کبھی اپنی بزرگی کے نشان کے طور پر پیش نہیں کیا اور نہ اسے کمالِ روحانیت کا معیار قرار دیا۔ ایسا ہی ایک واقعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سید صاحبؒ کو ہر مقام اور ہر مرحلے میں اتباعِ سنت کا کتنا خیال رہتا تھا۔

"میاں جی محمدی صاحبؒ بیان فرماتے تھے کہ جب سید صاحبؒ سیر کو تشریف لے جاتے تھے تو بڑے بڑے لوگ شکار بند پکڑا کرتے تھے۔ ہم بھی چاہتے تھے کہ یہ شرف ہمیں بھی نصیب ہو مگر ہمیں موقع نہ ملتا تھا۔ لیکن ایک روز موقع مل گیا اور میں شکار بند پکڑے ہوئے سید صاحبؒ کے ساتھ چلا۔ خانم کے بازار میں ایک کوچہ تھا اور اس کوچے میں جو رنڈی (طوائف) رہتی تھی وہ نہایت حسین اور پڑھی لکھی تھی اور اس کے یہاں معمولی آدمیوں کا گزر نہ تھا بلکہ بڑے بڑے لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ سید صاحبؒ جب اس کے مکان کے پاس کو نکلے تو اتفاق سے وہ اپنے دروازے پر کھڑی تھی اور بہتام لباس سرمئی تھا۔ سید صاحبؒ اس جگہ ذرا ٹھٹکے اور ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد گھوڑا بڑھا کر آگے روانہ ہو گئے۔ آپ بیس پچیس قدم ہی چلے ہوں گے کہ اتنے میں وہ رنڈی روتی ہوئی اور یہ آواز دیتی ہوئی آئی کہ اے میاں سوار خدا کے واسطے ذرا گھوڑا روک لے۔ آپ نے گھوڑا روک لیا اور وہ بے تحاشا گھوڑے کے اگلے دونوں پاؤں کو لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سید صاحبؒ ہر چند فرماتے ہیں کہ بی بی سُن تو سہی بات تو بتلا تو کون ہے اور کیوں روتی ہے۔ گھوڑے کے پاؤں چھوڑ دے اور اپنا مطلب کہہ مگر وہ نہیں مانتی اور برابر گھوڑے کے پاؤں پکڑے ہوئے رو رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں اسے افاقہ ہوا اور اس نے کہا کہ میں بیوہ (بیسوا) ہوں اور اور توبہ چاہتی ہوں اور کچھ نہیں چاہتی۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ توبہ کے بعد نکاح بھی کرے گی۔ اس نے کہا جی ہاں نکاح بھی کروں گی اور جو آپ فرمائیں گے وہ کروں گی۔ آپ نے فرمایا کہ تیرا دل کسی سے نکاح کو چاہتا ہے تو اس نے کہا جی ہاں فلاں سے۔ آپ نے فرمایا وہ کہاں ہے۔ اس نے کہا کہ اس وقت میرے مکان میں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مکان میں کوئی اور بھی ہے۔ اس نے کہا جی ہاں کئی آدمی ہیں۔ سید صاحبؒ نے اس طوائف سے اور مجھ سے فرمایا کہ جاؤ سب کو بلا لاؤ ہم گئے تو اس وقت دس آدمی تھے۔ ان میں سے نو تو آ گئے مگر وہ نہیں آیا جس سے وہ نکاح کرنا چاہتی تھی۔ جس شان سے وہ رنڈی آئی تھی اسی شان سے یہ لوگ بھی آئے اور وہ بھی سب کے سب تائب ہو گئے۔ اب آپ نے رنڈی سمیت سب سے فرمایا کہ تم لوگ اکبری مسجد میں چلو میں بھی آتا ہوں۔ چنانچہ وہ سب اکبری مسجد میں چلے گئے اور آپ

آگے بڑھ گئے۔ اس کے بعد آپ نے مجھ سے فرمایا کہ میاں محمدی تم نے دیکھا کہ یہ ہم نے کیا کیا۔ میں نے عرض کیا کہ ہاں حضور دیکھ لیا۔ آپ نے فرمایا کہ میاں سنو اس قسم کی باتیں یہود و نصاریٰ مجوس اور جوگی بھی کرتے ہیں۔ بعض میں نظر کی قوت ہوتی ہے۔ بعض میں دماغی بعض میں قلبی، بعض میں آواز کی قوت ہوتی ہے مگر وہ قوت کسبی ہوتی ہے اور مجھے جو قوت عطا ہوئی ہے وہ وہبی ہے۔ اگر تم کسی کے اندر ایسی قوت دیکھو تو میں نصیحت کرتا ہوں کہ فوراً اس کے معتقد نہ ہو جانا اور اس کو بزرگ نہ سمجھ لینا بلکہ جس کو متبع سنت دیکھو تو گو ان قوتوں میں سے کوئی قوت بھی اس کے اندر نہ دیکھو تو اس کے معتقد ہو جانا[1]۔

یہ کمال اور پھر یہ خاکساری، اتباعِ سنت کی یہ تاکید، اس قسم کے کمالات کو نفسہ قرار دے کر ان سے متاثر ہونے سے روکنا اور صرف سنتِ نبویؐ کو معیارِ روحانیت سمجھنے کی تلقین کرنا صرف یہی ایک واقعہ سید صاحبؒ کی بزرگی اور انہیں مجددِ وقت قرار دینے کے لئے کافی ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ میاں جی محمدی صاحب کا بیان ہے کہ سید صاحبؒ سیر سے لوٹ کر جب اکبری مسجد میں آئے تو وہ طوائف اور اس کے نو ساتھی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سید صاحبؒ نے سب سے بیعت لی اور ان میں سے جس شخص کو وہ طوائف چاہتی تھی اس سے اس کا نکاح کر دیا۔ یہ طوائف نہایت مالدار تھی مگر اس نے یہ سارا مال و متاع ٹھکرا دیا اور جب سید صاحبؒ سکھوں سے جہاد کرنے تشریف لے گئے تو یہ سب لوگ آپ کے ساتھ تھے۔ ان میں سے نو کے نو مرد مختلف لڑائیوں میں مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے اور یہ طوائف موتی نامی ایک طوائف کے ساتھ جو حضرتِ شاہ اسماعیلؒ کے ذریعے تائب ہوئی تھی مجاہدین کے گھوڑوں کے لئے دانہ دلا کرتی تھی اور چکی چلاتے چلاتے اس کے ہاتھوں میں ڈھٹے پڑ گئے تھے۔ حافظ محمد اکبر خانپوری کا بیان ہے کہ انہوں نے ان دونوں طوائفوں کو دیکھا تھا۔ ایک بار انہوں نے ان سے دریافت کیا کہ تم دونوں توبہ سے قبل والی حالت پر مطمئن تھیں یا بعد والی حالت میں خوش ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ توبہ سے پہلے تو ہم ایک مصیبت میں گرفتار تھے اور اب ہمیں جو راحت میسر ہے وہ بیان میں نہیں آسکتی۔ اس وقت ہمارے ایمان کا عالم یہ ہے کہ اگر ہم اسے پہاڑ پر رکھ دیں تو وہ بھی زمین میں دھنس جائے[2]۔

مجذوبوں پر تصرف

مجذوب لوگ عام طور پر کسی سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ ان کی دنیا ہی الگ ہوتی ہے اور ایک بہت بڑے بزرگ کے بقول عام طور پر ان سے کچھ حاصل نہیں ہوتا مگر سید صاحبؒ کی قوتِ تاثیر نے یہ کرشمہ بھی دکھایا کہ مجذوبوں پر اپنی نگاہ و پر تاثیر ڈال کر انہیں عالمِ ہوش و خرد میں واپس لے آئے۔ چنانچہ اسی کتاب میں ان کے سفرِ عظیم آباد کے سلسلے میں ایک واقعہ درج کیا جا چکا ہے کہ ایک پابندِ سلاسل مجذوب کو انہوں نے ایک نظر دیکھ کر اس میں تبدیلی پیدا کر دی۔

---

[1] ارواحِ ثلاثہ صفحہ ۱۳۰،۱۳۱ ، [2] ارواحِ ثلاثہ صفحہ ۱۳۲

اور حکم دیا کہ اسے زنجیروں سے آزاد کر دیا جائے۔ اسی نوعیت کا ایک واقعہ نواب وزیر الدولہ والیٔ ریاست ٹونک نے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک مجذوب جو ہوش و حواس سے عاری تھا اور جس پر ہر وقت کیفیتِ جذب طاری رہتی تھی سید صاحبؒ کی خدمت میں لایا گیا۔ آپ نے اس کی طرف توجہ فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور سید صاحبؒ کی نگاہ کی تاثیر سے اس میں تغیرِ عظیم پیدا ہو گیا۔ بے خبری کی کیفیت جاتی رہی اور اپنے آپ میں آ گیا۔ متبعِ سنت اور پابندِ شریعت ہو گیا اور سید صاحبؒ کے ارادتمندوں کے زمرے میں شامل ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ مقامِ رشد و ہدایت پر بھی فائز ہوا۔[1]

یہ تھا سید صاحبؒ کا تصرفِ نگاہ اور یہ بھی ان کی تاثیرِ قلب کہ جس طرف نظر کی اسے سونا نہیں بلکہ کیمیا بنا دیا۔ معلوم نہیں ان کی نگاہِ ایمانی سے کتنے دلوں کی دنیا بدل گئی اور کتنی زندگیوں میں حیرت انگیز انقلاب آ گیا۔ یہ کمال اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک صاحبِ کمال اللہ تعالیٰ کا مقرب اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سچا عاشق نہ ہو۔ بے ادب کو یہ توفیق کہاں نصیب ہوتی ہے۔

نکاحِ بیوگان

مجدد کا اصل کام ان سنتوں کو زندہ کرنا ہوتا ہے جو حرص و ہوا غلط رسوم و رواج اور بدعقیدگی کے دبیز پردوں میں چھپ کر متروک ہو جاتی ہیں اور ان طور طریقوں کو ختم کرنا ہوتا ہے جو غیر اسلامی ہوتے ہوئے اسلام کا نام پا کر مسلم معاشرے میں جگہ پا لیتے ہیں۔ سید صاحبؒ کی زندگی کا بڑا حصہ اس فرض کی تکمیل میں بسر ہوا۔ ہندوستان میں ہندو تمدن و معاشرت اور ہندو افکار سے اثر پذیری کا نتیجہ تھا کہ یہاں کے لوگوں نے بہت سے اسلامی احکام سے روگردانی اختیار کر لی تھی۔ بہت سی سنتوں کو مردہ کر دیا تھا اور بہت سی مشرکانہ رسوم اور غیر اسلامی طریقوں کو اختیار کر لیا تھا۔ انہیں میں نکاحِ بیوگان بھی تھا۔ ہندو اپنی بیواؤں کا عقدِ ثانی گناہ سمجھتے ہیں اور ان کے یہاں یہ حد درجہ معیوب بات ہے۔ ہندوؤں میں سینکڑوں سال رہنے سہنے کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں نے بھی ان کے اس معیوب طریقے کو اپنا لیا اور بیوہ کا عقدِ ثانی جو اسلام کی رو سے ایک مستحسن فعل بلکہ صحیح الفاظ میں سنتِ نبوی ہے افسوس کہ مسلمانوں کے نزدیک بھی معیوب بن گیا۔ بعض واقعات ایسے بھی رونما ہوئے کہ جن عورتوں نے فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنی پاکدامنی برقرار رکھنے کے لئے دوسرا نکاح کر لیا انہیں ان کے رشتہ داروں نے قتل کر کے زمین میں دفن کر دیا۔ سید صاحبؒ نے اس صورتِ حال کا شدت سے نوٹس لیا اور سینکڑوں مظلوم عورتوں کو جن کی جوانی بیوگی چاٹے لے رہی تھی اور جو گھروں میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو رہی تھیں اس ظلمِ عظیم سے نجات دلوائی۔

سید صاحبؒ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو دوسروں کو تو وعظ و تلقین کرتے ہیں مگر ان کا اپنا دامن عمل سے تہی

---

[1] وصایا الوزیر وصیت ۲۳ صفحہ ۳۲ (نصف ثانی)

ہوتا ہے۔ وہ جس امر کو اسلام اور سنتِ نبوی کے عین مطابق سمجھتے تھے اور دوسروں کو اس پر عمل پیرا ہونے کی تلقین فرماتے تھے پہلے خود اس پر عمل کرتے تھے تاکہ دوسروں کے لئے مثال اور نمونہ قائم ہو سکے۔ چنانچہ نکاحِ بیوگان کے معاملے میں بھی انہوں نے یہی مناسب بلکہ ضروری سمجھا کہ اس تحریک کا آغاز کرنے سے قبل خود بھی اس پر عمل کریں۔ حسنِ اتفاق سے انہی ایام میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ نواب وزیر الدولہ والیٔ ریاست ٹونک کا بیان ہے جو عالم شہزادگی میں عرصے تک سید صاحبؒ کی صحبت میں رہے ہے کہ ایک روز آپ نے خواب دیکھا کہ بہت سے لوگ لکڑیوں کا ایک پشتارہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر اٹھا نہیں سکتے۔ آپ کے برادرِ کلاں سید محمد اسحاق مرحوم کی بیوہ بھی وہاں موجود ہیں۔ آپ ان سے نہایت عجز و الحاح سے کہتے ہیں کہ آپ بھی سہارا دیں تاکہ ہم دونوں مل کر اسے اٹھا لیں اور گھر پہنچا دیں۔ مگر انہوں نے وزن زیادہ ہونے کی وجہ سے اول تو انکار کیا مگر جب سید صاحبؒ کا اصرار حد سے گزر گیا تو وہ تیار ہو گئیں۔ نواب وزیر الدولہ کے الفاظ یہ ہیں:

"آں منورہ بسبب ثقل پشتارہ در اول ابا و انکار می نمایند و آخر چوں الحاح جناب شیخ باصلاح از حد درگذشت متفق شدہ برداشتہ بخانہ بردند۔"[1]

سیّد صاحبؒ کا نکاحِ ثانی

نواب وزیر الدولہ لکھتے ہیں کہ سید صاحبؒ کا معمول تھا کہ نمازِ فجر کے بعد آپ کے ارادتمند آپ کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے تھے اور آپ ان کے سامنے اسرارِ روحانی بیان فرماتے تھے مگر اس روز آپ نے اپنا یہ معمول ترک کر دیا اور صرف مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیلؒ شہید کو روک کر ان کے سامنے یہ خواب بیان کر کے فرمایا کہ بیدار ہونے کے بعد جنابِ باری سے مجھ پر اس خواب کی یہ تعبیر منکشف ہوئی ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس پاک بی بی سے میرا نکاح ہو گا اس کے بعد آپ اس خواب کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال فرماتے رہے۔ اس کے بعد گھر میں تشریف لے گئے اور خاندان کی مستورات کو جو آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کر چکی تھیں جمع کر کے ایک پُر تاثیر تقریر فرمائی جس کا مفہوم یہ تھا کہ شعارِ ایمانی اور طریقۂ مسلمانی صرف یہی نہیں کہ زبان سے اسلام کا اقرار کر لیا جائے یا گائے کا گوشت کھا لیا جائے اور ختنہ کرا لیا جائے یا مسلمانوں کے رسم و رواج اختیار کر لئے جائیں، ان کی محافل و مجالس میں شرکت کر لی جائے۔ اسلام تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کی تعمیل کی جائے یہاں تک کہ اگر حکمِ الٰہی ہو تو امام انبیاء جناب ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنے بیٹے کو بھی خدا کی رضا کے لئے بخوشی ذبح کر دیا جائے۔ جن امور سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ان سے پرہیز کیا جائے اور اگر ان کی طرف دل میں رغبت پیدا ہو جائے تو چالیس روز تک اس خیالِ جاں سوز سے توبہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جن امور کا

---

[1] وصایا الوزیر صفحہ ۳۱ نصف اول

حکم دیا ہے انہی میں بیوہ کا نکاحِ ثانی بھی ہے خصوصاً وہ بیوہ جو جوان ہو مگر یہ کارِ ثواب شرفاء کے نزدیک معیوب بن گیا ہے اور بیوہ سے نکاح کرنے والے مرد کو کمینہ اور احمق سمجھا جاتا ہے اور نکاح ثانی کرنے والی عورت کو رذیلہ اور مثل بدکار عورت کے قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اگر یہ لوگ غور کریں تو یہ بات بہت دور تک جاتی ہے۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ازواجِ مطہرات میں سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سوا باقی سب بیوہ ہی تھیں۔ نواب وزیر الدولہ کا بیان ہے کہ آپ کی یہ پُراثر اور مدلل تقریر اشراق سے زوالِ آفتاب تک جاری رہی اور مستورات پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ ان میں سے اکثر روتے روتے بے حال ہوگئیں۔ دوسرے روز آپ نے اپنی بیوہ بھاوج کی خالہ سے نہایت لجاجت اور عجز و انکساری سے کہا کہ آپ سید محمد اسحاق صاحبؒ کی بیوہ کو نکاح ثانی پر آمادہ کریں تاکہ انہیں اللہ جل شانہٗ سے ثواب ملے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے گھر میں نہایت پاکباز اور حسین و جمیل بیوی موجود ہے۔ میں یہ نکاح حظِ نفس کے لئے کرنا نہیں چاہتا بلکہ مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا اور سنتِ نبوی کو زندہ کرنا ہے[1]۔

آخر سید صاحبؒ کی بھاوج نکاحِ ثانی پر رضامند ہوگئیں۔ نکاح کے تیسرے روز آپ نے مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کو ہدایت فرمائی کہ اس نکاح کی اطلاع حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں بھیج دی جائے اور ہندوستان میں آپ نے جو خلفاء مقرر کئے تھے ان کے نام بھی ہدایت نامے ارسال کرنے کا حکم دیا کہ وہ بھی اپنے اپنے علاقوں میں نکاحِ ثانی کی سنت کو زندہ کرنے کی سعی کریں۔ اس کے بعد سید صاحبؒ کے وطن اور پھر دوسرے علاقوں میں بیوگان کے نکاحِ ثانی ہونے لگے اور اور سینکڑوں عورتیں جو اپنے والدین کے گھروں میں بیٹھی مظلومیت کی زندگی گزار رہی تھیں۔ سید صاحبؒ کی کوشش سے نکاح ثانی کرکے پُرمسرت زندگی گزارنے لگیں۔ برصغیر کے مسلم معاشرے کی خواتین پر سید صاحبؒ کا یہ بڑا احسان ہے۔

اطاعتِ مرشد

سید صاحب نے تصوف، روحانیت اور اخلاق و کردار میں جو بلند مراتب حاصل کئے ان کے حصول میں آپ کی فطری سعادت مندی کو بڑا دخل تھا۔ ادب کا مادہ ان کے خمیر میں شامل تھا اور یہ انہیں اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملا تھا۔ اپنے استادوں اور مرشد کے اس ادب نے انہیں عرفان و سلوک کے مراحل سے کمال خوش اسلوبی سے گزار دیا۔ ان کی عقیدت مندی اور سعادت مندانہ سلوک نے ان کے اساتذہ اور مرشد کے دل میں ان کی غیر معمولی محبت پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان پر خاص توجہ دیتے تھے۔ اس سعادت مندی اور اطاعتِ مرشد کا ایک واقعہ صاحبِ "امیر الروایات" نے یوں بیان کیا ہے:۔

---

[1] وصایا الوزیر ص ۳۱۲۔ ۳۱۳

جب شاہ عبدالقادر صاحبؒ شاہ صاحب (شاہ عبدالعزیزؒ) سے مانگ کے ان (سید صاحبؒ) کو اپنے پاس لے گئے تو آپ نے مسجد میں ایک جگہ بتلادی تھی کہ اس جگہ بیٹھا کرو۔ ذکر وشغل کیا کرو رفتہ رفتہ برسات کا زمانہ آگیا۔ ایک روز شاہ صاحب نے ان کو اس حال میں دیکھا کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور یہ اسی میں بیٹھے ہیں شاہ صاحبؒ نے پوچھا کہ تم بارش میں کیوں بیٹھے ہو؟ تو فرمایا کہ آپ ہی نے تو یہ موقع بتلایا تھا۔ ہمارے حضرت (شاہ عبدالعزیزؒ) نے فرمایا "یہ ہے اطاعت" شاہ صاحب کو وہم بھی نہ تھا کہ میرے بتلانے کو ایسا عام سمجھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تمام برسات اور جاڑے بھی گزر جاتے جب بھی سید صاحبؒ اس جگہ سے نہ اٹھتے[1] ممکن ہے آج کے لوگ اس واقع کو بہ نظرِ استہزا دیکھیں اور سید صاحبؒ کے اس فعل کو ہدفِ تنقید بنائیں مگر اس وقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اطاعتِ مرشد سے سرِ مو انحراف نہ کرنا ہی سید صاحبؒ کی عظمت کا سبب بنا اور اس بھٹی سے وہ کندن بن کر نکلے آج تعلیمی اداروں سے خام کاروں کی جو کھیپ نکل رہی ہے اس کی فکری ژولیدگی، بے بصری اور جہل بلکہ بے نصیبی کا اصل سبب یہی ہے کہ یہ لوگ اپنے استادوں کا ادب نہیں کرتے ان کے مقام و منصب سے نابلد ہیں۔ اطاعت کا تو سوال ہی خارج از بحث ہے پھر علم و عمل کے ایسے عظیم الشان پیکر پیدا ہوں تو کیسے۔

شرک سے نفرت

سید صاحبؒ کی فطرت کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ وہ اپنے اساتذہ کے ارشاد سے سرِ مو انحراف نہ کرتے تھے اور ان کی حکم عدولی کو تقاضائے ادب و احترام کے خلاف سمجھتے تھے لیکن دوسری طرف جب مسئلہ شریعت کا پیدا ہو جاتا تھا تو اختلاف کرنے میں بھی کوئی باک محسوس نہ کرتے تھے مگر ان کا یہ اختلاف بھی ادب کے دوائر و حدود میں رہتا تھا اور اس کا مقصد استاد سے بغاوت کرنا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یہ اختلاف ان کی سلامتیٔ طبع کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ ایک روز حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب نے اولیاء اللہ کے طریقے کے مطابق سید صاحبؒ کو تصورِ شیخ کی تعلیم دی۔ اس پر سید صاحبؒ نے نہایت الحاح و لجاجت سے شاہ صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس طریق میں اور بت پرستی میں کہ کفر و شرک کا بدترین طریقہ ہے آخر کیا فرق ہے؟ یہ سن کر شاہ صاحبؒ نے حافظ شیراز کا مشہور شعر پڑھا ؎

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید — کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

اس سے سید صاحبؒ کی تسلی نہ ہوئی اور انہوں نے مرشد گرامی کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کیا کہ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن اپنے دل میں شیخ کا تصور کر کے اور اس کی تصویر جما کر ذکر و فکر کرنا تو بت پرستی اور شرک ہے۔ میں اس کی جسارت کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتا۔ ہاں اگر آپ کتاب و سنت سے اس کی سند پیش کر دیں اور اجماعِ امت سے ثابت

---

[1] ارواحِ ثلاثہ صہ ۱۳۸

فرمادیں کہ یہ اصلِ اصولِ دین ہے اور میری تشفی ہو جائے تو میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں سید صاحبؒ کا یہ جواب سن کر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا اور ان کے رخسار اور پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا کہ اے عزیز اللہ تعالےٰ نے تجھے ولایتِ انبیاء کے انعام و افضال سے نوازا ہے۔[1]

دوسری روایت ہے کہ آپ نے سید صاحبؒ کو سینے سے لگانے کے بعد فرمایا ہم تمہیں طریقِ نبوت سے اس راہ پر لے چلیں گے۔ تمہیں طریقِ ولایت سے مناسبت نہیں ہے۔[2] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ کو شرک سے طبعاً نفرت تھی اور جس طریق میں شرک کا شائبہ بھی نظر آتا اسے رد فرما دیتے اور اس معاملے میں کسی قسم کی رعایت نہ فرماتے آپ کی سیرت اور مزاج کے یہی پہلو تھے اور آپ کی فکر و نظر کی یہی بلندی تھی جس نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے دل میں آپ کے لئے بڑی جگہ پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ انہیں اپنے شاگردوں میں سب سے زیادہ چاہتے تھے کیونکہ ان کے مستقبل میں شاہ صاحبؒ کو ایک بہت بڑا انسان نظر آتا تھا۔

---

[1] مخزنِ احمدی صفحہ ۱۹-۲۰ [2] ارواحِ ثلاثہ صفحہ ۱۳۸

سیّد صاحبؒ کا عہد

حضرت سید احمد شہیدؒ ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۱ء میں شہادت پائی۔ تاریخی لحاظ سے تقریباً نصف صدی کا یہ زمانہ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے نہایت پرآشوب تھا۔ جب اس ملک کے مسلمانوں کی تقدیر کا ستارہ عروج پر تھا تو وہ سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی تینوں لحاظ سے حکمرانی کر رہے تھے۔ ہرات اور کابل سے بنگال کے آخری کونے تک اور کوہ ہمالیہ کی ترائی سے راس کماری تک سارا ملک ان کے زیرِ نگیں تھا۔ بڑے بڑے سرکش اور طاقتور راجہ ان کی دربانی پر فخر کرتے تھے۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے ممالک کے بادشاہ ان کی خدمت میں سفارتیں اور تحائف بھیجتے اور ان سے روابطِ دوستانہ قائم رکھنا باعثِ عزت سمجھتے تھے۔ ان کے عہد میں اس ملک کے عوام کی اقتصادی حالت نہایت اچھی تھی۔ مسلم تو خیر مسلم تھے غیر مسلم بھی نہایت عزت و آرام اور فارغ البالی کی زندگی گزارتے تھے۔ زراعت تجارت اور صنعت و حرفت تینوں شعبوں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں اطمینان، دلجمعی اور محنت سے حصہ لیتے اور ملک کی آمدنی اور عوام کی خوشحالی میں اضافہ کرتے۔ یہ درست ہے کہ اس دور میں جاگیردارانہ نظام تھا مگر بادشاہوں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ کوئی جاگیردار اپنے علاقوں کے عوام پر ظلم و ستم یا ان کا استحصال نہ کر سکتا تھا بلکہ ہر جاگیردار سے ہزاروں سپاہی، خدمت پیشہ اور کاشتکار وابستہ تھے اور وہ ان کا سرپرست تھا۔ مسلمان بادشاہوں کے خزانوں کے منہ محتاجوں، ناداروں، اہلِ فن اور علماء کے لئے کھلے رہتے تھے۔ اس عام سرپرستی نے بھی عوام کی اقتصادی حالت پر خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ سارے ملک میں مدارس اور مساجد کے جال بچھے ہوئے تھے۔ ان مدارس اور مساجد کے منتظموں اور متولیوں کو بادشاہوں کی طرف سے بڑی بڑی جاگیریں عطا ہوتی تھیں جن کی آمدنی سے علوم و فنون، دین اور تہذیب کے یہ مراکز قائم تھے اور اپنے اپنے علاقوں میں علمی اور اخلاقی لحاظ سے روشنی کے مینار کا کام دے رہے تھے۔ علمِ دین کے طلبا کو وظائف ملتے تھے۔ علما بادشاہوں کے دربار میں بڑی اونچی جگہ پاتے تھے کیونکہ وہ علم و عرفان کے چشمے تھے۔ زہد و اتقا کے پیکر تھے۔ کردار اور گفتار دونوں میدانوں کے مرد تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ عوام و خواص اور خصوصاً مسلمانوں کی اخلاقی اور روحانی حالت نہایت اچھی تھی۔ علماء کے تبحرِ علمی اور اعلیٰ اخلاق و کردار کی وجہ سے

عوام میں بھی ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ان کا ہر طبقے پر گہرا اثر تھا۔ وہ لوگوں کی اخلاقی اصلاح میں عملی حصہ لیتے تھے۔ فارغ البالی اور خوشحالی عام ہونے کی وجہ سے رشوت، منافع خوری، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری جیسے سماجی جرائم کا ارتکاب معاشرے میں عام نہ تھا۔ لوگوں میں حیا اور مروت تھی۔ چھوٹے بڑوں کا ادب کرتے تھے۔ بے حیائی، عُریانی اور موجودہ اخلاقی و جنسی بے راہ روی کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔

اخلاقی و سماجی حالت

یہ صورتِ حال اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد تک باقی رہی مگر اس کی وفات کے بعد ہی سارا نقشہ بگڑ گیا۔ اورنگ زیب خود نہایت متقی و پرہیزگار حکمران تھا۔ سادہ زندگی گزارتا تھا۔ جفاکشی اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اس کے گورنر، امرائے دربار اور سردارانِ فوج بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ ذاتی طور پر ان کی نگرانی کرتا تھا۔ اس کا رعب گورنروں اور سرداروں پر طاری رہتا تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ عیاشی اور بے راہ روی کی زندگی گزار سکے مگر اورنگ زیب کے بیشتر جانشینوں میں اس کی سی صفات نہ تھیں۔ جب بادشاہ شرابی، زناکار، راگ و رنگ کے رسیا اور خوبصورت عورتوں کے شیدائی ہوں تو ظاہر ہے کہ ان کے امراء ان لعنتوں سے کیسے بچ سکتے ہیں چنانچہ جب اورنگ زیب کے بیشتر جانشینوں نے تیغ و تفنگ کی بجائے ساز و مضراب اور ساغر و صہبا کی سرپرستی شروع کر دی تو ان کے گورنر اور امرائے فوج بھی راگ و رنگ کی محفلیں منعقد کرنے لگے۔ بادشاہوں کے درباروں سے لیکر گورنروں اور امیروں کی مجالس تک طوائفیں، سازندے حتیٰ کہ خواجہ سرا چھا گئے۔ بعض بے بصیرت بادشاہوں پر تو طوائفوں نے اس قدر غلبہ پا لیا کہ سارنگی نواز اور طبلہ نواز درباروں کے منتظم بن گئے۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ پست کردار کے لوگ ابھر آئے۔ گھٹیا لوگوں اور سفلوں کا طوطی بولنے لگا۔ طوائفیں اور سازندے معاشرے میں عزت کی جگہ پانے لگے۔ رئیسوں نے اپنے بچوں کو تہذیب سکھانے کے لئے طوائفوں کے کوٹھوں پر بھیجنا شروع کر دیا۔ ان "تربیت گاہوں" سے اسی قسم کے لوگ بن سنور کر اٹھے جیسے اٹھنے چاہیئے تھے۔ رئیسوں اور امیروں کا اثر عام لوگوں پر بھی پڑا۔ شراب اور زنا عام معاشرے میں بھی پھیلنے لگیں۔ یہ دو ایسی لعنتیں ہیں جو اور بہت سی لعنتوں کو جنم دیتی ہیں۔ اس کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ لوگوں نے مساجد سے تعلق منقطع کر لیا۔ نماز جو اخلاقِ عالیہ اور اوصافِ حمیدہ پیدا کرتی ہے جب مسلمانوں نے ترک کر دی تو ان میں ہزاروں برائیاں پیدا ہو گئیں۔ شرم و حیا اٹھ گئی۔ حلال و حرام کی تمیز ختم ہو گئی۔ قومی ذمہ داریوں کا احساس دلوں سے نکل گیا۔ نفس پرستی اور خودغرضی نے ہر دل میں اپنے قدم جما لئے۔ یہی علامتیں کسی قوم اور معاشرے کی موت کا اعلان کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ اعلان ہو گیا۔ علماء کی اکثریت نے یہ اعلان سن کر بجائے میدانِ عمل میں آنے کے اپنے کان بند کر لئے۔ فرار کے راستے ڈھونڈے جانے لگے۔ حجرے آراستہ ہونے لگے۔

مریدوں سے نذریں قبول ہونے لگیں۔ عرس کی محفلیں سجائی گئیں۔ نام نہاد تصوف کی پناہ ڈھونڈی گئی اور ایک غافل قوم کو افیون کھلا کر اور بے سدھ کر دیا گیا۔

دینی بے حمیتی اور بے غیرتی کی انتہا ہو گئی تھی کہ بے شمار عورتیں مسلمان ہونے کی حالت میں پنجاب میں سکھوں اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں انگریز افسروں کے گھروں کی زینت تھیں۔ اقتصادی بدحالی کا اندازہ کرنے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ کشمیر اور پنجاب کے بعض مفلوک الحال مسلمانوں نے اپنی جوان عورتوں کو چند سو روپوں کی رقم کے عوض ہندوؤں اور سکھوں کے پاس رہن رکھا ہوا تھا۔

یوپی اور راجپوتانہ کے بعض علاقوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں امتیاز کرنا مشکل تھا۔ بجائے سلام کے رام رام کہنا یا ہاتھ جوڑ کر نستے کرنا ان کے نزدیک بالکل معیوب نہ تھا۔ چیچک کی دیوی "ستیلا" کی پوجا کرنا بعض مسلمان خاندانوں میں بالکل ہندوؤں کی طرح مروج تھا۔ نکاح کی تقریب میں ہندوؤں کی طرح "پھیرے" ڈالنے کی رسم مسلمانوں نے بھی اختیار کر لی تھی۔ ہندو جوگیوں کی تقلید میں مسلمان فقراء کا بھی ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ لمبی لمبی لٹیں، زلفیں، عطر پھلیل میں بسی ہوئی ہر انگلی چھلوں اور انگوٹھیوں سے بھری ہوئی اور گیروا لباس۔ اس سج دھج کے ساتھ محلہ محلہ، شہر شہر اور قصبے قصبے یہ بہروپئے لوگوں کو اپنی ظاہری ہیئت سے متاثر کرتے اور مذہب کے نام پر نہایت قبیح حرکات کے مرتکب ہوتے۔

ہندوؤں کی تقلید میں متعدد مشرکانہ اور مسرفانہ رسوم مسلمانوں نے یوں اختیار کر لی تھیں گویا یہ ان کے مذہب کا جزو تھیں۔ عورت کا نکاح ثانی ایک سنت ہے اور مسلم معاشرے میں پاکیزگی اخلاق و کردار برقرار رکھنے کے لئے اس کی ضرورت ہر دور میں محسوس کی گئی۔ مگر افسوس کہ بے شمار مسلم خاندانوں خصوصاً یوپی میں اسے ایک معیوب فعل قرار دیا گیا اور بعض جگہ نکاح ثانی کرنے والی مظلوم عورتوں کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ بچے کی پیدائش پر چھٹی، چھلے، موت پر سوئم، دسواں، چالیسواں اور برسی۔ پھر ان رسوم پر بے دریغ روپیہ صرف کیا جاتا تھا۔ نام و نمود کی خاطر مکانات اور زمینیں رہن رکھ دی جاتیں جو سود در سود کی گردش میں آ کر اصل مالکوں کو کبھی واپس نہ ہوتیں۔ اس کا نتیجہ تھا کہ بعض بڑے بڑے خاندان تباہ و برباد اور نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے۔ ان کی تقلید میں متوسط اور غریب لوگوں نے بھی ان رسوم و رواج کو اختیار کیا اور اپنے لئے جو مصائب پیدا کرئے اُن کا اندازہ کرنا آج ممکن ہی نہیں رہا۔ غرض سارا مسلم معاشرہ مشرکانہ رسوم، ہندوانہ تہذیب، اخلاقی پستی، دینی افلاس اور اقتصادی بدحالی کا عبرتناک نمونہ بن چکا تھا۔

سیاسی حالات

یہ اجمالی خاکہ ہے اس دور کی مسلم سوسائٹی کا۔ اخلاقی اور دینی و سماجی پہلو کی طرح مسلمانوں کا سیاسی پہلو بھی

حد درجہ الم انگیز بلکہ عبرتناک تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں جس طرح مسلمانوں کے اقتدار کا آفتاب نصف النہار پر ضوفگن تھا اس سے تاریخ کا ہر طالب علم باخبر ہے مگر افسوس کہ اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی برصغیر کے مسلمانوں کی عظمت کا آفتاب روبہ زوال ہونے لگا بستم یہ ہوا کہ بہت تیزی سے روبہ زوال ہوا۔ پے در پے مصائب آئے اور اس طرح آئے کہ بقول شاعر ؎

یوں اترتی ہیں بلائیں چرخ نیلی فام سے
جیسے ضد باندھی ہو میں نے گردش ایام سے

چند ہی سال میں سارا نقشہ بگڑ گیا۔ اورنگ زیب کے عالی حوصلہ، فراخ دل، نیک نفس اور عالم فرزند بہادر شاہ اول نے ان خصوصیات کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی جو اس کے اجداد اور ان کے دور میں پائی جاتی تھیں اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوا۔ مگر اس کی عمر نے وفا نہ کی اور پانچ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۷۱۲ء میں وفات پاگیا۔ بہادر شاہ کی وفات کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ ایک بند تھا جو ٹوٹ گیا۔ ایک ایسا شدید سیلاب آیا جس کی سرکش موجیں ہر خشک و تر کو بہا لے گئیں۔ بہادر شاہ کے نالائق، خود غرض اور کم ہمت بیٹوں اور ان کے غلاکار و جاہ طلب سرداروں نے سارے ملک کو انتشار، بدنظمی اور خونریزی کے طوفان میں مبتلا کر دیا۔ شہزادوں کی اس خانہ جنگی میں آخر کار فتح فرخ سیر کو ہوئی اور وہ ۱۷۱۳ء میں تخت نشین ہوا۔ مسند حکومت پر قدم رکھنے سے پہلے اس نے اپنے پیش رو بادشاہ جہاندار شاہ کا گلا گھونٹ کر مروا دیا اور تخت نشین ہونے کے بعد بہت سے شہزادوں کو قتل کرا دیا اور بعض کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر نابینا کروا دیا تاکہ تخت کا کوئی دعویدار نہ اٹھ کھڑا ہو۔ اس شرمناک ظلم سے اس نے اپنے عہد حکومت کا آغاز کیا۔ دوسری بڑی غلطی جس نے ہندوستان کی قسمت کو تاریک بنا دیا اس سے یہ سرزد ہوئی کہ ایک خطرناک بیماری سے شفایاب ہونے کے بعد اس نے اپنے انگریز معالج ڈاکٹر گیبرائیل ہملٹن کو پیش کش کر دی کہ وہ جو چاہے مانگ لے۔ اپنی قوم کے اس انتہا درجے کی بہی خواہ اور عاشق نے زر و جواہر یا جاگیر طلب کرنے کی بجائے "وہ چیز مانگی جو اس کی قوم کی سلطنت و حکومت کا باعث ہوئی"[1] یعنی اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے تجارتی مراعات طلب کیں جو اسے مل گئیں اور جن کے حصول کے نتیجے میں انگریز تاجر ایشیا کے اس عظیم ملک کے مالک بن گئے۔

سید بھائی

فرخ سیر کے عہد حکومت میں تیسرا بڑا حادثہ یہ ہوا کہ بارہہ کے دو سید بھائی سید حسن علی (عبداللہ) اور سید حسین علی جو تاریخ میں بادشاہ گر کے نام سے مشہور ہوئے امور مملکت میں اس حد تک دخیل ہو گئے کہ سلطنت کا سارا نظام انہی کے اشاروں اور تدبیروں سے چلنے لگا۔ بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں بھائی مغلیہ

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد نہم صفحہ ۱۲۵ مصنف خان بہادر شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی

سلطنت کی تباہی و بربادی کے بہت حد تک ذمہ دار ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے کمال فراست اور سیاسی بصیرت سے کام لے کر اپنے جانشینوں کو وصیت کی تھی کہ ساداتِ بارہہ کی عزت و احترام میں کمی نہ آنے دینا مگر انہیں سیاست اور امورِ مملکت میں دخل دینے کی اجازت نہ دینا[1]۔ افسوس کہ اس کے جانشینوں نے اس کی ہدایت کو نظر انداز کر دیا۔ آخر کار انہی (ساداتِ بارہہ) کی ریشہ دوانیوں، عیاریوں اور خود اپنی بداعمالیوں کے باعث فرخ سیر ۱۷۱۹ء میں گرفتار ہوا اور سید بھائیوں کے اشارے پر اندھا کر دیا گیا۔ کچھ دن بعد اس کا بھی وہی حشر ہوا جو اس کے ہاتھوں جہاندار شاہ کا ہوا تھا۔ یعنی سید بھائیوں نے اس کا بھی گلا گھونٹ کر مروا دیا۔ فرخ سیر کے بعد ان سید بھائیوں نے یکے بعد دیگرے کئی شہزادوں کو تخت پر بٹھایا مگر یہ سب بیمار، ناکارہ اور نااہل تھے اور دو دو تین تین ماہ برائے نام حکومت کر کے تختِ سلطنت محمد شاہ کے لئے خالی کر گئے۔ ۱۷۱۹ء میں یہ عیاش بادشاہ سریر آرائے حکومت ہوا۔ محمد شاہ نے اگر اپنے عہد حکومت میں کوئی کام کیا تو وہ یہی ہے کہ اس نے ملک کو سید بھائیوں کے فتنہ پرداز وجود سے پاک کر دیا اور یہ دونوں اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے۔

نادر شاہ کا حملہ

اس طرح محمد شاہ نے مغلیہ سلطنت کو ایک بار پھر سہارا دینے کی کوشش کی مگر جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں کی سرکشی، دربار میں ایرانیوں اور تورانیوں کی کش مکش اور سب سے زیادہ خود محمد شاہ کی عیش و عشرت نے حالات کو بیحد خراب کر دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ ایرانی نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اس حملے نے مغلیہ سلطنت کی کمر توڑ دی اور محمد شاہ کی شکست اور پھر دہلی میں نادر شاہ کے حملے سے اہل شہر کی ہولناک بربادی نے حکومت کا رہا سہا وقار بھی خاک میں ملا دیا۔ ۱۷۴۰ء میں علی وردی خان نے مرکز کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور بہار بنگال اور اڑیسہ جیسے زرخیز صوبوں پر اپنی آزاد و خود مختار حکومت قائم کر لی۔ نظام الملک دکن میں اپنی آزادی کا اعلان کر چکا تھا۔ ۱۷۴۸ء میں محمد شاہ کا انتقال ہو گیا اور احمد شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ نہایت ناکارہ اور پرلے درجے کا عیاش بادشاہ تھا۔ جاوید نامی ایک خوبرو خواجہ سرا اس کا محبوب تھا۔ اس کی طرف اتنا ملتفت ہوا کہ سارا نظام حکومت ہی اس کے سپرد کر دیا۔ اسی کے عہد حکومت میں وزیر اودھ نواب صفدر جنگ نے مرکز سے رشتہ توڑ کر اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ آخر کار اس کا انجام بھی وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی اس کی آنکھیں نکلوا کر قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۷۵۴ء میں عالم گیر ثانی تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ اگرچہ یہ نہایت علم دوست، عبادت گزار اور شریف النفس بادشاہ تھا مگر اس میں تدبر اور جرأت کی کمی تھی۔ عماد الملک غازی الدین خان جیسا ذہین و فریس مگر فتنہ پرداز سردار اس کا وزیر تھا

---

[1] منتخب اللباب جلد دوم [illegible] مولفہ خافی خاں

آخر اس عماد الملک نے ایسے علم دوست اور شریف النفس بادشاہ کو بھی معاف نہ کیا اور نومبر ۱۷۵۹ء میں اسے دھوکہ سے قتل کروا کر اس کی نعش لال قلعے کی کھڑکی سے باہر دریائے جمنا کے کنارے پھینکوا دی جہاں وہ کئی دن بے گور و کفن اور برہنہ پڑی رہی ۔

شاہ عالم کی نااہلی

عالمگیر ثانی کے انتقال کے بعد ملک میں دو بادشاہ بیک وقت تخت کے دعویدار اٹھ کھڑے ہوئے ۔ ایک کام بخش کا پوتا محی الدین شاہجہان سوم کے لقب سے سریر آرائے سلطنت ہوا ۔ اسے عماد الملک غازی الدین خان نے بادشاہ بنایا تھا ۔ دوسرا عالمگیر ثانی کا بیٹا علی گوہر جس نے صوبۂ بہار سے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور شاہ عالم کا لقب اختیار کیا مگر دہلی میں حالات اس کے حق میں سازگار نہ تھے ۔ اس لئے ۱۲ سال تک یہ تخت سلطنت حاصل کرنے میں ناکام رہا ۔ آخر دسمبر ۱۷۷۱ء میں دہلی پہنچ کر تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور حادثہ یہ ہوا کہ اس نے مرہٹوں کو دست و بازو بنایا اور انہی کے سہارے اقتدار کے زینے پر چڑھا ۔ شاہ عالم نہایت کمزور حکمران ثابت ہوا ۔ اپنے سرداروں خصوصاً مرہٹوں کے اشاروں پر چلتا تھا ۔ جسے طاقتور پاتا اس کی طرف جھک جاتا ۔ یہ صورت حال دیکھ کر رسوائے زمانہ مگر قومی غیرت کے پیکر غلام قادر روہیلہ نے کئی بار بادشاہ کو مرہٹوں کے اثر سے آزاد کرانے کی کوشش کی مگر شاہ عالم کی آنکھیں نہ کھلیں حتیٰ کہ غلام قادر کو اسی کوشش میں اپنی جان دینی پڑی ۔ غلام قادر کی شکست اور قتل کے بعد مرہٹوں نے نابینا بادشاہ شاہ عالم کی سرپرستی شروع کر دی اور خود اس کے نام سے حکومت کرنے لگے ۔ ۱۸۰۳ء میں جنرل لیک انگریزی فوج لیکر دہلی میں داخل ہوئے اور مرہٹوں کو نکال کر شہر پر قبضہ کیا ۔ شاہ عالم کی ایک لاکھ روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر دی ۔ ۱۸۰۶ء میں اس بے بصارت و بے بصیرت بادشاہ کا انتقال ہوگیا ۔ شاہ عالم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا معین الدین اکبر ثانی کے لقب سے تخت پر بیٹھا ۔ ۳۱ سال تک برائے نام حکومت کرنے کے بعد ۸۰ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا ۔ اس نے ساری عمر انگریزوں کی پنشن کھانے اور اپنی پنشن میں اضافے کے لئے کوششیں کرنے کے سوائے اور کچھ نہ کیا ۔ اسی بادشاہ کے عہد حکومت میں ہماری کتاب کے ہیرو حضرت سید احمد شہیدؒ منظر عام پر آئے اور اسی بادشاہ کے عہد حکومت میں برصغیر سے اسلامی اقتدار کے بچے کھچے آثار کا خاتمہ ہوا ۔

یہاں تک ہم نے اورنگ زیب کے جانشینوں کی نااہلی ، خود غرضی اور عیش کوشی کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا ہے اس کے مطالعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ دور برصغیر کے مسلمانوں کے لئے کس قدر بھیانک تھا اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کے ان محافظ بادشاہوں نے اپنے ذاتی اقتدار کے حصول اور اپنی مجالس عیش و نشاط آراستہ رکھنے کے لئے کس بے دردی سے ساری قوم کو ذبح کر دیا ۔ اگر غور کیا جائے تو غیر ملکی طاقتوں کو ہندوستان کے معاملات میں

دخل اندازی کا موقع فراہم کرنے کے ذمہ دار ہندوستان کے یہی نالائق حکمراں اور ان کے خود غرض سردار تھے۔

حصولِ اقتدار کے لئے انگریزوں کی کوششیں

جیسا کہ تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ انگریز برصغیر میں تاجر کی حیثیت سے آئے اور یہاں کے حکمرانوں کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھاکر رفتہ رفتہ اس ملک پر قابض ہو گئے۔ ابتدا میں انہوں نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ ان کوٹھیوں اور بحری جہازوں کی حفاظت کے لئے انہوں نے بری اور بحری دونوں قسم کی طاقت فراہم کی۔ اس طرح بمبئی، سورات، مدراس، ہگلی اور کلکتہ میں جدید اسلحہ سے لیس فوج بھی رہنے لگی اور مضبوط بحری بیڑے بھی۔ افسوس کہ ہندوستان کے حکمرانوں نے عرصے تک اس خطرے کی طرف توجہ نہ کی بلکہ اکثر اپنی باہمی جنگوں میں ان کی خدمات حاصل کیں۔ انگریزوں کی آمد سے قبل پرتگیزی اور ولندیزی بھی یہاں اپنی تجارتی کوٹھیاں تعمیر کر چکے تھے۔ اسی طرح فرانس نے بھی ساحلی مقامات پر اپنی کوٹھیاں تعمیر کر لی تھیں اور ان کے پاس بھی بری اور بحری دونوں قسم کی مضبوط فوج تھی۔ انگریز اور فرانس دونوں ایک دوسرے کی حریف طاقتیں تھیں۔ ان کی یہ رقابت برصغیر میں بھی ظاہر ہوئی۔

۱۷۵۰-۱۷۴۹ء میں دکن کے تختِ سلطنت کے دو دعویداروں ناصر جنگ اور مظفر جنگ میں لڑائی شروع ہوئی۔ مظفر جنگ نے فرانسیسیوں سے فوجی امداد طلب کی، چنانچہ وہ امداد کو پہنچ گئے۔ مظفر جنگ کو فتح حاصل ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی ہند میں فرانسیسیوں کا اثر و نفوذ بڑھنے لگا۔ انگریزوں کے لئے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے ارکاٹ کے نواب محمد علی کی امداد شروع کر دی۔ لارڈ کلائیو نے پانچ سو انگریزوں اور ہندوستانی سپاہیوں کی مدد سے ۱۷۵۱ء میں نواب محمد علی کی درخواست پر آرکاٹ پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں چندا صاحب قتل ہوا اور انگریزوں کا حامی نواب محمد علی کرناٹک کا حکمراں بن گیا۔ برصغیر میں انگریزوں کی یہ پہلی کامیابی تھی۔ اس کے بعد ان کے لئے کامیابیوں کے دروازے کھلتے چلے گئے چنانچہ ۱۷۵۶ء میں جب بنگالہ کے خود مختار حکمراں نواب علی وردی خان کا انتقال ہو گیا اور اس کا نواسہ نواب سراج الدولہ تخت نشین ہوا تو انگریزوں نے اس کے خلاف پہلے طاقت کے ذریعے اور پھر سازشوں کے سہارے ایک زبردست محاذ قائم کیا اور آخر کار اپنوں ہی کی غداری کے نتیجے میں بنگال کا جواں عمر اور حریت پسند حکمراں ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے مقام پر شکست کھاکر قتل کر دیا گیا۔ سراج الدولہ کی شکست دراصل برصغیر میں انگریزوں کی حکومت کے قیام کا اعلان تھی۔ اس کے بعد بنگال میں میر جعفر اور میر قاسم کو نواب بنایا گیا مگر حکومت انگریزوں ہی کی رہی اور پھر یہ تکلف بھی ختم کر دیا گیا۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر انگریزوں اور میر قاسم کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ شجاع الدولہ اور شاہ عالم میر قاسم کی حمایت پر تھے مگر افسوس کہ یہ متحدہ قوت بھی انگریزوں کو شکست

نہ دے سکی۔ اس جنگ میں میر قاسم نے تو شکست کھائی مگر غضب یہ ہوا کہ شاہ عالم نے تاوانِ جنگ کے طور پر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کے اختیارات بھی انگریزوں کے نام منتقل کر دیئے اس جنگ میں شکست سے برصغیر کو اقتصادی لحاظ سے جو نقصان پہنچا شاید اسکی تلافی بھی ہو جاتی مگر سچ تھی پھر انگریزوں کے ہاتھوں تین حکمرانوں میر قاسم، شجاع الدولہ اور شاہ عالم کا شکست کھا جانا سیاسی لحاظ سے نہایت نقصان رساں ثابت ہوا اور انکی ساکھ انکے معاصرین کی نگاہوں میں کم ہوگئی۔ ملک کے دوسرے حکمرانوں اور زمینداروں میں بادشاہ کیخلاف سرکشی کی جرأت پیدا ہوگئی اور سلطانِ دہلی کا وقار خاک میں مل گیا۔

سب سڈی ایری سسٹم

اس واقعہ کے دو سال بعد یعنی ۱۷۶۵ء میں انگریزوں اور نواب شجاع الدولہ کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے کڑا الہ آباد، چنار، بنارس اور غازی پور پر شجاع الدولہ کی حکومت تسلیم کر لی گئی۔ اس کے عوض شجاع الدولہ نے پندرہ لاکھ روپیہ انگریزوں کو ادا کیا۔ کلائیو نے شجاع الدولہ کی حدود سلطنت کی حفاظت اپنے ذمے لی۔ اس حفاظتی فوج کے اخراجات برداشت کرنے کا ذمہ شجاع الدولہ نے لیا۔ اس طرح اودھ انگریزوں کے زیر اثر بلکہ زیرِ نگرانی آگیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ویلزلی نے یہاں کے حکمرانوں کی باہمی کشمکش اور خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے رسوائے زمانہ معاہدہ "سب سڈی ایری سسٹم" میں ہندوستانی ریاستوں کے فرماں رواؤں کو جکڑ لیا۔ اس معاہدہ پر دستخط کرنے والے حکمران انگریزوں سے مشورہ کئے بغیر نہ کسی سے صلح کر سکتے تھے نہ جنگ، کسی مغربی ملک کا کوئی شخص اپنی فوج یا دربار میں ملازم نہ رکھ سکتے تھے۔ ہر حکمران کو ریاست کی حفاظت کے لئے انگریزی فوج رکھنی پڑتی تھی جس کے اخراجات کے لئے انہیں اپنی ریاست کا ایک علاقہ انگریزوں کو دینا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس معاہدہ پر دستخط کرنے والے حکمرانوں کی آزادی ختم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جن حکمرانوں نے اس معاہدہ پر دستخط کئے وہ مکمل طور پر انگریزوں کے دست نگر بن گئے۔ ان دستخط کرنے والوں میں اودھ، حیدر آباد، تنجور اور کرناٹک کے حکمران شامل تھے۔ سورت کے نواب کو بھی پنشن دے کر اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا گیا۔ گویا برصغیر کے حکمرانوں کی خود غرضی اور نالائقی کی بدولت ۱۸۰۱ء تک بنگال، بہار، اڑیسہ اور یوپی کا بیشتر حصہ، مدراس، حیدر آباد اور ہندوستان کے مغربی ساحلی علاقے انگریزوں کے زیرِ اقتدار آچکے تھے اور وہ نصف سے زیادہ ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے۔

حیدر علیؒ اور ٹیپو سلطانؒ

برصغیر کے طاقتور مسلمان حکمرانوں میں نواب حیدر علیؒ اور ٹیپو سلطانؒ انگریزوں کے لئے سب سے زیادہ خطرے کا باعث تھے۔ حیدر علیؒ نے اپنی غیر معمولی سیاسی بصیرت، جنگی قابلیت اور عدیم النظیر شجاعت سے انگریزوں کو پے در پے شکستیں دیں۔ افسوس کہ ۱۷۸۲ء میں عین دورانِ جنگ اپنے دور کے اس عظیم جرنیل اور فاتح کا انتقال ہوگیا۔ اس کے

شیر دل و غیور فرزند اور جانشین سلطان ٹیپو نے اپنے نامور باپ کی روایات کو قائم کر رکھا اور انگریزوں اور مرہٹوں دونوں کو شکستوں پر شکستیں دیں لیکن بدقسمتی سے سلطان ٹیپو کو مشیر اور وزیر ایسے غلط اور خود غرض ملے تھے کہ انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنے آقا بلکہ ساری قوم سے غداری کی۔ ادھر نظام اور مرہٹے بھی سلطان کے خلاف انگریزوں کے متحدہ محاذ میں شامل ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو برصغیر کا آخری طاقتور اور شیر دل حکمران سلطان ٹیپو سرنگا پٹم کے قلعے کی فصیل پر نہایت بہادری سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا اور اس طرح جنوبی ہند مکمل طور پر انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔

مرہٹوں کی غارت گری

مغلیہ سلطنت بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان مرہٹوں نے پہنچایا۔ ابتدا میں یہ بالکل بے حقیقت لوگ تھے۔ یہ مسلمان حکمران ہی تھے جنہوں نے اپنی ناچاقی، باہمی کشمکش اور خود غرضی سے اس منتشر گروہ کو منظم کیا اور فنونِ جنگ سکھا کر ایک دوسرے کو شکست دینے کے لئے انہیں میدان میں لے آئے۔ ساہوجی، سیواجی، سبھاجی، بالاجی اور باجی راؤ پیشوا نے مرہٹوں کو ایک مستقل فوجی قوت کی حیثیت سے منظم کیا اور یہ جنگجو قوم اورنگ زیب، اس کے جانشینوں، دکن کے مسلمان حکمرانوں حتیٰ کہ سارے ہندوستان کے لئے مصیبتِ عظمیٰ بن گئی۔ سب سے زیادہ افسوس اس کا ہے کہ بادشاہِ دہلی سے لے کر نظام حیدر آباد تک تقریباً تمام مسلمان حکمرانوں نے خود اپنے مسلمان حریفوں کو زک دینے کے لئے مرہٹوں کو آگے بڑھایا۔ انہیں انعامات دیئے، جاگیریں عطا کیں، منصب بخشے۔ اس طرح ان کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ مغل بادشاہوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ایک موقعہ پر بادشاہ کی فوج پر حملہ کر کے اسے ایسی شکست دی کہ بادشاہ کو میدانِ جنگ سے دہلی کی طرف بھاگنا پڑا۔ انتہا تو یہ ہے کہ نظام الملک نے مرہٹوں کے سربراہ پیشوا سے مصالحت کر لی۔ اس طرح اس نے اس غارت گر کو اجازت دے دی کہ وہ دریائے نربدا کے شمالی علاقے کو تباہ و برباد کر سکتا ہے[1]۔

مغل دربار سے جو سب سے زیادہ شرمناک فرامین و اسناد جاری ہوئیں ان میں مرہٹوں کو "چوتھ" وصول کرنے کی اجازت سرِ فہرست ہے۔ چنانچہ ۱۷۱۸ء میں مغل بادشاہ فرخ سیر نے مشہور مرہٹہ سردار ساہوجی کو ایک پروانہ عطا کیا۔ جس کے مطابق اسے دکن کے چھ بادشاہی صوبوں اور خراج گزار ریاستوں ترچناپلی، تنجور اور میسور سے چوتھ وصول کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس کے عوض میں ساہوجی نے بادشاہ کی فرماں برداری کا عہد کیا اور تمام ملک کے امن و امان اور رعایا کے حفظِ جان و مال کی ذمہ داری قبول کی۔ یہی نہیں بلکہ بادشاہ نے ساہوجی کا یہ مطالبہ بھی تسلیم کر لیا کہ سیواجی کے انتقال کے وقت جو علاقے اس کے قبضے میں تھے ان پر ساہوجی کی حکومت ہوگی۔ ان "خدمات" کے صلے میں ساہوجی نے

---

[1] تاریخ مرہٹہ جلد اول صفحہ ۴۲۲ مولفہ گرانٹ ڈف

بادشاہ کو چھ لاکھ روپیہ "خراج" دینا منظور کیا[۱]۔ بعد میں محمد شاہ نے بھی اس سند اور اجازت نامے کی توثیق کر دی۔ تاریخ گواہ ہے کہ مغل بادشاہ اور مسلمانوں کو اس مرہٹہ سردار کے ہاتھوں ذلیل کرانے کا ذمہ دار وہی ننگِ سادات سیّد حسین علی ہے جو تاریخ میں "بادشاہ گر" کے شرمناک لقب سے مشہور ہوا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ بادشاہ کی طاقت نہایت کمزور ہو چکی تھی۔ اس میں باغیوں اور لٹیروں کو سزا دینے کی قوت نہ تھی۔ اب وہ خود انہیں سندِ حکومت دے رہا تھا اور اپنے اقتدار میں خود شریک کر رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان غارت گروں نے مالوہ، راجپوتانہ، اودھ، بنگال، بہار اور اڑیسہ تک حملے کئے۔ پھر روہیلکھنڈ کی طرف بڑھے حتیٰ کہ پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا۔ غرض تقریباً سارا ہندوستان ان کے حملوں سے پامال ہو گیا۔ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ بستیاں کی بستیاں راکھ کے ڈھیروں میں تبدیل ہو گئیں خصوصاً مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو اور شعائرِ دین غرض سب کچھ برباد ہو رہا تھا۔ آخر میں ان کے حوصلے اتنے بڑھ گئے کہ ایک موقع پر بھاؤ اور دیگر مرہٹہ سردار یہ فیصلہ کر کے دکن سے روانہ ہوئے کہ جنگ میں کامیابی کے بعد بادشاہ دہلی اور افغان سرداروں کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور بشواش راؤ کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے گا۔ وہ اپنے ساتھ ایک بہت بڑا بت بھی لے گئے تھے تاکہ دہلی فتح کرنے کے بعد اس بت کو جامع مسجد میں نصب کر دیں اور اذان کی آواز کی بجائے صدائے ناقوس جامع مسجد دہلی سے بلند ہو[۲]۔

جنگِ پانی پت

شاید یہ مرہٹہ سردار اور ان کے ٹڈی دل لشکر اپنے ان مذموم اور شرمناک مقاصد میں کامیاب ہو جاتے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تحریک اور افغان سردار نواب نجیب الدولہ کی مساعیٔ جمیلہ سے افغانستان کا بہادر اور مدبر حکمران احمد شاہ ابدالی تیس ہزار افغانوں کا لشکر لیکر ہندوستان آیا اور ۲۶ اپریل ۱۷۶۱ء کو پانی پت کے میدان میں پانچ لاکھ مرہٹوں کو ایسی شکست فاش دی کہ ان کے ۲ لاکھ سپاہی تو عین میدان جنگ میں کام آئے۔ بڑے بڑے مرہٹہ سردار مثلاً بھاؤ، بشواش راؤ (جو آئندہ ہندوستان کا بادشاہ بننے والا تھا)، جونت راؤ، سنبھاجی اور جھنکوجی سندھیا، روہیلوں اور ابدالی فوجوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ مرہٹوں کا شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس کا کوئی نہ کوئی فرد اس جنگ میں ہلاک نہ ہوا ہو۔ مرہٹوں کا راجہ بالاجی پیشوا اسی صدمے سے جلد ہی وفات پا گیا۔ اس طرح مرہٹوں کی طاقت اور ان کی کمرِ ہمت ٹوٹ گئی اور انہوں نے ہندوستان پر حکومت کرنے کا جو خواب دیکھا تھا وہ کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس واقعہ کے بعد بھی مرہٹوں کے ہاتھوں برصغیر کے مسلمانوں کو سخت مصائب برداشت کرنا پڑے اور دکن اور شمالی ہند پر

---

[۱] تاریخ ہندوستان جلد نہم صفحہ ۲۲ مولفہ مولوی ذکاءاللہ [۲] تاریخ محمد صفحہ بحوالہ نواب نجیب الدولہ اور جنگ پانی پت مولفہ مفتی انتظام اللہ شہابی۔

ان کی یورشیں جاری رہیں مگران کا وہ کس بل ختم ہو گیا جو جنگِ پانی پت سے پہلے تھا۔

جاٹوں کی فتنہ آرائی

مرہٹوں کے بعد جاٹ دوسری بڑی قوم تھی جس نے دہلی سے آگرہ تک سخت تباہی مچائی اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی کرنے والے بھی مسلمان سردار ہی تھے جو اپنے مسلمان حریفوں کو شکست دینے کے لئے جاٹوں کو استعمال کرتے تھے۔ اس طرح ان کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ سورج مل ان کا نہایت بہادر اور منتظم حاکم تھا۔ اس سے پہلے چورامن جاٹ نے بہت شہرت حاصل کی۔ آگرہ کے قرب وجوار میں اس نے سخت فتنہ وفساد برپا کیا اور ہزاروں مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ اس موقع پر سید عبداللہ (بادشاہ گر) نے سخت شرمناک کردار ادا کیا اور جب مغل فوجوں نے اسے ذلت ناک شکست دی تو اسی سید عبداللہ نے بادشاہ سے سفارش کر کے اسے معافی دلوا دی بلکہ منصب بھی دلوایا۔ اس کے بعد جب صفدر جنگ اور روہیلہ سرداروں میں جنگ ہوئی تو صفدر جنگ نے اپنے مسلمان حریفوں کو شکست دینے کے لئے سورج مل جاٹ سے امداد لی اور اس نے فرخ آباد پر حملہ کر کے مسلمانوں پر قیامت خیز مظالم توڑے۔ اس سے قبل جاٹوں نے صفدر جنگ کی امداد سے دہلی اور اس کے مضافات کو خوب تاخت وتاراج کیا۔ غرض آگرہ سے دہلی تک سارا علاقہ سال ہا سال جاٹوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنا رہا اور مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہتا رہا۔ مرکزی حکومت میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ شمالی ہند کے بدنصیب اور ستم رسیدہ مسلمانوں کو ان غارت گروں سے نجات دلاتی۔

سکھوں کی تباہ کاریاں

مرہٹوں اور جاٹوں کی غارت گری کی داستانیں بلاشبہ بڑی روح فرسا اور دل گداز ہیں مگر برصغیر نے ایک ایسی قوم کو بھی جنم دیا جس کی تباہ کاریاں مرہٹوں اور جاٹوں دونوں سے سبقت لے گئیں۔ یہ غارت گر اور اسلام دشمن قوم سکھ تھی۔ سکھ ابتدا میں ایک مذہبی فرقے کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ اس مذہب کے بانی گورونانک صاحبؒ ایک نیک دل اور توحید پرست صوفی تھے۔ انسانیت کی تبلیغ اور صلح وآشتی ان کا مسلک تھا مگر بعد کے گوروصاحبان خصوصاً گورو گوبند سنگھ نے سکھوں کو نیم فوجی گروہ بنا دیا۔ انہوں نے تلوار یا کرپان رکھنا ہر سکھ کے لئے لازمی قرار دیا اور اس گروہ کو منظم کر کے اورنگ زیب عالم گیر سے جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ میں انہیں بری طرح ناکامی ہوئی اور وہ اورنگ زیب سے معافی مانگ کر دکن کی طرف فرار ہو گئے۔ یہاں بیراگی فرقے کے ایک ہندو رہنما سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس شخص میں اقبال مندی کے آثار پا کر اور اس کی جمعیت پر نظر کر کے انہوں نے اسے اپنا چیلا بنا لیا اسے سکھ مذہب کی تعلیم دی اور اپنا جانشین مقرر کیا۔ گورو گوبند سنگھ کی وفات کے بعد ان کا یہی چیلا بندہ بہادر کے نام سے سکھوں کا رہنما ہوا۔

پنجاب آکر اس نے سکھوں کو ازسرِ نو منظم کیا اور انہیں ہمراہ لے کر مغلیہ علاقوں میں لوٹ مار کرنے لگا۔ سرہند خاص طور پر اس کی غارت گری کا نشانہ بنا۔ یہاں کے مغلیہ حاکم وزیر خاں نے اس کی گوشمالی کا ارادہ کیا۔ اس وقت اس کے پاس چھ ہزار سوار اور سات آٹھ ہزار پیادے تھے مگر بندہ کا لشکر تیس چالیس ہزار جنگجو سکھوں پر مشتمل تھا۔ اتفاق کی بات کہ اس جنگ میں وزیر خان گولی لگنے سے شہید ہوگیا۔ اس کی شہادت کے ساتھ ہی مغل فوج پسپا ہوگئی۔ اب سکھوں کو میدان خالی ملا۔ اس موقع پر انہوں نے ایسی سفاکی کا مظاہرہ کیا کہ چنگیز خاں کے مظالم بھی ہیچ نظر آنے لگے۔ ایک مورخ کے بیان کے مطابق "سکھوں نے مال لوٹا، مردوں کو مارا۔ وضیع و شریف کے اطفال و عیال کو اسیر کیا۔ تین چار روز تک ایسا بیداد و ظلم کیا کہ حاملہ عورتوں کے پیٹوں کو چاک کیا جو بچہ زندہ نکلا اس کو زمین پر پٹک کر مردہ کیا۔ عمارات کو جلایا۔ فقیر و غنی کو ہم صورت بنایا۔ جہاں مسجد اور بزرگوں کے مقبرے اور مزار دیکھے ان کو توڑا، ڈھایا، اکھیڑا۔ مزاروں میں سے مردوں کی ہڈیوں کو نکالا اور مردوں کی لاشوں سے وحشیانہ سلوک کیا۔[1]"

اس کے بعد اس نے سہارنپور کا رخ کیا۔ یہاں کے پٹھانوں نے بڑی بہادری سے سکھوں کا مقابلہ کیا اور انہیں بڑا نقصان پہنچایا۔ مکانوں میں مورچے قائم کرکے تیروں اور بندوقوں سے سینکڑوں سکھوں کو ہلاک کر دیا۔ مگر جو علاقے ان کی زد میں آگئے وہاں انہوں نے خوب تباہی مچائی۔ یہاں سے بندہ نے دوآبہ جالندھر کا رخ کیا۔ یہاں کے پٹھانوں نے بھی سکھوں پر ایسے تابڑ توڑ حملے کئے کہ انہیں فرار ہوتے ہی بن پڑی۔ ادھر سے ناکام ہوکر انہوں نے لاہور پر یورش کی۔ یہاں کے نائب گورنر اسلم خان نے سکھوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور شہر کو ان کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھا۔ مگر شہر سے باہر ملحقہ مواضعات کو انہوں نے بُری طرح لوٹا اور گاؤں کے گاؤں جلا کر خاک کر دیئے۔ بے شمار افراد ہلاک ہوئے اور ہزاروں عورتیں اغوا ہوئیں۔ غرض آٹھ نو مہینے تک دہلی کی سرحدوں سے لاہور تک کا وسیع علاقہ سکھوں کی غارت گری سے پامال و برباد ہوتا رہا۔ آخر بہادر شاہ اول (ابنِ اورنگ زیب) نے لشکر جرار کے ساتھ بندہ اور اس کی فوج پر حملہ کیا۔ کئی خوں ریز جنگوں کے بعد سکھ منتشر ہوگئے اور بندہ جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش ہوگیا۔ وقتی طور پر یہ فتنہ ختم ہوگیا مگر بہادر شاہ کے انتقال کے بعد جب اس کے بیٹوں میں تخت کے حصول کے لئے جنگ شروع ہوئی تو بندہ پھر نمودار ہوا اور سکھوں کو منظم کرکے پھر قزاقی اور غارت گری شروع کر دی۔ اب اس نے ضلع گورداسپور کے مقام لوہ گڑھ میں ایک قلعہ تعمیر کر لیا اور اس میں پچاس ساٹھ ہزار فوج فراہم کر لی۔ اس نے گورداسپور پر قبضہ کرنے کے علاوہ مضافات کے پرگنوں پر بھی دست درازی شروع کر دی اور لاہور اور سرہند پر حملے کرنے لگا۔ جدھر سے اس کا لشکر گزرا، آگ، خون اور ویرانی بطور نشان چھوڑ گیا۔ آخر فرخ سیر نے نواب عبدالصمد خان، دلیر جنگ، اعتماد الدولہ، محمد امین خاں بخشی اور چند آزمودہ کار جرنیلوں کو فوج کثیر کے ساتھ بندہ کی سرکوبی پر مامور کیا۔ ان بہادر

---

[1] تاریخ ہندوستان جلد نہم ص ۵۹ مولفہ مولانا ذکاءاللہ دہلوی

اور مدبر سرداروں نے سخت اور خون ریز جنگوں کے بعد بندہ کو شکست دی۔ ہزاروں سکھ مولی گاجر کی طرح کاٹ دیئے گئے۔ ہزاروں گرفتار ہوئے۔ بندہ اور اس کا خوردسال بڑا کا بھی پکڑے گئے اور بادشاہ کے حکم سے دہلی لے جاکر نہایت عبرتناک طریقے سے ہلاک کر دیئے گئے۔

ابدالی کے ہاتھوں سکھوں کی گوشمالی

بظاہر سکھوں کی طاقت ختم ہو گئی اور اگر دہلی کی حکومت مستحکم ہوتی اور صوبوں کے گورنر سرکشی اختیار نہ کرتے تو یقیناً سکھوں کو دوبارہ سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی مگر مرکز کی کمزوری، مسلمان سرداروں کی کش مکش اور خانہ جنگی نے سکھوں کو پھر منظم ہونے اور پنجاب میں غارت گری کا بازار گرم کرنے کا موقع دیا۔ اب انہوں نے مختلف گروہوں کی صورت میں جنہیں "مسلیں" کہتے تھے۔ قتل و خوں ریزی اور لوٹ مار شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ ان "مسلوں" (یا "مثلوں") کے سرداروں نے پنجاب کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔ ان مثلوں کی تعداد بارہ تھی۔ بھنگی مثل، رام گڑھیہ مثل، معلو والیہ مثل، سکر چکیہ مثل، نہنگ مثل اور پھلکیاں مثل ان میں بہت مشہور ہوئیں۔ ہر مثل کا ایک سردار ہوتا تھا جو جتھہ دار کہلاتا تھا۔ ان مثلوں اور ان کے جتھہ داروں نے سارے پنجاب میں لوٹ مار اور آتش زنی سے قیامت برپا کر دی حتیٰ کہ ایک بار ۱۷۶۲ء میں ان کی سرکوبی کے لئے احمد شاہ ابدالی کو پنجاب آنا پڑا۔ اس کی آمد کی خبر سنتے ہی یہ پہاڑوں میں جا چھپے البتہ آلا سنگھ نے دو لاکھ کے قریب فوج جمع کر لی اور لدھیانہ کے قریب گھور اگھارا کے مقام پر احمد شاہ ابدالی کے مقابل صف آرا ہوا۔ ابدالی نے چند ہزار افغانوں کی جمعیت سے اس ٹڈی دل لشکر کو شکست فاش دی۔ اس جنگ میں سکھوں کے بیس ہزار افراد قتل ہوئے۔ زخمیوں کا کوئی شمار نہیں۔ سکھوں میں یہ جنگ "گھلو گھاڑا یعنی "سخت خون خرابہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس تباہی کے نام سے سکھوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور اس جنگ کو وہ برسوں بھلا نہ سکے۔ "ابدالی نے سکھوں کو ذلیل کرنے کے لئے دربار صاحب کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس نے ازراہ عبرت جابجا مقتول سکھوں کے سر لٹکا دیئے"[1]۔

یہی نہیں بلکہ اس موقع پر ابدالی نے سکھوں سے بطور جرمانہ زر کثیر وصول کیا۔ سردار آلہ سنگھ گرفتار ہو کر احمد شاہ ابدالی کے حضور پیش ہوا۔ سات لاکھ روپیہ[2] تاوانِ جنگ ادا کیا تب رہائی ملی۔ احمد شاہ ابدالی کے واپس جانے کے بعد کئی سال سکھوں پر مرگ آسا سکوت طاری رہا لیکن بعض سکھ مثلیں جنہوں نے ابدالی کی تلوار کا مزا نہیں چکھا تھا پھر سرکشی پر آمادہ ہو گئیں۔ اب کی بار انہوں نے لاہور پر یورش کر دی اور تین سکھ سرداروں گوجر سنگھ، سوبھا سنگھ اور لہنا سنگھ نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ خود ان سکھ سرداروں میں خونریز جنگیں ہوئیں اس طرح لاہور بری طرح برباد ہوا

---

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ صفحہ ۳۲ مولفہ پروفیسر سیتارام کوہلی وسابق لکچرر گورنمنٹ کالج لاہور [2] تاریخ پنجاب صفحہ ۸۵ مولفہ رائے بہادر کنہیا لال

اور یہاں کے مسلمان سکھوں کی غارت گری کا نشانہ بنے۔ ان پر سخت ترین مظالم کئے گئے جن کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں یہ "سہ حاکمانِ لاہور" کہلاتے ہیں۔ ایک شہر پر بیک وقت تین حاکموں کی حکومت تھی۔ آخر میں انہوں نے لاہور کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا۔ لاہور کا مشہور علاقہ قلعہ گوجر سنگھ اسی سکھ سردار گوجر سنگھ کی یاد دلاتا ہے۔ ۱۷۶۶ء میں احمد شاہ ابدالی ان سکھ حاکموں کو سزا دینے کے لئے پھر پنجاب آیا۔ اس کی آمد سے پہلے ہی سکھ لاہور چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس طرح لاہور کو وقتی طور پر ان غارتگروں کے مظالم سے نجات مل گئی۔ اس موقع پر پنجاب کے ایک بہادر اور مدبر گورنر میر منو کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ اس نے سکھ خطرے کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا اور باوجودیکہ دربار دہلی کی کمزوری اور اندرونی انتشار کی وجہ سے اس کی خاطر خواہ امداد نہ کی جاتی تھی۔ مگر اس نے پھر بھی محض اپنے قوت بازو پر بھروسہ کر کے سکھوں کو پے درپے ہزیمت دی اور انہیں متعدد بار گھیر گھیر کر مولی گاجر کی طرح کاٹ کر پھینک دیا۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی کے بعد سکھ جس حاکم سے خوف کھاتے تھے وہ یہی پنجاب کا شیر دل گورنر میر معین الملک عرف میر منو تھا۔ اس نے سکھوں کی جسطرح سرکوبی کی تھی اس کے قصے پنجاب کے قریے قریے میں مشہور تھے۔ سکھوں نے اس کی تلوار آبدار سے اپنی قوم کے قتل عام پر پنجابی زبان میں نظمیں لکھیں۔ جن کا ایک شعر بچے بچے کی زبان پر تھا۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ "منو ہماری درانتی ہے اور ہم اس کی گھاس ہیں۔ وہ ہم کو جتنا کاٹتا جاتا ہے ہم اتنا ہی بڑھتے جاتے ہیں"۔ یہ بات غلط بھی نہ تھی۔ مغل جرنیلوں کی سختیوں اور احمد شاہ ابدالی کے شدید حملوں کے باوجود سکھ حیرت انگیز طور پر بڑھتے اور ترقی کرتے رہے اور پنجاب کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر کے خون کے دریا بہاتے رہے۔ احمد شاہ ابدالی کے آخری حملے کے بعد تو پنجاب میں کوئی ان کا سدِ راہ نہ رہا اور وہ خوب کھل کھیلے۔ سارا پنجاب ان کی یورشوں اور غارت گری سے بلبلا اٹھا۔ حصولِ اقتدار کے لئے ان کی آپس میں بھی جنگیں ہوتی رہیں اور سکھوں کی بارہ مثلیں ایک دوسرے سے سال ہا سال برسر پیکار رہیں۔ ان کی اس باہمی خونریزی میں بھی پنجاب کے مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا اور بربادی کا شکار ہونا پڑا۔ یہ ایسا زمانہ تھا کہ پنجاب میں جنگل کا قانون نافذ تھا کوئی فریاد سننے والا نہ تھا۔ ہر شخص غیر محفوظ تھا۔

رنجیت سنگھ کی منظم غارت گری

آخر ۱۷۹۸ء میں گوجرانوالہ کی ایک سکھ مثل "سکر چک" کے جتھے دار سردار مہان سنگھ کا بیٹا سردار رنجیت سنگھ سکھوں کا نجات دہندہ بن کر اٹھا اور اپنی غیر معمولی فراست، اولوالعزمی اور جنگجویانہ اسپرٹ سے بہت جلد سارے پنجاب پر چھا گیا۔ اس کے پردادا کا باپ بدھو پہلا شخص ہے جس نے ہندو مت ترک کر کے سکھ مذہب اختیار کیا اور بدھ سنگھ نام رکھا۔ یہ خاندان عرصہ دراز سے گوجرانوالہ میں آباد تھا اور اس کا آبائی پیشہ زمینداری تھا مگر سکھ مت

قبول کرنے کے بعد بدھ سنگھ نے نڈر اور سرکش لوگوں کا ایک جتھہ تیار کیا اور انہیں ساتھ لے کر لوٹ مار اور قتل وغارت شروع کر دی۔ بدھ سنگھ کے بیٹے نودھ سنگھ، پوتے چڑت سنگھ اور پڑپوتے مہا سنگھ نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا اور ان کے ہاتھوں ہزاروں بے گناہ مسلمان تہہ تیغ ہوئے اور سینکڑوں گھران کی لوٹ اور غارت گری کا نشانہ بنے۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں کی جرأتیں اتنی بڑھ گئیں کہ مقامی حکام اور مغل فوجوں پر بھی انہوں نے حملے شروع کر دیئے۔ مہا سنگھ کا بیٹا رنجیت سنگھ قتل وغارت گری میں سب پر سبقت لے گیا۔ یہ فطرتاً نہایت ظالم اور بے رحم شخص تھا۔ اس کی سفاکی کا اندازہ کرنے کے لئے یہی امر کافی ہے کہ ایک مغربی مورخ کے بیان کے مطابق "اپنی نوجوانی میں اس نے اپنی ماں کو قتل کروا دیا تھا"[1]

ظاہر ہے کہ ایسے سنگدل شخص سے انسانیت کی خدمت کی توقع ہی عبث تھی۔ اپنے باپ کا جانشین ہونے کے بعد اس نے اپنی فطری سفاکی کا پورا مظاہرہ کیا۔ عیاری، عہد شکنی اور لالچ کے اس مجسمے نے لوٹ مار اور مسلم آزاری کے گذشتہ تمام سکھ ریکارڈ توڑ دیئے۔ رنجیت سنگھ سے پہلے مختلف سکھ سردار مختلف علاقوں پر قابض تھے۔ ان میں اتحاد واتفاق بھی نہ تھا اور اکثر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ رنجیت سنگھ نے ان سب کو مغلوب کر کے ایک مضبوط حکومت قائم کی۔ اس طرح وہ ظلم وستم جو مختلف سکھ سردار انفرادی طور پر کرتے تھے۔ اب رنجیت سنگھ کی سرپرستی میں منظم طریقے سے ہونے لگا۔ ان دنوں لاہور پر تین سکھ سرداروں کی حکومت تھی اور اہل شہر خصوصاً مسلمان ان کے مظالم سے سخت پریشان تھے۔ جب یہ حالات قصور کے مسلمان حاکم کو معلوم ہوئے تو اس نے لاہور پر فوج کشی کرنے اور ان سکھ سرداروں کی گوشمالی کا ارادہ کیا مگر اسی اثنا میں لاہور کے چند سر کردہ لوگوں نے جن میں مہر محکم الدین اور میاں عاشق محمد جیسے مسلمان بھی شامل تھے نواب قصور کی بجائے رنجیت سنگھ کی ماتحتی کو ترجیح دی اور اسے لاہور آنے کی دعوت دی[2]۔ چنانچہ رنجیت سنگھ لشکر لے کر آ پہنچا اور نواں کوٹ کے مسلمان رئیس مہر محکم الدین[3] کی امداد سے ۶ جولائی ۱۷۹۹ء کو لاہور میں داخل ہو گیا۔ لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد رنجیت سنگھ کی طاقت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا اور اس نے قصور، اکال گڑھ، گجرات، امرتسر، جھنگ، اوچ شریف، سیالکوٹ، شیخوپورہ، ہریانہ، خوشاب، ساہیوال، جموں، کانگڑہ، وزیر آباد، اٹک، ملتان، پشاور اور کشمیر و ہزارہ تک کے دور دراز علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ان علاقوں میں سکھ فوجوں نے جو مظالم توڑے تاریخ کے صفحات ان کی لرزہ خیز تفاصیل سے بھرے پڑے ہیں جو علاقے مکمل طور پر رنجیت سنگھ کے قبضے میں نہیں آئے ان سے نذرانے وصول کرنے کا سلسلہ شروع کیا یہ نذرانے نہایت ظلم اور تشدد سے وصول کئے جاتے تھے۔

سکھوں خصوصاً رنجیت سنگھ کی منظم اور باقاعدہ حکومت میں مسلمانوں پر جو مظالم ہوتے تھے ان کی تفصیل بڑی دردناک ہے۔ رنجیت سنگھ اگرچہ سکھ تھا مگر اس کا رجحان ہندو مذہب کی طرف تھا۔ وہ ہندوؤں کے متبرک مقامات پر حاضری دیتا اور

---

[1] اوکس میں صفحہ ۶۱۹۔ [2] مہاراجہ رنجیت سنگھ صفحہ ۶۹ مولفہ پروفیسر سیتا رام کوہلی، [3] تاریخ پنجاب صفحہ ۱۴۰ مولفہ رائے بہادر کنہیا لال

مندر میں پیش کرتا۔ چنانچہ غیر مسلم مورخوں نے رنجیت سنگھ کی جو سوانح عمریاں لکھی ہیں ان میں ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے اس کی ہندو مذہب سے عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ منشی سوہن لال کا بیان ہے کہ جب مہاراجہ تسخیر کشمیر کے لیے روانہ ہوا تو پہلے دسہرہ کے موقع پر جوالا جی (ضلع کانگڑہ) کے مندر میں حاضری دی اور نیاز گزاری[1]۔ ہندو مذہب سے رنجیت سنگھ کی اس عقیدت اور دلی لگاؤ نے اسے سکھوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کا بھی ہیرو بنا دیا اور آج تک وہ اس کا نام بڑے ادب سے لیتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کتابوں سے ہوتا ہے جو ہندو مصنفوں نے رنجیت سنگھ کے بارے میں سپرد قلم کی ہیں۔ سکھ حکومت میں گئوکشی ممنوع اور قانوناً جرم قرار دے دی گئی۔ یہ دوسرا ثبوت ہے رنجیت سنگھ کی ہندو نوازی اور ہندو دھرم سے اس کی عقیدت کا۔ اذان بند کر دی گئی۔ مساجد کو اصطبل میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان میں سور ذبح ہونے لگے۔ قرآن حکیم کی بے حرمتی عام ہو گئی۔ مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہنے لگا۔ رنجیت سنگھ اور دوسرے سکھ سرداروں کے گماشتے معمولی معمولی باتوں پر مسلمانوں کو گرفتار کرتے، ان پر مقدمے چلاتے، ان کے گھر بار ضبط کر لیتے اور انہیں شہر سے نکال دیتے۔ ہزاروں مسلمان عورتیں جبراً سکھوں نے اپنے گھروں میں ڈال لیں۔ مسلمانوں سے بیگار لینا آئے دن کا معمول بن گیا۔ سکھ مسلمانوں کو اپنا زرخرید غلام سمجھتے تھے۔ ان کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر ہو گئی۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کو جب پنجاب کے مسلمانوں پر سکھوں کے انسانیت سوز مظالم کی خبریں ملیں تو وہ ان کی بچشم خود تصدیق کرنے کے لئے سپاہیانہ بھیس میں پنجاب گئے اور یہاں انہوں نے جو کچھ دیکھا وہ دہلی واپس جا کر بیان کیا۔ ذیل میں حضرت شاہ اسماعیلؒ کی رپورٹ درج کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے اس موضوع پر اس سے زیادہ صحیح اور مستند بیان اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ کا چشم دید بیان

شاہ شہیدؒ کے بیان کے مطابق "فیصدی دس مسجدیں سکھوں کے قبضے میں تھیں اور ان مسجدوں میں گھوڑے بندھے تھے یا سکھوں کے دفتر تھے۔ قطعاً حکم دے دیا گیا تھا کہ کوئی شخص اذان بلند آواز سے نہ کہے بلکہ اس خاموشی سے کہے کہ اس کا دوسرا بازو بمشکل سُن سکے۔ بقر عید کی قربانی کرنے کے قوانین بھی بہت سخت تھے۔ بعض اضلاع میں جاہل سکھ مسلمانوں کو بکرا ذبح کرتے وقت مجبور کرتے تھے کہ بجائے "اللہ اکبر" کے "واہگرو" کہو اور انہیں اپنی جانوں کے خوف سے کہنا پڑتا تھا۔ ریاست میں چھوٹے بڑے عہدے ملنا تو درکنار غضب یہ تھا کہ کوئی مسلمان مسجد کے کواڑ کھول کے نماز نہ پڑھ سکتا تھا اور اگر کسی ناواقف نے ایسا کیا تو اسے راستے چلتا سکھ پیچھے سے دھکا دے کر الٹ دیا کرتا تھا۔ معمولی جھگڑوں میں گھس آنا اور متبرک کتابوں کو جلا دینا یہ ایک معمولی بات تھی۔ بعض خاندان اپنا وطن چھوڑ کر انگریزی سلطنت میں چلے گئے تھے۔ رنجیت سنگھ کے خاص محل میں کئی مسلمان عورتیں تھیں۔ بعض مسلمانوں نے بیان کیا کہ ہماری

---

[1] عمدۃ التواریخ حصہ دوم صفحہ ۱۲ مولفہ منشی سوہن لال

کتے کے برابر بھی عزت نہیں کی جاتی ۔ ہمارے مذہبی ارکان میں کھلم کھلا دست اندازی کی جاتی ہے اور ہمارے مقابر اور پرستش گاہوں میں سکھ ناجائز افعال کرتے ہیں اور شب و روز اپنے جانور باندھے رکھتے ہیں ۔ کسی کی مجال نہیں کہ ٹوٹی ہوئی مسجد کی مرمت کر سکے ۔ سرِ دربار اسلام اور پیغمبرِ اسلام کو توہین آمیز الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے ۔ وہ عام طور پر مسلمانوں کو "موسلا" کہتے ہیں ۔ مسلمانوں کی صورت دیکھتے ہی یہ غلیظ فقرا ضرور کہدیا جاتا ہے "سُور دا بچہ" یعنی (سُور کا بچہ)

ایک سرائے میں شاہ اسماعیل شہید مقیم ہوئے ۔ اس میں چند اور مسلمان بھی ٹھہرے ہوئے تھے ۔ انہوں نے آپ کو اپنی دردناک داستان سناتے ہوئے بتایا کہ "قدیم سے ہم ملتان کے رہنے والے ہیں ۔ وہاں کے حاکم نے ہمارا گھر لوٹ لیا اور جلا دیا ۔ ہم لاہور آ گئے تھے شاید رنجیت سنگھ ہماری فریاد سنے ۔ وہاں ہماری اور بھی بے عزتی ہوئی ۔ ہماری ڈاڑھیاں گدھے کے بول سے منڈوا دی گئیں اور سارا سامان چھین کے ہمیں نکال دیا گیا ۔ ہم روتے پیٹتے امرتسر آئے ۔ کہیں حاکم ملتان کا رشتہ دار یہاں رہتا ہے ۔ اس ظالم نے ہمارے گھر آگ لگانے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ امرتسر میں اپنے رشتے دار شیر سنگھ نامی کو لکھ بھیجا اگر فلاں فلاں شخص آویں تو ان کی عورتیں اور اسباب چھین کے انہیں شہر بدر کر دینا ۔ ہم پرسوں امرتسر میں داخل ہوتے ہی گرفتار کئے گئے ۔ ہماری عورتیں چھین لی گئیں اور جو کچھ ہمارے پاس رہ گیا تھا وہ سب رکھوا لیا ۔"

" مسجد میں نمازیوں پر غلاظت پھینکی جاتی تھی ۔ بہت سی مسجدیں غیر آباد اور ٹوٹی ہوئی تھیں ۔ ان میں سؤر اور کتے بندھے ہوئے تھے ۔ یہ ہر سکھ کو مجاز تھا کہ اگر اس کو دوسری جگہ سونے کو نہ ملے وہ جا ہے جس مسجد میں چلا آوے ملّا کا ہاتھ پکڑ کر نکال دے اور آپ وہاں شب باشی کرے ۔ سؤر کا گوشت بآزادی کھا سکتا تھا اور مسجد کو پاخانہ بنا سکتا تھا ۔ اعلانیہ طور پر اجازت نہ تھی کہ کوئی فرد بشر قرآن گلے میں لے کر نکل سکے ۔ اگر کسی ناواقف نے ایسا کیا قید خانہ بھیج دیا گیا اور اس کا قرآن زبردستی آگ میں ڈال دیا گیا ۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جہاں ہر شہر میں آٹھ دس قرآن روزمرہ نہ جلائے جاتے ہوں جب فصل کٹنے کا زمانہ آتا مسلمان زمینداروں کی جان پہ بن جاتی ۔ ان سے یہ کوئی سننے والا تیار نہ ہوتا تھا کہ اب کے کال پڑا اور اب کے فلاں سنگھ جی اپنے مویشیوں کو سال بھر فصل کے دنوں میں چرایا کئے بلکہ ان پر کوڑے بازی ہوتی تھی اور مجبور کیا جاتا تھا کہ روپیہ لاؤ ۔ اگر کسی نے روپے محصول کے دے دیئے تو خیر ورنہ ان کے بال بچے چھین لئے جاتے تھے اور سرِ بازار نیلام کر دیئے جاتے تھے ۔"

ایک غیور مسلمان نے شاہ اسماعیلؒ سے اپنے علاقے کے مسلمانوں کی بربادی اور سکھوں کی سفاکی کی داستان بیان کرتے ہوئے بڑے دکھ بھرے انداز میں کہا کہ "ہمیں اس کی کچھ پرواہ نہیں ہمارے نابالغ بچوں اور بیمار مردوں اور عورتوں کو سکھوں نے کس بے رحمی سے قتل کیا اور زندہ آگ میں جلا دیا بلکہ اگر خیال ہے تو یہ کہ انہوں نے ہمارے پاک مقابر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ہماری مساجد میں سؤر ذبح کئے اور جو کچھ ان سے ہو سکا دین اسلام کی توہین کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا اور اب تک وہ اسی سرگرمی سے توہینِ اسلام کئے جاتے ہیں ۔ بے محابا سکھ ہر مسلمان کے مکان میں

چلے جاتے ہیں۔ انہیں اختیار ہے جو چاہیں اٹھالیں اگر کھانا پکتا ہو تو اس پر سؤر کی ہڈی ڈال کر پاک کر لیتے ہیں"۔

"سکھوں کی عملداری میں بڑا جرم مسلمان ہونا تھا مجسٹریٹ کے سامنے جب کوئی جرم کسی مسلمان پر ثابت نہ ہوتا تھا تو اس سے سکھ ہو جانے کی درخواست کی جاتی تھی اور جب وہ انکار کرتا تو اس پر یہ عظیم الشان جرم قائم کر کے موت کی سزا دی جاتی تھی۔ سکھوں کا دستور ہے کہ ہولے کر کے کھاتے ہیں۔ دہلی میں ہولے سوکھے بوٹوں کو گھاس پھوس کی آگ میں مع شاخوں کے خستہ کرنے کو کہتے ہیں مگر سکھوں میں انہیں ہولے نہیں کہتے۔ وہ ایک بڑے فولادی پنجرہ میں چیل، کوے، کبوتر، تیتر، مینائیں، طوطے غرض مختلف قسم کے جانور بند کر کے پنجرہ کو کسی درخت پر لٹکا دیتے ہیں اور پھر نیچے سے آگ دے دیتے ہیں۔ وہ زندہ پرند پھڑپھڑا کے بھن کر کوئلہ ہو جاتے ہیں۔ پھر انہیں صاف کر کے یہ ناخدا ترس کھاتے ہیں۔ اسی طرح بے گناہ مسلمانوں کے ہولے کئے جاتے تھے اور یوں تڑپا کے انہیں مارا جاتا تھا"۔[1]

یہ تھے سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے سے قبل اور آپ کے زمانے میں برصغیر کے سیاسی حالات اور یہ تھے وہ انسانیت سوز مظالم جو سکھ حکومت پنجاب کے مسلمانوں پر مذہب کے نام پر کر رہی تھی۔ ان حالات میں سید احمد شہیدؒ جیسا غیور مسلمان رہنما جسے اللہ تعالےٰ نے مجدد کے طور پر مبعوث فرمایا تھا ان مظالم پر خاموش کیسے رہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ یہ زہرہ گداز حالات سن کر تڑپ اٹھے اور مٹھی بھر مجاہدوں کو لے کر مسلمانانِ پنجاب کی رستگاری کے لئے وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ آئندہ صفحات میں ان کے اسی مقدس سفر اور مہماتِ جہاد کے کوائف بیان کئے جائیں گے۔

---

[1] حیاتِ طیبہ از صنا۱۲ تا صنا۱۴۴ (اقتباسات ملخص)

سیّد صاحب کی مہمّاتِ جہاد

سید صاحبؒ کی زندگی کے دو بڑے مقاصد تھے۔ ایک مسلمانوں کو حقیقی مسلمان بنانا اور دوسرا ظلم وستم کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مسلمانوں کو ان ہولناک مظالم سے نجات دلانا۔ تاریخ گواہ ہے اور گزشتہ صفحات میں جو تصریحات پیش کی گئی ہیں وہ شہادت دیتی ہیں کہ سارے برّصغیر میں پنجاب ہی وُہ بدنصیب صوبہ تھا جہاں پہلے غیر منظم طور پر اور پھر رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں نہایت منظم طریقے سے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا تھا اور ایک ایسی خطرناک مہم شروع کی گئی تھی کہ اگر وہ اسی طرح جاری رہتی تو پنجاب میں بھی مسلمانوں کا وہی حشر ہوتا جو اسپین میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سید صاحبؒ نے اپنی جدوجہد کا مرکز سرحد کو بنایا جہاں سے پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف موثر کارروائی کی جا سکتی تھی۔ سید صاحبؒ نے اپنی تبلیغی مہم پر روانہ ہونے سے قبل ہی حضرت شاہ اسمٰعیلؒ سے ان کے دورۂ پنجاب کے چشم دید حالات سن کر اور اس سفر میں شاہ صاحبؒ نے جو معلومات فراہم کی تھیں ان کی تفصیلات سے آگاہ ہو کر اس مصیبت زدہ خطے کے مسلمانوں کو اس مظلومانہ زندگی سے نجات دلانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب آپ اپنی تبلیغی و اصلاحی مہم پر روانہ ہُوئے تھے تو رام پور کے دورانِ قیام میں بعض افغانوں نے بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمانوں پر سکھوں کے انسانیت سوز مظالم کی روداد سنائی تھی۔ چنانچہ مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں کہ:

جہاد کی فوری تحریک

"جن ایام میں سید صاحبؒ رام پور میں رونق افروز تھے۔ کئی ولایتی افغان رامپور میں آئے اور انھوں نے ایک بڑا دردانگیز قصہ سید صاحبؒ کے روبرو اس طرح بیان کیا کہ ہم اپنے اثنائے راہِ ملک پنجاب میں ایک کنویں پر پانی پینے کو گئے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ چند سکھنیاں یعنی سکھ عورتیں اس کنویں پر پانی بھر رہی ہیں۔ ہم لوگ دیسی زبان نہیں جانتے تھے ہم نے اپنے مونہوں پر ہاتھ رکھ کر ان کو اشاروں سے بتلایا کہ ہم پیاسے ہیں۔ ہم کو پانی پلاؤ۔ تب ان عورتوں نے ادھر ادھر دیکھ کر پشتو زبان میں ہم سے کہا کہ ہم افغان زادیاں فلانے ملک اور بستی کے رہنے والی ہیں۔

یہ سکھ لوگ ہم کو زبردستی پکڑ لائے اور سکھنیاں بنا کر اپنی جورویٔں کر لیا ہے۔ یہ سن کر ہم کو بہت رنج ہوا کہ مسلمان عورتیں جبراً اس طرح کافر بنائی جائیں۔ اے سید صاحبؒ آپ ولی اللہ ہو، کچھ ایسا فکر کرو کہ ان کو ان کے کفر سے نجات ملے۔ تب سید صاحبؒ نے فرمایا کہ انشاء اللہ میں عنقریب سکھوں پر جہاد کروں گا۔[1]"

رامپور سے روانہ ہو کر سید صاحبؒ رائے بریلی پہنچے۔ اس سے قبل آپ کے عقیدت مند اپنا زیادہ وقت ذکر و فکر اور مراقبوں میں گزارتے تھے۔ کبھی کبھار جہاد کا بھی تذکرہ ہو جاتا تھا مگر جہاد گفتگو اور افکار کا مرکز و محور نہ تھا۔ لیکن رائے بریلی پہنچنے کے بعد سید صاحبؒ نے ہدایت فرمائی کہ تمام بھائی فنونِ جنگ کی مشق کریں۔ مولانا غلام رسول مہرؔ کا بیان ہے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رفقاء میں سے بعض کو اس حکم پر تعجب ہوا اس لیے کہ ذکر و شغل کے عام طریقوں کو جنگی فنون کی مشق سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ چنانچہ مولوی عبدالرحیم کاندھلوی کے ذریعے سے یہ معاملہ سید صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ:

"ان دنوں دوسرا کام اس سے افضل ہمارے درپیش ہے۔ اب اس کی طرف ہمارا دل مشغول ہے۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔ اس کے سامنے حال کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ اس واسطے کہ وہ کام یعنی علم سلوک اس کے (جہاد کے) تابع ہے۔ اگر کوئی تمام دن روزے رکھے، تمام رات زہد و ریاضت میں بسر کرے یہاں تک کہ نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں پر ورم آ جائے اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک ساعت دن یا رات کو بندوق اڑائے تاکہ مقابلۂ کفار میں بندوق لگاتے وقت آنکھ نہ جھپکے تو وہ عابد اس مجاہد کے مرتبے کو ہرگز نہ پہنچے گا۔"

مزید فرمایا:

"اور وہ کام (سلوک) اس وقت کا ہے جب اس کام (جہاد) سے فارغ البال ہو، اور اب جو پندرہ سولہ روز سے دوسرے انوار کی ترقی نماز یا مراقبے میں زیادہ معلوم ہوتی ہے وہ اسی کاروبار کے طفیل سے ہے۔ کوئی بھائی جہاد کی نیت سے تیراندازی کرتا ہے، کوئی بندوق لگاتا ہے، کوئی پھری گدکا کھیلتا ہے، کوئی ڈنڑ پیلتا ہے۔ اگر ہم اس کی (یعنی سلوک کی) اس وقت تعلیم کریں تو ہمارے بھائی لوگ کام سے جاتے رہیں۔"

پھر مولوی محمد یوسف پھلتی سے مخاطب ہوئے:

"یوسف جی! آپ اپنے ہی حال کا خیال کریں کہ گردن ڈالے عالمِ سکوت میں رہتے ہو۔ اسی طرح اور لوگ بھی۔ کوئی کمبل اوڑھے مسجد کے کونے میں بیٹھا ہے، کوئی چادر لپیٹے حجرے میں گھسا ہوا ہے، کوئی جنگل میں جا کر مراقبہ کرتا ہے۔ کوئی ندی کے کنارے گڑھا کھود کر بیٹھ جاتا ہے۔ ان صاحبوں سے تو جہاد کا کام ہونا دشوار ہے۔ آپ ہمارے بھائیوں کو سمجھائیں کہ اب اسی کام (استعدادِ جہاد) میں دل لگائیں۔ ان کے واسطے بہتر یہی ہے۔ حاجی

---

[1] تواریخ عجیبہ صفحہ ۲۳

عبدالرحیم صاحب سے بھی شورہ کرکے جواب دیجئے۔"

جہاد سے پہلے مصلحتِ حج

سید صاحبؒ کے تبلیغی اور اصلاحی دوروں کی ساری تفصیلات (جو اب تک میسر آسکیں) ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رام پور میں افغانوں کی زبانی مسلمانانِ پنجاب پر لرزہ خیز مظالم کی تفصیلات سننے سے قبل سید صاحبؒ نے اپنے ارادت مندوں کو کبھی جہاد کی ترغیب نہ دی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے قبل آپ سکھوں کی بربریت اور مسلم کشی سے بے خبر تھے۔ پنجاب و سرحد کے مسلمان جن حالات سے گزر رہے تھے سید صاحبؒ کو ان حالات کا علم ہو چکا تھا لیکن اس صورتِ حال کے تدارک کے لئے ضروری تھا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں دورے کرکے پہلے مسلمانوں کی دینی روح کو بیدار کیا جاتا۔ انھیں ان کے حقیقی مقام سے روشناس کرایا جاتا۔ جب ان کا جذبۂ اسلامی جاگ اٹھتا اس کے بعد انھیں جہاد کے لئے تیار کیا جاتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے قبل آپ کی مساعی کا رُخ مسلمانوں کی اخلاقی، سماجی اور دینی اصلاح کی طرف تھا۔ اس طرح آپ ایسے پاک نفوس کی ایک جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو دین کی سربلندی کی خاطر آپ کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے دیوانہ وار دوڑ پڑے۔ جب یہ جماعت تیار ہوگئی اور ادھر رام پور میں افغانوں نے آپ کو ایک ایسا دردناک واقعہ سنایا جس نے آپ کی دینی غیرت و حمیت کے لئے چیلنج کا کام کیا تو آپ نے ذکر و فکر اور اشتغال و وظائف پر جہاد کو ترجیح دی اور اپنے ارادتمندوں کو حکم دیا کہ وہ اپنا زیادہ وقت فنونِ جنگ کی تربیت پر صرف کریں۔ اگر غور کیا جائے تو یہ راز بھی کھل جاتا ہے کہ اپنے ارادتمندوں کو تیاریٔ جہاد کی تحریک کرنے کے بعد حج بیت اللہ کی تیاری بھی اسی لئے تھی کہ آپ جہاد کے لئے روانہ ہونے کا عزم فرما چکے تھے اور آپ کا خیال تھا کہ میدانِ جنگ میں غازی بننے کے ساتھ ساتھ شہادت سے سرفراز ہونے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ اس لئے آپ چاہتے تھے کہ جہاد سے پہلے یہ فرض بھی ادا کر لیا جائے "تاکہ اگر میدانِ جہاد میں خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوں تو حج بیت اللہ کی سعادت سے محروم نہ ہو جائیں اور یہ فرض بھی ادا ہو چکا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ حج عالمِ اسلام کی ایک کانفرنس ہوتی ہے جس میں دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے ہیں۔ سید صاحبؒ اپنے اس بلند اور پاکیزہ مقصد کے لئے تبادلۂ خیال کرنے اور عالمِ اسلام کا تعاون حاصل کرنے کے لئے بھی حجازِ مقدس جانا ضروری سمجھتے تھے[1]۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حج سے واپسی کے بعد سید صاحبؒ نے اپنی تمام کوششیں جہاد پر مرکوز کر دیں۔ اس مقصد کے لئے آپ نے اپنے نائبینِ خاص شاہ اسمٰعیلؒ اور مولانا عبدالحیؒ کے مشورے سے متعدد داعی مختلف شہروں کو روانہ کئے تاکہ وہ لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیں اور جو لوگ خود اس مہم میں شامل نہ ہو سکیں

---

[1] سید احمد شہید صفحہ ۱۴۰ - ۱۴۱ ایک بدایونی مولف نے اپنی کتاب میں حضرت سید صاحبؒ پر یہ لغو اور مہمل اعتراض بھی کیا ہے کہ آخر جہاد جیسے اہم فرض کو نظر انداز کرکے حج کے لئے جانے میں کیا مصلحت تھی۔ مندرجہ بالا تصریحات سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ حضرت سید صاحبؒ نے جہاد پر حج کو کیوں ترجیح دی۔ (مولف)

ان سے مالی امداد حاصل کریں۔ خود آپ نے بھی سَو سوا سو عقیدت مندوں کے ساتھ دورہ کیا اور لوگوں کو فریضۂ جہاد کی اہمیت و ضرورت سے آگاہ کیا۔

سفرِ جہاد

دو سال کے قریب آپ نے جہاد کی تیاریوں میں صرف کئے اور ۷، جمادی الثانی ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۷، جنوری ۱۸۲۶ء کو آپ اس مقدس مہم پر روانہ ہوئے۔ اپنے لشکر کو آپ نے پانچ حصّوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کا ایک امیر مقرر کیا۔ مقدمۃ الجیش کی قیادت حضرت شاہ اسمٰعیلؒ صاحب کو تفویض ہوئی۔ سید صاحبؒ قلبِ لشکر میں تھے۔ اس دستے کی قیادت محمد یوسفؒ پھلتی کر رہے تھے۔ رائے بریلی سے روانہ ہو کر مجاہدین کا یہ قافلہ دلمو، فتح پور، جالون ہوتا ہُوا گوالیار پہنچا۔ یہاں آپ نے دو ہفتہ قیام فرمایا۔ مہاراجہ گوالیار کی فوج کے مسلمان سالار غلام حیدر خاں ٹونک کے زمانے سے آپ کے عقیدت مند تھے۔ غلام حیدر خاں کی وجہ سے گوالیار کے راجہ نے سید صاحبؒ کے ساتھ نہایت اعزاز و اکرام کا سلوک کیا۔ کئی بار شاہانہ ضیافتیں کیں۔ سچے موتیوں کا بیش قیمت ہار اور دو زرکار چغے تحفے کے طور پر پیش کئے۔ گوالیار سے روانہ ہو کر سید صاحبؒ قرولی، خوشحال گڑھ، دانتوئی، ڈھاڑی اور رجھلائی ہوتے ہوئے ٹونک پہنچے۔ حاکم ریاست ٹونک نواب امیر خاں کو آپ کی تشریف آوری کی اطلاع ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ کی آمد سے قبل ہی نواب کی طرف سے آپ کے قیام کا شاہانہ انتظام کیا گیا۔ نواب اور ولی عہد (نواب وزیر الدولہ) دونوں حاضرِ خدمت ہوئے۔ ایک ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ نواب نے سید صاحبؒ کو اپنا مہمان رکھا۔ نواب ہی کی تحریک پر سید صاحبؒ نے اپنی دونوں بیویوں کو وطن سے ٹونک بلوا لیا اور نواب نے ان کے قیام اور جملہ ضروریات کی کفالت کی ذمہ داری قبول کی تاوقتیکہ سرحد پہنچ کر آپ کے مستقل قیام کی کوئی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ ٹونک کے دورانِ قیام میں نواب اور ولی عہد دونوں نے سید صاحبؒ کی بیعت کی۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں نے سید صاحبؒ کی اطاعت کا جُوا اپنے کندھے پر رکھا جن کی تعداد کا صحیح علم نہ ہو سکا۔ نواب وزیر الدولہ نے "خلائقِ لاتعداد" کے الفاظ لکھے ہیں۔[1] جب سید صاحبؒ کا قافلہ ٹونک سے روانہ ہوا تو نواب امیر خاں اور ولی عہد ریاست نواب وزیر الدولہ دونوں نے چار کوس تک مشایعت کی۔

سندھیوں کی عقیدت

ٹونک سے چل کر سید صاحبؒ کا قافلہ اجمیر کے راستے سندھ میں داخل ہُوا۔ اس راستے میں سید صاحبؒ اور

---

[1] وصایا الوزیر صنا۱ حصّہ دوم مؤلفہ نواب وزیر الدولہ حکمران ریاست ٹونک۔

آپ کے ساتھیوں کو بڑے ہولناک مصائب برداشت کرنا پڑے۔ جگہ بہ جگہ خاردار جنگل اور حدِ نگاہ تک ریت کے میدان تھے۔ پانی اگر کہیں ملتا بھی تو اتنا نمکین کہ جانور بھی نہ پیتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس سفر کا ایک خوشگوار پہلو یہ تھا کہ راستے کے بعض مقامات پر لوگ جوق در جوق سید صاحبؒ کی زیارت کے لئے آئے اور ہزاروں افراد نے آپ کی بیعت کی۔ ان سندھیوں میں سے بہت سے لوگ آپ کے ساتھ جہاد میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے اور اثنائے جہاد میں جامِ شہادت نوش کیا۔ سندھ میں سید صاحبؒ جن مقامات سے گزرے ان میں سے کھاوڑہ، کارو، میرپور، ٹنڈو، الہیار، ٹنڈو جام اور حیدر آباد خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ امیرانِ سندھ (خاندانِ تالپور) اور حیدر آباد کے حکام نے سید صاحبؒ کا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ امراء نے تحائف پیش کئے اور سید صاحبؒ اور آپ کے اہلِ قافلہ کی پُر تکلف ضیافتیں کیں۔ حیدر آباد سے چل کر سید صاحبؒ کا قافلہ ہالہ، کوٹ سیدو، لالوکوٹ، ہنگوجہ اور پیر گوٹھ ہوتا ہوا دریائے سندھ کو عبور کر کے شکارپور پہنچا۔ حاکمِ شکارپور میر اسماعیل کے فرزند میر کاظم اور علمائے شکارپور نے سید صاحبؒ کا نہایت پُر تپاک استقبال کیا۔ شکارپور کے دورانِ قیام میں عید الاضحیٰ آ گئی۔ اہلِ شکارپور کی استدعا پر نمازِ عید سید صاحبؒ نے پڑھائی۔ روانگی کے وقت حاکمِ شکارپور نے سید صاحبؒ کی خدمت میں ایک سانڈنی بطور تحفہ پیش کی۔ اسی سانڈنی پر آپ نے کابل تک سفر کیا۔[1]

سندھ کے دورانِ سفر میں سید صاحبؒ کو اس علاقے کی مشہور روحانی شخصیت یعنی سید صبغۃ اللہ شاہ (پیر پگاڑو) نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ پیر صاحب اپنے عہد کے نہایت فاضل اور حریت پسند بزرگ تھے سندھ میں انہیں نہایت عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ بھی سید صاحب کی طرح سکھوں کے روز افزوں ظالمانہ اقتدار پر سخت مضطرب تھے۔ رانی پور کے دورانِ قیام میں سید صاحبؒ کی پیر پگاڑو سے پہلی ملاقات ہوئی اور پھر پیر صاحب کے مستقر "پیر گوٹھ" میں تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ انھوں نے سید صاحبؒ کے ساتھ نہایت محبت آمیز سلوک کیا۔ تین روز تک سید صاحبؒ اور آپ کے قافلے کی ضیافت کی۔ اس کے علاوہ سکھوں کے خلاف جہاد میں اپنے تعاون کا پورا یقین دلایا بلکہ بعد میں ایک موقع پر تو وہ اپنے مریدوں کا ایک جیش لے کر سید صاحبؒ کی امداد کے لئے روانگی کی غرض سے تیار بھی ہو گئے مگر ایران و افغانستان کے درمیان کشیدگی پیدا ہو جانے کی وجہ سے راستے سفر کے قابل نہ رہے تھے، اس لئے اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ سید صاحبؒ پیر پگاڑو پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ ایک موقع پر جب آپ نے محسوس کیا کہ شاید آئندہ جنگ ان کے لئے پیغامِ شہادت لے آئے تو انھوں نے پیر صاحب کو یہ وصیت لکھ کر بھیج دی کہ میرے شہادت پا جانے کے بعد اہل و عیال کو حجازِ مقدس بھیج دیا جائے۔

---

[1] تواریخ عجیبہ ص ۲۱۸

بلوچستان اور افغانستان کا سفر

شکار پور سے روانہ ہو کر سید صاحب کا قافلہ جاگن، خان گڑھ، پھتر، شور، حاجی اور ڈھاڈر ہوتا ہوا درۂ بولان میں داخل ہوا۔ یہاں سے چل کر کوئٹہ میں قیام کیا۔ اب تک کے اس طویل سفر میں یہ سفر سب سے زیادہ خطرناک اور تکلیف دہ تھا۔ ہولناک جنگل، دشوار گزار پہاڑ، قیامت کی گرمی، مہلک لو اور قدم قدم پر ڈاکو۔ خصوصاً درۂ بولان کا راستہ تو قدم قدم پر موت کو دعوت دیتا تھا مگر سید صاحبؒ اور آپ کے اہل قافلہ نے یہ صعوبتیں کمال خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ کوئٹہ میں بھی سید صاحبؒ کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ والیٔ شہر نے حاضر ہو کر بیعت کی۔ ہر روز ضیافت کرتا۔ بلوچ عوام نے بھی آپ کے ساتھ بہت اخلاص و محبت کا سلوک کیا۔ سید صاحبؒ کی روانگی کے وقت حاکم شہر سواروں کی ایک جمعیت کے ساتھ تین کوس تک ساتھ گیا اور دعا کی درخواست کی۔ کوئٹہ سے چل کر آپ سدوزئی، چوکی، قلعہ حاجی، کاریز اور خوشاب ہوتے ہوئے قندھار میں داخل ہوئے۔ یہاں کے معززین و علماء اور عوام الناس کے جم غفیر نے شہر سے کئی میل باہر آکر آپ کا استقبال کیا۔ قندھار میں سید صاحبؒ چھ روز مقیم رہے۔ ہر روز کثیر تعداد میں لوگ آکر آپ کی زیارت اور بیعت کرتے۔ آپ کی روانگی کے بعد اہل قندھار کا ایک قافلہ جو چار سو افغانوں پر مشتمل تھا آپ کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا اور راستے میں آپ سے جا ملا۔

قندھار سے روانہ ہو کر سید صاحبؒ قلعہ اعظم خاں، شہر صفا، کوزم، یشم زئی اور رشکئی ہوتے ہوئے غزنی پہنچے۔ یہاں بھی لوگوں کی کثیر تعداد نے آپ کا استقبال کیا۔ حاکم غزنی بھی ملاقات کی غرض سے آپ کی قیام گاہ پر آیا۔ غزنی ہی کے دوران قیام میں حاکم کابل کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ چنانچہ آپ کابل روانہ ہو گئے۔ حاکم کابل سلطان محمد خاں اور اس کے بھائی پچاس سوار لئے دروازۂ شہر پر استقبال کے لئے موجود تھے۔ سید صاحبؒ کو قریب آتا دیکھ کر گھوڑوں سے اتر پڑے اور بغل گیر ہوئے۔ اپنے معمول کے خلاف سید صاحبؒ کابل میں عرصے تک مقیم رہے اور یہاں کے عوام الناس کو جہاد میں شرکت کی ترغیب دیتے رہے۔ سرداران کابل کے اختلافات دور کرانے کی بھی آپ نے نہایت مخلصانہ کوشش کی مگر اس کوشش میں آپ کو کامیابی نہ ہوئی۔ آپ کے ایک تذکرہ نگار کا بیان ہے کہ "چہل و پنج روز دراں بلدہ قامت نمود"[1] یعنی آپ نے اس شہر میں ڈیڑھ ماہ گزارا تاکہ اکابر شہر میں اتحاد کی صورت پیدا ہو جائے۔ آخر کار ماحول کو ناسازگار دیکھ کر آپ کابل سے روانہ ہو گئے۔ روانگی کے وقت حاکم کابل سلطان محمد خاں نے گھوڑے اور نقد رقم بھی نذر کی۔

---

[1] منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ و الشہداء صفحہ ۱۰۱۔ مولفہ سید جعفر علی نقوی۔

قیام چارسدہ

کابل سے چل کر سید صاحبؒ پشاور پہنچے۔ یہ سفر پانچ روز میں تمام ہوا۔ پشاور میں تین یا چار روز قیام کر کے آپ عازمِ چارسدہ ہو گئے۔ پشاور سے چارسدہ تک متعدد مقامات پر افغانوں حتیٰ کہ ان کی خواتین نے بھی سید صاحبؒ کی راہ میں آنکھیں بچھائیں۔ جس اونٹ پر آپ سوار تھے اس کی جھالر کے تار تک لوگوں نے جوشِ عقیدت سے مغلوب ہو کر نکال لئے اور بطور تبرک اپنے ساتھ لے گئے۔ ایسے مناظر بھی دیکھنے میں آئے کہ جس اونٹ پر سید صاحبؒ سوار تھے لوگ اس کے قدموں کے نیچے کی مٹی اٹھا اٹھا کر اپنی آنکھوں سے مل رہے تھے[۱]۔

چارسدہ پہنچ کر علاقہ ہشت نگر کا حاکم سید محمد خاں حاضرِ خدمت ہوا اور سید صاحبؒ کی بیعت کی۔ چارسدہ اور مضافات کے افغان اس کثرت سے زیارت و بیعت کے لئے آئے کہ فرداً فرداً بیعت لینا ناممکن ہو گیا۔ تب سید صاحبؒ نے ایک لمبا کپڑا پھیلا دیا جس کا ایک سرا آپ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور باقی حصہ حاضرین نے پکڑ لیا۔ اس طرح آپ نے ارادت مندوں کے اس جمِ غفیر سے بیعت لی۔ بیعت کے لئے آنے والوں کی اکثریت اظہارِ عقیدت کے طور پر مٹھائی ضرور ساتھ لاتی تھی۔

چارسدہ میں سید صاحبؒ کی سب سے بڑی مصروفیت یہ تھی کہ لوگوں میں وعظ و تلقین فرماتے۔ اسلام کی حقیقی تعلیم اور جہاد کی اہمیت سے آگاہ فرماتے۔ چارسدہ کے علاوہ مضافات میں بھی آپ نے اصلاحِ اخلاق اور تبلیغِ جہاد کے لئے دورے کئے۔

سید صاحبؒ چارسدہ میں تھے کہ رنجیت سنگھ کو آپ کے عزمِ جہاد کی اطلاع ہو گئی اور اس کے حکم سے سکھ فوج کا مشہور جرنیل سردار بدھ سنگھ دس ہزار لشکر کے ہمراہ منزلیں مارتا اکوڑہ کے قریب پہنچ کر خیمہ زن ہو گیا[۲]۔ ادھر اکوڑہ کا رئیس اور خٹک قبیلے کا سردار امیر خاں سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کی بیعت کی اور عرض کیا کہ بدھ سنگھ علاقہ سمہ میں جدال و قتال کرنے کی غرض سے آیا ہے اور دریائے لنڈہ کے اس پار خیمہ زن ہے۔ میری رائے میں قبل اس سے کہ وہ پیش قدمی کرے لشکرِ اسلام کو دریائے لنڈہ عبور کر کے اس کی پیش قدمی روک

---

[۱] تواریخ عجیبہ صفحہ ۹۶

[۲] یہ روایت تواریخ عجیبہ کے مصنف نے درج کی ہے مگر بعض اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چارسدہ کے رئیس امیر خاں اور اس کے بھتیجے خواص خاں میں عداوت تھی۔ خواص خاں اپنے چچا کو زک دلوانے اور اس کی سرداری خاک میں ملانے کے لئے سردار بدھ سنگھ کو بلا لایا تھا۔ سید صاحبؒ کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو سکھ فوج کے ہاتھوں ذلیل کرائے اس لئے آپ نے اپنے لشکر کو پیش قدمی کا حکم دیا اور جنگ اکوڑہ پیش آئی۔ (مولف)

دینا چاہئے۔ سید صاحبؒ نے سردار امیر خاں کی رائے پسند کی اور چارسدہ سے روانہ ہو کر خویشگی پہنچے، وہاں کچھ عرصہ قیام کر کے نوشہرہ روانہ ہوئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بدھ سنگھ اکوڑہ میں داخل ہو گیا ہے اور لشکرِ اسلام پر حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے۔

بدھ سنگھ کے نام سیّد صاحبؒ کا خط

چارسدہ کے دورانِ قیام میں جب سیّد صاحبؒ کو پہلی بار سردار بدھ سنگھ کی آمد کی خبر ملی تو آپ نے اتمامِ حجت کے طور پر اسے ایک خط لکھا جس میں اس کے سامنے چند شرائط رکھیں:

۱۔ یا تو تم اسلام قبول کر لو۔ اس وقت ہمارے برابر ہو جاؤ گے اور ہم بجائے جنگ و جدال کے ہر طرح سے تمہاری اعانت کریں گے۔ جبراً کسی کو داخلِ اسلام کرنے کا حکم نہیں ہے۔ اگر بخوشی تم کو اسلام منظور ہو تو:۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تم اپنے دین و مذہب پر قائم رہ کر ہماری اطاعت کر کے جذیہ دینا قبول کرو۔ اس حالت میں بھی جب تک تم مطیع رہو گے ہم تمہارے جان و مال کی حفاظت مثل اپنے جان و مال کے کریں گے۔

۳۔ اور اگر یہ دونوں امور مذکورہ بالا تم کو منظور نہ ہوں تو پھر جنگ کے واسطے تیار ہو جاؤ اور یہ بھی یاد رکھو کہ ہم اس وقت تعداد میں تھوڑے ہیں مگر ملکِ یاغستان اور سارا ہندوستان راہِ خدا میں جان دینے کو تیار ہے اور ہم لوگ موتِ شہادت کو ایسا دوست رکھتے ہیں جیسا تم شراب[1] کو"

جنگِ اکوڑہ

سیّد صاحبؒ کی اس تنبیہ کا سردار بدھ سنگھ پر کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ وُہ طاقت کے نشے میں چُور تھا۔ بہر حال نوشہرہ پہنچ کر سید صاحبؒ نے اہل الرائے اصحاب کے مشورے سے ہر جماعت میں سے چاق و چوبند اور دلیر افراد کو منتخب کر کے ایک لشکر مرتب فرمایا جو نو سو آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اللہ بخش خاں جمعدار کو اس کا کمانڈر مقرر کیا اور اپنی دستارِ مبارک ان کے سر پر بندھوائی۔ نصف شب کے بعد یہ لشکر دریائے لنڈہ عبور کر کے سکھوں کی لشکرگاہ پر جا پڑا۔ سکھوں نے اپنی لشکرگاہ کو خاردار تاروں سے محفوظ کر لیا تھا مگر یہ حفاظتی انتظامات کچھ کام نہ آئے اور مجاہدین نعرۂ تکبیر بلند کر کے سکھوں پر ٹوٹ پڑے۔ لشکرگاہ کے محافظ سنتری نے فائر کیا اور گولی شیخ باقر علی عظیم آبادی کے لگی، وہ زخم کھا کر گر گئے اور شہید ہو گئے۔ سلسلہ جہاد کی اس پہلی جنگ کے یہ پہلے شہید تھے۔ نعرۂ تکبیر کا شور سن کر سکھ سپاہی تلواریں سونت سونت کر مقابلے پر آ گئے۔ مجاہدوں نے خوب خوب دادِ شجاعت دی۔ ایک شیر دل

---

[1] تواریخ عجیبہ صفحہ ۹۰

جماعت نے اس بے جگری سے یورش کی کہ سکھوں کے توپچی گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور توپ خانہ مجاہدوں کے قبضے میں آ گیا۔ جنگ کا یہ نقشہ دیکھ کر سردار بدھ سنگھ میدان سے بھاگ نکلا اور موضع اکوڑہ میں جا کر دم لیا۔ اس کے بھاگتے ہی ہر طرف بھاگڑ پڑ گئی اور جس سکھ کا جدھر منہ اٹھا بھاگ نکلا۔ اس اثناء میں مقامی لوگوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ اس خوف سے کہ کہیں ان سے اس مال غنیمت میں سے حصہ نہ طلب کیا جائے۔ وہ مال لے لے کر بھاگنے لگے۔ ان کی اس بھاگم بھاگ سے مجاہدین کے لشکر کی ترتیب متاثر ہوئی۔ اسی دوران میں سردار بدھ سنگھ نے اکوڑہ پہنچ کر نقارہ بجوانا شروع کر دیا۔ نقارہ کی آواز سن کر بھاگتے ہوئے سکھ واپس آنے لگے۔ اس طرح سکھ دوبارہ منظم ہو گئے اور انھوں نے مجاہدین پر بندوقوں کی باڑھیں مارنا شروع کیں۔ اس حملے میں صف اوّل کے کچھ شیر دل مجاہد شہید ہو گئے۔ سردار بدھ سنگھ پر مجاہدین کی شجاعت اور پامردی کا ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ اکوڑہ میں بھی نہ ٹھہرا بلکہ تین میل اور پیچھے جا کر سیدو نامی گاؤں میں جا اترا۔[۱] اس کے ساتھ ہی سکھ بھی میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے اور سیدو میں جا کر اپنی از سرِ نو تنظیم شروع کی۔[۲]

اب صبح کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے اس لئے مجاہدین نے نہایت سرعت سے سکھوں کی لشکر گاہ کی خار بندی عبور کی اور دریائے لنڈہ سے گزر کر دوسرے کنارے پر پہنچ گئے جہاں سید صاحبؒ نہایت بے قراری سے ان کے منتظر تھے۔ مجاہدین اور سکھوں کے درمیان سلسلۂ جہاد کا یہ پہلا معرکہ ۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء کو ہوا۔ اس میں ۳۶ یا ۳۷ مجاہد ہندوستانی اور ۴۶ قندھاری شہید ہوئے اور سات سو سکھ قتل ہوئے۔[۳] جنگ اکوڑہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مجاہدین کی اس شجاعانہ یورش سے سکھوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ ان پر مجاہدین کا رعب قائم ہو گیا۔ خود مجاہدین کے حوصلے اس جنگ نے بڑھا دیئے۔ انھیں جنگ کی عملی تربیت کا موقع ملا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ بدھ سنگھ چارسدہ اور اس کے مضافات کو تاراج کرنے اور اس علاقے پر سکھ حکومت کا پرچم لہرانے کا جو عزم لے کر آیا تھا اس میں بری طرح ناکام ہُوا اور یہ علاقہ سکھوں کی غارت گری سے محفوظ ہو گیا۔

جنگِ حضرو

مجاہدین کا سکھوں سے دوسرا مقابلہ حضرو میں ہُوا۔ یہ مقام دریائے سندھ سے سات میل دور ضلع کیمبل پور میں واقع ہے اور اس زمانے میں اس پر سکھوں کا قبضہ تھا۔ سید صاحبؒ کا ارادہ اس جنگ میں حصہ لینے کا نہ تھا کیونکہ جنگِ اکوڑہ میں اگرچہ میدان مجاہدین کے ہاتھ رہا تھا مگر ان کے بعض قیمتی افراد اس لڑائی میں شہید ہو گئے تھے۔ دوسرے حضرو میں کسی باقاعدہ جنگ کا منصوبہ مرتب نہیں کیا گیا تھا بلکہ افغانوں نے اس علاقہ پر شبخون مارنے اور

[۱] تواریخ عجیبہ ص ۹۹ [۲] حیات طیبہ ص ۱۰۱ [۳] حیات طیبہ میں سکھ مقتولوں کی تعداد ڈھائی ہزار بتائی گئی ہے۔ ص ۱۰۱

مال ومتاع پر قبضہ کرنے کی اسکیم بنائی تھی جو سید صاحبؒ کے مزاج اوران کے مقاصد کے مطابق نہ تھی اس لئے انھوں نے افغانوں سے معذرت کردی۔ البتہ آپ کے لشکر میں شریک افغانیوں میں سے چھیالیس[1] افراد نے سید صاحبؒ سے اجازت حاصل کرلی۔ آپ نے اس شرط پر اجازت دی کہ ان کے ہاتھ سے کسی مسلمان کو نقصان نہ پہنچے۔ رات کو افغان بلائے ناگہانی کی طرح سکھوں پر جاگرے اور پہلے ہی حملے میں ان کی گڑھی پر قبضہ کرلیا۔ سکھوں کی ایک توپ بھی ان کے قبضے میں آگئی۔ یہ حملہ آور اور گڑھی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہونے والے سید صاحبؒ کے لشکر کے وہی قندھاری تھے جو آپ کی اجازت سے اس شبخون میں شریک ہوئے تھے۔ جن سکھوں نے مجاہدین کا مقابلہ کیا وہ مارے گئے اور افغانوں نے حضرو کے مہاجنوں کو خوب لوٹا کہ یہاں کی تجارت انہی کے قبضے میں تھی۔ مالِ غنیمت کی گٹھڑیاں باندھ کر افغان حضرو سے روانہ ہوگئے۔ دریائے سندھ کے قریب پہنچ کر سکھوں کا ایک دستہ ان کے تعاقب میں آپہنچا۔ اس کے بعد ہی پانچ سو سواروں اور پیادوں کا ایک اور سکھ لشکر آگیا جس کے ساتھ توپیں بھی تھیں۔ انھوں نے افغانوں پر اندھادھند گولیاں چلائیں اور توپوں سے گولے پھینکنے شروع کردیئے۔ سید صاحبؒ کے قندھاریوں نے قریب کی ایک نہر میں پوزیشن لے کر سکھوں کا مقابلہ شروع کردیا مگر مقامی باشندے مقابلہ کرنے کی بجائے مالِ غنیمت لے کر بھاگے۔ اس افراتفری میں کچھ تو صحیح سلامت مع مال واسباب بچ نکلے اور کچھ دریائے سندھ میں ڈوب گئے۔ کچھ سکھوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ یہ صورت دیکھ کر سید صاحبؒ نے اپنے مجاہدین کو حکم دیا کہ فوراً سکھوں کے مقابلے پر پہنچ جاؤ۔ چنانچہ سید انور شاہ امرتسری کی قیادت میں مجاہدین کا ایک دستہ قندھاریوں کی امداد کے لئے پہنچ گیا جو اپنے مورچوں میں بیٹھے سکھوں سے بڑی بہادری سے جنگ کررہے تھے۔ ہنڈ کا رئیس سردار خادے خاں بھی جو چند روز قبل سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت کرچکا تھا پچاس ہندوستانی مجاہدین کو لے کر سکھوں کے مقابلے میں پہنچ گیا۔ غرض قندھاری مجاہد، سید انور شاہ امرتسری کی زیر قیادت دستے اور خادے خاں کی زیر امارت ہندوستانی غازی اس بہادری سے لڑے کہ سکھ فوج شکست کھاکر میدان جنگ سے فرار ہوگئی اور اس کے کثیر آدمی مجاہدوں کی شمشیر آبدار کا نشانہ بنے۔ اس جنگ میں مجاہدین میں سے دو آدمی شہید ہوئے، ایک برکت اللہ بنگالی اور دوسرے حیات خاں بریلوی۔

سیّد صاحبؒ کی امامت کا اعلان

اس شبخون میں افغانوں نے لاکھوں روپیہ کا جو مالِ غنیمت لوٹا تھا وہ انھوں نے کسی اصول کے تحت تقسیم نہیں کیا اور جو کچھ جس کے ہاتھ لگا لے کر چلتا بنا۔ حالانکہ اس مال میں قندھاریوں کو بھی حصہ ملنا چاہیئے تھا کیونکہ انھوں نے

[1] تواریخ عجیبہ صنا

ہی اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر سکھوں کی گڑھی پر قبضہ کیا تھا اور سکھوں سے جدال و قتال میں مصروف ہوئے تھے۔ اس طرح افغانوں کو اطمینان سے لوٹ مار کا موقع ملا تھا اس لئے وہ اس مال غنیمت میں حصہ پانے کے سب سے زیادہ حقدار تھے۔ ہُنڈ کے رئیس خادی خاں نے کوشش کی کہ مالِ غنیمت موافقِ حکمِ شرع تقسیم ہو مگر افغانوں نے بے تجویز زمانی اور خودسری کا مظاہرہ کیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ہر شخص نے محسوس کیا کہ نتیجہ ہے تنظیم کے فقدان اور واجب التعظیم امیر کے نہ ہونے کا۔ چنانچہ علماء کے مشورے اور افغان سرداروں کی تائید سے فیصلہ کیا گیا کہ سید صاحبؒ کو امام بنا لیا جائے تاکہ مالِ غنیمت کی تقسیم، جنگ وامن کے معاملات اور احکامِ شرعی کے نفاذ میں کوئی دشواری پیش نہ آئے اور ہر کام ایک تنظیم اور اصول کے تحت ہو۔ اس فیصلے کے مطابق ہُنڈ میں ۱۲۔ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۱۔ جنوری ۱۸۲۷ء کو سید صاحبؒ کی بیعتِ امامت وخلافت ہوئی۔ افغان رؤسا، سادات کرام، علمائے عظام، مشائخ ذوی الاحترام اور عوام نے جوق در جوق سید صاحبؒ کی بیعت کی۔ اس دن سے آپ کو امیر المومنین کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ جمعہ میں آپ کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ خطوط کے ذریعے دُور ونزدیک آپ کی امامت وخلافت کی اطلاع بھیجی گئی۔ سردارانِ پشاور سردار یار محمد خاں، سردار سلطان محمد خاں اور سردار پیر محمد خاں نے بھی سید صاحبؒ کی امامت وخلافت قبول کر لی اور خطوط کے ذریعے اپنی اطاعت اور نیازمندی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ہی سردارانِ پشاور لشکر کثیر اور توپیں لے کر بمقام سرمائی مضافات نوشہرہ پہنچے اور سید صاحبؒ کو اطلاع بھیجی کہ ہم آپ کی تائید ونصرت کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ مل کر سکھوں سے جنگ کیجیے یہ خبر سُن کر سید صاحبؒ نے سردار خادے خاں اور سردار اشرف خاں کو ہدایت کی کہ سردارانِ پشاور کے پاس جا کر گفتگو کریں۔ ان کے ساتھ آپ نے پانچ سو مجاہدین کا لشکر بھی بھیج دیا۔

ایک اور جھڑپ

حضرو میں شکست کھانے کے بعد سردار بدھ سنگھ نے سید صاحبؒ کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ اکوڑہ اور حضرو میں آپ نے شبخون مار کر ہمیں نقصان پہنچایا۔ یہ شیوۂ مردانگی نہیں۔ اگر آپ حقیقی سید ہیں تو میدان میں نکل کر دو بدو جنگ کیجیے۔ اس کے جواب میں سید صاحبؒ نے سردار بدھ سنگھ کو لکھا کہ میرا مدعا نہ تو اپنی شجاعت کا مظاہرہ کرنا ہے اور نہ مجھے ہوسِ ملک گیری ہے۔ میرا مقصد صرف اسلام کی نصرت میں دل وجاں سے مصروف رہنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مجھ سے جو کچھ ممکن ہوگا کروں گا اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس میں مصروف رہوں گا، خواہ کامیابی حاصل ہو یا شہادت پاؤں۔ جب تم اپنے حاکم کی اطاعت سے سرِ مو انحراف نہیں کرتے، حالانکہ وہ تم جیسا ایک انسان ہے تو میں اپنے احکم الحاکمین سے سرتابی کیسے گوارا کر سکتا ہوں جو ساری مخلوقات کا

خالق اور کل عالمین کا رب ہے۔

اس معقول اور مدلل خط کے جواب میں سردار بدھ سنگھ نے تین ہزار کا لشکر دریائے سندھ کے کنارے اتار دیا۔ چالاکی یہ کی کہ آٹھ دس توپیں بھی ہمراہ لایا مگر انھیں پوشیدہ رکھا تاکہ مجاہدین دھوکے میں رہیں۔ اس موقع پر افغان سردار اشرف خاں سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ اس لشکرِ کفار سے لڑنے کی اجازت مجھے عطا فرمایئے اور چند ہندوستانی مجاہدین کو برکت کی غرض سے میرے ساتھ کر دیجئے۔ سید صاحبؒ نے اسے اجازت دی اور بہت سے ہندوستانی مجاہد اس کی کمان میں دے دیئے۔ اس موقع پر شاہ اسمٰعیل صاحبؒ نے تجویز پیش کی کہ جب تک کشتیاں ہمارے قبضے میں نہ ہوں گی، کامیابی مشکل ہے۔ چنانچہ سید صاحبؒ کی اجازت سے کشتیوں کی نگرانی شاہ اسمٰعیلؒ کے ذمے ہوئی۔ جب افغانوں کا لشکر دریا کے وسط میں پہنچا تو سکھوں کے توپ خانے نے شدید گولہ باری شروع کر دی۔ افغان بندوقوں سے لڑنے کے عادی تھے اس لئے ان میں سے اکثر پسپا ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر شاہ اسمٰعیلؒ اور اشرف خاں نے مجاہدین کو للکارتے ہوئے غیرت دلائی اور خود بھی تیزی سے لشکر کی طرف دوڑ پڑے۔ افغان بھی سکھوں پر جا پڑے۔ اس دلیرانہ حملے سے سکھ گھبرا کر میدان سے بھاگ نکلے اور اپنی توپیں اور سامانِ جنگ بھی چھوڑ گئے۔ مجاہدین مالِ غنیمت لے کر اپنی لشکر گاہ میں مظفر و منصور واپس آئے[1] اس جنگ میں سید صاحبؒ کے ایک سندھی مجاہد سید متا شہید ہو گئے۔

جنگِ شیدو

سید صاحبؒ کی بیعت امامت اور سکھوں پر مسلسل فتح کے بعد صوبۂ سرحد کے عوام و خواص جوق در جوق آپ کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے اور دو ماہ سے بھی کم عرصے میں ۸۰ ہزار افغان سید صاحبؒ کے اشارے پر مرنے مارنے کے لئے ان کے گرد پروانہ وار جمع ہو چکے تھے۔ اسی اثناء میں سردار بدھ سنگھ تیس ہزار فوج لے کر شیدو کے مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ یہ جگہ اکوڑہ سے چار میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف واقع ہے۔ سید صاحبؒ اس وقت تک ہُنڈ میں مقیم تھے۔ بدھ سنگھ کی آمد کی خبر سن کر آپ اپنے لشکر کے ساتھ نوشہرہ پہنچ گئے یہاں سردارانِ پشاور نے نہایت گرم جوشی سے آپ کا استقبال کیا اور بظاہر بڑی نیاز مندی کا اظہار شروع کر دیا مگر یہ سب فریب ثابت ہوا اور بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لوگ درپردہ سکھوں سے ساز باز کر چکے تھے۔ آپ کے کھانے کا انتظام سردار یار محمد خاں نے اپنے ذمے لیا۔ جس روز صبح کو جنگ ہونی تھی اس شب معمول کے مطابق کھچڑی اور گنڈیریاں سید صاحبؒ کے لئے بھیجی گئیں۔ کھانا کھانے کے بعد آپ کی طبیعت بگڑنے لگی۔ صاف ظاہر تھا کہ

[1] حیات طیبہ ص۱۸۲، ص۱۸۳

آپ کو زہر دیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کو قے شروع ہو گئی اور غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ صبح کو جب لشکر آراستہ ہوا اور سید صاحبؒ کو کچھ ہوش آیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے سہارا دے کر ہاتھی پر سوار کرا دیا جائے۔ اسی حالت میں آپ کو میدانِ جنگ میں لایا گیا۔ آپ کو دیکھتے ہی لشکر اسلام میں بلا کا جوش پیدا ہو گیا اور قندھاری افغانوں، سمہ کے پٹھانوں اور ہندوستانی مجاہدوں نے بڑی بے جگری سے سکھ لشکر پر پے در پے حملے شروع کر دیئے مگر سردارانِ پشاور نے جنگ میں قطعاً سرگرمی نہ دکھائی بلکہ جب افغان سردار امیر خاں باجوڑی اور سید صاحبؒ کے ایک مرید گو دڑی شہزادہ نے اپنے مجاہدوں کے ساتھ سکھوں پر حملے کر کے انھیں تہِ تیغ کرنا شروع کیا اور ان کے توپچی توپیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تو عین اس وقت کہ سید صاحبؒ کا لشکر فتح سے ہمکنار ہونے والا تھا، سردارانِ پشاور نے اپنے گھوڑوں کی باگیں اٹھائیں اور اپنا لشکر لے کر میدانِ جنگ سے روانہ ہو گئے۔ کچھ دُور چل کر انہوں نے بے تحاشہ بھاگنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے لشکر میں سراسیمگی پیدا ہو گئی اور سردارانِ پشاور کی سازش کی وجہ سے جیتی ہوئی بازی شکست میں تبدیل ہو گئی۔ رنجیت سنگھ کے روزنامچہ نویسوں اور انگریز مصنفوں نے اس جنگ کے جو حالات قلم بند کئے ہیں ان میں صاف صراحت موجود ہے کہ جنگ شروع ہونے سے قبل ہی سردارِ پشاور یار محمد خاں اور بدھ سنگھ کے درمیان سازش ہو چکی تھی۔ سید صاحبؒ کو زہر دینا اور پھر عین اس وقت جب سید صاحبؒ کو فتح حاصل ہونے والی تھی سردار یار محمد خاں کا میدانِ جنگ سے فرار ہو جانا اسی سازش کے تحت تھا۔[۱]

دورِ عُسرت

جنگ شیدو میں ناکامی کے بعد مجاہدین کو سخت تکالیف و مصائب سے گزرنا پڑا۔ مولانا شاہ اسمٰعیلؒ کی ہوشیاری اور سُرعت کی بدولت سید صاحبؒ کو میدانِ جنگ سے بحفاظت نکال لیا گیا اور سردار اشرف خاں رئیس زیدہ نے اپنی نگرانی میں آپ کو دریائے سوات پار کرایا۔ اس کے بعد آپ کے جاں نثار آپ کو سوات کے مقام چنگلئی لے گئے۔ یہاں کے افغانوں نے آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی مہمان نوازی میں نہایت سرگرمی اور خلوص کا مظاہرہ کیا۔ آٹھ روز کے بعد سید صاحبؒ چلنے پھرنے کے قابل ہو سکے۔ اسی اثناء میں وہ مجاہدین بھی چنگلئی پہنچنا شروع ہو گئے جو جنگِ شیدو کے بعد منتشر ہو گئے تھے۔ پنجتار اور تورو سے بھی عقیدت مند آنے لگے۔ اس کے ساتھ تنگ دستی اور عسرت کا دور شروع ہوا۔ کپڑے، بستر، غلّہ، روپیہ، غرض سب کچھ لٹ چکا تھا۔ سوائے تن کے کپڑوں اور ہتھیاروں کے کسی کے پاس کچھ نہ تھا۔ کچھ عرصے کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ درختوں

---

[۱] عمدۃ التواریخ صفحہ ۳۴۰ حصہ دوم مولفہ سوہن لال

کی چھالیں ابال ابال کر کھانے لگے۔ دن بھر دھوپ میں گزر کرتے تھے اور شب کو سردی سے محفوظ رہنے کے لئے الاؤ کے گرد بیٹھ جاتے تھے[1]۔

شیدو کی جنگ میں نقصان عظیم اٹھانے کے بعد اگر کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار کر بیٹھ جاتا مگر سید صاحبؒ کا ضمیر کم ہمتی کی مٹی سے اٹھا ہی نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اللہ کی رحمت پر بھروسہ کر کے علاقہ یوسف زئی کا دورہ شروع کیا۔ آپ کی پرکشش شخصیت اور دل کش و اثر آفریں تقریروں نے علاقہ سوات کے افغانوں کو آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ انہوں نے جوق در جوق سید صاحبؒ کی بیعت کی۔ غیر اسلامی رسوم ترک کر دیں۔ احکامِ الٰہی کی پابندی کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیا اور ہزاروں افغانوں نے آپ کے ہاتھ پر سکھوں سے جہاد کرنے کا عہد کیا۔ اسی اثناء میں ہندوستان سے مجاہدین کے قافلے بھی پہنچنے لگے۔ ان میں مولوی قلندر علی، قاضی احمد اللہ میرٹھی، مولانا عبدالحیٔ اور میاں محمد مقیم رامپوری کے قافلے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر قافلے کے ساتھ نقد رقم کے علاوہ بندوقیں اور دوسرا سامانِ جنگ بھی تھا[2]۔ اسی دوران آپ نے پنجتار تشریف لا کر ہندوستان، افغانستان اور بخارا کے بادشاہوں، نوابوں اور سرداروں کو تبلیغی خطوط لکھے جن میں مسلمانانِ پنجاب و سرحد پر سکھوں کے انسانیت سوز مظالم کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد ان مسلمان سلاطین اور سرداروں کو تحریکِ جہاد میں حصہ لینے کی تحریک کی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے ہندوستان کے مختلف علاقوں مثلاً سندھ، مدراس، بنگال، یوپی، حیدر آباد دکن اور بمبئی میں اپنے داعی بھیجے تاکہ یہ لوگ وعظ و تلقین کے ذریعے ان علاقوں میں مجاہدین کی مالی اور افرادی قوت کی فراہمی کی کوشش کریں۔ "الدر المنثور" میں ہے کہ "سید صاحبؒ نے ترویج دینِ حق کے لئے مولوی سید محمد علی صاحب رام پوری اور مولوی ولایت علی عظیم آبادی کا انتخاب فرمایا اور ان دونوں بزرگوں کو خلافت دے کر جنوبی ہند کے لئے مامور کیا۔ مولانا ولایت علی صاحب سے یہ بھی فرمایا کہ مولانا ہم آپ کو تخم کر کے اٹھاتے ہیں۔ مولوی محمد علی صاحب مدراس روانہ ہوئے اور مولانا ولایت علی صاحب بمبئی اور حیدر آباد دکن کی طرف رہ گیر ہوئے"[3]۔ اسی دوران میں ضلع ہزارہ کے مختلف سرداروں کی طرف سے امداد کی درخواستیں پہنچیں ان لوگوں سے سکھوں کی جنگیں ہو رہی تھیں۔ چونکہ یہ واقعات ضلع ہزارہ میں پیش آئے اس لئے ان کا مختصر تذکرہ وہاں کیا جائے گا جہاں ضلع ہزارہ کے حالات بیان ہوں گے۔

سید صاحبؒ نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ترغیبِ جہاد کے سلسلے میں جو دعوت نامے بھیجے تھے ان کی بھی نہایت مخلصانہ پذیرائی ہوئی اور مجاہدین کے قافلے سید صاحبؒ کی خدمت میں پہنچنے لگے۔ ان میں ایک قافلہ سید صاحبؒ کے ہمشیر زادے سید احمد علی صاحب کی قیادت میں، دوسرا مولوی مظہر علی صاحب عظیم آبادی کی قیادت میں، تیسرا مولوی خرم علی صاحب بلہوری کی سرکردگی میں، چوتھا مولوی محمد علی رامپوری کی زیرِ امارت اور پانچواں

---

[1] حیاتِ طیبہ صفحہ ۱۸۵ [2] تواریخ عجیبہ صفحہ ۱۰۰ [3] الدر المنثور فی تراجم اہل صادق پور صفحہ ۱۱۲

مولوی محبوب علی صاحب دہلوی کی زیرِ سرکردگی سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ قافلہ چھ سو افراد پر مشتمل تھے۔[1] ان کے علاوہ بعض اور قافلے آئے جن کا تذکرہ مختلف کتابوں میں آتا ہے۔ ان میں سے مولوی محبوب علی صاحب کو اپنی ایمانی کمزوری اور عزیمت کے فقدان کی وجہ سے ٹھوکر لگی اور وہ چند افراد کو ساتھ لے کر واپس چلے گئے۔ ان کی واپسی کا تحریکِ جہاد پر ناخوشگوار اثر پڑا۔ بعض لوگ دل برداشتہ ہوئے۔ اکثر لوگ سست پڑ گئے اور ہندوستان سے بھی قافلوں کا آنا رُک گیا مگر سید صاحبؒ کے معاونین کی کوشش سے جلد ہی حالات سازگار ہو گئے۔ لوگ پھر سرگرمِ عمل ہو گئے اور ہندوستان سے مزید امداد آنے لگی۔ اس کے بعد ڈمگلہ اور شنکیاری کی جنگیں پیش آئیں۔ چونکہ ان جنگوں کے ہیرو حضرت شاہ اسمٰعیلؒ تھے اس لئے انشاء اللہ ان جنگوں کی تفاصیل ہم اپنی آئندہ کتاب 'اسماعیل شہید' میں بیان کریں گے۔

اتمان زئی کا معرکہ

سید صاحب پنجتار سے نکل کر سوات کا دورہ فرما رہے تھے کہ موضع خہر میں آپ کو یہ افسوسناک خبر ملی کہ سکھوں نے سردارانِ پشاور کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر آپ نے افغانوں سے فیصلہ کن جنگ کا فیصلہ کر لیا تاکہ راستے کی اس بڑی رکاوٹ کو دور کر کے اصل مقصد کے حصول کی کوشش کی جا سکے چنانچہ آپ نے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ کا امیر شاہ اسمٰعیلؒ کو مقرر کیا اور دوسرے کی قیادت خود سنبھالی۔ شاہ اسمٰعیل کو حکم دیا کہ وہ اتمان زئی پہنچ کر دشمن پر شبخون ماریں اور خود اتمان زئی کے قریب مقیم ہو گئے تاکہ جب دشمن ادھر آئے تو اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔ حملہ کرنے سے پہلے آپ نے حکم دیا کہ صرف انہی لوگوں سے جنگ کی جائے جو مقابلے پر آئیں۔ پناہ طلب کرنے والوں پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، نہ بھاگتے ہوئے لوگوں کو قتل کیا جائے۔ شاہ اسماعیلؒ نے نہایت پامردی اور شجاعت سے درانیوں کا مقابلہ کیا اور ان کی توپوں پر قبضہ کر لیا۔ درانیوں کا لشکر بھاگ کر ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اب سید صاحبؒ آگے بڑھے۔ توپوں کو اپنی نگرانی میں مناسب مقام پر نصب کروایا۔ فوج کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے مورچہ بندی کرائی۔ توپیں بھروا کر خود نشانہ درست کیا اور توپچی کو نشانہ لگانے کا حکم دیا۔ پہلے ہی حملے میں درانیوں کی کثیر تعداد ہلاک ہو گئی اور وہ ٹیلہ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اسی دوران میں درانیوں کی تازہ کمک آ گئی ادھر عالم خاں سردار اتمان زئی جو اس جنگ کا محرک تھا کمزوری دکھانے لگا۔ یہ دیکھ کر سید صاحبؒ نے واپسی کا فیصلہ کیا اور آپ اپنے لشکر کو نہایت ہوشیاری سے بحفاظت میدانِ جنگ سے نکال لائے۔ اس لڑائی میں درانیوں کو عظیم جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

---

[1] تواریخ عجیبہ صفحہ ۱۰

پابندئ شریعت کی بیعت

اسی جنگ کے بعد یعنی ماہِ شعبان ۱۲۴۲ھ میں جمعہ کے روز سید صاحب نے پنجتار اور مضافات کے علماء، سرداروں اور عوام کے ایک بہت بڑے اجتماع سے پابندئ شریعت کی بیعت لی۔ اس اجتماع میں دو ہزار افراد شریک تھے۔ ہر شخص نے پابندی سے نماز پڑھنے، چوری، ڈاکہ، زنا، شراب نوشی اور قتل سے دست کش رہنے اور سارے امور و مقدمات شریعت کے مطابق انجام دینے کا عہد کیا۔ مولانا جعفر تھانیسری کا بیان ہے کہ کچھ ہی عرصے میں اس علاقے کی کایا پلٹ گئی۔ چوری، زناکاری اور قتل و خونریزی کا نام نہ رہا۔ لوگ خود بخود پیداوار کا عُشر سید صاحبؒ کو پیش کر دیتے تھے مگر ہُنڈ کا سردار خادے خاں اپنی فطری کجی اور بداعمالیوں کی وجہ سے ان برکات سے محروم رہا بلکہ اجرائے شریعت سے اسے اتنی نفرت پیدا ہوئی کہ سکھوں کا لشکر اپنے علاقے میں بلوا لیا۔[1]

جنرل ونٹورا کی شکست

سید صاحبؒ کے روز افزوں اثر و اقتدار اور پے در پے کامیابیوں سے سردارانِ پشاور سخت خوفزدہ تھے چنانچہ انہی کے مشورے سے سردار خادے خاں نے رنجیت سنگھ کے فرانسیسی جرنیل ونٹورا کو سید صاحبؒ پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ جب سید صاحبؒ کو سکھ لشکر کی آمد کی اطلاع ملی تو آپ نے مٹھی بھر مجاہدین کو ساتھ لے کر سکھوں کے ٹڈی دل لشکر کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا جس کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی جبکہ سید صاحبؒ کے پرچم تلے صرف نو سو مجاہد تھے۔ آپؒ نے پنجتار کی طرف آنے والے راستوں پر مضبوط دیواریں تعمیر کروائیں اور ان دیواروں کی تعمیر میں خود بھی حصہ لیا۔ جب سکھ لشکر قریب پہنچا اور اس نے دیواریں گرانا شروع کیں تو سید صاحبؒ نے مرزا حسین بیگ افسر توپ خانہ کو گولہ باری کا حکم دیا۔ جو سکھ دیوار گرانے میں مصروف تھے وہ تو پہلے ہی حملے میں مارے گئے۔ ادھر سید صاحبؒ کے سواروں اور پیادوں نے مردانہ وار سکھوں کی طرف پیش قدمی کی۔ ونٹورا پر مجاہدوں کی شجاعت کا ایسا خوف طاری ہوا کہ اس نے سکھ لشکر کو پسپا ہونے کا حکم دیا۔ مجاہدین نے بھاگتے ہوئے سکھوں کا دُور تک تعاقب کیا اور بہت سے سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سید صاحبؒ نے اس کامیابی پر میدانِ جنگ ہی میں سجدۂ شکر ادا کیا۔

---

[1] تواریخ عجیبہ صفحہ ۱۱

فتح ہُنڈ اور خادے خاں کا قتل

خادے خاں نے سید صاحبؒ کی تحریک (غلبۂ اسلام) کو ناکام بنانے کے لئے جو افسوسناک حرکتیں کی تھیں وہ اس قابل نہ تھیں کہ انھیں نظر انداز کر دیا جاتا۔ اس کی گردن پر سیکڑوں بے گناہ مسلمانوں کا خون تھا اور وہ دشمنان اسلام کی صف میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اس لئے علمائے نے متفقہ طور پر فتویٰ دیا کہ ایسے باغی اور منافق کو سزا دی جائے "تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ چنانچہ اس کی سرکوبی کے لئے سات سو افراد پر مشتمل ایک لشکر تیار کیا گیا۔ شاہ اسماعیلؒ اس لشکر کے کمانڈر مقرر ہوئے۔ آپ نے راتوں رات ہنڈ پہنچ کر اپنے لشکر کو قلعہ کے دروازے کے قریب پوشیدہ جگہ پر بٹھایا۔ جُوں ہی صبح ہوئی اور قلعہ کا دروازہ کھلا۔ شاہ صاحبؒ کے دستے نے قلعے میں داخل ہو کر بندوقیں سر کرنا شروع کر دیں۔ معمولی سے مقابلے کے بعد خادے خاں کے لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اس دار و گیر میں ایک گولی خادی خاں کے لگی اور وہ اپنے قلعے کی چھت پر ہلاک ہو گیا[1]۔ ہنڈ پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا اور سید صاحبؒ کو ایک بڑے فتنے سے نجات مل گئی۔

زیدہ کا معرکہ

خادے خاں کے قتل کے بعد اس کے بھائی امیر خاں نے کوشش کی کہ ہُنڈ کی سرداری اسے تفویض کر دی جائے اپنے مقصد میں ناکام ہو کر اس نے حاکم پشاور یار محمد خاں سے رابطہ قائم کیا۔ یار محمد خاں پہلے ہی موقع کا منتظر تھا چنانچہ وہ ایک لشکرِ جرار لے کر ہُنڈ پہنچ گیا۔ سید صاحبؒ نے اسے ہر چند تلقین کی کہ وُہ بلا وجہ مسلمانوں کا خون بہا کر مقصدِ جہاد کو نقصان نہ پہنچائے مگر اس پر سید صاحبؒ کی تلقین کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس نے جواب دیا کہ اگر اب سید صاحبؒ کی طرف سے کوئی پیغامبر آیا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا[2]۔ یہ دیکھ کر سید صاحبؒ نے شاہ اسمٰعیلؒ کو چھ سو مجاہدوں کے لشکر کا قائد مقرر کر کے یار محمد خاں سے نبرد آزما ہونے کا حکم دیا۔ شاہ صاحبؒ نے نہایت قابلیت سے نقشۂ جنگ تیار کیا۔ یار محمد خاں کے سواروں کے دستے سے مجاہدین کا پہلا مقابلہ ہوا۔ پہلے ہی حملے میں یار محمد خاں کے بہت سے آدمی ہلاک ہُوئے باقی فرار ہو گئے۔ یہ دیکھ کر یار محمد خاں نے توپ خانے کو گولہ باری کا حکم دیا۔ مجاہدین نے بڑی سرعت سے پیش قدمی کر کے توپ خانے پر حملہ کیا اور کئی توپیں چھین لیں اور ان توپوں سے دشمن پر گولہ باری شروع کر دی گئی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ یار محمد خاں کے لشکر کو شکست ہوئی۔ اس لڑائی میں یار محمد خاں بُری طرح زخمی ہُوا اور پشاور کو فرار ہوتے ہوئے راستے ہی میں فوت ہو گیا۔ جس خیمے میں یار محمد خاں مقیم تھا۔ اس کے فرار کے بعد اس خیمے سے

---

[1] منظورۃ السعداء صفحہ ۵۱۵ [2] ایضاً صفحہ ۵۴۹۔

کئی نوجوان عورتیں برآمد کی گئیں جنھیں مضافات کے گاؤں سے بدکاری کی خاطر جبراً پکڑ کر لایا گیا تھا۔ یہ جنگ ۱۰ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ کو پیش آئی۔ [1]

اس جنگ میں کامیابی سے سید صاحبؒ کی شجاعت کی دھاک دور دور تک بیٹھ گئی۔ پشاور اور مضافاتِ پشاور کے متعدد ذی اثر لوگوں نے سید صاحبؒ کو پشاور آنے کی دعوت دی مگر آپ نے جنگ میں پہل کرنے سے گریز کیا۔

تربیلہ و امب کے معرکے

اسی دوران میں تربیلہ کی مشہور جنگجو قوم مشوانہ کے رئیس زمان خاں نے سید صاحبؒ کو تربیلہ پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ یہ مقام سکھوں کے قبضے میں آچکا تھا اور وہ تربیلہ کے مسلمانوں پر سخت ظلم و ستم کر رہے تھے۔ چنانچہ سید صاحبؒ ساڑھے چار سو سواروں اور پیادوں کی جمعیت لے کر تربیلہ روانہ ہو گئے اور بھاروکوٹ کے علاوہ سارے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ مگر سید صاحبؒ کے غازیوں کی تعداد بہت کم تھی اور زمان خاں کے پاس بھی سامانِ جنگ اور جمعیت کافی نہ تھی اس لئے جب ہری سنگھ نے اپنے توپ خانے اور لشکرِ کثیر کے ساتھ سید صاحبؒ پر حملہ کیا تو چند معرکوں کے بعد آپ نے مجاہدوں کو واپسی کا حکم دیا۔

ابھی سید صاحبؒ تربیلہ کے مضافات میں واقع کھبل نامی موضع میں مقیم تھے کہ ستھانہ کے سردار سید اکبر شاہ حاضرِ خدمت ہوئے اور اپنے ساتھ ستھانہ چلنے کی دعوت دی۔ سید اکبر شاہ سید صاحبؒ کے ان فدائیوں میں سے تھے جنھوں نے اول سے آخر تک کسی لمحے نہ صرف یہ کہ کمزوری نہیں دکھائی بلکہ نازک سے نازک لمحے میں بھی آپ کی رفاقت کا حق ادا کیا۔ چنانچہ سید صاحبؒ نے ان کی دعوت قبول کر لی۔ کھبل کے دورانِ قیام ہی میں امب کے حکمران نواب پائندہ خاں کا سفیر حاضرِ خدمت ہوا اور نواب کی طرف سے امب آنے کی دعوت دی۔ ستھانہ پہنچ کر آپ نے نواب پائندہ خاں کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ امب کے مقام عشرہ میں نواب نے ملاقات کا انتظام کیا۔ بظاہر بڑی مدارات سے پیش آیا مگر اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کا دل سید صاحبؒ کی طرف سے صاف نہ تھا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد جب آپ نے کشمیر کی طرف پیش قدمی کا منصوبہ بنایا اور شاہ اسمٰعیلؒ کی قیادت میں ہراول دستہ روانہ کیا جسے نواب پائندہ خاں کی حدودِ ریاست سے گزرنا تھا تو پائندہ خاں نے امب سے گزرنے کی اجازت نہ دی بلکہ کہلا بھیجا کہ اگر آپ نے ادھر سے گزرنے کے لئے طاقت آزمائی کرنے کی کوشش کی تو میں بھی طاقت استعمال کروں گا۔ سید صاحبؒ کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ ایک طرف علاقۂ سمہ (یوسف زئی) میں بعض لوگ مخالفت پر آمادہ ہو رہے تھے دوسری طرف کشمیر کے مظلوم مسلمان آپ کو اپنی امداد کے لئے بلا رہے تھے۔

---

[1] منظورۃ السعداء صفحہ ۵۳۶۔

مستزاد یہ کہ ایک مسلمان حکمران جنگ کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ ان حالات میں آپ نے مناسب یہی سمجھا کہ پہلے اپنے اس مسلمان حریف سے نبٹ لیا جائے تاکہ اس راستے کی ایک بڑی رکاوٹ دُور ہو کر کشمیر کا راستہ صاف ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کا امیر شاہ اسمٰعیلؒ کو اور دُوسرے کا اپنے بھانجے سید احمد علی کو مقرر کیا اور حکم دیا کہ جنگ میں پہل نہ کرنا بلکہ جہاں تک ممکن ہو صلح و آشتی سے معاملات درست کر لینا۔ جب یہ دونوں لشکر امب پہنچے تو نواب پائندہ خاں نے اپنے آپ کو محاصرہ میں پاکر صلح کا پیغام دیا اور دوسری طرف مجاہدین کو غافل کر کے ازراہِ فریب ان پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں مجاہدین کے چھ افراد شہید ہوئے مگر میدان انہی کے ہاتھ رہا اور پائندہ خاں کا لشکر ہزیمت اٹھا کر فرار ہو گیا۔ امب کے قلعے پر سید صاحبؒ کا قبضہ ہو گیا اس کے بعد ساری ریاست آپ کے زیرِ تسلط آ گئی۔ شرعی نظام نافذ کر دیا گیا۔ جگہ جگہ قاضی اور تحصیلدار مقرر کر دیئے گئے اور سید صاحبؒ کا دفتر بھی یہیں منتقل ہو گیا۔ اب سید صاحبؒ کا مرکز امب قرار پایا۔ یہیں سے آپ نے مولوی نظام الدین چشتی کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے کشمیر روانہ کیا تاکہ اہلِ کشمیر کو وعظ و تلقین کے ذریعے اسلامی احکام کی تعمیل پر آمادہ کریں اور جہاد کے لئے ابھاریں۔

جنگِ پھولڑہ

پھولڑہ علاقہ تناول کا نہایت اہم مقام تھا۔ یہ مقام مانسہرہ سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس پر سکھ قابض تھے اور کشمیر جانے کے لئے ضروری تھا کہ اس مقام پر قبضہ کر لیا جائے۔ چنانچہ سید صاحبؒ نے اپنے بھانجے سید احمد علی کو ایک جمعیت دے کر پھولڑہ پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ مجاہدین کو پھولڑہ پہنچے ابھی دو تین دن ہوئے تھے کہ سکھوں کے ایک بڑے لشکر نے اچانک حملہ کر دیا۔ مجاہدین نمازِ فجر کی تیاری میں مصروف تھے کہ دفعتہً سکھوں کا لشکر ان پر آ پڑا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ بہت سے مجاہد شہید ہو گئے جن میں سید صاحبؒ کے بھانجے سید احمد صاحبؒ بھی تھے۔ اسی اثناء میں مجاہدین کے دوسرے دستے نے بندوقوں سے سکھ لشکر پر حملہ کیا اور اس شدت سے گولیاں برسائیں کہ ان میں سے بہت سے افراد ہلاک ہو گئے باقی تابِ مقابلہ نہ لا کر فرار ہو گئے اور مجاہدین کا پھولڑہ اور پھر سارے تناول پر قبضہ ہو گیا۔

رنجیت سنگھ کی طرف سے صلح کی پیشکش

امب ہی کے دورانِ قیام میں وہ تاریخی واقعہ پیش آیا جس نے ثابت کر دیا کہ سید صاحبؒ کی کامیابیوں اور افغان عوام پر آپ کے غیر معمولی اثر و رسوخ نے سکھ دربار کو سخت تشویش میں مبتلا کر دیا تھا، اور وہ آپ سے

خائف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رنجیت سنگھ نے سیّد صاحبؒ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور ایک سفارت صلح کی غرض سے آپ کی خدمت میں بھیجی۔ یہ سفارت سردار وزیر سنگھ اور رنجیت سنگھ کے ایک مسلمان مشیر فقیر عزیزالدین پر مشتمل تھی۔ سردار وزیر سنگھ رنجیت سنگھ کا عزیز اور اس کا معتمدِ خاص تھا۔ یہ دونوں سید صاحبؒ کے لئے رنجیت سنگھ کا یہ پیغام لائے کہ آپ درویش آدمی ہیں اور میں امیر ہوں۔ امیروں پر درویشوں کی خدمت لازم ہے اور درویشوں کا کام دعا کرنا ہے۔ رنجیت سنگھ کی طرف سے اس کے سفیروں نے یہ بھی عرض کیا کہ جو علاقے سیّد صاحبؒ کے قبضے میں آچکے ہیں ان سب میں وُہ بڑے شوق سے شرعی احکام نافذ کریں مگر مزید علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر ایسا کریں گے تو یہ سمجھا جائے گا کہ وُہ ملک گیری کے حریص اور دنیا دار ہیں۔ اس صورت میں جنگ ہو گی اور دونوں فریقوں کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ بہ ظاہر یہ بڑی قیمتی پیش کش تھی اور وُہ طاقت ور حکمران جس سے انگریز بھی خم کھاتے تھے سیکڑوں بلکہ ہزاروں میل وسیع علاقے پر سیّد صاحبؒ کی سیادت و حکومت تسلیم کر رہا تھا۔ سید صاحبؒ کی بجائے اگر کوئی دنیا دار شخص ہوتا تو فوراً یہ پیش کش قبول کر لیتا مگر سید صاحبؒ کا مقصد دوسروں کے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کرنا نہ تھا بلکہ یہ پیش کش ان کے بلند و پاکیزہ مقاصد کے لئے سمِ قاتل کا حکم رکھتی تھی۔ چنانچہ آپ نے یہ پیش کش مسترد کر دی۔ چونکہ رنجیت سنگھ نے خواہش کی تھی کہ سید صاحبؒ اپنے کسی سفیر کے ہاتھ اس کے پیغام کا جواب ارسال فرمائیں اس لئے آپ نے اپنے دو معتمدوں مولوی خیرالدین صاحب شیر کوٹی اور حاجی بہادر شاہ خاں کو اپنا جواب دے کر رنجیت سنگھ کے سفیروں کے پاس بھیج دیا۔ رنجیت سنگھ کے دونوں سفیر پنجتار کے قریب سکھ لشکر گاہ میں مقیم تھے۔ ایک خیمے میں جنرل ونٹورا، ایلارڈ، سردار وزیر سنگھ اور فقیر عزیزالدین سید صاحبؒ کے سفیروں کے منتظر تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ اگر سید صاحبؒ کے سفیر رنجیت سنگھ کی پیش کش قبول کر لیں تو سکھ لشکر واپس چلا جائے ورنہ سید صاحبؒ سے جنگ کا آغاز کر دے۔ مگر اس ملاقات کا سکھوں کی توقع کے مطابق نتیجہ نہ نکلا۔ سید صاحبؒ کے سفیر مولوی خیرالدین شیر کوٹی نے بڑی جرأت و قابلیت سے اپنے فرائض ادا کئے اور جنرل ونٹورا کے سوالات کے نہایت مدلل و مسکت جواب دیئے۔ سید صاحبؒ کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی۔ ونٹورا کی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ مقصدِ جہاد کی تشریح کی۔ جب ونٹورا نے دیکھا کہ مولوی شیر کوٹی گفتگو میں اس سے مات نہیں کھا سکتے تو اس نے سید صاحبؒ سے اپنی نیاز مندی کا اظہار شروع کر دیا اور کہا کہ میرے دل میں خلیفہ صاحب (سید صاحبؒ) کی بڑی محبت ہے لیکن جنگ کے وقت اس محبت سے کچھ فائدہ نہ ہو گا اور مجھے حق نمک ادا کرنا پڑے گا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میرے اور خلیفہ صاحب کے درمیان تحائف کے تبادلے کی رسم جاری ہو جائے تاکہ میرے پاس یہاں سے واپس جانے کا معقول عذر ہو۔ اس کے بعد خلیفہ صاحب ملک یوسف زئی پر حکمرانی کریں۔ خالصہ فوج پھر کبھی ادھر کا رُخ نہ کرے گی۔ اس کے بعد جنرل ونٹورا

اور مولوی خیرالدین شیرکوٹی کے درمیان اس مسئلے پر گفتگو شروع ہو گئی کہ تحائف کس نوعیت کے ہوں۔ آخر میں ونٹورا نے مطالبہ کیا کہ سید صاحبؒ ہمارے مہاراجہ کو گھوڑا بہ طور تحفہ عنایت کر دیں تو میں رنجیت سنگھ کے سامنے اپنی واپسی کا عذر پیش کر سکتا ہوں۔ یہ سن کر مولوی خیرالدین صاحب جنرل ونٹورا کا مقصد و مدعا سمجھ گئے۔ سکھوں کا دستور تھا کہ جب وہ کسی علاقے پر حملہ کر کے غالب آ جاتے تو اس کے سردار سے خراج میں گھوڑا لیتے تھے، یہ اطاعت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ونٹورا کا مطلب یہ تھا کہ جب سید صاحبؒ رنجیت سنگھ کے تحائف کے جواب میں گھوڑا پیش کریں گے تو سارے علاقے میں مشہور ہو جائے گا کہ انہوںؒ نے رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ اس طرح ونٹورا بھی رنجیت سنگھ کے سامنے سرخ رو ہو جائے گا۔ مولوی خیرالدین صاحب اپنی فطری ذہانت سے بات کی تہ تک پہنچ گئے اور جواب دیا کہ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ گھوڑا تو کیا ہم آپ کو گدھا بھی نہیں دیں گے کیونکہ ہمارا ارادہ تو آپ سے جہاد کرنے، آپ کی سرکار سے جزیہ اور خراج لینے کا ہے۔ پھر ہم آپ کو بہ طور خراج گھوڑا کیسے دے سکتے ہیں؟[1]

ونٹورا کی پیش قدمی اور فرار

اس گفتگو کے بعد سید صاحبؒ کی سفارت پنجتار کو روانہ ہو گئی اور ادھر سکھ فوج نے مجاہدین پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ جنرل ونٹورا بارہ ہزار سواروں اور پیادوں کا لشکر لے کر روانہ ہوا اور زیدہ کے قریب خیمہ زن ہو گیا۔ اسی روز کسی نے مشہور کر دیا کہ آج رات کو مجاہدین سکھوں پر شب خون ماریں گے۔ ونٹورا اور لشکر کے سکھ سرداروں نے بہت کچھ تسلی دی مگر سکھوں پر ایسی وحشت طاری ہو چکی تھی کہ تھوڑی تھوڑی دیر میں اپنے گھوڑوں کی باگ پکڑ لیتے تھے۔ اچانک رات کے پچھلے پہر سکھ لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ سارا لشکر دریائے لنڈہ کا پل عبور کر کے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ دریا عبور کرنے کے بعد انھوں نے اس خوف سے پل بھی توڑ دیا کہ کہیں مجاہدین تعاقب کرتے ہوئے راستے ہی میں نہ گھیر لیں۔ اس واقعے کی خبر جب اس سکھ فوج کو ہوئی جو قلعۂ ہنڈ پر قابض ہو چکی تھی تو خوف کی وجہ سے اس نے خود بخود قلعہ خالی کر دیا اور حضرو کی طرف فرار ہو گئی۔ یہ فوج سات سو سواروں پر مشتمل تھی۔ ادھر مجاہدین کا لشکر بھی آ گیا اور اس نے قلعۂ ہنڈ پر قبضہ کر لیا۔

مردان پر سیّد صاحبؒ کا قبضہ

اسی دوران میں سیّد صاحبؒ نے علاقۂ پنجتار، سمہ اور مردان کے علماء و امراء کو مدعو کیا اور ان کے سامنے

---

[1] تواریخ عجیبہ صفحہ ۱۲۱

غیر اسلامی رسوم کے خلاف ایک پُر اثر تقریر کی۔ بعض لوگ عُشر (پیداوار کا دسواں حصہ) دینے میں پس و پیش کر رہے تھے۔ انھیں بھی اس کوتاہی کی طرف متوجہ کیا۔ اس اجتماع میں ہوتی کا رئیس احمد خاں شریک نہ ہوا بلکہ اس اجتماع کی غرض و غایت معلوم کر کے سیدھا پشاور روانہ ہو گیا تاکہ سردارانِ پشاور سے امداد لے کر سید صاحبؒ اور مجاہدین کا قلع قمع کر دے۔ ان حالات میں سوائے اس کے اور کوئی صورت باقی نہ رہی تھی کہ مردان پر حملہ کر دیا جائے اور قبل اس سے کہ سردارانِ پشاور کا لشکر آئے مردان سید صاحبؒ کے قبضے میں آچکا ہو، چنانچہ قاضی سید محمد حبان، شاہ اسمٰعیلؒ، مولوی مظہر علی عظیم آبادی اور رسالدار عبدالحمید خاں کو مجاہدین کی ایک جماعت کے ہمراہ ہوتی کی طرف روانہ کیا گیا۔ قاضی سید محمد حبان امیر لشکر مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنی جمعیت کو نہایت عمدگی سے مرتب و منظم کیا کہ جب قلعہ ہوتی کے محافظوں نے مجاہدوں پر بندوقیں سر کیں تو ان کے جواب میں قاضی حبان کی طرف سے ایسی شدید یورش کی گئی کہ ہوتی کے بندوقچی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد مولوی مظہر علی عظیم آبادی کی جماعت بھی پہنچ گئی۔ اس متحدہ لشکر نے اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کے بیشتر سپاہی فرار ہو گئے اور قلعہ بھی فتح ہو گیا۔

ہوتی پر قبضہ ہو جانے کے بعد مجاہدین کا لشکر مردان روانہ ہوا۔ مردان پہنچ کر قاضی محمد حبان نے گڑھی پر حملہ کر دیا اس کے جواب میں مردان کے لوگوں نے بھی بندوقیں سر کرنی شروع کر دیں اور ہر گھر سے گولیاں چلنے لگیں۔ آخر کار شاہ اسمٰعیلؒ کے مشورے پر چالیس پچاس سوار بستی میں بھیجے گئے اور انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ شاہین لے کر پیدل چلیں اور شاہینوں کے گولوں سے گڑھی کے بُرجوں کو خالی کرائیں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی گڑھی کے پانچ برجوں پر خاموشی چھا گئی۔ صرف ایک بُرج باقی رہ گیا۔ اس اثناء میں ملا لال محمد قندھاری اس بُرج کے نیچے پہنچ گئے اور باآواز بلند پشتو میں پکارے "اندرپائی راوڑا اندرپائی راوڑا" یعنی سیڑھی لاؤ، سیڑھی لاؤ حالانکہ کوئی سیڑھی پاس نہ تھی۔ یہ سن کر بُرج والوں پر ہراس طاری ہو گیا اور انہوں نے حوالگی کی درخواست پیش کر دی۔ قرارداد کے مطابق پہلے ہتھیار نیچے پھینک دیئے پھر ایک ایک کر کے اُتر آئے۔[1]

اس طرح ہوتی اور مردان دونوں پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ احمد خاں رئیس مردان کے بھائی رسول خاں کو سید صاحبؒ کی طرف سے اس علاقے کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اس جنگ میں کئی مجاہدین شہید ہو گئے۔ ان شہیدوں میں قاضی سید محمد حبان بڑے پائے کے بزرگ، جید عالم اور بہادر شخص تھے۔ ان کی شہادت کا خود سید صاحبؒ کو سخت صدمہ ہوا۔ اس جنگ کے بعد سید صاحبؒ نے اپنے بعض عقیدت مندوں کو خطوط لکھ کر مجاہدین کی فتح و کامرانی کی اطلاع دی۔ ایک خط میں آپ نے امب کے معرکے اور جنگِ مردان دونوں کے حالات کو نہایت اختصار سے بیان کئے ہیں لیکن اس اختصار میں بھی بعض بڑے کام کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اب تک یہ خط غیر مطبوعہ تھا

---

[1] سید احمد شہید صفحہ ۲۲۳ مولفہ مولانا غلام رسول مہر

اور کسی کتاب کی زینت نہ بن سکا تھا۔ اس لئے اس تاریخی خط کا ترجمہ اور عکس دونوں شائع کئے جا رہے ہیں۔

سیّد صاحبؒ کا ایک نادر خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امیر المومنین کی طرف سے عالی جاہان، رفیع جایگاہان عظمت دستگاہان عمدۃ السلاطین العظام زبدۃ الارکین الفخام سلطان زبردست خاں و سلطان نجف خاں کھوڑمی والا و سلطان احمد خاں سلمہم اللہ تعالیٰ کے مطالعے کی غرض سے۔

بعد سلام مسنون و دعائے اجابت مقرون واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ اس نے اپنی مہربانی سے اپنے بندوں پر فتح و کامرانی کے دروازے خود کھول دیئے اور طرح طرح کے انعامات سے نوازا یعنی ان دنوں میں ہم لوگوں نے علاقہ سمہ کے انتظام کی غرض سے اور مہم پشاور سرانجام دینے کے لئے مقام انب (امب) سے اپنے لشکر کے ہمراہ کوچ کیا اور مولانا محمد اسماعیل صاحب کو تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ اس مقام کی حفاظت کی غرض سے چھوڑ دیا۔ اس دوران میں کفار اور فرانسیسی مع تنولی منافقین کے اپنی تمام قوت و جمعیت اور توپ خانہ و شاہین خانہ کے باوجود قلعہ انب و چترائی پر زوردار حملے کر کے بھی کامیاب نہ ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے مجاہدین ابرار کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا البتہ کفار کے بہت سے آدمی ہلاک کر دیئے گئے۔ آخر کار بڑی ذلت و خواری کے ساتھ یہ لوگ اس ملک سے فرار ہو گئے اور انہیں اپنی حرکات پر ندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ ادھر جب لشکر اسلام علاقہ سمہ کے انتظام و انصرام میں مصروف تھا کہ درانیوں کے تمام سرداروں نے اپنی ساری قوت و جمعیت اور توپ خانہ و شاہین خانہ کے ہمراہ ہم سے اپنی تمام تدبیروں کے ساتھ ارادۂ جنگ کیا آخر نورو اور ہوتی کے مقامات پر مومنوں اور منافقوں کے درمیان جنگ ہوئی جو ڈیڑھ پہر جاری رہی۔ سخت جدال و قتال کا معرکہ گرم ہوا۔ مجاہدینِ ابرار پر خدائی رحمتیں نازل ہوئیں اور فاجر منافقوں پر خدائے جبار کا قہر نازل ہوا۔ اپنی کثرت کے باوجود انہیں شکستِ فاش ہوئی اور وہ میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے۔ ان کے بہت سے افراد اور گھوڑے ہلاک کر دیئے گئے اور بہت سے مجروح ہوئے۔ ان کے بہت سے سردار بھی قتل کر دیئے گئے۔ مجاہدین میں سے بیس نے شہادت پائی اور اتنے ہی زخمی ہوئے۔ اس جانب کے سرداروں میں سے مثل مولانا صاحب و ارباب بہرام خاں وغیرہ خیریت سے ہیں اور اخلاص نشان سید اسماعیل کو ہیں نے اپنے پاس ٹھہرا لیا ہے۔ انشاء اللہ جو حال بھی فضلِ الٰہی سے ظاہر ہو گا آپ کو لکھ دیا جائے گا باقی احوال قاصد سے دریافت ہو سکتے ہیں۔

والسلام مع الاکرام

ہفتم ربیع الاولیٰ ۴۶ ھ

درانیوں سے فیصلہ کن معرکہ

رئیس مردان احمد خاں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا اور ہوتی مردان کی فتح کے بعد ہی وہ سلطان محمد خان حاکم پشاور کو لے کر مردان سے چار میل دور مہیار یا مایار کے مقام پر پہنچ گیا۔ سلطان محمد خاں کی فوج آٹھ ہزار سواروں اور چار ہزار پیادوں پر مشتمل تھی۔ چار بڑی اور دس چھوٹی توپیں بھی ہمراہ تھیں۔ جب سید صاحبؒ کو سرداران پشاور کی آمد کی اطلاع ہوئی تو آپ نے بھی اپنی فوجوں کو آراستہ کیا۔ اس وقت آپ کے پاس ساڑھے تین ہزار جنگجو تھے جن میں ہندوستانی اور افغان دونوں شامل تھے۔ سواروں کی تعداد پانچ سو تھی۔ باقی پیادہ فوج تھی۔ توپیں آپ اس جنگ میں اپنے ہمراہ نہیں لائے تھے مگر شاہینیں ضرور تھیں۔ سید صاحبؒ نے فوج کی ترتیب یوں قائم کی کہ سب سے آگے پیادے، ان کے پیچھے شاہینیں، سب سے آخر میں سوار، جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو سید صاحبؒ نے مجاہدین کو ہدایت کی کہ تیزی سے آگے بڑھ کر دشمن کی توپوں پر قبضہ کر لو۔ یہ ہدایت دے کر آپ خود بھی گھوڑے سے اتر کر پیادوں کی پہلی صف میں شامل ہو گئے۔ ادھر مجاہدین نے پوری شدت سے یورش کی اور ادھر درانیوں نے توپوں سے گولہ باری شروع کر دی۔ پہلی باڑھ کے بعد ابھی دوسری باڑھ نہیں آئی تھی کہ مجاہدین توپوں پر قابض ہو گئے۔ درانی گولہ انداز توپوں کو چھوڑ کر سواروں کی صفوں میں چلے گئے جو ان کے پیچھے قائم تھی۔ مولانا جعفر تھانیسری اس جنگ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

سید کجاست سید کجاست؟

"اس وقت آٹھ ہزار (درانی) سوار بڑے جوش اور غضب سے اپنی داڑھیوں کو دانتوں میں دبائے ہوئے اپنے گھوڑے دوڑا کر غازیوں پر حملہ آور ہوئے۔ ان سب سواروں کے پاس کوہاٹی شیر بچے تھے جس کا ایک ایک فیر کر کے نیزے اور تلوار انھوں نے پکڑ لئے اور ہر سوار "سید کجاست سید کجاست" (سید کہاں ہے سید کہاں ہے) کہتا ہوا سید صاحبؒ کے خون کا پیاسہ تھا۔ اس وقت سید صاحبؒ نے بڑی پھرتی سے صف آرائی کر کے بھرمار کا حکم دیا۔ ایک ہزار بندوق اور قرابینوں کی باڑھ پر باڑھ مثل باران عظیم القطر درانیوں پر پڑنے لگی اور دو تین آدمی تو صرف بندوقیں بھر بھر کر سید صاحبؒ کو دیئے جاتے تھے اور سید صاحبؒ بجواب "سید کجاست" کے یہ کہہ کر کہ "سید ہمیں است، سید ہمیں است" (نہایت) سرعت سے بھرمار کر رہے تھے۔"[1] ایک موقعے پر جب درانی سواروں نے مجاہدین پر حملہ کیا تو خود سید صاحبؒ نے نشانہ باندھ باندھ کر توپوں سے فائرنگ کرائی۔ غرض درانیوں کی لاشیں میدان جنگ میں گرنے لگیں۔ انھیں سخت شکست ہوئی۔ کثیر تعداد میں ان کے افراد ہلاک و

---

[1] تواریخ عجیبہ ص ۱۲۶

زخمی ہوئے۔ غازیوں کے اٹھائیس آدمی کام آئے اور قریب قریب اتنے ہی زخمی ہوئے۔ درانیوں میں ان کے بعض بڑے بہادر جنگجو بھی قتل ہو گئے مثلاً حاکم پشاور یار محمد خاں کا برادرِ نسبتی اسرائیل خاں جو بہت بڑا پہلوان اور ماہر نشانہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ نے درانیوں کی کمر توڑ دی اور اس کامیابی نے سید صاحبؒ کی طاقت اور ہمت اور شجاعت کا سکہ صوبۂ سرحد سے لے کر پنجاب کے راجہ رنجیت سنگھ تک ہر ایک کے دل پر بٹھا دیا۔ یہ جنگ مہیار (مایار) اور تورو کے درمیان ہوئی۔ شہداء کو تورو کے قریب دو بڑی قبروں میں دفن کر دیا گیا۔

پشاور پر سید صاحبؒ کا قبضہ

شیدو، اتمان زئی، زیدہ اور مہیار کی جنگوں میں سردارانِ پشاور نے سید صاحبؒ سے نبرد آزما ہو کر جس طرح ان کے مقاصدِ عالیہ کو نقصان پہنچایا تھا اس کے مختصر کوائف گزشتہ صفحات میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ سید صاحب اپنے وطن سے ظالم سکھوں سے جہاد کرنے نکلے تھے تاکہ پنجاب و سرحد کے مسلمانوں کو ان کے انسانیت سوز مظالم سے نجات دلا کر ان مظلوموں کی آزادی بحال کی جائے لیکن افغانوں کے ان نادان اور خود غرض سرداروں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے یہ مقاصد پس پشت جا پڑے تھے۔ سید صاحبؒ نے بجا طور پر سوچا کہ جب تک سردارانِ پشاور کا فتنہ فرو نہیں ہوتا اور یہ جنگ یا صلح سے راہِ راست پر نہیں آتے اس وقت تک اگلا قدم اٹھانا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ چنانچہ آپ نے شاہ اسمٰعیلؒ، مولوی مظہر علیؒ عظیم آبادی اور ارباب بہرام خاںؒ وغیرہ سے مشورہ کرنے کے بعد پشاور کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کیا۔ آپ تورو مضافاتِ مردان سے روانہ ہوئے اور چارسدہ سے ہوتے ہوتے شب قدر اور وہاں سے کمٹ فروسی پہنچے۔ سید صاحبؒ کے ساتھ اس وقت تقریباً سات ہزار سواروں اور پیادوں کا لشکر تھا جس میں ہندوستانی مجاہدین کے علاوہ قندھاری اور علاقہ سمہ کے سردار بھی اپنی جماعتوں کے ہمراہ شامل تھے۔ سید صاحبؒ کی آمد کی خبر سن کر حاکم پشاور سلطان محمد خاں نے اپنے اہل و عیال کو کوہاٹ بھیج دیئے اور خود پشاور کے قریب ایک گاؤں میں چلا گیا۔ کمٹ فروسی کے مقام پر سلطان محمد خاں کا سفیر ارباب فیض اللہ خاں مہمند جو سید صاحبؒ کا عقیدت مند بھی تھا سلطان محمد خاں کی طرف سے معافی اور صلح کی درخواست لے کر حاضر ہوا۔ مولانا جعفر تھانیسریؒ کے بیان کے مطابق اس نے سید صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ:

"سردار سلطان محمد خاں معافی تقصیراتِ ماضیہ کے چاہ کر توبۃ النصوح کرنے کے واسطے حاضر ہے اور کہتا ہے کہ اگر کوئی کافر حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لائے تو آپ اس کو ضرور مسلمان کرو گے اور جبکہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان کی اولاد ہوں اور اپنی خطاؤں ماضیہ کا معترف اور تائب ہو کر اقرار کرتا ہوں کہ تا حیات

اپنے تئیں آپ کے خادموں اور غلاموں میں شمار کروں گا اور جو حکم آپ فرمائیں گے اس پر عمل کروں گا تو ضرور ہوا کہ آپ مجھ سے توبہ کرا کے مجھ کو اپنے خادموں میں داخل کر لیں[1]۔

اس کے جواب میں سید صاحبؒ نے فرمایا کہ ہم لوگ تو اس ملک میں دینِ اسلام کی تائید کے لئے آئے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ یہاں کے جملہ مسلمان اس کام میں ہماری مدد کریں لیکن تمہارے سردار اپنی کج فہمی سے ہمارا ساتھ چھوڑ کر سکھوں سے جو ہمارے اصلی دشمن ہیں مل گئے اور سکھوں کی طرف سے ہمارے ساتھ جنگ کی یہاں تک کہ تمہارے سردار کا بھائی (یار محمد خاں) اپنی جان گنوا بیٹھا۔ اس کے بعد ہم نے تمہارے سردار سلطان محمد خاں کو متعدد خطوط لکھ کر تائیدِ اسلام اور کفار کے مقابلے پر اپنی حمایت کی بار بار دعوت دی مگر ہماری یہ کوششیں بھی ضائع ہوئیں اور وہ مایار کی جنگ میں ہمارے مقابلے پر آیا۔ اللہ نے ہمیں فتح عطا کی اور اسے شکست ہوئی اور ہم اس کے تعاقب میں یہاں تک پہنچ گئے۔

چونکہ سلطان محمد خاں نے تقصیر معافی کے ساتھ اپنی سرداری دوبارہ بحال کرنے کی بھی درخواست کی تھی اور اس میں شرط کا رنگ پایا جاتا تھا گویا وہ مشروط معافی کا طالب تھا اس لئے سید صاحبؒ نے اس کی درخواست منظور نہ کی مگر سید صاحب کی اس تقریر کا سلطان محمد خاں کے سفیر ارباب فیض اللہ خاں پر بہت اثر ہوا اور وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ میں دونوں فریقوں میں واسطہ بن کر صلح کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر مجھے اس میں ناکامی ہوئی اور سلطان محمد خاں اپنی پہلی روش پر قائم رہا تو میں اس سے الگ ہو کر آپ کے خدام میں شامل ہو جاؤں گا۔

دوسرے روز ارباب فیض اللہ خاں پھر سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلطان محمد خاں کا یہ پیغام دیا کہ میں اپنے افعال ماضی سے غیر مشروط طور پر توبہ کر کے آپ کی بیعت کرتا اور خدام میں شامل ہوتا ہوں۔ میرا ملک حضور کے اختیار میں ہے جسے چاہیں عطا فرمائیں۔ یہ جواب سن کر سید صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر وہ سچے دل سے توبہ کرے اور آئندہ کے لئے یہ عہد کرے کہ کفار کی رفاقت اور دوستی ترک کر دے گا اور ان سے مقابلہ کے وقت ہمارا ساتھ دے گا تو ہم اس کا ملک بھی اپنی طرف سے اسے واپس کر دیں گے۔ ارباب فیض اللہ خاں خوش خوش سلطان محمد خاں کے پاس گیا اور اسے یہ خبر سنائی۔ دوسرے دن سید صاحب اپنے لشکر کے ہمراہ پشاور میں داخل ہوئے۔ سب سے آگے پیادوں کا لشکر تھا۔ سید صاحبؒ اسی لشکر کے ساتھ تھے۔ اس کے پیچھے سواروں کا لشکر تھا۔ سید صاحبؒ سبز گھوڑے پر سوار تھے۔ احتیاطاً بندوقیں بھر لی گئی تھیں کہ مبادا کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ جائے۔ سید صاحبؒ کو سرائے گورکھتری میں ٹھہرایا گیا۔ یہ ایک عالی شان قلعہ نما حویلی تھی۔ ارباب بہرام خاں اس حویلی کی حفاظت پر مامور ہوئے اور ہر روز باری باری مختلف دستوں کے مجاہد سید صاحبؒ کی حفاظت کی

---

[1] تواریخ عجیبہ ص ۱۲۷۔

غرض سے حویلی کے دروازے پر پہرہ دیتے تھے۔

پشاور کے ماحول میں پاکیزہ تبدیلی

پشاور میں داخل ہونے کے بعد سید صاحبؒ نے عام منادی کرادی کہ شہر کی کسی چیز کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ بغیر قیمت دیئے کوئی چیز نہ لی جائے نہ کسی پر تشدد کیا جائے۔ اس اعلان کا نہایت خوشگوار اثر ہوا۔ جن لوگوں نے خوف کی وجہ سے دکانیں بند کردی تھیں اس اعلان کے بعد وہ مطمئن ہو گئے۔ دوسرے روز بازار کھل گئے اور معمول کے مطابق کاروبار ہونے لگا۔ پشاور پہنچنے کے بعد سید صاحبؒ نے ایک فرمان جاری کیا کہ بھنگ، چرس، افیون اور شراب کی دکانیں بند کردی جائیں۔ ان منشیات کا استعمال ممنوع قرار دے دیا گیا۔ فاحشہ عورتوں کے مذموم اور شرمناک کاروبار پر پابندی لگادی گئی۔ ان میں سے کچھ تو شہر چھوڑ کر چلی گئیں اور باقی گھروں میں جا بیٹھیں۔ سارے شہر میں شرعی نظام قائم کر دیا گیا۔ نماز کی پابندی ہر شخص کے لئے لازمی قرار دے دی گئی۔ تارکین صلوٰۃ کے لئے سزا تجویز ہوئی۔ چور، بدمعاش اور عیاش طبع لوگ راہِ راست پر آگئے۔ غرض چند ہی روز میں پشاور کی کایا پلٹ گئی۔ اور ایک مورخ کے بقول سید صاحبؒ کے قدموں کی برکت سے یہ شہر رشکِ عرب بن گیا۔

حاکمِ پشاور کا تقرر

اس دوران میں سردارِ پشاور سلطان محمد خاں نے سید صاحبؒ کی خدمت اور اپنی نیاز مندی کے اظہار میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور اپنے سفیر ارباب فیض اللہ خاں کی معرفت مسلسل معافی تقصیر کی درخواستیں پیش کرتا رہا۔ ادھر سید صاحبؒ کے ارادت مندوں میں سے ہر شخص کی رائے یہی تھی کہ سلطان محمد خاں نہایت دغاباز اور ناقابلِ اعتبار شخص ہے اس پر اعتماد کرکے اسے پشاور کی حکومت پر بحال کرنا کسی طرح مناسب نہیں مگر سید صاحبؒ فیصلہ کر چکے تھے کہ سلطان محمد خاں کو معاف کرکے اسے اپنی طرف سے حاکم پشاور مقرر کر دیا جائے۔ ہر شخص کو سید صاحبؒ کے اس ارادے کا علم تھا مگر کسی کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ ان کی رائے سے اختلاف کرکے ان کی خدمت میں اس اقدام کی مضرتیں بیان کرے۔ آخر ایک روز ارباب بہرام خاں نے جو سید صاحب کا سچا فدائی تھا، ان کی خدمت میں عرض کر ہی دیا کہ سلطان محمد خاں سخت دغاباز اور فریب کار شخص ہے۔ آپ اسے پشاور کی حکومت تفویض کر رہے ہیں اس سے بھلائی کی ہرگز توقع نہیں اس لئے آپ اس کی بجائے یہ منصب کسی اور کو عنایت فرما دیجئے۔

یہ سن کر سید صاحبؒ نے فرمایا کہ:

"بھائی بہرام خاں! میں خوب جانتا ہوں کہ قدیم سے یہ خاندان (یعنی سلطان محمد خاں وغیرہ کا) اپنی مکاری اور

غداری میں بے نظیر ہے مگر مجھ کو اپنے اس ناصرِ حقیقی پر پُورا بھروسا ہے کہ جس نے اس مرتبہ باوجود کثرتِ مخالفین ہم عاجزوں کو ان پر غالب کیا۔ وُہ پھر بھی قادر ہے کہ اگر ہمارے ایسے سلوک پر جس کو اور کوئی دوسرا فاتح ہرگز نہ کرتا۔ یہ لوگ ہم سے دغابازی کریں گے تو ان کو ایسی سزا دے گا کہ دنیا میں ان کی بیخ کنی ہو کر آخرت میں گرفتارِ عذاب الیم کے ہوں اور سوائے اس کے مجھ کو اب نام اپنے پروردگار کا بھی ہے کہ جس کے نام کو ذریعۂ معافی اور توبہ کا کر کے مجھ سے ملتجی ہوئے ہیں اور نیز یہ بھی منظور رہے کہ تمام ملک والوں پر یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ میں طالب ملک اور ریاست کا نہیں ہوں بلکہ محض للہ فی اللہ بارگراں اس عبادتِ جہاد کا میں نے اپنے سر پر اٹھایا ہے کیونکہ بعض نادان اس ملک کے اپنے گمانِ فاسد سے مجھ کو بھی مثل دوسرے فاتحین کے طالب ملک اور جاہ کا سمجھتے ہیں۔[1]"

سید صاحبؒ کی یہ موثر تقریر سن کر ارباب بہرام خاں نے جو خود پشاور کے بہت بڑے رئیس اور ذی اثر سردار تھے سید صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر آپ خود اس شہر پر حکومت کرنا نہیں چاہتے اور اپنی طرف سے کسی اور کو حاکم بنانے کا فیصلہ ہی کر چکے ہیں تو اس شہر کی حکومت مجھے تفویض کر دیجئے، میں خیر خواہِ دین اور آپ کا خادم ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ چار ہزار جنگ جو افغانوں کا لشکر منظم کر کے تائید اسلام کے لئے ہر وقت کمربستہ رہوں گا۔ اس فوج کے جملہ اخراجات خود برداشت کروں گا اور میرے عہدِ حکومت میں یہاں شرعی نظام قائم رہے گا۔ اگر کسی وقت سردارانِ پشاور نے فوج کشی کی تو میں خود ان کا مقابلہ کروں گا آپ کو کبھی زحمت نہ دوں گا۔ یہ سن کر سید صاحبؒ مسکرائے اور فرمایا کہ میری اصل غرض تم ابھی تک نہیں سمجھے۔ اسی اثناء میں سلطان محمد خاں سردارِ پشاور کا سفیر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ سلطان محمد خاں آپ کی بیعت کے لئے آنے کی اجازت چاہتا ہے سید صاحبؒ نے فرمایا کہ وہ پہلے شاہ اسماعیلؒ سے مل کر ان سے نیابتہً بیعت کریں۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ موضع ہزار خانی تشریف لے گئے جو پشاور سے نصف کوس کے فاصلے پر جنوب کی طرف ہے۔ وہاں سلطان محمد خاں نے شاہ صاحبؒ کے ہاتھ پر سید صاحبؒ کی بیعت کی اور آئندہ کے لئے ان کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کیا اس کے بعد ایک مقررہ دن سید صاحبؒ جنگی لباس زیب تن کر کے اور اسلحہ لگا کر گھوڑے پر سوار ہوئے اپنے لشکر کے ہمراہ موضع ہزار خوانی تشریف لے گئے۔ سلطان محمد خاں نے آگے بڑھ کر سید صاحبؒ کا استقبال کیا۔ مصافحہ و معانقہ کے بعد سید صاحبؒ اور سلطان محمد خاں ایک قالین پر بیٹھ گئے اور سید صاحبؒ نے ایک گھنٹہ تک سلطان محمد خاں کو پند و نصائح فرمائیں۔ جہاد کی اہمیت و ثواب سے آگاہ کیا۔ رموزِ مملکت اور حکومت کی ذمہ داریاں سمجھائیں۔ خوفِ خدا اور رعایا کے ساتھ انصاف کرنے کی تلقین کی۔ سلطان محمد خاں اس اثناء میں سید صاحبؒ کے روبرو سر جھکائے بیٹھا رہا اور ہر بات پر درست و بجا کہتا رہا۔ اس ملاقات میں آپ نے سلطان محمد خاں کو

---

[1] تواریخ عجیبہ صفحہ ۱۲۵

اپنی طرف سے پشاور کا حاکم مقرر فرمایا اور مولوی سید مظہر علی عظیم آبادی کو جو جید عالم، نہایت بہادر اور مدبر بزرگ تھے پشاور کی عدلیہ کا سربراہ نامزد کیا۔ چالیس مجاہدین کو ان کی امداد و اعانت کے لئے پشاور میں متعین کیا اور خود اپنے مرکز پنجتار واپس روانہ ہو گئے۔

معاشرتی اصلاح

سید صاحبؒ کی پشاور سے واپسی کے بعد چند ماہ تک حالات نہایت سازگار و خوش گوار رہے۔ لوگ نماز دل میں مستعد ہو گئے۔ زکوٰۃ اور عشر باقاعدہ ادا کرنے لگے۔ علاقہ سمہ میں تو شرعی نظام کئی سال سے نافذ تھا اور وہاں کے سردار بھی زکوٰۃ اور عشر باقاعدگی سے ادا کر رہے تھے۔ اب پشاور پر سید صاحبؒ کے قبضے کے بعد وہاں بھی یہ نظام نافذ کر دیا گیا۔ ان تمام علاقوں میں جو سیّد صاحبؒ کے زیر تسلط تھے اور جہاں ان کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ زکوٰۃ اور عشر کی وصولی کے لئے تحصیلدار مقرر تھے جو اپنا فرض نہایت محنت اور دیانت داری سے ادا کرتے تھے۔ سید صاحبؒ کی اصلاحی تحریک صرف نماز کی پابندی اور عشر و زکوٰۃ کی ادائیگی تک محدود نہ تھی بلکہ اس کا مقصد معاشرے کو مکمل طور پر اسلامی سانچے میں ڈھالنا تھا۔ گویا معاشرتی اصلاح اور ظلم و ستم کا خاتمہ سید صاحبؒ کی تحریک کے اجزائے اعظم تھے۔ سیّد صاحب کو سمہ اور پشاور کے لوگوں نے بتایا کہ یہاں ایک رسم ہے کہ لڑکیوں کو نکاح کے باوجود اس وقت تک شوہروں کے ساتھ رخصت نہیں کرتے جب تک کہ ان سے ایک مقررہ رقم جو اکثر بڑی گراں ہوتی ہے، وصول نہ کر لیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روپیہ فراہم نہ ہونے کی وجہ سے ہزاروں افراد اپنی منکوحہ بیویوں کو اپنے گھروں میں آباد نہیں کر سکتے اور یہ لڑکیاں اپنے والدین کے گھروں میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ بعض روایات کے مطابق افغان عورتوں نے بھی سید صاحبؒ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ جہاں اور برائیوں کی اصلاح فرما رہے ہیں وہاں ہماری حالتِ زار کی جانب بھی توجہ فرمائیں۔ بلاشبہ یہ ایک بدرسم تھی، ظلمِ عظیم تھا جو ان مظلوم عورتوں پر روا رکھا جا رہا تھا۔ چنانچہ سید صاحبؒ نے پہلے علاقہ سمہ کے خوانین اور علماء کو طلب کر کے نصیحت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے کسی فرد یا قوم کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ روپیہ لئے بغیر اپنی دختروں کو کسی کے نکاح میں نہ دے اور اسے تجارت کا وسیلہ بنا لے۔ آپ نے فرمایا کہ :۔

ہر قوم میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں پیدا ہوتی ہیں پس جس قدر تم بعوض لڑکیوں کے دوسروں سے لیتے ہو اسی قدر اپنے لڑکوں کے نکاح میں دوسروں کو دیتے ہو۔ اس واسطے یہ نفع افغذِ روپیہ بعوض دختران فرضی ہے نہ کہ حقیقی اور چونکہ یہ لین دین سراسر خلافِ شریعت کے ہے۔ اس واسطے اس کو ترک کر دینا چاہئے۔ تم دیکھتے ہو

---

[1] ہزارہ گزیٹیر صث۲۰۱

اس رقم عوضِ نکاح کے ادا کرنے کے واسطے تم لوگ ہندوستان، ایران، توران وغیرہ ممالک میں جا کر گھر گھر بھیک مانگتے پھرتے ہو اور مدتوں تک مفقود الخبر رہتے ہو۔ بہت آدمی راہ میں مر جاتے ہیں اور بہت آدمی ان ملکوں میں کسی عورت کو مفت پا کر پھر یہاں واپس نہیں آتے اور لڑکیاں اپنے والدین کے گھروں میں بیٹھی ہوئی بڑھیاں ہو جاتی ہیں[1]۔"

سید صاحبؒ نے انھیں اس معاملے کے ایک اور پہلو کی طرف متوجہ کرتے ہوئے سمجھایا کہ اس طرح جو لڑکیاں اپنے والدین کے گھروں میں بیٹھی ہوئی ہیں اگر وہ اپنے شوہروں کے گھروں میں چلی جاتیں تو ان سے ہزاروں مسلمان پیدا ہو چکے ہوتے۔ یہ ساری خرابیاں اسی لئے رونما ہوتی ہیں کہ دولھا سے اتنی گراں قدر رقم طلب کی جاتی ہے جو اس کی طاقت اور وسعت سے زیادہ ہوتی ہے۔ علاقہ سمہ کے ان خانوں اور علماء نے سید صاحبؒ کے ارشادات کو بڑی توجہ سے سنا اور اس پر عمل کرنے کا عہد کیا۔ چنانچہ چند ہی ماہ میں ہزاروں عورتیں جو سالہا سال سے اس رسمِ بد کی وجہ سے اپنے والدین کے گھروں میں بیٹھی اپنی جوانی برباد کر رہی تھیں۔ شوہروں کے گھروں میں جا کر آباد ہو گئیں۔ اسی طرح پشاور پر غلبہ کے بعد آپ نے اس علاقے سے بھی یہ رسمِ بد موقوف کرنے کا فیصلہ کیا اور حکم دے دیا کہ:۔

"جن لڑکیوں کے نکاح ہو چکے ہیں اور ان کے شوہر چار چار کوس کے اندر ہیں انھیں آٹھ روز کے اندر اندر رخصت کر دیا جائے۔ جن لڑکیوں کے شوہر دور گئے ہوئے ہیں ان کی رخصتی کے لئے ایک ماہ کی مہلت مناسب ہوگی۔ جو شوہر غیر ممالک میں ہیں ان کی بیویوں کو تین ماہ میں شوہروں کے گھر بھیج دیا جائے"[2]۔

سمہ اور پشاور بلکہ سارے صوبۂ سرحد میں خوانین برسرِ اقتدار تھے۔ اس آبائی امارت نے ان کے مزاجوں میں سخت رعونت پیدا کر دی تھی۔ غرباء اور کمزوروں کی ان کی نظر میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ ان سے بڑی سختی سے بیگار لی جاتی تھی۔ تاجروں کی زندگی بھی عذاب میں تھی اور جس سردار کا جب جی چاہتا دکانداروں سے ضرورت کا سامان بغیر قیمت ادا کیے منگوا لیتا۔ سید صاحبؒ نے ان مظالم کا بھی سدِ باب کیا۔ غریب اور کمزوروں پر سے سرداروں اور خانوں کی بالادستی ختم ہو گئی۔ اس طرح امیر اور غریب، قوی اور کمزور ایک سطح پر آ گئے۔

سید صاحبؒ کے تحصیلداروں کا قتل

افسوس کہ سید صاحبؒ کی یہی اصلاحات اور مبارک اقدامات ان کے مصائب اور ناکامی کا سبب ہوئے۔ انہوں نے ظالم و جابر اور طاقتور سکھ حکومت کو تو بار بار شکست فاش دے کر اس کے حوصلے پست کر دیئے

---

[1] تواریخ عجیبہ ص ۱۲۳ [2] سید احمد شہید ص ۲۸۵

اور پشاور پر سید صاحبؒ کے غلبے کے بعد سکھوں کو اس مردِ درویش کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی مگر افغان سرداروں نے سید صاحبؒ کی راہ میں اتنی مشکلات پیدا کر دیں کہ ان کی چار ساڑھے چار سال کی جاں کاہ محنت ایک رات میں برباد ہو گئی۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ طبائع جو طویل عرصے مذہبی قیود کی پابندی سے آزاد تھیں۔ ظلم و ستم، فسق و فجور، قتل و خوں ریزی اور فتنہ و فساد جن کی سرشت میں داخل تھا انھیں راہِ راست پر لانا بہت مشکل تھا۔ سکھوں کی کئی دن کی یلغار سے مجبور ہو کر سرحد کے افغان سرداروں نے سید صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی اور ان کے جاں نثاروں میں شامل ہو گئے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ سکھوں کی لوٹ کھسوٹ اور ان کے ظلم و ستم سے محفوظ ہو جائیں گے۔ سید صاحبؒ کے متعلق ان کا خیال تھا کہ یہ ایک درویش آدمی ہیں جس طرح دوسرے مولوی ملاؤں کو یہ لوگ صدقہ و خیرات دیتے رہتے تھے اسی طرح انھیں بھی عشر کی رقم ادا کر دیا کریں گے اور آزادی سے حسبِ سابق اپنے علاقوں پر حکومت کریں گے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ سید صاحبؒ نے تو یہاں آکر باقاعدہ ایک نظام قائم کر دیا ہے جس میں صرف نماز کی پابندی نہیں بلکہ زکوٰۃ اور عشر بھی باقاعدہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ شراب، زنا، زیردستوں سے بیگار اور روزمرہ زندگی میں تمام بے اعتدالیوں سے کنارہ کشی گوارا کرنی پڑتی ہے تو وہ گھبرا گئے۔ وہ جس آزاد اور لہو و لعب کی زندگی کے عادی تھے اس کے مزے یاد کر کے کوشش کرنے لگے کہ وہی دور پھر واپس آجائے جس میں وہ جی بھر کے اپنے دل کی حسرتیں نکالیں اور کوئی ان سے پوچھنے والا نہ ہو۔ اپنی لڑکیوں کی قیمت وصول کرنے کی رسم ان میں بہت پرانی تھی اور جس لڑکی کی جتنی زیادہ قیمت ملتی تھی اس کی عزت لڑکے والوں اور خود لڑکے کے خاندان والوں میں اتنی ہی زیادہ سمجھی جاتی تھی[1]۔

اس رسم کا انسداد بھی افغانوں کو ناگوار گزرا اور انھوں نے اسے اپنے معاملات میں مداخلت خیال کیا۔ جن افغان سرداروں کے اقتدار پر ضرب لگی تھی انھوں نے اس رسم کے انسداد کے خلاف افغانوں کو خوب مشتعل کیا۔ غرض سید صاحبؒ کے ان اقدامات اور سخت شرعی نظام کے قیام نے افغانوں کے دلوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا اور انھوں نے یہ نہ سوچا کہ بظاہر یہ سخت نظام ان کے لئے اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے۔ ان باغیانہ سرگرمیوں میں سب سے زیادہ سرگرم حاکمِ پشاور سلطان محمد خاں تھا۔ چنانچہ اس نے علاقہ سمہ کے بعض سرداروں سے رابطہ قائم کیا اور اس "مصیبت" سے نجات پانے کی تدابیر ہونے لگیں ادھر سید صاحبؒ کے غلبے کی وجہ سے سرحد کے پرانے ملاؤں کی "دکانیں" بند ہو گئیں۔ ان کی اجارہ داری ختم ہو گئی اور مختلف مواقع پر جاہل افغانوں سے مذہب کے نام پر وہ لوگ جو غلہ وغیرہ وصول کرتے تھے اب اس سے محروم ہو گئے۔ چنانچہ ان کا ایک وفد سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ:

---

[1] ہزارہ گزیٹیئر ص ۲۶ (مرتبہ ۸۴-۱۸۸۳ء)

"یہ عشر ہمارا حق ہے ہم کو ملے کیونکہ ہم سب ان عشر دینے والوں کو رسوم اسلام کے سکھاتے ہیں اور لڑکا تولد ہوتا ہے تو اذان اس کے کان میں دیتے ہیں۔ جب بالغ ہوجاتا ہے تو نماز روزہ سکھاتے ہیں۔ نکاح ان کے کرتے ہیں۔ مرجاتا ہے تو جنازہ، کفن دفن ان کا مطابق احکام شرعی کے کرتے ہیں"[1]

سید صاحبؒ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اس وقت دین کی سب سے بڑی ضرورت کفار سے جہاد ہے جب تک تم لوگ اس میں حصہ نہ لو گے اس وقت تمہیں عشر میں سے بھی حصہ نہیں ملے گا۔ سید صاحبؒ کے اس جواب سے دل برداشتہ ہو کر یہ لوگ چلے گئے اور سادہ لوح افغانوں کو ان کے خلاف مشتعل کرنے لگے۔ ادھر رنجیت سنگھ نے سردارانِ پشاور اور خوانین سمہ کو ترغیب و تحریص کے ذریعے سید صاحبؒ سے متنفر کرنے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے بھی سکھ ایک موقع پر سردارانِ پشاور کو اسی قسم کا لالچ دے چکے تھے کہ "تم لوگ خلیفہ سید احمدؒ کو مار ڈالو اور قبضہ (علاقہ) یوسف زئی پر کر لو۔ یہ علاقہ تم کو عطا ہوگا"[2]

چنانچہ ان سب امور نے مل کر سید صاحبؒ کے خلاف عداوت اور بغاوت کی فضا پیدا کر دی۔ حاکم پشاور سلطان محمد خاں نے اس میں مرکزی کردار ادا کیا اور ایک روز پشاور کے قاضی سید مظہر علی عظیم آبادی اور سید صاحبؒ کے ایک عقیدت مند ارباب فیض اللہ خاں کو بلا کر قتل کرا دیا۔ اس کے بعد اسی کے ایماء سے پشاور اور علاقہ سمہ کے تمام تحصیلداروں اور ان لوگوں کو جو سید صاحبؒ کی طرف سے ان علاقوں کے انتظام پر مقرر تھے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس مقصد کے لئے جمعہ کی شب مقرر ہوئی اور طے یہ ہوا کہ رات کو مختلف مقامات پر آگ روشن کر دی جائے، بعض جگہ نقارے بجائے جائیں۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ قتل کی کارروائی شروع کر دو۔ اس سفاکانہ قتل کے لئے "مکی کوٹنے" کی اصطلاح مقرر ہوئی۔ یعنی جب آگ روشن ہو اور سید صاحبؒ کے مجاہدین دریافت کریں کہ یہ روشنی کیسی ہے تو اس کے جواب میں کہا جائے کہ غلۂ عشر جمع کرنے کے لئے ہر گاؤں کے لوگ جمع ہو رہے ہیں تاکہ سب مل کر مکی کوٹیں۔ غرض جمعہ کی رات کو "لوگ مجاہدین کے قتل کی تیاری کرتے رہے۔ ادھر کچھ مجاہدین سو رہے تھے، کچھ نماز کی تیاری میں مصروف تھے کہ ہر ایک گاؤں میں ان کا اچانک قتل عام شروع ہو گیا اور ایک ہی وقت میں قریب ا ـــــ ررر ہندوستانی قتل ہوا"[3]

سید جعفر علی نقوی کاتبِ خاص سید شہیدؒ کا بیان ہے کہ قاتلوں نے شہداء کے جسموں پر گھوڑے دوڑا کر انہیں روند ڈالا۔ اس عالم میں وہ ان سے کہتے جاتے تھے کہ "اب ہمیں نماز پڑھاؤ اور عشر وصول کرو"۔ نقوی مرحوم بے گناہ مجاہدین کے سفاکانہ قتل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"بعض مجاہدین عشاء کی نماز ادا کر رہے تھے۔ بعض نماز کی تیاری میں مصروف تھے کہ انہیں چاروں طرف سے

---

[1] ہزارہ گزیٹیر صہ ۲۴۔ [2] ایضاً صہ ۲۶۔ [3] ایضاً صہ ۳۰۔

زغے میں لے کر قتل عام شروع کر دیا۔ کچھ گاؤں میں نصف رات گئے، بعض میں صبح کی نماز سے قبل اور بعض مقامات پر نماز ادا کرتے ہوئے مجاہدین قتل کر دیئے گئے۔ کم کسے بود کہ فرصت یافتہ فرار نمود یا در جائے محفوظ خزید۔" (یعنی بہت کم لوگوں کو بھاگنے یا کسی محفوظ مقام پر پناہ لینے کا موقع مل سکا۔)

سید صاحبؒ کی ہزارہ کو روانگی

یہ حادثہ معمولی نہ تھا۔ صوبۂ سرحد کے اس علاقے میں سید صاحبؒ نے جن لوگوں کو مختلف انتظامی عہدوں پر مقرر کیا تھا ان میں بڑے بڑے صاحبانِ علم و فضل تھے بعض اعلیٰ درجے کے مدبّر تھے اور ہر ایک خوفِ خدا، عشقِ رسولؐ اور جرأت و شجاعت کا پیکر تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں سید صاحبؒ نے محنت شاقہ کے بعد اس مہتم بالشان مہم کے لئے تیار کیا تھا۔ ایسے علماء، مدبرین، شجاع اور سید صاحبؒ کے جاں نثار و وفادار گروہ کا رات کی رات میں اچانک قتل ہو جانا اتنا بڑا سانحہ تھا کہ اگر کوئی اور ہوتا تو اول تو وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکتا اور اگر برداشت بھی کر لیتا تو اس علاقے کے لوگوں پر نفرین بھیج کر چلا جاتا۔ ہمارے اکثر مورخوں نے بھی یہی لکھا ہے کہ اس واقعے کے بعد سید صاحبؒ دل برداشتہ ہو کر چلے گئے۔ یقیناً انہیں اس سانحۂ عظیم کا سخت دُکھ ہوا۔ اتنا دُکھ ہوا کہ اس کا اندازہ کرنا ہمارے لئے ممکن ہی نہیں مگر انھوں نے یک دم روانگی کا فیصلہ نہیں کیا بلکہ ایک روایت کے مطابق:

"جب خبرِ قتل ان سب کی خلیفہ سید احمدؒ کو پہنچی تو اس نے خواہ اپنی سلامت مزاجی یا مصلحتِ وقت کے کچھ شکایت زبان سے نہ کی اور جابجا دیہات اور خوانین کے نام احکام جاری کئے کہ جو کچھ ہو گیا وہ تقدیر کا معاملہ تھا، اب بھی توبہ کرو کہ پھر ایسا امر ہم سے سرزد نہ ہو گا۔"[2]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ میں انتقامی جذبہ بالکل نہ تھا نہ وہ فوراً مشتعل ہو جاتے تھے۔ اتنے بڑے حادثے نے بھی ان کے دل و دماغ کو ماؤف نہیں کیا۔ نہ وہ اس سانحۂ عظیم سے اس حد تک دل برداشتہ ہوئے کہ فوراً روانگی کا فیصلہ کر لیتے بلکہ اس حادثے کو انھوں نے کمال صبر و ضبط سے برداشت کیا اور ایک بار پھر کوشش کی کہ اس علاقے کو اس تباہی سے بچا لیا جائے جسے ان کی دُور بین آنکھیں دیکھ رہی تھیں مگر افسوس کہ سردارانِ پشاور اور علاقہ سمہ کے خود غرض خوانین نے سید صاحبؒ کے قلب کی تڑپ محسوس نہ کی اور انھوں نے پنجتار کے سردار فتح خاں پر دباؤ ڈالا کہ تم سید صاحبؒ کو اپنے علاقے سے نکال دو۔ ایک روایت کے مطابق علاقہ یوسف زئی کے ۵ ۳ ہزار افراد سید صاحبؒ سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ یہ کیفیت دیکھ کر

---

[1] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۰۰۳ [2] تواریخ ہزارہ صفحہ ۳، زیرِ نگرانی کپتان ایڈورڈ جارج ویس

آپؒ نے مناسب یہی سمجھا کہ اب اس علاقے سے چلے جائیں کیونکہ ان کی آخری کوشش بھی ناکام ہوگئی تھی چنانچہ آپ نے اپنے رفیقوں اور عقیدت مندوں کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے اس ملک کے لوگوں کو برسوں نصیحت کی اور ان کی اصلاح میں کوشاں رہا مگر افسوس کہ اصلاح کی بجائے انہوں نے سرکشی اختیار کی اور ان دین دار مسلمانوں کو نہایت ظلم اور بے رحمی سے قتل کر ڈالا جو اپنے اپنے علاقوں کا لب لباب اور عطر تھے میں ان کے خون کا انتقام خدا پر چھوڑتا ہوں۔ اب میں اس ملک میں نہ رہوں گا۔ اس کے بعد آپ نے غازیوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

"اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے تم کو اس عبادتِ جہاد میں میرا شریک فرمایا اور گرم و سرد اور رنج و راحت اور فتح و شکست میں محض واسطے مرضیٔ باری تعالیٰ کے تم آج تک میرے شریک رہے اور حقِ سعی اور نصرت اور شرکت کو پورا پورا ادا کیا۔ اب میں اس ملک سے ہجرت کر کے کسی ملک دور دست میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ خداوند تعالیٰ مجھ کو کہاں لے جائے گا۔ غالباً اس سفر میں تکلیفِ آب و دانہ اور ترک مالوفات و مرغوبات کی لازم آئے گی۔ پس جو شخص ایسی تکالیف کی برداشت کر کے صبر اور استقامت کر سکے اور کلمۂ شکایت مالکِ حقیقی کا زبان پر نہ لائے وہ میرے ساتھ چلے۔ پھر ایسا نہ ہو کہ بروقت درپیشی ایسی تکالیف کے کہنے لگے کہ اس سیدؒ نے ہم سے دغا کی۔ پس جو آدمی اپنے نفس میں قوت صبر اور استقامت کی رکھتا ہو وہ ہمارا شریک ہو۔ اور میں تو اپنی تمام عمر حصولِ رضامندیٔ مولائے حقیقی میں صرف کروں گا۔"[1]

سید صاحبؒ کی یہ دل سوز و اثر انگیز تقریر سن کر حاضرینِ مجلس میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو اشکبار نہ ہو گیا ہو سب نے متفقہ طور پر عرض کیا کہ ہم لوگ زندگی کے آخری لمحے تک آپ کا ساتھ دیں گے اور اپنی جان راہِ الٰہی میں قربان کر کے دم لیں گے آپ کو چھوڑ کر ہمیں ہفت اقلیم کی بادشاہی بھی قبول نہیں۔

سید صاحبؒ کے کاتبِ خاص اور "منظورۃ السعداء" کے مصنف مولوی جعفر علی نقوی کا بیان ہے کہ تقریر کے بعد سید صاحبؒ نے مولانا اسماعیلؒ صاحب سے فرمایا کہ "مولانا آپ کثرت سے قرآن حکیم کی تلاوت کیجئے اور ہم کثرت سے مراقبہ کریں گے تاوقتیکہ کسی ایسے مقام پر نہ پہنچ جائیں جہاں انتظام جہاد کی طاقت میسر آجائے۔"

سید صاحبؒ کے یہ نصیحت آمیز کلمات سن کر لوگوں کی آنکھوں سے چشمے کی طرح آنسو جاری ہو گئے اور بے شمار دل مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔[2]

جب سید صاحبؒ کی ہجرت کی خبر پنجتار اور اس کے مضافات کے لوگوں کو معلوم ہوئی تو وہ گروہ در گروہ آپ کی

---

[1] تواریخِ عجیبہ صفحہ ۱۳۱ [2] منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء صفحہ ۱۰۵۴ (قلمی) مولفہ مولوی جعفر علی نقوی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور۔

خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ ہمیں چھوڑ کر نہ جایئے۔ ہماری قوم نے آج تک آپ سے غداری نہیں کی۔ ہم شروع سے آپ کے غلام اور فرمانبردار ہیں اور آئندہ بھی آپ کی فرمانبرداری کرتے رہیں گے۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ سچ ہے کہ تم لوگوں نے آج تک میرے ساتھ فرمانبرداری وجاں نثاری کا سلوک کیا۔ میں تم سے بہت خوش ہوں مگر دوسری اقوام نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کے پیش نظر میں اس وقت تک یہاں نہیں ٹھہروں گا جب تک کہ تمہارا سردار (فتح خاں) جاں نثاری اور امداد کا وعدہ نہ کرے۔ فتح خاں کی دشواری یہ تھی کہ اسے سرداران پشاور اور بعض دوسرے افغان سرداروں نے پہلے ہی دھمکی دے دی تھی کہ تم سید صاحبؒ کو اپنے علاقے سے نکال دو ورنہ ہم سب مجتمع ہو کر تم پر حملہ کر دیں گے اس لئے وہ گھبرا گیا اور سید صاحبؒ کی حمایت وجاں نثاری کا عہد نہ کر سکا۔ اسی دوران میں ہزارہ کے سرداروں کی طرف سے سید صاحبؒ کی خدمت میں درخواستیں پہنچیں کہ آپ ہمارے ملک میں تشریف لے آیئے ہم آپ کے ساتھ پوری وفاداری وجاں نثاری کا سلوک کریں گے۔ چنانچہ سید صاحبؒ نے علاقہ پکھلی (ضلع ہزارہ) کی طرف روانگی کا فیصلہ کر لیا۔

نمازِ خاص کی تعلیم کی درخواست

سید صاحبؒ پنجتار سے روانہ ہونے کی تیاری کر رہے تھے کہ مولوی جعفر علی نقوی نے شیخ محمد اسحاق گورکھپوری کی زبانی سنا کہ سید صاحبؒ نے دہلی میں مولانا عبدالحیؒ کو دو رکعت نماز پڑھائی تھی اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد مولانا عبدالحیؒ نے کہا تھا کہ آج تک میں نے ایسی سرور آفریں نماز کبھی نہیں پڑھی تھی۔ آج معلوم ہوا کہ نماز کیا ہوتی ہے۔ یہ سن کر مولوی جعفر علی نقوی نے شیخ محمد اسحاق کی معرفت حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے بھی نہایت اشتیاق ہے کہ اس نماز کی تعلیم دیجئے جو آپ نے مولانا عبدالحیؒ کو پڑھائی تھی۔ سید صاحبؒ نے ان کا اشتیاق دیکھ کر فرمایا کہ اچھی بات ہے مگر دو تین افراد سے زیادہ نہ ہوں۔ چنانچہ شیخ محمد اسحاقؒ مولوی جعفر علی نقوی اور مولوی احمد اللہ ناگپوری کو بشارت دی گئی کہ ان اصحاب کو سید صاحبؒ اس نمازِ خاص کی تعلیم دیں گے لیکن جلد ہی یہ خبر عام ہو گئی اور پھر تو ہر شخص نے اس نماز میں شامل ہونے کی درخواست شروع کر دی یہاں تک کہ نمازِ عشاء کے بعد جب سید صاحبؒ نے ان تین اصحاب کو اس خاص نماز کی تعلیم کے لئے طلب کیا تو لوگوں کا جمِ غفیر ہو گیا۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ اگر ایک دو آدمی ہوتے تو کوئی مضائقہ نہ تھا مگر اب اتنے لوگ جمع ہو گئے ہیں اور آپ سب میرے بھائی ہیں۔ اب میں کسے نماز پڑھاؤں اور کسے محروم رکھوں۔ میں نے کچھ اور سوچا ہے اور انشاء اللہ کل نمازِ عصر کے بعد میں ایک جانب رختِ سفر باندھوں گا۔ یہ امر اس نماز کی تعلیم سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔[1]

---

[1] منظورة السعداء صفحہ ۱۰۵۰

اہلِ سمہ پر قہرِ الٰہی

اس کے بعد سید صاحبؒ پنجتار سے علاقۂ پکھلی (ضلع ہزارہ) کی طرف روانہ ہو گئے۔ سید صاحبؒ کے پنجتار سے رخصت ہونے کے چند ہی روز بعد سکھوں کے ٹڈی دل لشکر نے علاقۂ سمہ پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ سکھوں کے گزشتہ حملے اس کے سامنے گرد ہو گئے۔ انھوں نے سیکڑوں دیہات نذرِ آتش کر دیئے۔ مال و اسباب اور مویشی لوٹ لئے اور اہل سمہ کے ساتھ اس قدر ذلت ناک سلوک کیا کہ ان کی عورتیں اور بچے بھی اسیر کر کے لاہور لے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سکھ لشکر میں جو مسلمان تھے انھیں سکھوں نے سخت طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا اور کہا کہ تم تو بہت بری قوم کے لوگ ہو کہ اپنے مرشد و پیشوا کے ساتھ ایسی بدسلوکی روا رکھی دوسروں کو تم سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ سکھوں کے یہ طعن آمیز الفاظ سن کر ان کے لشکر میں شامل مسلمانوں کو اہل سمہ کی اس غداری پر سخت غصہ آیا جو انھوں نے سید صاحبؒ کے ساتھ کی تھی۔ چنانچہ اس بار پر جب سکھوں نے علاقۂ سمہ کے مسلمانوں پر حملہ کیا تو سکھ لشکر میں شامل مسلمانوں نے اہل سمہ کو سکھوں کے ظلم و ستم سے بچانے کی قطعاً کوشش نہیں کی حالانکہ اس سے پہلے وہ سکھوں کو مسلمان آبادی پر ظلم و زیادتی کرنے سے روکا کرتے تھے۔ پس اہلِ سمہ میں سے بعض لوگ بھاگ کر راستے میں سید صاحبؒ سے ملے اور نہایت عاجزی و زاری سے درخواست کی کہ ہمارے علاقے میں واپس تشریف لے چلیں اور ہمیں اس ظلم و ستم سے نجات دلائیں مگر سید صاحبؒ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق کہ لا یلدغ المومن حجرٍ واحد مرتین (مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا) ان کی درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن اہل سمہ کی عاجزی اور ان کا اصرار بڑھتا گیا۔ جب آپ راج دواری پہنچے تو اہل سمہ کے اس وفد سے صرف اتنا فرمایا کہ "جاؤ اور اپنے جلے ہوئے گھروں کو درست کرو۔"[1]

---

[1] منظورۃ السعداء ص ۹۳-۱۰۹۲

سید صاحبؒ کے عہد میں ہزارہ کی سیاست

پنجتار سے روانہ ہو کر سید صاحبؒ ہزارہ میں داخل ہوئے۔ اس کے مختلف مواضعات میں قیام کیا۔ یہاں کے مختلف علاقوں میں مجاہدین اور سکھوں کے درمیان پے در پے جنگیں ہوئیں۔ سید صاحبؒ کے ہزارہ تشریف لانے سے قبل بھی اس علاقے کے متعدد مقامات مجاہدین اور سکھوں کے درمیان میدانِ جنگ بن چکے تھے اور آخر کار اسی ہزارہ کے ایک مقام بالاکوٹ میں سید صاحبؒ اور آپ کے بہت سے رفقاء سکھوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے ہزارہ کے سیاسی حالات اور سید صاحبؒ کے زمانے میں جو واقعات پیش آئے ان کا پس منظر بیان کر دیا جائے۔ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے ہزارہ کو سید صاحبؒ کے عہد میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ مغلیہ دورِ حکومت میں اگرچہ یہ مغل سلطنت کا ایک حصہ تھا مگر عملاً یہاں افغانوں، ترکوں اور گکھڑوں کی حکومت تھی اور یہی تین قومیں اس کے مختلف حصوں پر قابض تھیں۔ مغلیہ سلطنت کے عہدِ زوال میں ان قوموں کے سردار خود مختار ہو گئے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس نے پنجاب، صوبہ سرحد اور کشمیر کے ساتھ ساتھ ہزارہ بھی فتح کر لیا۔ افغانستان سے کشمیر جانے کا راستہ ہزارہ میں سے ہو کر جاتا تھا اس لئے افغانی فوجوں کی اس علاقے میں آمد و رفت رہتی تھی۔ کشمیر جاتے ہوئے ان کے سردار اس علاقے کے لوگوں سے مالیہ وصول کرتے تھے اور ہزارہ کے رئیس افغان فوجوں اور افغان حاکموں کی ضیافت اور حسبِ ضرورت اپنی فوجوں سے ان کی امداد بھی کرتے تھے مگر جب ابدالی کے جانشینوں میں کمزوری آ گئی تو ہزارہ کے سرداروں نے سرکشی اختیار کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاکمِ افغانستان اور ہزارہ کے سرداروں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔

ہزارہ سے افغانی اقتدار کا خاتمہ

۱۸۰۰ء میں محمود شاہ افغانستان کا حکمران ہوا۔ اس نے اپنے ایک سردار سمندر خاں درانی کو اہلِ ہزارہ

کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ اس نے اس علاقے میں سخت تباہی مچائی اور بہت سے گاؤں کو جلاکر راکھ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اٹک کے ناظم کو ہزارہ کا منتظم مقرر کیا۔ ناظم اٹک نے حاجی وہاب خاں نامی ایک شخص کو ہزارہ کا مالیہ وصول کرنے پر مامور کیا۔ وہ تین سو سواروں اور کچھ پیادوں کی جمعیت کے ہمراہ ہزارہ آیا اور سکندرپور کے مقام پر ہزارہ کے سرداروں کو طلب کیا۔ ان میں محمد خاں ترین بھی تھا جو ہزارہ کا سب سے بڑا اور دلیر سردار تھا۔

جب حاجی وہاب نے سرداران ہزارہ سے فصلِ خریف کا مالیہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا تو محمد خاں ترین اور حاجی وہاب خاں کے درمیان تلخ کلامی ہوئی اور محمد خاں غصے کی حالت میں مجلس سے اُٹھ کر چلا گیا۔ حاجی وہاب خاں کو محمد خاں کا یہ انداز ناگوار گزرا اور اس نے محمد خاں کے گاؤں "درویش" پر حملہ کر کے اس کے مکانات کو نذرِ آتش اور بعض کو منہدم کرا دیا۔ محمد خاں ترین نے اس واقعہ کا بدلہ لینے کی تیاری شروع کر دی اور ترکوں، افغانوں اور مشوانیوں کا لشکر مرتب کر کے حاجی وہاب خاں کی قیام گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ ابھی حاجی وہاب نیند سے بیدار بھی نہ ہوا تھا کہ بندوقیں سر ہونے لگیں۔ اس نے جلدی سے گھوڑا تیار کرایا اور باہر آکر محمد خاں ترین سے مقابلہ شروع کر دیا مگر قسمت نے یاوری نہ کی اور اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں کام آیا۔ اس کی فوج کے پیر اکھڑ گئے۔ وہاب خاں کے گھوڑے، اسلحہ، نقد و جنس اور خیمے غرض سارا سامان محمد خاں ترین کے قبضے میں آگیا۔[1]

اس واقعے کے بعد اہلِ ہزارہ کے دلوں سے افغان حکومت کا رعب و دبدبہ اُٹھ گیا۔ ان میں سے بعض نے کھلم کھلا بغاوت کر دی بعض نے مالیہ ادا کرنا بند کر دیا۔ ۱۸۰۲ء کے قریب افغان حکومت روبہ زوال ہو گئی اور ہزارہ کے تمام سردار باغی ہو گئے۔ البتہ جب افغان حاکم کشمیر جاتے ہوئے ہزارہ سے گزرتے تو طاقت کے زور سے جو کچھ وصول ہوتا لے لیتے۔ بہت سے لوگ افغان فوجوں کی آمد کی خبر سُن کر پہاڑوں میں رُوپوش ہو جاتے تھے۔ جب افغان لشکر گزر جاتا تو اپنے گھروں میں واپس آجاتے اور مالیہ ادا کرنے سے بچ جاتے۔[2]

افغانستان کی مرکزی حکومت کی کمزوری دیکھ کر ہزارہ کے سردار خود مختار ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں باہمی آویزش شروع ہو گئی۔ اس طرح ہزارہ خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ ان خود مختار اور باہم برسرِ پیکار رہنے والے سرداروں میں محمد خاں ترین، ہیبت خاں، گل شیر خاں، سعادت خاں، ہاشم علی خاں ہندوال، احمد علی خاں، حسن علی خاں کرڑال، راجہ مہندی علی خاں گکھڑ، راجہ شیر محمد خاں گکھڑ، نواب خاں، پائندہ خاں، سربلند خاں تنولی، حبیب اللہ خاں سواتی اور صالح محمد مشوانی کے نام قابلِ ذکر ہیں ان میں سے ہر سردار اپنے علاقے کا مطلق العنان حاکم تھا اور دوسرے سے برسرِ پیکار رہتا تھا۔ انہی کی باہمی آویزش اور خانہ جنگیوں نے سکھوں کو دخل اندازی کا موقع دیا۔ ذیل میں ہزارہ کے سرداروں کی ان خانہ جنگیوں کی اجمالی کیفیت درج کی جاتی ہے تاکہ سید صاحبؒ کے

---

[1] جنگ خورد و بُرد سنگھاں و درانیاں (فارسی قلمی) مولفہ منشی مہتاب سنگھ۔ [2] تواریخ ہزارہ صفحہ ۶۵

عہد کے ہزارہ کا سرسری نقشہ سامنے آجائے اور ان کی مشکلات کا اندازہ کیا جا سکے۔

قبیلۂ ترین کے خلاف شورش

ہزارہ کے سرداروں میں نجیب اللہ خاں ترین نہایت بہادر، صاحب تدبیر اور نامور سردار گزرا ہے۔ حکومتِ درانی کی طرف سے ہزارہ کا گورنر مقرر ہوا اور نہایت دانشمندی سے علاقے کا انتظام کیا۔ ۱۷۹۹ء میں اس بہادر سردار کا انتقال ہوگیا۔ اس کے انتقال کے وقت اس کا فرزند محمد خاں ترین نابالغ تھا۔ اس لئے مضافات کی اقوام نے ہزارہ میں شورش برپا کر دی۔ خود ترینوں میں بھی اختلاف ہوگیا۔ امن و امان معدوم ہو کر ہر طرف انتشار و فساد کی صورت پیدا ہوگئی۔ نجیب اللہ خاں کی بیوہ نہایت عقیل و فہیم عورت تھی۔ اس نے ایک گوجر سردار مقدم مشرف کو بلا کر اپنے علاقے کا انتظام اس کے سپرد کر دیا[1]۔ مقدم مشرف نہایت نیک نفس، عالی حوصلہ اور شجاع انسان تھا۔ اس نے نجیب اللہ خاں ترین کے علاقے کا انتظام ہاتھ میں لیتے ہی اپنی شجاعت اور تدبر سے فتنہ و فساد کا وقتی طور پر خاتمہ کر دیا لیکن تزک گکھڑ، دلازاک اور اتمان زئی قبیلے کے لوگوں نے مقدم مشرف کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ آئے دن کبھی ایک قبیلہ سرکشی کرتا کبھی دوسرا۔ مقدم مشرف ان سب کا بڑی بہادری سے مقابلہ کرتا اور شکستیں دیتا رہا۔ اس طرح ہزارہ میں شورش جاری رہی۔

ہیبت خاں اور گل شیر خاں کی کشمکش

اسی دوران میں ہزارہ کی تنولی قوم کے دو سرداروں ہیبت خاں اور گل شیر خاں کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی اور گل شیر خاں نے ہیبت خاں پر چڑھائی کر کے اس کا گاؤں نذرِ آتش کر دیا۔ ہیبت خاں مقابلہ نہ کر سکا اور گل شیر خاں کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھایا۔ دونوں میں صلح ہوگئی۔ اس صلح کو پائیدار بنانے کے لئے گل شیر خاں کے بیٹے احمد علی خاں کا نکاح ہیبت خاں کی بیٹی سے اور ہیبت خاں کے بیٹے ہاشم علی خاں کا نکاح گل شیر خاں کی بیٹی سے طے پا گیا۔ اس دوران میں ہیبت خاں کے فرزند ہاشم علی خاں اور نواب خاں اپنی طاقت میں اضافہ کرتے رہے یہاں تک کہ ساری قوم ہندوال نے ہاشم علی خاں کو اپنا سردار بنا لیا۔ اس کے بعد ہاشم علی خاں نے گل شیر خاں سے دربند اور گڑھی کی واپسی کا مطالبہ کیا جس پر گل شیر خاں نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر گل شیر خاں کے فرزند احمد علی خاں کو فکر پیدا ہوئی کہ اگر ہاشم علی خاں کی طاقت میں اسی طرح اضافہ ہوتا گیا تو وہ سارے علاقے پر تسلط قائم کر لے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے قبیلے کے لوگوں سے مشورہ کر کے ہاشم علی خاں کو شکار کی دعوت دی

---

[1] تاریخ ہزارہ صفحہ ۱۰۱ مولفہ ویس

اور یہ پیغام بھی بھیجا کہ اپنی بیوی (احمد علی خاں کی ہمشیرہ) کو ہمراہ لے آئے تاکہ دربند اور گڑھی جن کا ہاشم علی خاں نے مطالبہ کیا تھا۔ اس کی بیوی (اور اپنی بہن) کے نام منتقل کر دیئے جائیں۔ ہاشم علی خاں نے یہ دعوت قبول کر لی اور احمد علی خاں کے پاس چلا آیا۔ چند روز کے بعد موقع پا کر احمد علی خاں کے مسلح سپاہیوں نے ہاشم علی خاں پر یک بارگی یورش کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔

سربلند خاں اور احمد علی خاں کا تصادم

جب ہاشم علی خاں کے بھائی نواب خاں کو اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے عطا محمد خاں گورنر کشمیر سے امداد کی درخواست کی۔ عطا محمد خاں نے افغانوں کا ایک لشکر نواب خاں کی امداد کے لئے بھیج دیا۔ احمد علی خاں کو بھی اس لشکر کی آمد کا علم ہو گیا۔ چنانچہ وُہ اپنی ریاست سے فرار ہو گیا۔ عطا محمد خاں کے افغان لشکر نے احمد علی خاں کی ریاست میں داخل ہو کر اس کے مکانات جلا دیئے اور اس کا گاؤں ویران کر دیا۔ افغان لشکر کی واپسی کے بعد احمد علی خاں اپنی ریاست میں واپس آ گیا۔ دُوسری طرف تنولیوں کے ایک اور سردار سربلند خاں سے احمد علی خاں کے اختلافات شروع ہو گئے اور سربلند خاں نے اپنے کارندوں کے ہاتھوں احمد علی خاں کو عین اس وقت قتل کرادیا جب وہ نماز پڑھ رہا تھا اور رکوع کی حالت میں تھا۔[1]

کمال خانیوں اور ہاشم خانیوں کی عداوت

ہزارہ کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ سردارانِ ہزارہ کی باہمی عداوت کی وجہ سے سکھوں کو اس علاقے میں دخل اندازی کا موقع ملا اور پھر رفتہ رفتہ انھوں نے اس علاقے پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ ترکوں کی دو شاخوں کمال خانی اور ہاشم خانی کے درمیان عداوت اس کا فوری سبب بنا۔ ترک سردار عنایت خاں نے ایک دُوسرے سردار قلیچ بیگ کو قتل کرا دیا۔ قلیچ بیگ کے ماموں سلام خاں نے انتقاماً عنایت خاں کو مروا دیا۔ عنایت خاں کی والدہ جیوئی بیگم نے اپنے بیٹے کمال خاں کے خون کا بدلہ لیا اور سلام خاں کو مع اس کے دو قرابت داروں کے تہ تیغ کرا دیا۔ عنایت خاں کا بیٹا ہاشم خاں اس وقت کمسن تھا، جوانی کی عمر کو پہنچ کر اس نے باپ کا انتقام لیا اور ۱۸۰۹ء میں کمال خاں کو قتل کرا دیا۔ کمال خاں کا بیٹا فتح خاں محمد خاں ترین کی پناہ میں چلا گیا اور اس سے طالبِ امداد ہوا۔ محمد خاں ترین یُوں بھی کمال خاں کا دوست اور حلیف تھا۔ جب اس کا بیٹا یتیم ہو کر پناہ اور امداد کا طالب ہوا تو اس کی غیرت نے خاموش رہنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ اس نے راجہ ہاشم خاں پر حملہ کر دیا۔ ہاشم خاں تابِ مقابلہ نہ لا سکا

---

[1] تاریخ منشی مہتاب سنگھ (فارسی قلمی)

اور شکست کھا کر فرار ہو گیا۔

ہزارہ میں سکھوں کی مداخلت

اپنے مسلمان حریف سے انتقام لینے کے لئے ہاشم خاں راولپنڈی پہنچا اور وہاں کے سکھ حاکم سے طالبِ امداد ہوا۔ سکھ تو ایسے مواقع کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ سردار مکھن سنگھ سکھ فوجوں کے ساتھ ہاشم خاں کی معیت میں داخلِ ہزارہ ہوا۔ سکھوں نے محمد خاں ترین کا گاؤں نذرِ آتش کر دیا اور اس کے علاقے پر قبضہ کر کے سرائے صالحہ میں اپنا تھانہ قائم کر دیا جہاں سکھ فوج مستقل طور پر رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ ہزارہ کے بیشتر حصہ پر سکھوں کا مکمل قبضہ ہو گیا اور سردار حکماں سنگھ چمینی کو اس علاقے کا حاکم مقرر کیا گیا۔ حکماں سنگھ نے مکھن سنگھ کو ہزارہ کا مالیہ وصول کرنے پر متعین کیا۔ اس نے محمد خاں ترین سے مالیہ کی ادائیگی کا مطالبہ کیا اور ایک سخت خط لکھا۔ محمد خاں نے اس سخت خط کا سختی سے جواب دیا۔ مکھن سنگھ بپھر گیا اور لشکر لے کر لڑائی کے لئے نکلا۔ محمد خاں نے ہزارہ کے افغانوں اور مشوانہ قبیلے کے لوگوں کی جمعیت فراہم کی۔ دونوں فوجوں میں سخت جنگ ہوئی۔ مکھن سنگھ مارا گیا، سکھوں کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر اپنی گڑھی میں چھپ گئے۔ جب یہ خبر لاہور پہنچی تو رنجیت سنگھ نے اپنے آزمودہ کار جرنل دیوان رام دیال کی زیرِ سرکردگی ایک زبردست لشکر روانہ کیا۔ سری کوٹ کے مقام پر محمد خاں ترین اور دیوان رام دیال کی فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ خونریز جنگ کے بعد پھر سکھوں کو شکست ہوئی۔ اس لڑائی میں دیوان رام دیال بہت سے سکھ سرداروں کے ساتھ کام آیا اور سکھوں کی فوج ہزیمت اٹھا کر بھاگ نکلی۔

اس صورتِ حال سے رنجیت سنگھ سخت پریشان ہوا اور اس نے اپنے ایک اور جنگجو سردار امر سنگھ مجیٹھ کو ہزارہ کی تسخیر و انتظام پر مامور کیا۔ ادھر محمد خاں ترین کی پے در پے کامیابیوں سے اس کے حریف سردار اس کی طاقت سے خائف ہو گئے اور ان میں سے بعض امر سنگھ سے مل گئے اور اسے مالیہ دینا شروع کر دیا۔ اس طرح محمد خاں ترین کی طاقت کو ضعف پہنچا اور مجبور ہو کر اس نے بھی امر سنگھ کی اطاعت قبول کر لی۔ اسی دوران میں سردار امر سنگھ نے ہزارہ کے ایک با اثر اور طاقت ور سردار حسن علی خاں کرڑال کا زور توڑنے کے لئے ناڑہ پر حملہ کر کے یہ علاقہ فتح کر لیا۔ حسن علی خاں اپنے ساتھیوں کو لے کر ناڑہ سے نکل گیا اور اپنے قبیلے کے لوگوں کو مجتمع کر کے سردار امر سنگھ پر اس زور کا حملہ کیا کہ وہ مع اپنے چھوٹے بھائی ہری سنگھ کے اس جنگ میں مارا گیا اور سکھوں کو سخت شکست ہوئی۔[1]

---

[1] ہزارہ گزیٹئر صفحہ ۶۸۹

ہری سنگھ نلوہ کا تقرر

اس شکست کی خبر سُن کر رنجیت سنگھ نے اپنے فرزند شیر سنگھ اور اپنی خوش دامن سدا کور کو ہزارہ روانہ کیا۔ اس لشکر کے ساتھ کرنل الٰہی بخش کی معیت میں ایک توپ خانہ بھی تھا۔ اس لشکر نے تربیلہ پہنچ کر ایک گڑھی تعمیر کرائی اور محمد خاں ترین سے خراج لے کر واپس ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق مہارانی سدا کور نے محمد خاں ترین کو فرزند کا خطاب دیا۔ گویا سکھ لشکر نے محمد خاں کی طاقت اور شجاعت کا اقرار کیا اور اس سے جنگ کرنے سے گریز بھی کیا۔ اس طرح ہزارہ کے حالات جُوں کے تُوں رہے بلکہ محمد خاں ترین کے اثر و اقتدار میں اور اضافہ ہو گیا۔ اسی دوران میں ایک واقعہ یہ ہوا کہ رنجیت سنگھ نے سردار ہری سنگھ کی بجائے دیوان موتی رام کو کشمیر کا گورنر مقرر کیا اور ہری سنگھ کو جلد لاہور پہنچنے کی ہدایت کی۔ جب سردار مذکور اپنی سات ہزار فوج کے ساتھ پکھلی کے راستے سے لاہور جا رہا تھا تو مانگل کے مقام پر جدون اور تنولی قبائل کو ساتھ لے کر محمد خاں ترین نے ہری سنگھ کا راستہ روکا اور مطالبہ کیا کہ سامان کا محصول ادا کرو۔ ہری سنگھ نے محصول دینے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی۔ محمد خاں ترین کا لشکر خوب جم کر لڑا لیکن فتح آخر کار سکھوں کو ہوئی۔ ہری سنگھ نے جنگ کے بعد نواں شہر میں ایک گڑھی تعمیر کی اور اس میں سکھ فوج متعین کر دی۔ ہری سنگھ نے لاہور پہنچ کر جب رنجیت سنگھ کو بیش قیمت تحائف اور زرِ نقد پیش کیا اور ساتھ ہی فتح مانگل کی خوشخبری سنائی تو اس نے ہری سنگھ کے ذمہ کشمیر کی جو رقم واجب الادا تھی نہ صرف وہ معاف کر دی بلکہ اسے ہزارہ کا گورنر بھی مقرر کر دیا۔ اسی دوران میں محمد خاں ترین لاہور آیا اور دیوان چند کی معرفت رنجیت سنگھ سے ملا۔ رنجیت سنگھ اس کی طاقت سے پہلے ہی خائف تھا اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بیس ہزار کی جاگیر محمد خاں کے نام لکھ دی۔ اس کے بعد ہری سنگھ اور محمد خاں دونوں ہزارہ آئے۔ اب ہزارہ کے بیشتر حصے پر سکھوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ تربیلہ، مانگل، دربند اور ننکیاری میں سکھوں کی گڑھیاں تعمیر ہو گئی تھیں اور ان گڑھیوں میں سکھ فوجیں متعین تھیں جن کا کام نہایت ظلم و ستم سے مالیہ وصول کرنا تھا۔ کمزور اور غرباء ان کی زیادتیوں کا بُری طرح نشانہ بنے ہوئے تھے۔

ہری سنگھ اور سردارانِ ہزارہ کی جنگیں

جب سکھ فوجوں اور ان کے سرداروں کا ظلم حد سے تجاوز کر گیا تو مفتوحہ علاقے کے سرداروں نے سری کوٹ کے مقام پر جمع ہو کر سکھوں سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ دیکھ کر ہری سنگھ نے سری کوٹ پر فوج کشی کر دی۔ محمد خاں ترین نے اپنے ہم وطنوں کا ساتھ دیا۔ اس جنگ میں افغانوں نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور

ہزارہ گزیٹر کے مطابق افغانوں کی گولیوں سے سکھوں کے جھتے کے جھتے موت کی آغوش میں سو گئے۔ دوپہر تک جنگ ہوتی رہی۔ ادھر عثمان زئی کی کمک آگئی اور سکھوں کا جو لشکر ڈھاکہ[1] پر چڑھ گیا تھا اسے مشوانیوں نے تہ تیغ کر دیا۔[2] اس سخت شکست کے بعد ہری سنگھ اپنی باقی ماندہ فوج کے ہمراہ سکندر پور کی طرف فرار ہو گیا۔ اس شکست کے بعد اس نے ایک قلعہ تعمیر کرایا اور اس کا نام ہرکشن گڑھ رکھا۔ اس قلعے میں مقیم فوج کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اس کے قریب ایک بستی بسائی گئی۔ اس بستی کا نام ہری سنگھ نے اپنے نام پر ہری پور تجویز کیا جو اب ترقی کر کے ایک بڑے شہر کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس کے بعد ہری سنگھ ہرکشن گڑھ کے قلعے میں فوج متعین کر کے ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور ڈیرہ غازی خاں کی طرف چلا گیا اور سردار ہرسا سنگھ کو اس فوج کا نگراں اور علاقے کا منتظم مقرر کر گیا۔

ہرسا سنگھ نے اپنی نادانی سے محمد خاں ترین کو مشتعل کر دیا اور اس کی جاگیر سے شیشم کا ایک درخت اس کی اجازت کے بغیر کٹوا لیا۔ بات اتنی بڑھی کہ دونوں میں جنگ ہو گئی۔ محمد خاں کی فوج نے قلعہ ہرکشن گڑھ کا ایسا سخت محاصرہ کیا کہ اہل قلعہ کو جان کے لالے پڑ گئے۔ ادھر قلعہ دربند پر تنولی اور افغان قوموں نے قبضہ کر لیا اور تنکیاری کو سواتیوں سے فتح کر کے سکھوں کو قتل کر دیا۔ اسی طرح نواں شہر بھی سکھوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جب یہ حالات ہری سنگھ کو معلوم ہوئے تو وہ ہزارہ واپس آیا اور ہرسا سنگھ، مہان سنگھ، بدھ سنگھ اور ہری سنگھ نے متحدہ فوجی طاقت سے ہزارہ کے سرداروں پر حملہ کیا۔ نواں شہر اگرور، مگڑی، حاجی میرا، بھگورا، کونش اور تنکیاری میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان سخت جنگیں ہوئیں۔ نواں شہر میں سکھ فوج نے خانۂ خدا کو بھی نہ چھوڑا اور اسے آگ لگا دی۔ اس میں کئی سو آدمی پناہ گزیں تھے۔ بیشتر جل کر اندر ہی راکھ ہو گئے۔ اسی طرح سکھ لشکر نے اگرور میں سیکڑوں بے گناہ مسلمان عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا اور ان میں سے بہت سی عورتوں کو پنجاب لے جا کر فروخت کر دیا۔ متعدد دیہات نذر آتش کر دیئے۔ ان کی لوٹ مار سے شاید ہی کوئی گاؤں بچا ہو۔ ہزارہ کے علاقہ تناول کا سردار سربلند خاں بڑا باہمت آدمی تھا۔ ہری سنگھ نے اس پر بھی حملہ کیا اور اس کے مسکن موضع شنگری کو نذر آتش کر دیا۔ ان دنوں سربلند خاں موضع باندہ لوہاراں میں مقیم تھا۔ یہ خبر سن کر اس نے اپنے فرزند شیر محمد خاں کو ہری سنگھ کا مقابلہ کرنے کے لئے بھیجا۔ شیر محمد خاں نے اپنی جمعیت کے ساتھ سکھ لشکر پر اس زور کا حملہ کیا کہ وہ شکست کھا کر پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ اب ہری سنگھ خود میدان میں آیا اور تازہ دم فوج کے ساتھ شیر محمد خاں پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں شیر محمد خاں بڑی بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ ہری سنگھ نے شیر محمد خاں کا سر قلم کروا کر ہری پور کے قلعہ پر آویزاں کروا دیا۔ شیر محمد خاں کی فوج شکست کھا کر سری کوٹ چلی گئی۔ سربلند خاں

---

[1] ہزارہ کی مقامی اصطلاح میں "ڈھاکہ" پہاڑ کی اس چوٹی کو کہتے ہیں جو بلند و بالا درختوں سے ڈھکا ہوتا ہے۔ (مولف)

[2] ہزارہ گزیٹر صد ۶۹۳

نے بھی سری کوٹ کا رُخ کیا۔ محمد خاں ترین پہلے سے سری کوٹ میں موجود تھا۔ اس طرح اس مقام پر ہزارہ کے دو بہادر سرداروں کا اجتماع ہوگیا۔ دونوں کے ساتھ جنگجو افراد کی خاصی تعداد بھی تھی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ہری سنگھ نے اپنے ہواخواہوں کے مشورے پر سری کوٹ فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ وہ ایک بڑا لشکر لے کر جو سات ہزار سوار و پیادہ، ایک سو چھوٹی اور دو بڑی توپوں پر مشتمل تھا، سری کوٹ کی طرف روانہ ہوا۔

ہری سنگھ کی شکست

ناڑہ سید خانیاں کے مقام پر دونوں فوجیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئیں۔ صبح سے شام تک جنگ ہوتی رہی مگر ہری سنگھ کو کامیابی نہ ہوئی۔ شام کے قریب سکھوں کی تمام جمعیتیں فرار ہوگئیں۔ صرف وہ مورچہ قائم تھا جہاں ہری سنگھ جنگ کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں مہان سنگھ کا چھوٹا بھائی کشن سنگھ ایک جمعیت کے ساتھ مورچہ سے نکل کر فیصلہ کن جنگ کرنے میدان میں آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ترکوں اور افغانوں کے ہاتھوں مقتول ہوا۔ یہ دیکھ کر سردار مہان سنگھ اور ہری سنگھ بھی مورچے سے نکلے۔ کچھ دیر مقابلہ کرنے کے بعد ہری سنگھ تو زخموں سے چُور ہوکر پہاڑ کی تلی میں جاگرا اور مہان سنگھ موقع پاکر فرار ہوگیا۔ ہری سنگھ کو بہت بری حالت میں چارپائی پر ڈال کر ہری پور پہنچایا گیا۔ اس جنگ میں سکھوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ ان کے بڑے بڑے سردار اور جرنیل مثلاً کشن سنگھ، جمعیت سنگھ اور مولراج قتل ہوگئے۔ چھوٹے افسروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ سیکڑوں پیادے اور سوار مارے گئے۔

رنجیت سنگھ کی آمد اور ہزارہ پر تسلّط

جب رنجیت سنگھ کو اس شکست کا حال معلوم ہوا تو وہ خود بہت بڑا لشکر اور توپ خانہ لے کر ہزارہ آیا۔ اس نے علاقہ تربیلہ پہنچ کر بہت تباہی مچائی۔ گاؤں کو نذرِ آتش اور آبادی کو قتل کرنا شروع کیا۔ محمد خاں ترین کو ملاقات کے بہانے بلوایا اور گرفتار کرکے ہری سنگھ کے حوالے کردیا جس نے نہایت بے دردی سے یعنی خشک نمکین روٹی کھلا کھلا کر اسے مروادیا۔ اسی دوران میں مضافاتِ تربیلہ کے ایک گاؤں "کھبل پٹھاناں" کے افغانوں نے رنجیت سنگھ پر بندوقوں سے حملہ کردیا۔ اس حملے کا انتقام لینے کے لئے رنجیت سنگھ کے حکم سے ہری سنگھ نے "کھبل پٹھاناں" کو جلا کر خاک سیاہ کردیا۔

رنجیت سنگھ نے حکمت عملی سے کام لے کر بعض افغان اور ترک سرداروں کو جاگیریں دے کر اپنا دوست بنالیا۔ بعض علاقوں پر اس کے جرنیلوں نے بہ زور و قوت قبضہ کرلیا۔ بعض بدستور آزاد اور برسرِ پیکار رہے۔ علاقہ کھلی، تناول، تربیلہ، سرائے صالحہ، دربند اور مانسہرہ پر سکھوں کا پورا تسلط قائم ہوگیا۔ انب کا سردار

نواب پائندہ خاں بڑا طاقت ور، اور جی دار آدمی تھا۔ ابتداء میں حالات کے تحت اس نے رنجیت سنگھ کی اطاعت اختیار کر لی مگر سکھوں کی دست درازیوں سے مجبور ہو کر ان کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر اگرور پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ اس کے پاس فوج اور سامانِ جنگ کی قلت تھی مگر اس نے بڑی بہادری سے جنگ جاری رکھی اور کئی مقامات پر سکھوں کو شکست دی۔ اس کی حوصلہ مندی اور بے خوفی کا اندازہ کرنے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ ڈھاکہ بھیکڑہ کے مقام پر خیمہ زن ہو کر اس نے براہ راست سردار ہری سنگھ سے مقابلہ شروع کیا اور یہ دلیرانہ اعلان کر دیا کہ "جو شخص ایک سکھ کا سر کاٹ کر لائے گا اسے بیس روپے انعام دیا جائے گا"[1] چنانچہ اس اعلان کے بعد بہت سکھ مارے گئے۔ آخر کار ہری سنگھ کو پائندہ خاں سے صلح کرنی پڑی اور وہ مع اپنی فوج کے پنجاب واپس چلا گیا۔ پائندہ خاں بلا شبہ بہت دلیر اور ہوشیار سردار تھا مگر افسوس کہ اس میں خلوص کی کمی تھی اور یہ بھی ہزارہ کے دوسرے سرداروں کی طرح صرف اپنی ریاست بچانے کی فکر میں رہتا تھا۔ یہ جتنا اولوالعزم، باہمت اور صاحبِ تدبیر سردار تھا اگر اس میں اسی قدر قومی اور اسلامی مفادات سے محبت بھی ہوتی تو بلا شبہ اسی ایک شخص کے ذریعے صوبۂ سرحد کی سیاست میں نہایت خوشگوار تغیر آجاتا۔ قبائلی عصبیت اور انتقامی جذبے سے بھی اس کا ذہن مبرا نہ تھا۔ چنانچہ سربلند خاں سردار تناول اور پائندہ خاں کی عداوت نے ہزارہ کے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ سکھوں نے بھی ان کی دشمنی سے فائدہ اٹھایا اور سید صاحبؒ کی تحریکِ جہاد کو بھی ان کے اختلافات سے سخت نقصان پہنچا۔

یہ ہیں اس دور کے ہزارہ کے مختصر حالات۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس علاقے کے لوگ افغان اور ترک دونوں نہایت بہادر اور جنگجو تھے۔ ان کے سرداروں میں بھی خاصی تعداد اولوالعزم اور صاحبِ تدبیر لوگوں کی تھی۔ انہوں نے سالہا سال سکھوں سے جنگ کی اور انہیں ہزیمت پر ہزیمت دی۔ اگر یہ سردار باہم متحد رہتے تو سکھوں کو ان کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی مگر ان کے اختلافات نے ان کی طاقت کو کمزور کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ لشکروں نے ہزارہ کو پامال کرنا شروع کیا۔ انہی میں سے بعض سرداروں نے سکھوں کی امداد کی اور سب سے پہلے سکھ فوج کو ہزارہ آنے کی دعوت ہزارہ ہی کے ایک ترک ہاشم خاں نے دی۔ اس طرح سکھوں کا ہزارہ میں عمل دخل شروع ہو گیا۔ اس کے بعد اس علاقے کے لوگوں کو جو مصائب برداشت کرنے پڑے ان کی تفصیل بڑی دردناک ہے۔ بڑے بڑے سرداروں مثلاً محمد خاں ترین رئیس ہزارہ کے بھتیجے بوستان خاں ترین، جلال خاں ولازاک، سلیم خاں مشوانی، شیخا جدون اور صالح محمد سردار سری کوٹ کے بھائی شیر محمد خاں کو توپ سے اڑا دیا گیا۔ مساجد کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ بستیاں کی بستیاں جلا کر راکھ کر دی گئیں۔ سیکڑوں عورتوں اور بچوں کو اسیر کیا گیا

---

[1] تاریخ منشی مہتاب سنگھ (فارسی، قلمی)

اور ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔ مالیہ کے نام پر ہزارہ کو بُری طرح لُوٹا گیا اور کتنے ہی سردار اپنی ریاستوں سے جلاوطن ہو کر دوسرے علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

یہ تھے وہ حالات جنہوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کو بے قرار کر دیا کہ اپنے مظلوم مسلمان بھائیوں کی امداد کریں۔ انہی ایام میں کشمیر اور ہزارہ کے سرداروں نے سید صاحبؒ کی خدمت میں امداد کی درخواستیں بھیجیں۔ ان درخواست کرنے والوں میں مظفر آباد کا حاکم زبردست خاں، کاغان کا سردار سید ضامن شاہ، امب کا نواب پائندہ خاں، تناول کا سردار سربلند خاں، خانپور کا رئیس راجہ نجف خاں، گڑھی حبیب اللہ کا سردار حبیب اللہ خاں، اگرور کا سردار عبدالغفور خاں اور دندھیاڑ کا سردار ناصر خاں بٹ گرامی شامل تھے۔ ان میں سے بعض نے خود سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ بعض نے اپنے سفیروں کی معرفت بیعت کی اور بعض نے بیعت نہیں کی بلکہ صرف امداد کی درخواست کی۔

سیّد صاحبؒ کا سفرِ راج دُواری

سید صاحبؒ رجب ۱۲۴۶ھ میں پنجتار سے ہزارہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اس سفر میں آپ کی ابتدائی منزلیں یہ تھیں۔ پنجتار سے کن گلئی جہاں آپ نے دو روز قیام فرمایا، تیسرے روز نگرئی پہنچے۔ وہاں سے چل کر برڈھیری میں قیام کیا۔

قیامِ برڈھیری

یہاں آپ نے دو دن گزارے۔ یہیں بونیر کے مقام ڈگر کا خان، شہزادہ خاں سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ سید صاحبؒ کے خلاف اہلِ سمہ کی بغاوت میں اس کا بھی ہاتھ تھا مگر جب سید صاحبؒ اہلِ سمہ سے دل برداشتہ ہو کر پنجتار سے روانہ ہو گئے تو خان نے محسوس کیا کہ اس نے اپنی نادانی سے ایک بہت بڑی نعمت اپنے ہاتھ سے کھو دی۔ چنانچہ وہ علاقۂ بونیر کے بہت سے سرداروں کو ساتھ لے کر سید صاحبؒ سے اپنی خطائیں معاف کرانے کے لئے روانہ ہوا اور برڈھیری میں حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ اہلِ سمہ نے مجھے غلط اطلاعات دیں۔ انہوں نے بتایا کہ سید بادشاہ نے ہمارے علاقے میں نئے نئے قوانین جاری کئے ہیں اور معمولی معمولی خطاؤں پر ہمیں ذلیل کیا جاتا ہے۔ میں ان کے کہنے میں آ گیا آپ مجھے معاف فرما دیں۔ سید صاحبؒ نے فرمایا: آپ کو چاہئے تھا کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے معاملات کی تحقیق کر لیتے۔ خان نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا کہ مجھے باغیوں کے زمرے میں شمار نہ کیجئے میرا قصور معاف فرما دیجئے۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ نے میرا کوئی قصور نہیں کیا خدا کا قصور کیا ہے۔ اس سے صدقِ دل سے معافی مانگئے اور توبہ کیجئے۔ اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے امید ہے وہ معاف کر دے گا۔ یہ سن کر شہزاد خاں زار زار روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ سمہ والوں نے میرا دین و دنیا دونوں تباہ کر دیے۔

بڑھیری سے راج دُواری تک

سید صاحبؒ نے بڑھیری سے روانہ ہو کر دریائے برندو کے کنارے قیام کیا۔ یہاں سے کوہ پیواڑ کا دشوار گزار سفر شروع ہوا۔ یہ سفر طے کر کے آپ کرنا پہنچے۔ کرنا سے کابل گرام تشریف لے گئے۔ یہاں تین دن قیام فرمایا۔ کابل گرام سے دریائے سندھ عبور کیا۔ پھر تاکوٹ پہنچے۔ یہاں ناصر خاں بھٹ گرامی اور وادیٔ پکھلی کے متعدد سردار آپ کے استقبال کے لئے چشم براہ تھے۔ آپ کی اہلیہ بھی اس سفر میں ہمراہ تھیں۔ اسی طرح کچھ اور غازیوں کی بیویاں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ چونکہ سید صاحبؒ کی اہلیہ حاملہ تھیں اس لئے آپ نے انہیں تاکوٹ میں چھوڑا۔ دیگر غازیوں کی بیویوں کو بھی یہیں قیام کرنے کی ہدایت فرمائی اور ایک مجاہد عبدالقیوم کو چند افراد کے ساتھ ان کی حفاظت پر متعین فرمایا۔ تاکوٹ میں سید صاحبؒ کا قیام دو روز رہا۔ یہاں سے آپ بھٹ گرام تشریف لے گئے۔ ناصر خاں بھٹ گرامی یہیں کے خان تھے۔ اس مقام پر آپ کی اور آپ کے اہل قافلہ کی نہایت پر تکلف دعوت کی گئی۔ یہاں سید صاحبؒ نے چار روز قیام فرمایا۔

سید صاحبؒ کا قیامِ راج دُواری

بھٹ گرام میں وادیٔ پکھلی کے سرداروں نے آپ کو مشورہ دیا کہ اب برف باری کا موسم شروع ہونیوالا ہے اس لئے آپ اُس وقت تک آگے تشریف نہ لے جائیں جب تک کہ برف باری ختم نہ ہو جائے۔ اس کے بعد اگلی منزلوں کے لئے روانہ ہوں۔ خوانین نے آپ کے لئے جس مقام کو منتخب کیا وہاں دُوسرے مقامات کے مقابلے میں بعض آسانیاں بھی حاصل تھیں۔ مثلاً اس مقام پر بہت سی پن چکیاں نصب تھیں جن سے مجاہدین کے لئے آٹا پسوایا جا سکتا تھا۔ قریب ہی وسیع جنگل تھا جہاں سے جلانے کے لئے لکڑی فراہم ہو سکتی تھی۔ یہ جگہ وادی کے دہانے پر واقع تھی یہاں سے ساری وادی کی حفاظت کا بخوبی انتظام ہو سکتا تھا۔ چنانچہ سید صاحبؒ نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور بھٹ گرام کے قریب ایک مقام راج دُواری میں آپ کے قیام کا انتظام کیا گیا۔ چونکہ راج دُواری کو سید صاحبؒ کا مرکز ثانی بننے کا شرف نصیب ہوا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ضروری کوائف بیان کر دیئے جائیں۔

راج دُواری اور اس کا محلِ وقوع

مانسہرہ سے ۴۰ میل جانبِ مغرب ایک مقام ہے نیلی تنگ۔ یہ خان آف گڑھی حبیب اللہ کی جاگیر اور

ان کا گرمائی صدر مقام ہے۔ بلند و بالا اور سرسبز پہاڑوں سے گھرا ہوا نہایت صحت افزا مقام ہے۔ نیلی ٹشنگ سے شمال کی طرف دس میل کے فاصلہ پر راج دواری واقع ہے۔ اس کا راستہ دشوار گزار پہاڑوں میں سے ہو کر گزرتا ہے ۵ میل کے قریب نہایت سخت چڑھائی اور اتنی ہی اترائی ہے۔ بھٹ گرام کی طرف سے راج دواری کا فاصلہ تقریباً ۵ میل اور محل وقوع مشرق کی طرف ہے۔ اس طرف سے راج دواری جانے کے لئے ہموار زمین پر سفر کرنا پڑتا ہے راج دواری چھوٹا سا گاؤں ہے جس میں پچاس ساٹھ گھر، چند دکانیں، ایک مسجد اور ایک پرائمری سکول ہے۔ آبادی سواتی افغانوں کی ہے۔ زبان پشتو بولی جاتی ہے۔ گاؤں کے ارد گرد دور دور تک زرعی زمین ہے۔ مکئی، گندم اور دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ زمین زرخیز ہے۔ موسم سرما میں سخت برف باری ہوتی ہے۔ گرمیوں میں موسم خوشگوار رہتا ہے۔ ارد گرد بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ لوگ غریب مگر نہایت محنتی، جسم کے مضبوط اور رنگ کے سرخ و سپید ہوتے ہیں۔ یہ گاؤں بھی خان آف گڑھی حبیب اللہ کی ملکیت ہے۔ نیلی ٹشنگ، راج دواری اور بٹ گرام یہ سب علاقے یاغستان میں شامل ہیں اور پہلے علاقۂ غیر کہلاتے تھے۔ چند سال ہوئے کہ حکومتِ پاکستان نے یہاں کے خوانین سے رابطہ قائم کر کے ان علاقوں کو پاکستان میں شامل کر لیا۔ لیکن اثر و اقتدار ابھی تک خوانین ہی کا ہے۔ اور یہاں کے لوگ اپنے تمام معاملات اور تنازعات میں خوانین ہی سے رجوع کرتے ہیں۔

جس زمانے میں سید صاحبؒ راج دواری تشریف لائے، اس زمانے میں تو ان علاقوں پر خوانین کی مکمل حکومت تھی۔ راج دواری کے خان حبیب اللہ خاں (گڑھی والے) کی ہدایت پر یہاں کے لوگوں نے اپنے بہت سے مکانات مجاہدین کے لئے خالی کر دیئے۔ ہر مکان مجاہدین کی ایک جماعت کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ سید صاحبؒ نے اپنی اور اپنی جماعت کے لئے وہ مکان منتخب کیا جو مسجد کے قریب واقع تھا۔ یہ مکان اور مسجد ابھی تک محفوظ ہے۔ ۷۔ شعبان ۱۲۴۶ھ کو بمقام تاکوٹ سید صاحبؒ کے حرم میں دختر پیدا ہوئی جس کا نام سفرِ ہجرت کی مناسبت سے ہاجرہ تجویز کیا گیا۔ ۱۴۔ شعبان کو سید صاحبؒ نے نومولود دختر کا عقیقہ کیا[1] اسی دوران میں سید صاحبؒ کی ہدایت پر مجاہدین برفباری کا زمانہ گزارنے کے لئے ایندھن جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔ چند روز کے بعد ناصر خاں بٹ گرامی اور اس علاقے کے بعض اور سرداروں شلاً سعادت خاں رئیس درہ ٹیکری اور سامی خاں رئیس درہ کونش نے سید صاحبؒ کو مشورہ دیا کہ اگر امیر المومنین اپنے سارے لشکر کے ساتھ راج دواری میں قیام فرمائیں گے تو برف باری کا موسم قریب ہونے کی وجہ سے غلّے کی فراہمی اور اتنے بہت سے مجاہدین کے لئے مکانات کا انتظام مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے اگر آپ اپنے لشکر کو درے کے مختلف دہانوں پر بھیج دیں تو ان علاقوں کے لوگ سکھوں کے حملوں سے بھی محفوظ ہو جائیں گے، جن کا

---

[1] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۱۱۱

زور روز بروز بڑھ رہا ہے اور مجاہدین کی خوراک اور ان کے قیام کا بار بھی کسی کو محسوس نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں عُشر ادا کرنے میں بھی لوگوں کو دشواری پیش نہ آئے گی۔ برفباری کا زمانہ گزرنے کے بعد جس وقت سکھوں کا لشکر مقابلہ کے لئے آئے گا تو اس علاقے کے مسلمان مجاہدوں کی رفاقت میں سکھوں کا جم کر مقابلہ کر سکیں گے۔ چنانچہ سید صاحبؒ نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور شاہ اسماعیلؒ کی قیادت میں مجاہدین کا ایک لشکر علاقے کے اہم دروں کی حفاظت کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ مولوی خیر الدین صاحبؒ شیر کوٹی کو شاہ صاحبؒ کا نائب اور مشیر مقرر کیا گیا۔

مجاہدین کا بھوگڑمنگ اور سچہ میں قیام

ابتدا میں مجاہدین کا لشکر شاہ اسماعیلؒ صاحب کی قیادت میں موضع چتر کرائی میں مقیم ہوا۔ اس کے بعد مقامی سرداروں کے مشورے سے لشکر کے دو حصے کر دیئے گئے۔ ایک حصے کا قائد مولوی خیر الدین شیر کوٹی کو مقرر کیا گیا۔ یہ لشکر بھوگڑمنگ میں متعین کیا گیا جو بین درے کے دہانے پر واقع ہے۔ یہ لشکر تین سو قندھاری مجاہدوں پر مشتمل تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سکھوں کی آمد و رفت کا راستہ مسدود ہو جائے۔ لشکر کا دوسرا حصہ جو پچاس ہندوستانی مجاہدین پر مشتمل تھا، شاہ اسماعیلؒ صاحب کی قیادت میں موضع سچہ روانہ ہو گیا۔ یہاں مقیم ہو کر شاہ صاحبؒ نے سچہ اور بھوگڑمنگ دونوں کی نگرانی و حفاظت کا فریضہ سرانجام دیا۔

سکھوں اور مجاہدین میں جھڑپیں

بھوگڑمنگ سے چند میل کے فاصلے پر واقع موضع شنکیاری میں سکھوں کی ایک مضبوط گڑھی تھی۔ اس گڑھی سے نکل کر وہ علاقے کے مسلمانوں پر حملے کرتے اور انہیں جانی و مالی نقصان پہنچاتے۔ مجاہدین کے بھوگڑمنگ پہنچنے پر یہ علاقہ سکھوں کے حملوں سے محفوظ ہو گیا کیونکہ جب بھی سکھ گڑھی سے نکل کر بھوگڑمنگ پر حملہ آور ہونے کا قصد کرتے تو مولوی خیر الدین شیر کوٹی اور ان کے مجاہدین سکھوں کی مزاحمت کرتے اور شکست دے کر بھگا دیتے۔ جب تک مجاہدین بھوگڑمنگ میں مقیم رہے کسی کی مجال نہ تھی کہ اس درے میں داخل ہوتا۔[۱] چنانچہ ایک روز کا ذکر ہے کہ قندھاریوں کی ایک جماعت مولانا خیر الدین شیر کوٹی کے حکم کے مطابق اس علاقے کی حفاظت کی غرض سے درے سے باہر نکلی اور گشت کرنے لگی۔ اتفاقاً سکھ بھی ادھر آنکلے باوجودیکہ وہ غازیوں سے بہ اعتبار تعداد دو چند تھے مگر ان کی ہیبت سے گھبرا کر پہاڑ پر چڑھ گئے۔ مجاہدین نے ان کا تعاقب کیا اور ایک شخص کو یہ خبر دے کر مولوی خیر الدین شیر کوٹی کے پاس بھیج دیا۔ مولوی صاحب فوراً تیس چالیس مجاہدین کی

---

[۱] منظورۃ السعدا ص ۱۱۱۳ ۲ منظورۃ السعدا

جماعت کے ساتھ ان کی مدد کے لئے پہنچ گئے۔ چونکہ ایک کوس کا فاصلہ تھا اس لئے ان کے پہنچتے پہنچتے آفتاب غروب ہوگیا۔ جب وہ کوہستان میں پہنچے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس لئے معلوم نہ ہو سکا کہ سکھ کس راستے سے فرار ہو کر اپنی گڑھی میں جا چھپے[1]۔

مجاہدین کی بالاکوٹ میں آمد

مولوی خیر الدین شیر کوٹی کو بھوگڑمنگ میں مقیم ہوئے ایک ماہ سے کچھ زیادہ گزرا تھا کہ اُن کے نام سید صاحبؒ کا حکم آیا کہ آپ فوراً بالاکوٹ چلے جائیں۔ دو تین روز تک اللہ تعالیٰ کی مدد سے میں بھی بالاکوٹ پہنچ جاؤں گا۔ یہ حکم دوپہر کو پہنچا۔ رات کو برف باری ہوئی ۲۷ ۔ شعبان کو مولوی صاحب مع اپنے لشکر کے ظہر کے بعد بالاکوٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔ اگرچہ برف باری کی شدت اور پہاڑوں کے دشوار گزار نشیب و فراز کی وجہ سے بڑے مصائب پیش آئے مگر ابھی رات کے چار نہیں بجے تھے کہ مولوی خیر الدین صاحبؒ بالاکوٹ میں داخل ہو گئے وہاں پہنچتے ہی انہوں نے دکانداروں سے غلہ خرید کر اپنے لشکر میں تقسیم کر دیا۔ یہاں آکر مولوی صاحب کو معلوم ہوا کہ سلطان نجف خاں نے اپنے چچا زاد بھائی سلطان زبردست خاں حاکم مظفر آباد کو سکھوں کی حمایت سے بے دخل کر کے مظفر آباد پر قبضہ کر لیا ہے۔ اسی طرح سلطان نجف خاں بھی اپنے علاقے کھوڑی سے محروم ہو کر کوہ درابہ میں مقیم ہے۔ گڑھی حبیب اللہ خاں کا خان بھی سکھوں کی یورش سے مجبور ہو کر درہ کاغان میں پناہ گزیں ہے۔

خوانین اور مولوی خیر الدین کے مابین گفتگو

جب اپنے علاقوں سے معزول شدہ سرداروں کو مجاہدین اور ان کے امیر مولانا خیر الدین شیر کوٹی کی بالاکوٹ میں آمد کا علم ہوا تو وہ ان سے ملنے کے لئے آئے۔ دوپہر کے قریب دریائے کنہار کے کنارے جو بالاکوٹ کے نیچے سے گزرتا ہے خوانین اور مولوی خیر الدین کے مابین ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں خوانین نے مولوی صاحب کو بتایا کہ سلطان نجف خاں شیر سنگھ کے ہمراہ پشاور کی طرف گیا ہوا ہے۔ اس وقت مظفر آباد میں صرف آٹھ نو سو سکھ ہیں اگر آپ فوری طور پر حملہ کر دیں تو مظفر آباد پر آپ کا قبضہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہم لوگ باقی علاقوں پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ اس طرح ہم امیر المومنین کو بلا خوف و خطر راج دواری سے بلا کر مظفر آباد میں بٹھا دیں گے اور پھر کشمیر فتح کرنے کے لئے آگے بڑھیں گے۔ اگر سلطان نجف خاں اور شیر سنگھ اپنے لشکروں کے ساتھ واپس آگئے تو مظفر آباد کا فتح کرنا مشکل ہو جائے گا۔

---

[1] منظورۃ السعداء ص ۱۱۳۔

یہ گفتگو سُن کر مولوی خیرالدین صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمیں حضرت امیرالمومنین نے بالاکوٹ پہنچنے اور یہیں قیام کرنے کا حکم دیا ہے۔ ہمارے امیر مولوی اسماعیل صاحبؒ ہیں، وہ عنقریب آنے والے ہیں۔ میں خودمختار نہیں ہوں بلکہ ان کا فرماں بردار ہوں۔ اس لئے اس مسئلے پر آپ اُن سے گفتگو کریں۔ علاوہ ازیں حضرت امیرالمومنین اس ملک میں تازہ وارد ہوئے ہیں۔ یہاں کے سرداروں اور عوام کے متعلق انہیں پوری معلومات بھی حاصل نہیں اس لئے یہاں کے خوانین سے ملاقات کرنے اور ان کے عادات وخصائل دریافت کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے پس مناسب یہ ہے کہ آپ لوگ حضرت امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر سارے حالات بیان کریں اور پھر اُن سے امداد کی درخواست کریں۔

مولوی خیرالدین صاحب کی گفتگو سن کر خوانین نے کہا کہ آپ کی باتیں نہایت معقول ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ امیرالمومنین کے پاس جانے اور وہاں سے واپس آنے میں بہت وقت صرف ہو جائے گا۔ ایسا نہ ہو کہ اس اثناء میں شیر سنگھ پشاور سے واپس آجائے۔ اگر ایسا ہوا تو موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا اور ہمارے اہل وعیال کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی جو اس درے میں پناہ گزیں ہیں۔ اس پر مولوی صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ کے اہل وعیال بالاکوٹ میں ہیں اور میں بھی مع لشکر یہاں موجود ہوں۔ اس لئے آپ مطمئن رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان کی حفاظت کا میں ذمہ دار ہوں۔ یہ سن کر خوانین نے کہا کہ حفاظت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ مظفرآباد پر قبضہ نہ کر لیا جائے۔ اس مقام پر قبضہ کرنے کے بعد تمام درہ کنہار، نندھیاڑ اور کاغان وغیرہ پر بھی پوری طرح قبضہ کیا جا سکتا ہے۔

مولوی صاحب نے فرمایا کہ آپ کا خیال صحیح نہیں، مظفرآباد میں رہنے سے اس (بالاکوٹ) درے کی بھی حفاظت نہ ہو سکے گی اور ہمارے پاس اتنا لشکر موجود نہیں کہ نصف بالاکوٹ میں رکھیں اور نصف مظفرآباد میں متعین کریں۔ اس پر خوانین نے کہا کہ مجاہدین کی ہمراہی تو برکت کے طور پر ہوگی، سکھوں کا مقابلہ ہم خود کریں گے۔ مولوی خیرالدین صاحب نے فرمایا کہ مجھے آپ سے اتفاق نہیں اگر آپ لوگوں میں اتنی طاقت وجرأت ہوتی تو آپ کو اپنے علاقوں سے محروم نہ ہونا پڑتا۔[۱]

یہ گفتگو تین دن تک ہوتی رہی۔ خوانین مولوی صاحب کو مظفرآباد لے جانا چاہتے تھے، مولوی صاحب انکار کرتے اور فرماتے تھے کہ میں حضرت امیرالمومنین کے حکم کے بغیر یہ قدم نہیں اٹھا سکتا۔

۱۔ منظورۃ السعداء ص ۱۱۱۷

شاہ اسماعیلؒ کی بالاکوٹ میں آمد

مولوی خیر الدین صاحبؒ اور خوانین کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ ۲۹۔شعبان کو شاہ اسماعیل صاحبؒ کو سید صاحب کا حکم ملا کہ آپ فوراً بالاکوٹ روانہ ہو جائیں۔ اس وقت مولانا (شاہ اسماعیل صاحبؒ ، سچہ میں مقیم تھے۔ اگرچہ سخت برف باری ہو رہی تھی اور راستے نہایت دشوار گزار اور پُر خطر تھے مگر مولانا نے سید صاحبؒ کے حکم کے سامنے کسی خطرے اور دشواری کی پرواہ نہ کی اور اپنے لشکر کے ساتھ سچہ سے روانہ ہو گئے۔ اس وقت بادل چھائے ہوئے تھے اور اتنی شدید برف باری ہو رہی تھی کہ گھوڑوں کے منہ سے نکلنے والا جھاگ بھی جم جاتا تھا۔ سچہ سے روانہ ہو کر شاہ صاحبؒ بھوگڑمنگ پہنچے۔ یہاں تھوڑی دیر قیام کرنے کے بعد اسی برفباری کی حالت میں بالاکوٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس راستے میں جو اندوہ ناک اور ہوش ربا مصائب پیش آئے ، ان کی تفصیلات تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ یہ تفصیلات مولانا جعفر علی نقوی نے اپنی کتاب " منظورۃ السعداء" میں درج کی ہیں۔ چونکہ ہمارا ارادہ " شاہ اسماعیل شہیدؒ " کے نام سے ایک الگ کتاب لکھنے کا ہے اس لئے انشاء اللہ یہ تفاصیل اس کتاب میں درج کی جائیں گی۔ اسی طرح شاہ صاحبؒ کے قیامِ بالاکوٹ کی جزئیات بھی انشاء اللہ اسی کتاب کا حصہ بنیں گی یہاں صرف سرسری ذکر کیا جائے گا۔

یکم رمضان المبارک کو حضرت شاہ اسمٰعیلؒ مع لشکر بالاکوٹ میں داخل ہوئے۔ ان کی آمد سے قبل ہی بالاکوٹ کے لوگوں نے بہت سے مکانات مجاہدین کے لئے خالی کر دیئے تھے۔ کچھ لوگوں نے ان مکانات میں قیام کیا اور بعض نے مسجد میں۔ چونکہ رمضان المبارک شروع ہو گیا تھا اور بہت سے لوگ راستے کے مصائب کی وجہ سے بیمار ہو گئے تھے۔ اس لئے شاہ صاحبؒ نے ہدایت فرمائی کہ جو لوگ تندرست ہوں وہ روزہ رکھیں البتہ بیمار افراد فی الحال روزہ ترک کر دیں۔ اسی طرح کمزور اور بیمار لوگ نمازِ تراویح بھی ترک کر سکتے ہیں خود مولانا بھی نہایت کمزور ہو گئے تھے اس لئے انہوں نے بھی تراویح نہیں پڑھی۔ مولوی نصیر الدین سہارن پوری کو ہدایت فرمائی کہ آپ تراویح پڑھایا کریں۔

سکھوں پر شب خون

بالاکوٹ کے دوران قیام میں مجاہدین نے اپنا لہو گرم رکھنے کی کوشش جاری رکھی۔ سکھوں کے لشکر گڑھی حبیب اللہ میں موجود تھے اور قرب وجوار میں حملے کر کے مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہتے تھے۔ چنانچہ شاہ اسماعیلؒ کی ہدایت پر ان کی سرکوبی کا فیصلہ کیا گیا۔ مجاہدین نے دو یا تین بار ان پر شب خون مارا۔۔۔ ان

جنگوں میں بہت سے غیر مسلم مرد، عورتیں اور بچے مجاہدین کے ہاتھوں اسیر ہوئے اور ان کے اموال مثلاً ریشمی کپڑے اور برتن وغیرہ بطور مالِ غنیمت مجاہدین کے ہاتھ آئے۔[1]

سید صاحبؒ کی سچہ میں تشریف آوری

شاہ اسمٰعیلؒ صاحب کو بالاکوٹ روانہ کرنے کے بعد سید صاحبؒ نے بھی روانگی کا قصد کیا۔ سب سے پہلے آپ نے اپنی حرم محترم اور دوسرے غازیوں کی بیویوں کو تاکوٹ سے راج دواری بلوایا اور شیخ حسن علی کو مع ان کے ساتھیوں کے مستورات کی حفاظت پر متعین کیا۔ ان کے علاوہ حاجی ننھے خاں بنارسی، الٰہی بخش مہاجر مع برادران، حاجی قاسم پانی پتی اور احمد خاں ساکن عیسیٰ خیل کو بھی شیخ حسن علی کی امداد کے لئے متعین کیا اور خود سچہ روانہ ہو گئے۔ اس وقت ساڑھے تین سو غازی آپ کے ہمراہ تھے۔ یہ سفر آپ نے خچر پر سوار ہو کر طے کیا۔ درہ کا راستہ چھوڑ کر پہاڑ پر چڑھے۔ پھر سرکول (شارکول) کے مقام پر قیام کیا۔ وہاں سے کسی اور مقام پر گئے اور تیسرے روز ۴ ۲۔ رمضان کو سچہ میں داخل ہوئے۔ یہاں کے سردار حسن علی خاں کے متعلق یہ بدگمانی پیدا کر دی گئی تھی کہ انہوں نے سکھوں سے ساز باز کر رکھا ہے مگر جب سید صاحبؒ سچہ میں تشریف لائے اور حسن علی خاں نے سید صاحبؒ کی زیارت کی، ان سے ملاقاتیں کیں اور اُن کی گفتگو سنی تو وہ سید صاحبؒ سے بےحد متاثر ہوئے۔ سید صاحبؒ کو انہوں نے اپنے بھائی عنایت خاں کی حویلی میں ٹھہرایا۔ سچہ میں سید صاحبؒ نے ایک روز وعظ کیا۔ اس مجلسِ وعظ میں حسن علی خاں بھی موجود تھے۔ سید صاحبؒ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

سید صاحبؒ کی اثر انگیز تقریر

"جب کسی مکان کی چھت گر جاتی ہے اور مکان میں رہنے والوں کو جسمانی تکلیف پہنچتی ہے تو اس گھر کے مردوں، عورتوں اور بچوں سب کو اس کی مرمت اور تعمیر کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر شخص اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق اس مکان کی درستی پر مستعد ہو جاتا ہے۔ کوئی اینٹ لائے گا، کوئی گارا لائے گا۔ اس طرح چھت تعمیر ہو جائے گی۔ جب تمام اہل خانہ کئی روز تک مسلسل تکلیف اٹھائیں گے تو ایک دن ایسا آئے گا جب مکان درست ہو جائے گا۔ پھر وُہ مدتِ دراز تک اس مکان میں آرام سے زندگی گزاریں گے۔ بالکل اسی طرح آج اس ملک میں مسلمانوں کا قصرِ دین ویران ہو گیا ہے اور کفار لٹیروں کی طرح مسلمانوں کا مال و اسباب برباد کر رہے ہیں اور

---

[1] منظورۃ السعداء ص ۱۱۳۵

بے دھڑک غارت گری میں مصروف ہیں کیونکہ مسلمانوں کے سامان اور گھروں کا کوئی پاسبان موجود نہیں، اس لئے جو مسلمان خوابِ غفلت میں محو ہیں سب بیدار ہو جائیں اور اپنے (دین کے) ویران مکان کی آبادی کے لئے سامانِ ضروری بہم پہنچائیں۔ ان لٹیروں اور چوروں کو گرفتار کر کے ان کے کیفرِ کردار تک پہنچا دیں اور ان سے اپنی خدمت لیں۔ اس مکان کو تعمیر کرنے کے بعد اس میں آرام سے زندگی گزاریں[1]۔"

سید صاحبؒ کی درد و اثر میں ڈوبی یہ تقریر سن کر حسن علی خاں سردار سچہ اس قدر روئے کہ اُن کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ وُہ غائبانہ طور پر کہا کرتے تھے کہ میں نے سید صاحبؒ کی اس مہم جہاد کو بچوں کا کھیل سمجھا ہوا تھا مگر ان سے ملاقات کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اگر اس قسم کے عظیم ارادے کا آدمی ہفت اقلیم فتح کرنے کا بھی ارادہ کر لے تو کوئی تعجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے سارے ممالک کی فتح آسان بنا دے۔

حسن علی خاں کا اعزاز

سید صاحبؒ نے حسن علی خاں سے متعدد ملاقاتیں کیں۔ ان سے تبادلۂ خیال کیا اور انہیں خدمتِ دین کے لئے نہایت مستعد پایا۔ ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر آپ نے انہیں درہ بھوگڑ منگ کا ناظم مقرر فرمایا اور ایک فرمان جاری کیا جس میں تمام خادمانِ دین اور مجاہدین کو مطلع کیا کہ جملہ سواتی خوانین اور ساکنین درہ بھوگڑ منگ میں عالی شان حسن علی خاں خدمتِ دین میں نہایت ہوشیار و مستعد ہیں اس لئے انہیں درۂ بھوگڑ منگ کے انتظام، مالیہ کی تحصیل اور مقدمات کے فیصلوں کی ذمہ داریاں تفویض کی جاتی ہیں۔ وُہ امیرالمومنین کی طرف سے بہ طور نائبِ مطلق و صاحبِ اختیار یہ فرائض سرانجام دیں گے۔ سید صاحبؒ کا یہ فرمان اب تک لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ چونکہ اس کی نوعیت تاریخی ہے اس لئے ذیل میں یہ پورا فرمان نقل کیا جاتا ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ از امیرالمومنین بخدمت جمیع خادمانِ دینِ متین و کبرئ مجاہدین واضح آنکہ از ایں جا کہ حال عالی شان حسن علی خاں از جملہ خوانین سواتیاں و ساکنانِ درہ پھوکرمک (بھوگڑ منگ) بودند و بخدمت دین نہایت چست و چالاک شوند بنا علیہ بندوبست درۂ مذکورہ از قبیل تحصیل اموال و فیصل خصومات مالیہ بر طریقہ کتاب با یشاں سپردہ شد پس خان مذکور در یں مقدمات از طرف ایں جانب نائبِ مطلق و صاحبِ اختیار در مذکورہ اند بنا بریں چند کلمہ بطریق رقم نوشتہ دادہ شد کہ سند باشد۔ تحریر با تاریخ بست و پنجم شوال ۱۲۴۳ھ در مقام سہنجہ[2]" (سچہ)

---

[1] منظورۃ السعدا صفحہ ۱۱۳۷ [2] مکتوبات مولوی صفحہ ۱۲۹ (قلمی)، مملوکہ نفیس رقم صاحب (لاہور)

شیر سنگھ کا عزم بھوگڑمنگ اور ناکام واپسی

سید صاحبؒ کو سچہ میں قیام کئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ شیر سنگھ پشاور سے واپس آ گیا اور مظفر آباد سے گڑھی حبیب اللہ تک سکھوں کی جو گڑھیاں واقع تھیں ان میں سے غلہ اور جنگ جو افراد جمع کرنے لگا۔ پوری طرح تیاری کرنے کے بعد اس نے بھوگڑمنگ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ شاہ اسماعیل صاحبؒ کو شیر سنگھ کی نقل و حرکت اور عزائم کی برابر اطلاعات مل رہی تھیں چنانچہ آپ نے سید صاحبؒ کی خدمت میں اس مضمون کا ایک خط لکھا کہ :-

"اس کافر (شیر سنگھ) نے اپنے لشکر کے ساتھ درۂ بھوگڑمنگ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ ایک صاحبِ ارادہ شخص کے لئے مناسب بھی یہی ہے کہ دشمن کے سردارِ لشکر کے ساتھ مقابلے کیلئے صف آرا ہو۔ پس آپ ہوشیار رہیں اور آپ کے خدام دشمن کی نقل و حرکت کی طرف سے غفلت نہ کریں۔ اگر جنگ کی صورت پیدا ہو جائے تو ایک تیز رو قاصد ہم خاکساروں کی اطلاع کے لئے دوڑائیں تاکہ یہ عاجز بھی اپنی جماعت کے ساتھ شریکِ جنگ ہو سکے۔"[1]

جلد ہی سید صاحبؒ کی طرف سے شاہ اسماعیلؒ کے خط کا جواب موصول ہو گیا۔ ادھر شیر سنگھ غازیوں کو جنگ کے لئے مستعد پا کر حملہ کئے بغیر بھوگڑمنگ سے ناکام واپس آ گیا۔ اس کے بعد شاہ اسماعیل صاحبؒ نے شیر سنگھ کے حوصلے پست کرنے اور اس پر مجاہدین کی قوت و شوکت کا رُعب ڈالنے کی غرض سے سکھ لشکر پر شب خون مارنے کا منصوبہ بنایا۔ ابھی اس منصوبے پر عمل کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ سید صاحبؒ کی طرف سے ایک قاصد آپ کا خط لے کر آیا جس کا مضمون یہ تھا :

حبیب اللہ خاں کا نظامتِ بالاکوٹ پر تقرر

"عرصے سے آپ ہم سے جدا ہیں، مجھے آپ سے ملنے کا نہایت اشتیاق ہے، اس لئے یہ خط آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اس کے بعد سردار حبیب اللہ خاں بھی آپ کے پاس پہنچیں گے۔ اسے قطعی حکم سمجھ کر جتنی جلد ممکن ہو ہمارے پاس آ جائیں۔ اس اثناء میں سردار حبیب اللہ خاں بالاکوٹ کی حفاظت کریں گے۔"[2]

خط کی پیشانی پر آپ نے "اللہ کافی" کے الفاظ لکھ دیے جو اس امر کی علامت تھے کہ اس حکم کی تعمیل

---

[1] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۰۵۶   [2] ایضاً صفحہ ۱۰۶۱

نہایت ضروری ہے۔ اس خط کے پہنچتے ہی شاہ صاحبؒ نے اپنی جماعت کے مجاہدین کو حکم دیا کہ اپنی اپنی جگہ پہنچ جاؤ، شب خون کی تجویز موقوف ہوگئی ہے۔

شاہ اسماعیلؒ کی سچہ کو روانگی

دوسرے روز شاہ اسماعیلؒ صاحب مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ "ست بنی" کے راستے سچہ روانہ ہوگئے اور حبیب اللہ خاں (دگڑھی والے) نے بالاکوٹ کے ناظم کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ شاہ اسماعیل صاحبؒ نے درۂ بھوگڑ منگ میں داخل ہوکر موضع جبوڑی میں قیام فرمایا۔ مولانا سید محمد جعفری نقوی بھی اس سفر میں شاہ صاحبؒ کے ساتھ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جبوڑی کے قریب ایک اور گاؤں تھا۔ میری جماعت کے دو دستوں میں سے ایک ایک دستے نے دونوں گاؤں میں قیام کیا۔ جس گاؤں میں میں مقیم تھا وہاں پہلے سے مقیم مجاہدین میں سے بعض نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم گیارہ افراد سچہ میں آرام سے زندگی گزار رہے تھے۔ اب ہمیں اس طرح تقسیم کردیا گیا ہے کہ چھ آدمی ایک جگہ رہتے ہیں اور پانچ دوسری جگہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں ضروری سامان مہیا کرنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔ پہلے جب ہم اکٹھا تھے اور ہمارا اسباب یک جا تھا تو ہم کسی کے محتاج نہ تھے۔ آپ دونوں جماعتوں کے سرداروں سے کہیں کہ وہ کوشش کرکے دونوں جماعتوں کو یک جا کردیں تاکہ ہماری پریشانی دور ہو۔ چنانچہ افسروں کی اجازت سے دونوں جماعتیں یک جا کردی گئیں۔ سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ:

جب یہ معاملہ مولوی احمد اللہ ناگپوری کو معلوم ہوا تو انہیں اس سے رنج پہنچا۔ اس کی اطلاع مجھے (سید جعفر علی نقوی کو) خدابخش قاسم غلہ سے ملی۔ یہ صورت حال دیکھ کر پہلے تو میں نے مولوی احمد اللہ ناگپوری کی خدمت میں اپنا عذر اور دونوں جماعتوں کے یک جا ہونے کا فائدہ بیان کیا۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ یہ ایک جماعت حضرت امیرالمومنین کے حکم سے دو حصوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ یہ میرا یا کسی اور کا اقدام نہ تھا۔ اس پر مولوی جعفر علی نقوی نے کہا کہ میں خود حضرت امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہوکر ان دونوں جماعتوں کے الگ الگ رہنے سے جو حرج ہوتا تھا بیان کروں گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اگر حضرت امیرالمومنین آپ کی اس حرکت پر اظہارِ ناراضگی نہیں کریں گے تو اس کی وجہ ان کا اخلاقِ حمیدہ ہوگا۔ مولانا جعفر علی نقوی نے کہا کہ اس صورت میں آپ کو اختیار ہے کہ پھر پہلی صورت اختیار کرلیں۔ یہ سن کر مولوی احمد اللہ ناگپوری خاموش ہوگئے۔ پھر تھوڑے سے توقف کے بعد فرمایا کہ میں تمہارے دستے پر بجائے تمہارے کسی اور شخص کو افسر مقرر کروں گا۔ اس پر مولانا جعفر علی نقوی نے کہا کہ بسر و چشم۔

جعفر نقویؒ اور شاہ اسماعیلؒ سید صاحبؒ کی خدمت میں

یہاں سے رخصت ہو کر شاہ اسماعیلؒ اور مولانا جعفر علی نقویؒ سچہ روانہ ہو گئے۔ مولانا جعفر نقوی پہلے سید صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے۔ اس وقت سید صاحبؒ ایک مکان میں فروکش تھے۔ بہت سے لوگ آپ کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ کھڑے ہوئے تھے۔ مولوی جعفر نقوی بھی کھڑے ہوئے لوگوں میں شامل ہو گئے اور لوگوں کے درمیان سے سر نکال کر سید صاحبؒ کو سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا اور مسکرا کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر اپنی پیٹھ کی طرف جہاں بہت سے منشی بیٹھے ہوئے تھے، اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اپنے منشی خانے میں بیٹھ جاؤ۔ اس کے بعد آپ نے مولوی جعفر نقوی سے ان کی خیریت دریافت کی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی۔ مولوی جعفر نقوی بیان کرتے ہیں کہ "ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ تمہارے متعلق تو برف کے صدمے سے بیمار ہو جانے کے متعلق طرح طرح کی خبریں سننے میں آئیں۔ پہلے تمہاری موت کی خبر سنی گئی۔ پھر تمہاری انگلیاں گل جانے کی خبر آئی۔" میں نے جواب دیا کہ "میری انگلیاں تو سلامت ہیں لیکن میرے ہاتھوں اور پیروں کی جلد برف کی شدت سے اتر گئی ہے۔ جب یہ بات سید صاحبؒ نے سنی تو آپ نے اپنا ہاتھ مولانا جعفر نقوی کی طرف بڑھا کر فرمایا کہ مجھے اپنا ہاتھ دکھاؤ۔ چونکہ انہوں نے علاج کے لئے اپنے ہاتھوں پر مہندی لگائی تھی اس کی سرخی ہاتھوں پر موجود تھی۔ اس لئے انہیں سید صاحبؒ کی طرف اپنے ہاتھ بڑھاتے ہوئے شرم آئی لیکن ہاتھ کھینچ بھی نہ سکتے تھے۔ آخر یہ عرض کرتے ہوئے انہوں نے اپنا ہاتھ سید صاحبؒ کی طرف بڑھا دیا کہ میں نے مہندی بطور دوا استعمال کی ہے۔ سید صاحبؒ نے مولانا جعفر نقویؒ کا ہاتھ دیکھا۔ اسی اثناء میں شاہ اسماعیلؒ صاحب بھی آ گئے اور سید صاحبؒ کی ہدایت پر انہوں نے دوسرے دن مشکوٰۃ کا درس شروع کر دیا۔ سید صاحبؒ بھی درس دیتے اور بعض احادیث کے اسرار و نکات بیان فرماتے۔[۱]

سید ضامن شاہ کی حاضری

ایک ماہ تک یہ چشمۂ فیض جاری رہا۔ اسی دوران کاغان کے سردار سید ضامن شاہ سید صاحبؒ کی زیارت کرنے کے لئے سچہ میں حاضر خدمت ہوئے۔ مرغ زریں کا ایک جوڑا بھی لائے جو سید صاحبؒ کی نذر کیا۔ آپ نے یہ مرغ نہایت پسند کئے۔ معرکۂ بالاکوٹ تک مرغ زریں کا یہ جوڑا سید صاحبؒ کے

---

[۱] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۱۶۴۔

پاس رہا۔ یہ نہایت خوش شکل مُرغ تھے۔ ان کا رنگ نیلا تھا۔ مولانا جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ اسی قسم کا مرغ نیپال کے کوہستان میں بھی پایا جاتا ہے جو قد و قامت میں اس سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کی گردن کی لمبائی مور سے کچھ کم ہوتی ہے۔ رنگ نیلا اور اس کی سبزی نہایت چمکیلی ہوتی ہے۔ اس میں زرد رنگ کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ اس کے پروں پر سُرخ و سپید رنگ کے نقطے ہوتے ہیں۔

آزادیٔ کشمیر کے لیے سید صاحبؒ کی مساعی

کشمیر میں سکھوں کی مداخلت

ہزارہ کی طرح کشمیر کی حسین وادی بھی سکھوں کے ظلم وبربریت تلے پامال ہو رہی تھی اور سکھ فوجیں کشمیر کے مسلمانوں کو بری طرح لوٹ رہی تھیں۔ لوٹ کے ساتھ ساتھ ان کا خون بھی بہایا جا رہا تھا اور ان کی عزت وآبرو بھی برباد کی جا رہی تھی۔ غرض ساری وادی مظلوموں کی آہ وبکا سے جہنم کدہ بنی ہوئی تھی۔ یہ روح فرسا حالات سید صاحبؒ تک بھی پہنچ رہے تھے اور وہ اس انتظار میں تھے کہ صوبۂ سرحد کے حالات سازگار ہو جائیں تو وہ کشمیر کا رُخ کریں۔ اسی دوران میں سید صاحبؒ اور مجاہدین کی بہادری کی ایمان افروز داستانوں نے اہل کشمیر کو چونکا دیا اور انہوں نے سُنا کہ یہ بزرگ سید دو ہزار میل کا سفر طے کر کے پنجاب وسرحد کے ستم رسیدہ مسلمانوں کی امداد کے لئے آیا ہے تو انھوں نے اسے فرشتۂ رحمت سمجھ کر امداد کی درخواست کی۔ سید صاحبؒ نے ان کی آواز پر فوراً لبیک کہا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں کشمیر پر سکھوں کے غلبے کا پس منظر بیان کر دیا جائے۔

جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے کہ ہزارہ کی طرح کشمیر بھی ابدالی حکومت کا ایک صوبہ تھا اور عطا محمد خاں ابدالی حکومت کی طرف سے صوبۂ کشمیر کا گورنر تھا۔ ابدالی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے گورنر کشمیر عطا محمد خاں نے سرکشی اختیار کر لی۔ جب حکومتِ افغانستان پر محمود خاں کی گرفت مضبوط ہو گئی تو اس نے اپنے وزیر فتح خاں کے مشورے سے گورنر کشمیر کو مطیع کرنے کا منصوبہ بنایا مگر اس راہ میں ایک مشکل یہ تھی کہ کشمیر کے تمام اہم ناکوں مثلاً جہلم، گجرات اور بھمبر پر رنجیت سنگھ کا قبضہ تھا اور اس کی امداد وتعاون کے بغیر یہ مہم سر ہونی مشکل تھی۔ چنانچہ وزیر فتح خاں نے ۱۸۱۱ء میں اپنے ایک سفیر گوڈرمل کو رنجیت سنگھ کے پاس بھیجا کہ وہ اس مہم میں شاہ محمود کے ساتھ تعاون کرے۔ افغانستان کا معزول بادشاہ شاہ شجاع ان دنوں کشمیر کے

گورنر عطا محمد خاں کی قید میں تھا۔ شاہ محمود اور شاہ شجاع کے درمیان دیرینہ عداوت تھی اس لئے اس کے شہزادوں اور بیگمات کو جو لاہور میں پناہ گزیں تھے بڑی فکر پیدا ہوئی کہ اگر شاہ محمود نے کشمیر پر قبضہ کر لیا تو وہ شاہ شجاع کو ہرگز زندہ نہ چھوڑے گا۔ اس لئے اس کی بیگمات اور شہزادوں نے رنجیت سنگھ سے درخواست کی کہ وہ شاہ شجاع کو قید سے چھوڑ کر بحفاظت لاہور لے آئے۔ چنانچہ رنجیت سنگھ نے جو پہلے ہی کشمیر پر دانت لگائے بیٹھا تھا۔ شاہ محمود کے پیغام اور شاہ شجاع کی بیگمات کی درخواست پر بارہ ہزار سکھ فوج دیوان محکم چند کی قیادت میں روانہ کر دی۔ ادھر وزیر فتح محمد خاں افغانوں کا لشکر لے کر نومبر ۱۸۱۲ء میں دریائے اٹک عبور کر کے رہتاس آیا اور یہاں سے سکھ اور افغان فوجیں گورنر کشمیر عطا محمد خاں کی تادیب کے لئے روانہ ہوئیں۔ افغان سکھوں سے زیادہ جفاکش اور پہاڑی راستوں پر سفر کرنے کے ماہر تھے اس لئے باوجود شدید برفباری کے پیر پنجال کو عبور کر کے قلعہ شیر گڑھ پہنچ گئے اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ سکھ فوجیں قلعے کی تسخیر کے بعد پہنچیں۔ ایک دن موقع پاکر سکھ فوجوں کے جرنیل دیوان محکم چند نے بڑی ہوشیاری سے شاہ شجاع کو قلعے سے نکال لیا اور اپنی حفاظت میں لاہور لے کر روانہ ہو گیا۔ محکم چند کی اس حرکت کا وزیر فتح خاں کو نہایت قلق ہوا اور اس کے بعد رنجیت سنگھ اور افغان حکومت کے تعلقات خراب ہو گئے۔

اٹک پر رنجیت سنگھ کا قبضہ

ادھر گورنر کشمیر عطا محمد خاں کو شکست ہوئی اور ادھر اس کے بھائی جہاں داد خاں گورنر اٹک کو بھی اپنا اقتدار خطرے میں نظر آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اب وزیر فتح خاں اور شاہ محمود اسے اٹک کی گورنری سے معزول کر دیں گے اور وہ ان کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ چنانچہ اس نے رنجیت سنگھ سے رابطہ قائم کیا اور اس سے امداد کی درخواست کی۔ رنجیت سنگھ نے اسے پیش کش کی کہ وہ اٹک اس کے حوالے کر دے اس کے عوض وزیر آباد کا پرگنہ بہ طور جاگیر اسے دے دیا جائے گا، جہاں داد خاں نے یہ پیش کش قبول کر لی اور جب سکھ فوج اٹک کا قلعہ اپنی تحویل میں لینے کے لئے پہنچی تو جہاں داد خاں نے سکھ سپہ سالار سے ایک لاکھ روپیہ کی رقم طلب کی تاکہ افغان فوجوں کی جو تنخواہ اس کے ذمے تھی وہ ادا کر سکے۔ رنجیت سنگھ کے حکم سے یہ رقم جہاں داد خاں کو دے دی گئی۔ اس طرح اٹک پر فوجوں کا قبضہ ہو گیا اور ایک افغان کی غیر دانشمندی اور خود غرضی کی بدولت پہلی بار سکھوں کو صوبہ سرحد میں قدم جمانے کا موقع ملا۔

رنجیت سنگھ کا کشمیر پر حملہ اور شکست

اس سے بھی بڑا حادثہ یہ ہوا کہ افغانستان میں طوائف الملوکی پھیل جانے کی وجہ سے کشمیر پر افغان حکومت کی گرفت کمزور ہو گئی۔ اب کیفیت یہ تھی کہ بیرونی حملے کی صورت میں گورنر کشمیر کو اسی قوت پر انحصار کرنا پڑتا تھا جو اس کے پاس موجود تھی۔ باہر سے کسی امداد کی توقع نہ تھی۔ ادھر اٹک پر سکھوں کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے افغانستان سے کمک آنے کا یہ راستہ بھی بند ہو گیا تھا۔ رنجیت سنگھ اس صورتِ حال سے پوری طرح باخبر تھا۔ چنانچہ جون ۱۸۱۴ء میں وہ ٹڈی دل لشکر لے کر خود فتح کشمیر کے لئے روانہ ہوا اور گجرات سے بھمبر ہوتا ہوا راجوری پہنچا۔ اس لشکر میں رنجیت سنگھ کے تمام قابلِ ذکر جرنیل مختلف فوجوں کی قیادت کر رہے تھے مثلاً دیوان رام دیال، سردار ہری سنگھ نلوہ، سردار نہال سنگھ اٹاری والا، سردار دلیسا سنگھ مجیٹھیہ، بھیا رام سنگھ اور سردار مت سنگھ پدہانیہ۔ پہلا معرکہ ہمیر پور کے قریب ہوا اور اس شہر پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ مگر جب رنجیت سنگھ کا لشکر شوپیاں کے مقام پر پہنچا تو گورنر کشمیر عظیم خاں کے افغان سردار محمد شکور خاں نے سکھوں کا راستہ روکا۔ دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ اگرچہ محمد شکور خاں کے پاس تھوڑی سی فوج تھی مگر اس نے کمال ہمت و شجاعت سے مقابلہ کیا۔ سکھوں کا مشہور جرنیل جیون مل ایک افغان سپاہی کے ہاتھ سے مارا گیا اور سکھ فوج شکست کھا کر فرار ہو گئی۔ خود رنجیت سنگھ کو پونچھ میں افغان سردار روح اللہ خاں حاکم پونچھ سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مونڈہ کے مقام پر روح اللہ خاں کے افغان فوجیوں نے رنجیت سنگھ کے لشکر پر اس شدت سے گولیاں برسائیں کہ اسے سخت شکست ہوئی اور بچی کھچی فوجوں کو لے کر وہاں سے ناکام واپس ہوا اور لاہور آ کر دم لیا۔

دوسرا حملہ اور فتح کشمیر

اکتوبر ۱۸۱۵ء میں رنجیت سنگھ نے دوسری بار پھر کشمیر پر حملہ کیا اور راجوری کا محاصرہ کر لیا۔ آخر سخت جنگ کے بعد اس علاقے پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بھمبر کی طرف بڑھا اور سخت مقابلے کے بعد یہ علاقہ بھی اس کے قبضے میں آ گیا۔ راجوری اور بھمبر کی فتح کے بعد تسخیر کشمیر کا راستہ کھل گیا۔ چنانچہ مئی ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے فتح کشمیر کے لئے زبردست تیاریاں کیں۔ چونکہ گزشتہ جنگ میں وہ افغانوں سے پے در پے شکستیں کھا چکا تھا اس لئے اب کی بار اس نے پہلے سے کہیں زیادہ انتظامات کئے۔ زبردست تیاریوں اور کثیر لشکر کے ساتھ وہ بھمبر اور راجوری ہوتا ہوا شاہ آباد پہنچ کر خیمہ زن ہو گیا۔ اس مہم میں بھمبر کا حاکم سلطان خاں

بھی رنجیت سنگھ کے ہمراہ تھا۔ حاکمِ راجوری کے بھائی رحیم اللہ خاں نے بھی رنجیت سنگھ کا ساتھ دیا۔ اس خدمت کے صلے میں اسے راجوری کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔ ایک ہاتھی مع طلائی ہودہ، ایک گھوڑا مع طلائی ساز اور خلعتِ فاخرہ دے کر رنجیت سنگھ نے اسے اپنا مطیع بنا لیا۔ ان مسلمان حکمرانوں نے اس مہم میں رنجیت سنگھ کی پوری امداد کی۔ ادھر گورنر کشمیر کو باہر سے کمک نہ مل سکی۔ اس کے باوجود حاکمِ کشمیر جبار خاں نے علیہ آباد کے مقام پر سکھوں کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور ایک غیر مسلم مورخ کے بقول جس نے رنجیت سنگھ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں۔ جبار خاں کی سپاہ جان توڑ کر مقابلہ کیا چنانچہ ایک بار خالصہ فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا اور ان کی دو توپیں دشمن (جبار خاں کی فوج) کے ہاتھ لگیں[1]۔ آخرکار خونریز جنگ کے بعد ۴ جولائی ۱۸۱۹ء کو سکھ فوج سری نگر میں داخل ہو گئی۔ اس طرح کشمیر پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس قبضے کے بعد سکھ فوجوں نے ریاست کے مسلمانوں پر وہ مظالم کئے کہ ساری وادی مسلمانوں کے خون سے رنگین ہو گئی اور ان کی عزت و آبرو اور جان و مال ہر چیز غارت ہو گئی۔

آزادیٔ کشمیر کے لئے سیّد صاحبؒ کی مساعی

ہمیں یقین ہے کہ سکھ کشمیر پر قبضہ کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتے۔ پہلی جنگ میں رنجیت سنگھ کی ذلت ناک شکست اس کا واضح ثبوت ہے مگر جب کشمیر کے افغان گورنر نے حکومتِ کابل سے سرکشی اختیار کی اور اٹک کے افغان گورنر نے غداری کر کے اٹک کا قلعہ سکھوں کے حوالے کر دیا تو حالات سکھوں کے حق میں سازگار ہونے شروع ہو گئے۔ خود کشمیر کے اندر جو انتشار پیدا ہو چکا تھا اس نے بھی حالات کو خراب کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ وادیٔ جنت نظیر درندوں کے قبضے میں آ گئی۔ حالات کے تحت کشمیر کے لوگ سکھوں کا اقتدار قبول کرنے پر مجبور ہو گئے مگر تاریخ شہادت دیتی ہے کہ انہوں نے دل سے اس ظالمانہ تسلط کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور کشمیر کے علماء، سادات اور بعض علاقوں کے مسلمان سردار اس کوشش میں مصروف رہے کہ سرزمینِ کشمیر کو اس جابرانہ تسلط سے نجات دلائی جائے چنانچہ فتح امب کے بعد جب سید صاحبؒ آپ کے رفقاء و مشیر اور آپ کا دفتر امب منتقل ہو چکا تھا تو کشمیر میں سکھوں کے مظالم اور وہاں کے مسلمانوں کی پس ماندگی کی اطلاع پا کر آپ نے اپنے ایک معتمد مولوی نظام الدین چشتی کو جو بڑے پائے کے عالم تھے اپنا خلیفہ مقرر کر کے کشمیر بھیجا تاکہ وہاں کے مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کریں اور انہیں جہاد کے لئے آمادہ کریں۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام امب ہی کے دوران آپ نے کشمیر کے مسلمانوں کو سکھوں کے

---

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ صفحہ ۲۲۹ مولفہ پروفیسر سیتارام کوہلی۔

مظالم سے نجات دلانے کے لئے کئی بار کشمیر پر لشکر کشی کا بھی ارادہ کیا مگر بعض دشواریوں کے پیشِ نظر آپ کے مشیروں نے آپ کو اس ارادے سے باز رکھا۔

ہمارے خیال میں کشمیر کی تاریخ میں آزادیٔ کشمیر کی یہ پہلی کوشش تھی جس کا آغاز سید صاحبؒ نے کیا اور وہاں کے پس ماندہ اور مظلوم مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں باعمل مسلمان بنانے کی بھی کوشش کی۔ اس کوشش کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور کشمیری مسلمانوں نے بڑی گرم جوشی سے سید صاحبؒ کی دعوت قبول کی۔ بہت سے لوگوں نے آپ کے خلیفہ مولوی نظام الدین چشتیؒ کے ہاتھ پر آپ کی بیعت کر لی۔ ان لوگوں میں بعض اکابر اور علماء بھی شامل تھے۔ چنانچہ کشمیر کے مشہور روحانی پیشوا حضرت مولانا محمد اکرمؒ سہروردی نے بھی سید صاحبؒ کی بیعت کی۔ موجودہ تحریکِ کشمیر کے ایک رہنما مولانا عطاء اللہ سہروردی نائب صدر محاذِ رائے شماری انہی حضرت مولانا محمد اکرم سہروردیؒ کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور بارہا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر چکے ہیں۔ مرزا محمد افضل بیگ صدر محاذِ رائے شماری نسبتِ مادری سے سید صاحبؒ کے مرید حضرت مولانا محمد اکرم سہروردیؒ کے خانوادہ سے منسلک ہیں اور کم و بیش چالیس برس سے تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی رہنمائی کر رہے ہیں۔[1]

اہلِ کشمیر کی سید صاحبؒ سے درخواست

یہ سید صاحبؒ ہی کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ ان کے خلیفہ مولوی نظام الدین چشتی نے کشمیری مسلمانوں میں بیداری کی رُوح پھونک دی اور یہ مجبور و بے حس مسلمان سکھوں کی ظالمانہ حکومت کا جُوا اپنے کندھے سے اتار پھینکنے کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد کشمیر کے بعض سرکردہ مسلمانوں نے سید صاحبؒ کی خدمت میں خطوط لکھے کہ کشمیر کا گورنر کرپا رام رنجیت سنگھ کا معتوب ہو کر چلا گیا ہے۔ اس وقت میدان خالی ہے آپ تشریف لا کر ریاست پر قبضہ کر لیں۔ ہم دل و جان سے آپ کی مدد کریں گے۔ سید صاحبؒ اس کے لئے تیار بھی ہو گئے مگر شاہ اسماعیلؒ نے اس اقدام سے اختلاف کیا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ کشمیر یہاں سے دس بارہ منزل کے فاصلے پر ہے اور پھر نیا ملک ہے جہاں کے حالات سے ہمیں پوری واقفیت بھی نہیں۔ جب ہمارا لشکرِ کثیر کشمیر کی طرف روانہ ہو گا تو اس کی نقل و حرکت پوشیدہ نہیں رہ سکے گی اور لاہور کی سکھ حکومت تک اس کی خبر ضرور پہنچ جائے گی۔ جب سکھ فوجیں کشمیر میں داخل ہوں گی تو کشمیری مسلمان جو پہلے ہی کمزور اور سکھوں کے

---

[1] یہ معلومات مجھے اپنے کرم فرما پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ صاحب پرنسپل بی۔ اے۔ ایف کالج پشاور کے ایک عنایت نامہ سے حاصل ہوئی۔ (مولف)

ظلم کی وجہ سے خوف زدہ ہیں ہمارا ساتھ نہیں دے سکیں گے اور نتیجہ تباہی کے سوائے اور کچھ نہیں ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے علاقۂ یوسف زئی، پشاور اور ہزارہ پر مکمل تسلط حاصل کر لیا جائے، اپنی طاقت خوب مستحکم کر لی جائے اور کشمیر کے اگر سب نہیں تو بعض اہم ناکوں پر قبضہ کر لیا جائے تاکہ کشمیر جانے کے راستے پر ہمارا اقتدار قائم رہے اور مجاہدین کی نقل وحرکت میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ شاہ صاحبؒ کا خیال تھا کہ اس دوران میں کشمیر کے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور انہیں آمادۂ جہاد کرنے کی تحریک بھی دور دور تک پھیل جائے گی اور سید صاحبؒ کے کشمیری جاں نثاروں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہو جائے گا اور ان کی حالت میں اتنا تغیر پیدا ہو چکا ہوگا کہ جب مجاہدین کا لشکر کشمیر میں داخل ہوگا تو کشمیری مسلمان پوری ثابت قدمی سے سید صاحبؒ کا ساتھ دے سکیں گے۔

سید صاحبؒ کی عادت تھی کہ سنتِ نبویؐ کی پیروی میں مشورے کے بغیر وہ کوئی قدم نہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے بالغ نظر اور فنِ جنگ کے ماہر مشیر اس وقت کشمیر پر حملہ کرنے کے خلاف ہیں تو انھوں نے یہ ارادہ کسی اور وقت کے لئے ملتوی کر دیا۔ اس کے بعد جب پشاور اور اس کے مضافات میں سید صاحبؒ کے تحصیلداروں کا قتلِ عام کیا گیا اور آپ نے ہزارہ کی طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا تو اس موقع پر علاقۂ پکھلی اور کاغان کے علاوہ کشمیر سے بھی وہاں کے اکابر کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ مجاہدین کا لشکر بھیج کر کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلائی جائے۔

فتح کشمیر کا منصوبہ

سید صاحبؒ خود بھی مسلمانانِ کشمیر کی حالتِ زار سے سخت بے چین تھے اور پنجتار سے روانہ ہو کر ان کا ارادہ بھی یہی تھا کہ کسی محفوظ مقام کو مرکز بنا کر کشمیر میں جنگ کی جائے اور مسلمانانِ کشمیر کو سکھوں کے ظلم وستم سے نجات دلا کر وہاں اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ چنانچہ جب آپ راج دواری پہنچے تو کشمیر کے بعض سرداروں مثلاً سلطان زبردست خاں حاکم مظفر آباد اور سلطان نجف خاں حاکم کھوڑی نے جو سکھوں کے حملوں اور خود اپنے عزیزوں کی ایذا رسانی کی وجہ سے اپنی اپنی ریاستوں سے جلاوطن ہو گئے تھے۔ سید صاحبؒ کی خدمت میں راج دواری حاضر ہو کر امداد کی درخواست کی۔ ان ملاقاتوں میں سید صاحبؒ نے کشمیر کے ان معزول حکمرانوں سے فتح کشمیر کے مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا اور ایک جامع منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبہ کی تشکیل میں کھوڑی (ریاست کشمیر) کے سلطان نجف خاں نے سید صاحبؒ کو راستوں اور منزلوں کی کیفیات بتائیں اور اہل کشمیر کے جذبات سے آگاہ کیا۔ خان ہدایت اللہ خاں آف پرسچہ (مضافاتِ مظفر آباد) نے جو سلطان نجف خاں والیٔ کھوڑی کے خاندان

سے تعلق رکھتے ہیں راقم الحروف سے بیان کیا کہ مقام راج پیاں کا ایک معمر شخص جو ایک سو ساٹھ سال کی عمر پاکر فوت ہوا سلطان نجف خاں کا معتمد تھا اور سلطان موصوف کے خطوط لے کر سچہ اور بالاکوٹ جایا کرتا تھا۔ اس نے مجھ (خان ہدایت اللہ خاں) سے یہ روایت بیان کی کہ سید صاحبؒ اور سلطان نجف خاں والئ کھوڑی کے درمیان ایک منصوبہ طے پایا تھا کہ جب بھوگڑمنگ اور بالاکوٹ سے گڑھی حبیب اللہ اور مظفر آباد تک سید صاحبؒ کے مجاہدین کا اقتدار قائم ہو جائے گا اور یہ علاقے سکھوں کی دست برد سے محفوظ ہو جائیں گے تو سید صاحبؒ بالاکوٹ سے اپنا لشکر لے کر براستہ گلی گلوٹی روانہ ہوں گے۔ کھوڑی کے مقام پر سلطان نجف خاں اپنا لشکر لئے سید صاحبؒ کے منتظر ہوں گے۔ یہاں سے دونوں لشکر براستہ کرناہ گلی ہوتے ہوئے نتھی چھنہ پہنچیں گے اور تحصیل ہنڈواڑہ پر حملہ کریں گے۔ ہنڈواڑہ فتح کرنے کے بعد سری نگر کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔ مگر افسوس کہ بعد میں جو واقعات پیش آئے ان کی وجہ سے یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا ورنہ آج کشمیر کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔

مظفر آباد پر حملہ کرنے کی دعوت

سچہ پہنچنے کے بعد سید صاحبؒ نے مولانا خیرالدین شیر کوٹی کو بھوگڑمنگ میں متعین فرما دیا تھا۔ ایک ماہ کے بعد آپ نے انہیں وہاں سے تبدیل کر کے بالاکوٹ بھیج دیا۔ وہاں پہنچ کر انہیں اس علاقے کے بعض سرداروں کا یہ پیغام ملا کہ شیر سنگھ کا مقرر کردہ حاکم مظفر آباد نجف خاں اور زبر سنگھ دونوں پشاور گئے ہوئے ہیں۔ قلعے میں سکھ فوج کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ نہیں۔ یہ موقع اچھا ہے آپ مظفر آباد پر حملہ کر دیں مگر چونکہ مولانا خیرالدین کو صرف بالاکوٹ جانے کا حکم ملا تھا اور وہ اپنے امیر کے خلاف حکم از خود کوئی اقدام نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مظفر آباد پر حملہ کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ جلد ہی شاہ اسماعیلؒ بھی بالاکوٹ پہنچ گئے۔ علاقے کے سرداروں مثلاً حبیب اللہ خاں (گڑھی والے) اور مظفر آباد کے معزول حاکم زبردست خاں نے ان سے بھی یہی درخواست کی۔ یہ ملاقات شاہ صاحبؒ کے بالاکوٹ پہنچنے پر اسی روز بعد نمازِ ظہر ہوئی۔ شاہ صاحبؒ نے اُن سے وعدہ کیا کہ ہم کچھ آدمی تمہارے ساتھ بھیج دیں گے مگر ان سرداروں نے زیادہ آدمیوں کا مطالبہ کیا۔ مولانا نے ان سے اتفاق نہ کیا کیونکہ بالاکوٹ کی حفاظت کے لئے بھی مضبوط جمعیت کی ضرورت تھی۔ شاہ صاحبؒ نے سلطان زبردست خاں کے اصرار پر فرمایا کہ ہم غازیوں کی جماعت کو آپ کے ساتھ برکت کے طور پر بھیج رہے ہیں۔ اس مجلس سے اُٹھ کر شاہ صاحب مجاہدین کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ "میں نے سلطان زبردست خاں کے طرزِ کلام سے نفاق کی بُو محسوس کی ہے[1]"۔

---

[1] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۱۳۱۔

مولانا جعفر نقوی کا بیان ہے کہ شاید اس مجلس میں مولوی خیرالدین شیرکوٹی موجود نہ تھے۔ کیونکہ شاہ اسماعیلؒ نے سلطان زبردست خاں سے جو وعدہ کیا تھا مولانا خیرالدین نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت ہمارا لشکر اسلحہ سے پوری طرح آراستہ نہیں۔ اگر سلطان زبردست خاں مجاہدین کا لشکر لے جانا چاہتا ہے تو اسے لشکر کی درستی اور اسلحہ وغیرہ کے لئے پانچ ہزار روپے دینے چاہئیں۔ اگر اتنا نہ دے سکیں تو تین ہزار روپے دیں۔ اور یہ بھی ممکن نہ ہو سکے تو دو ہزار تو ضرور دیں۔ اس پر شاہ اسماعیلؒ نے فرمایا کہ ریاست سے محرومی کی اس حالت میں ان کے پاس اتنی رقم موجود نہیں۔ البتہ وہ کہتے ہیں کہ مظفر آباد پہنچنے پر تمام سامان مہیا کر دیا جائے گا۔ یہ سُن کر مولوی شیر کوٹی نے عرض کیا کہ یہ اُن کی حیلہ سازی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس لشکر پر میرے بجائے کسی اور کو امیر بنا دیں۔

مجاہدین کی مظفر آباد کو روانگی

چنانچہ شاہ اسماعیلؒ نے تین سو غازیوں کا ایک لشکر ملا قطب الدین ننگرہاری، منصور خان قندھاری اور منشی محمد دین امان زئی کی سرکردگی میں مظفر آباد روانہ کر دیا۔ سلطان زبردست خاں بھی مع اپنی جمعیت کے مجاہدین کے ساتھ عازم مظفر آباد ہو گیا۔ اس کے بعد ہی حبیب اللہ خان (گڑھی والے) سلطان نجف خاں (کھوڑی والا) اور راجہ مظفر خاں سید صاحبؒ کی خدمت میں سچہ روانہ ہو گئے۔ جب مجاہدین اور سلطان زبردست خاں کا لشکر دریا پر پہنچا تو طوفان زوروں پر تھا۔ کشتیاں سکھوں کے قبضے میں تھیں اور وہ آمادۂ جنگ تھے اس وقت دریا میں ایسی شدید طغیانی آئی ہوئی تھی کہ بڑے بڑے پتھر بھی پانی میں بہتے چلے جا رہے تھے۔ چونکہ اس علاقے کے لوگوں میں پُل تعمیر کرنے کی استطاعت نہ تھی اس لئے انہوں نے دریا پر لکڑی اور چمڑے کے رسوں کا ایک عارضی اور کمزور سا پل بنا لیا تھا جس کے ذریعے صرف معمولی سامان لے کر دریا عبور کیا جا سکتا تھا۔ اسے پشتو میں "ترانگو" کہتے ہیں۔

مجاہدین کی بے خوفی

اس سے قبل ہندوستانی مجاہدین نے ایسا پُل کبھی نہ دیکھا تھا اس لئے اس پُل کے ذریعے دریا عبور کرنا ان کے لیے نہایت مشکل تھا۔ چنانچہ جب لشکر دریا کے قریب پہنچا اور سلطان اور اس کے ہمراہیوں نے اس پل کے ذریعے دریا عبور کرنا چاہا تو مجاہدین نے کہا ہمیں اس طرح دریا عبور کرنے کی مہارت نہیں۔ ہم خدا کا نام لے کر دریا میں داخل ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اِسے پار کریں گے۔ پس غازی اللہ کا نام لے کر

دریا میں داخل ہو گئے اور اسی کے نام کی برکت سے انھوں نے دریا عبور کر لیا۔[1] حالانکہ دریا پوری طرح چڑھا ہوا تھا اور طغیانی اس شدت کی تھی کہ بڑی بڑی چٹانیں بھی سرکش موجوں کے ساتھ تنکوں کی طرح بہتی چلی جا رہی تھیں۔

مظفر آباد کی فتح

دریا کے دوسری طرف سکھ فوج یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے بندوقوں کی مسلسل باڑھیں مارنی شروع کیں مگر مجاہدین نے کچھ پروانہ کی اور وُہ بندوقوں کے پے در پے فائر کرتے ہوئے مظفر آباد میں داخل ہو گئے۔ سکھ فوج پسپا ہو گئی اور مجاہدین نے سلطان زبردست خان کے مکانات اور شہر کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ صرف گڑھی اور چھاؤنی پر سکھوں کا قبضہ باقی رہ گیا۔

اِدھر مظفر آباد فتح ہوا اور اُدھر حبیب اللہ خاں اور سلطان نجف خاں وغیرہ نے راج دواری میں حاضر ہو کر سید صاحبؒ سے ملاقات کی اور سلطان زبردست خان کی طرف سے عرض کیا کہ مولوی خیر الدین شیرکوٹی کو ان کی امداد کے لئے بھیج دیا جائے ادھر مولوی شیرکوٹی نے سید صاحبؒ کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا جس میں مجاہدین کی مظفر آباد کو روانگی اور ان کے ساتھ نہ جانے کا عذر تحریر کیا۔ اس کے جواب میں سید صاحبؒ نے انہیں لکھا کہ گو تمہارا عذر معقول ہے مگر اس وقت تمہارا مظفر آباد جانا نہایت ضروری ہے کیونکہ جو لوگ مظفر آباد گئے ہیں وُہ وہاں کے حالات سے واقف نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس ناواقفیت کی وجہ سے مجاہدین کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ اسی فرمان کے ذریعے سید صاحبؒ نے مولوی خیر الدین شیرکوٹی کو تمام غازیوں کا امیر مقرر فرمایا۔ جب یہ حکم مولوی خیر الدین کو ملا تو وُہ اسی وقت دس ہندوستانی غازیوں کا ایک دستہ لے کر مظفر آباد روانہ ہو گئے۔

مولوی خیر الدین مظفر آباد میں

جب مولوی خیر الدین مظفر آباد پہنچے تو اگرچہ ان کے پاس سید صاحبؒ کا فرمان مظفر آباد میں مقیم مجاہدین کے افسروں کے نام موجود تھا جس میں انہیں مولوی خیر الدین صاحب کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا تھا مگر اس کے باوجود ان میں سے بعض نے نفسانیت کا مظاہرہ کیا اور مولوی صاحب کی اطاعت سے سرتابی کی۔[2] لیکن مولوی صاحب نے اپنی قابلیت و فراست سے آہستہ آہستہ ہر افسر کے ماتحتوں کو اپنے موافق کر لیا۔ پھر افسروں کو جمع کر کے فرمایا کہ تم بہت سے افسر ہو اور اتنے افسروں کی اطاعت میرے لیے محال ہے۔ اگر فوج میں

---

[1] منظورۃ السعدا صد ۱۱۳۴ [2] منظورۃ السعدا صد ۱۱۳۵

ایک شخص کو افسر قرار دے تو ہم سب اس کی اطاعت اختیار کریں گے ورنہ نفسانیت کے ہاتھوں کام بگڑ جائے گا۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ باہم مشورہ کر کے ہم آپ کو اپنے فیصلے سے مطلع کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی مولوی صاحب نے یہ سارا ماجرا شاہ اسماعیل صاحبؒ کی خدمت میں لکھ بھیجا اور جعفر خاں پنجابی کی جماعت کو جو تیس افراد پر مشتمل تھی، اپنی رفاقت کے لئے طلب کر لیا۔ جعفر خاں نے اس موقع پر مولوی خیر الدین صاحب سے پورا تعاون کیا اور ان کی اطاعت اختیار کر لی۔ ان کی جماعت کے بعض افراد کے نام یہ ہیں: اللہ دتہ ساکن پکھلی (ہزارہ) ۔ عبداللہ، عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم ۔ یہ تینوں حقیقی نومسلم بھائی اور مظفر آباد کے باشندے تھے ان کے علاوہ امام الدین ساکن شاہجہان آباد بھی جعفر خاں پنجابی کی جماعت میں شامل تھے۔

زبردست خاں کی کمزوری

جب سلطان زبردست خاں کے مکانات اور بازار وغیرہ کے علاقے سکھوں کے قبضے سے آزاد ہو گئے تو اس کا اندازِ فکر بدل گیا ۔ شاید اسے خطرہ تھا کہ اس وقت تو مظفر آباد شہر کے بڑے حصے پر مجاہدین کی مدد سے اس کا قبضہ ہو گیا ہے مگر جب شیر سنگھ اور سلطان نجف خان فوجِ کثیر لے کر آئیں گے تو شاید مجاہدین مقابلہ نہ کر سکیں اور نتیجہ یہ ہو کہ ریاست بھی جاتی رہے اور جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں۔ چنانچہ اس نے سکھوں کو پیغام بھیجا کہ میرا وہ تمام سامان جو تم نے ابتدا میں لوٹ لیا تھا مجھے واپس کر دو۔ میں کسی حیلے سے سیّد صاحبؒ کے غازیوں کو رخصت کر دوں گا اور ساری عمر تمہارا فرمانبردار رہوں گا[1]۔ سلطان زبردست خاں کی یہ خفیہ ساز باز مجاہدین سے مخفی نہ رہی چنانچہ انھوں نے مطالبہ کیا کہ اپنے مکانات اور بازار پر سے سکھوں کا قبضہ ختم کروا کر خاموش کیوں بیٹھے ہو سکھوں کی چھاؤنی اور گڑھی پر قبضہ کرنے کے لئے اقدام کیوں نہیں کرتے۔ معلوم ہوا کہ سکھوں سے تمہارا ساز باز ہے۔ سلطان زبردست خاں حیلہ بہانہ کر کے وقت گزارنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر غازیوں نے کمال جرأت سے اس کے نفاق کا اعلان کر دیا اور کہا کہ تم نے ہمیں یہاں لا کر خود کافروں سے سازش کر لی ہے۔ اسی دوران میں مولوی خیر الدین شیرکوٹی نے سلطان کو اس کا وعدہ یاد دلاتے ہوئے مطالبہ کیا کہ تم نے بالاکوٹ میں اقرار کیا تھا کہ مظفر آباد پہنچ کر گولہ بارود فراہم کرو گے۔ اب اپنا وعدہ پورا کرو مگر اس نے مولوی صاحب کا مطالبہ پورا کرنے میں بھی حیلہ سازی شروع کر دی۔

---

[1] منظورۃ السعداء ص ۱۱۳۵

مجاہدین کا مظفرآباد کی چھاؤنی پر قبضہ

آخر سلطان زبردست خاں کی مسلسل خاموشی اور سکھوں کے ساتھ جنگ سے پہلو تہی سے مجبور ہو کر مجاہدین نے سکھوں کی چھاؤنی پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ایک دن مولوی خیرالدین شیر کوٹی سے اجازت لئے بغیر ملّا قطب الدین ننگرہاری اور عبدالصمد خاں خیبری نے سکھوں کی چھاؤنی پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں سلطان زبردست خاں کا بھائی بھی جو ایک غیرت دار اور باحمیت شخص تھا مجاہدوں کے ساتھ شریک ہو گیا۔ دونوں طرف سے بکثرت بندوقیں چلنے لگیں۔ آخر کار سکھوں کو شکست ہوئی اور مجاہدین نے مظفرآباد کی چھاؤنی بھی ان کے قبضہ سے آزاد کرا لی۔ اس جنگ میں سکھ فوج کا جرنیل ہلاک ہو گیا اور اس کے بہت سے ساتھی بھی قتل ہوئے[1]۔ مجاہدین کی طرف سے بھی چند افراد زخمی ہوئے۔ ملّا قطب الدین کے بازو پر گولی لگی۔ ایک گولی عبدالصمد خاں خیبری کی ران پر لگی جس سے وہ گر پڑے۔ اسی طرح بعض اور مجاہدین کے ہاتھوں اور بعض کے پیٹ پر زخم آئے چونکہ مجاہدین نے یہ جنگ مولوی صاحب کے مشورے کے بغیر اچانک لڑی تھی اس لئے اپنی اس حرکت پر سخت پشیمان اور مولوی صاحب سے معافی کے خواستگار ہوئے۔ آخر حبیب اللہ خاں (گڑھی والے) کے چچا زاد بھائی پائندہ خاں اور بہرام خاں کی سفارش پر مولوی صاحب نے ان کی خطا معاف کر دی۔

جنگ کے بعد سکھ میدان سے بھاگ کر گڑھی میں پناہ گزین ہو گئے تھے اور میدانِ جنگ میں طرفین کے زخمی پڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ مولوی خیرالدین صاحب نے گڑھی کا محاصرہ کر لیا اور سکھوں کو پیغام دیا کہ جب تک ہم اپنے زخمی غازیوں کو اٹھا نہیں لیتے اس گڑھی سے جدا نہیں ہوں گے پس بہتر یہ ہے کہ تم اپنے زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا لے جاؤ اور ہم اپنے زخمی اٹھائے لیتے ہیں۔ شکست خوردہ سکھوں نے اس پیغام کو غنیمت جانا اور مولوی صاحب کی پیش کش قبول کرنے پر رضامند ہو گئے۔ مجاہدین میں سے جن لوگوں کو شدید زخم آئے تھے انہیں سید صاحبؒ کے پاس ستھانہ بھیج دیا گیا۔

اہل کشمیر کا وفد بالاکوٹ میں

جب مظفرآباد پر سید صاحبؒ کے مجاہدین کا قبضہ ہو گیا اور اس کامیابی کی خبریں کشمیر پہنچیں تو اہل کشمیر کی طرف سے چند معتبر مسلمان بالاکوٹ بھیجے گئے تاکہ وہ سید صاحبؒ کی خدمت میں کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کو سکھوں کے

---

[1] منظورۃ السعداء ص ۱۱۴۷

ظلم وستم سے نجات دلانے کی درخواست کریں۔ جب یہ وفد بالاکوٹ پہنچا تو شاہ اسماعیلؒ سچہ سے بالاکوٹ واپس آچکے تھے اور سید صاحبؒ ابھی سچہ میں مقیم تھے۔ وفد شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ جب اللہ تعالیٰ لشکرِ اسلام کو بالاکوٹ تک لے آیا جہاں سے کشمیر صرف تین منزل کے فاصلے پر ہے تو ہم بہت خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ لشکرِ اسلام کو ہمارے شہر میں جلد داخل فرمائے تاکہ ہم سکھ کفار کے ظلم وستم سے نجات پائیں اور جناب امامِ ہمامؒ (سید صاحبؒ) کے سایۂ حمایت میں آرام کا سانس لیں اور اسلام و سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے میں آزاد ہوں۔

چنانچہ شاہ اسمٰعیلؒ نے وفد کی عرضداشت سن کر سید صاحبؒ کی خدمت میں ایک عرضی بھیجی اور ان کا سابقہ ارادہ یاد دلاتے ہوئے لکھا کہ:

"آں جناب نے امب میں ریاست کشمیر کی تسخیر کا ارادہ فرمایا تھا۔ وہ جگہ کشمیر سے بہت دور تھی اور اب تو جناب کا لشکر مظفر آباد تک پہنچ گیا ہے جہاں سے کشمیر صرف دو روز کی مسافت پر ہے۔ اگر وہاں کے مقامی باشندوں نے تعاون کیا تو پہلی منزل ذرا طویل ہوگی۔ راستے میں کسی ایک جگہ قیام کر لیا جائے گا اور دوسرے روز اللہ تعالیٰ کی مدد سے مجاہدین کشمیر میں داخل ہو جائیں گے۔ وہاں کی رعایا کفارِ کے ظلم وستم سے تنگ ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان میں سے بیشتر لوگ لشکرِ اسلام کی امداد کریں گے[1]"

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ سید صاحبؒ کا طریقہ تھا کہ آپ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سنت نبویؐ کی اتباع میں اہل الرائے اصحاب سے مشورہ ضرور فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ جب شاہ اسماعیلؒ کی عرضی ان کی خدمت میں پہنچی تو انھوں نے حسن علی خاں، حبیب اللہ خاں اور بعض دوسرے خوانین سے مشورہ کیا۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ:

تسخیرِ کشمیر کے متعلق خوانین کا مشورہ

"اگر جناب تسخیر کشمیر کا ارادہ فرمائیں تو اللہ تعالیٰ کی مدد اور تائید سے آپ ریاست میں داخل ہو جائیں گے۔ لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کے یہاں سے تشریف لے جانے کے بعد سکھوں کا لشکر ہم پر حملہ آور ہوگا اور ہمیں تباہ کر دے گا۔ وہ یہ خیال کرے گا کہ ہم ہی لوگوں نے کشمیر تک آپ کی رہنمائی کی، اس لئے مناسب یہ ہے کہ پہلے سکھوں کے ساتھ یہیں ایک

---

[1] منظورۃ السعداء ص ۱۱۳۸، ۱۱۲۹

(فیصلہ کن) جنگ کی جائے اور انہیں شکست دے کر پھر آپ کشمیر کی فتح کا ارادہ فرمائیں۔ اس فتح سے ایک تو لشکرِ اسلام کی شوکت قائم ہو جائے گی اور دوسرے ہم بھی بالاتفاق آپ کے لشکر کے ہمراہ ہو جائیں گے۔[1]

چونکہ خوانین کا یہ مشورہ نہایت صائب اور معقول تھا۔ دوسرے سید صاحبؒ کے دل میں کمزوروں کے لئے رحم کا جذبہ بہت زیادہ تھا اس لئے انہوں نے یہ خیال فرماتے ہوئے کہ ان کے کشمیر جانے کے بعد سکھ یہاں کے مسلمانوں پر ظلم و ستم نہ کریں۔ شاہ اسماعیلؒ کو لکھ دیا کہ فی الحال تسخیرِ کشمیر کی مہم میں بعض قباحتیں ہیں۔ اس لیے اس تجویز کو آئندہ کسی موقع کے لئے ملتوی کر دیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اگر سید صاحبؒ کے پاس گولہ بارود کا وافر ذخیرہ اور لشکرِ کثیر ہوتا تو وہ اسی وقت کشمیر کی طرف کوچ کر دیتے مگر چونکہ بالاکوٹ اور اس کے نواحی علاقوں پر سکھوں کے حملے کا اندیشہ تھا اور اس علاقے کے سرداروں میں ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ اس لئے سید صاحبؒ نے پہلے ان علاقوں کی حفاظت مقدم سمجھی تاکہ یہاں سکھوں کو شکست دینے کے بعد اس علاقے کی حفاظت کا مستحکم انتظام ہو جائے۔ اس کے بعد کشمیر کی طرف کوچ کیا جائے۔ مگر بعد میں جو واقعات پیش آئے ان کی وجہ سے سید صاحبؒ کا ارادہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

شیر سنگھ کی آمد اور مولوی خیر الدین کا مشورہ

مجاہدین کو مظفر آباد آئے ایک ماہ سے زیادہ ہو چکا تھا۔ سلطان زبردست خاں کی لیت و لعل کی وجہ سے سکھوں کی گڑھی پر قبضہ نہ ہو سکا تھا۔ وہ بدستور اپنی گڑھی میں محصور تھے کہ اچانک شیر سنگھ اور سلطان نجف خاں ورہ بالاکوٹ پہنچ کر گڑھی حبیب اللہ خاں میں خیمہ زن ہو گئے۔ یہ خبر سلطان زبردست خاں کو رات کے دو بجے ملی۔ اس نے فوراً مولوی خیر الدین صاحب کو بلایا اور پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ میرا تو شروع سے یہی خیال تھا کہ سکھ اور سلطان نجف خاں ضرور ادھر کا رخ کریں گے۔ اس لئے ہمیں سکھوں کو گڑھی سے نکال کر مظفر آباد کی حفاظت کا مستحکم انتظام کرنا چاہئے مگر تم نے میری رائے پر عمل نہ کیا۔ جو شخص اپنے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہو اسے روپیہ صرف کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ابتدا سے ہی تمہارا ساتھ دینا پسند نہ کیا۔ اب بھی وقت ہے۔ یہ دریا اس وقت ہمارے لئے مورچے کی حیثیت رکھتا ہے۔ سکھ اسے عبور نہیں کر سکیں گے۔ دریا کی دوسری جانب پہاڑ اور دشوار گزار گھاٹیاں ہیں۔ تمہیں خطرات ضرور نظر آ رہے ہیں لیکن اگر تم استقامت اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ مشکلات آسان

---

[1] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۱۳۹

فرما دے گا۔ اس کا ارشاد ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ○ (اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) مگر مجھے تم سے اس کی توقع نہیں۔

مولوی صاحب کے اس مشورے کو سب نے قبول کر لیا اور صبح کی نماز کا وقت اس تجویز پر عمل کرنے کے لئے مقرر ہوا۔ یعنی سکھوں کو گڑھی سے نکال مظفر آباد کا دفاع مضبوط کر لیا جائے۔

زبردست خاں کا فرار

بظاہر تو سلطان زبردست خاں نے مولوی خیرالدین صاحب کا مشورہ قبول کر لیا مگر اس کی ہمت جواب دے چکی تھی اور اس میں مقابلہ کرنے کا حوصلہ بالکل نہ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے نمازِ فجر سے قبل ہی اپنا اسباب بندھوا کر پہاڑوں کے دروں میں پہنچا دیا۔ ابھی مجاہدین مصروفِ خواب تھے کہ سلطان نے مولوی خیرالدین صاحب کو بلا کر کہا کہ مولوی صاحب کوچ کرو۔ مولوی صاحب نے پوچھا کہ کس طرف؟ اس نے جواب دیا کہ کوہستان میں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ رات کا مشورہ کہاں گیا؟ اس نے سوائے اس کے کوئی جواب نہ دیا کہ کوچ کرو۔ اس وقت سلطان بہت پریشان اور گم سُم تھا۔ آخر مولوی صاحب نے غازیوں کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا اور مجبوراً سلطان کے ساتھ مظفر آباد سے روانہ ہو گئے۔ سلطان کے ہمراہی گھبراہٹ میں راستے سے بھٹک رہے تھے اور پہاڑوں میں سرگرداں پھر رہے تھے حالانکہ ان کی جمعیت میں پانچ سات سو سے کم آدمی نہ تھے۔

راستے میں سکھوں سے مڈبھیڑ

یہ صورتِ حال دیکھ کر سکھ گڑھی سے نکل آئے اور انہوں نے مسلمانوں کا تعاقب شروع کر دیا۔ لوگ گھاٹیوں میں چھپنے لگے۔ یہ دیکھ کر مولوی خیرالدین صاحب لشکر کے سامنے کھڑے ہو گئے اور انھیں بھاگنے سے منع کیا۔ اسی دوران میں جعفر خاں پنجابی بھی آ گئے۔ مولوی صاحب نے انھیں سخت و سست کہا کہ تم ان لوگوں کو روکتے کیوں نہیں۔ اس وقت مولوی صاحب سخت غضب ناک ہو رہے تھے۔ جعفر خاں نے عرض کیا کہ میں کیا کروں لوگ افراتفری کی وجہ سے بھاگ رہے ہیں۔ آخر مولوی خیرالدین صاحب کی استقامت اور جعفر خاں پنجابی کی کوشش سے لوگ رُک گئے اور سکھوں سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب سکھوں نے دیکھا کہ بھاگنے والے مقابلے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور ان کی گولیاں سکھوں پر برسنے لگیں تو پھر وہ میدان سے بھاگ نکلے اور مظفر آباد میں داخل ہو کر مکانوں کو آگ لگانی شروع کر دی۔ اس وقت تمام غازی مولوی صاحب کے

لہ منظورۃ السعدا صفحہ ۱۱۵۔

پاس اکٹھے ہو گئے۔ اسی اثناء میں سلطان زبردست خاں کے داماد قطب الدین خاں نے اپنے خسر کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ کر مولوی خیرالدین کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ یہ میرا خسر اب آپ کے ہاتھ میں ہے آج اس کا کوئی رفیق نہیں مولوی صاحب نے فرمایا کہ جاؤ جب تک میں زندہ ہوں کسی کو اسے نقصان پہنچانے کی جرأت نہ ہوگی۔

راستے کے واقعات

اس کے بعد مجاہدین اور سلطان زبردست خاں بالاکوٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں پہاڑ کی چوٹی پر واقع ایک گاؤں میں قیام کیا۔ قطب الدین خاں اور راجہ منصور خاں رئیس درابہ بھی وہیں مقیم ہوئے۔ درابہ نہایت دشوار گزار جگہ ہے جہاں بہت سے چشمے اور چاروں طرف کئی گہرے نالے ہیں۔ قریب ہی سے دریا گزرتا ہے مگر کوہستان ہونے کی وجہ سے یہاں کشتی نہیں چل سکتی۔ اس لئے لوگ دریا عبور کرنے کے لئے چھینکا[1] استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ غازیوں کے لئے چھینکا سے گزرنا محال تھا اس لئے منصور خاں نے جو اس علاقے کا رئیس تھا درختوں کی چھال سے پل تعمیر کروایا جسے پشتو زبان میں "زانگو" کہتے ہیں۔ اس پل کے ذریعے مجاہدین نے دریا عبور کیا اور اس بستی میں پہنچ گئے جو منصور خاں کا مسکن تھا۔ سلطان زبردست خاں کے قبائل پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ پس سلطان نے غازیوں کو بھی اسی بستی میں ٹھہرایا۔

مولوی خیرالدین کی اطاعت پر اتفاق

اب بالاکوٹ جانے کا مرحلہ درپیش تھا مشکل یہ تھی کہ اس مقام تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ تھا جو گڑھی حبیب اللہ کے پاس سے گزرتا تھا۔ چونکہ اس راستے پر شیر سنگھ کا لشکر خیمہ زن تھا اس لئے وہ راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ قندھاریوں کی تجویز یہ تھی کہ سورج غروب ہونے سے قبل ہم پہاڑ کے کنارے تک پہنچ جائیں۔ اس کے بعد راتوں رات بالاکوٹ کی طرف نکل جائیں۔ مولوی خیرالدین صاحب کو اس تجویز سے اتفاق نہ تھا۔ چنانچہ افسر تو کوچ کے لئے تیار ہو گئے مگر باقی لوگوں نے روانگی کی تیاری نہ کی۔ جب افسروں نے پوچھا کہ تم لوگ کیوں تیار نہ ہوئے تو انہوں نے کہا کہ چونکہ ہمارے امیر نے کوچ کی تیاری نہیں کی اس لئے ہم بھی تیار نہیں ہوئے۔ اس پر افسروں نے پوچھا کہ تمہارا امیر کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جسے حضرت امیرالمومنین نے ہمارا اور تمہارا امیر مقرر کیا ہے۔ اس وقت ان پر ظاہر ہوا کہ تمام لشکر مولوی خیرالدین صاحب

---

[1] چھینکا رسیوں کے ایک کمزور سے عارضی پل کو کہتے ہیں جس پر سے گزرنا مقامی لوگوں کے لئے تو آسان ہوتا ہے مگر غیر مقامی لوگ اس پل پر سے نہیں گزر سکتے۔ (مولف)

کا تابع فرمان ہے۔ چنانچہ وہ بھی مولوی خیرالدین صاحب کے مطیع ہو گئے۔ اسی اثناء میں سلطان زبردست خاں کے مشورے سے بالاکوٹ جانے کے لئے کاغان کا راستہ تجویز کیا گیا۔ اگرچہ وہ راستہ دُور کا تھا مگر اس کے سوائے بالاکوٹ پہنچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ دو تین دن کے بعد مجاہدین اور سلطان زبردست خاں مع اپنے کنبے اور قبائل کے کاغان پہنچ گئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ کاغان سے بالاکوٹ تک راستہ کثرتِ برفباری کی وجہ سے بند ہو چکا تھا۔ ان واقعات کی اطلاع سید صاحبؒ تک پہنچ گئی۔ چنانچہ آپ نے چالیس پچاس گوجروں کی ایک جماعت برف صاف کرنے والے اوزار دے کر روانہ فرمائی۔ پس وہ لوگ راستہ صاف کرتے جاتے تھے اور مجاہدین ان کے پیچھے چلتے جاتے تھے۔ اتفاقاً ایک بہت ہی آسان راستہ مل گیا جس کے ذریعے تین دن میں بالاکوٹ پہنچ سکتے تھے۔ سلطان زبردست خاں اور دوسرے سرداروں نے بھی اس راستے کو پسند کیا۔ اس کے بعد چند معتمد گوجروں کو رہنمائی کے لئے مجاہدین کے ہمراہ روانہ کر دیا گیا۔ سفر کی تھکان اور برف باری کی شدت سے مولوی خیرالدین صاحب بخار میں مبتلا ہو گئے۔ مجبوراً آپ نے ایک بستی میں قیام کیا۔ بخار روز بروز ترقی پر تھا اور مولوی صاحب میں چلنے کی سکت بالکل نہ رہی تھی۔ آخر گوجروں نے اٹھا کر انھیں دوسرے گاؤں میں پہنچا دیا۔ وہاں پہنچ کر مولوی صاحب بے ہوش ہو گئے۔ تمام رات یہی حالت رہی۔ صبح کو ہوش آیا تو فرمایا۔ اس جگہ کیوں پڑے ہو۔ خان بہرام خاں نے جو بالاکوٹ سے مظفرآباد اور پھر وہاں سے واپسی تک آپ کے ساتھ تھے عرض کیا کہ آپ میں سوار ہونے کی طاقت نہ تھی مجبوراً ہم آپ کو اٹھا کر یہاں تک لائے ہیں۔ اس پر مولوی صاحب نے فرمایا کہ مجھے چارپائی پر ڈال کر دریائے بالاکوٹ (کنہار) تک پہنچا دو۔ یہاں قیام کرنا مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ بالاکوٹ میں جنگ پیش آجائے۔

مجاہدین کی دعوت

اس علاقے کے گوجر اگرچہ غریب تھے مگر ان کے دل وسیع تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ مٹھی بھر لوگ مسلمانوں کی امداد اور اسلام کی سربلندی کے لئے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر اس قدر مصائب برداشت کر رہے ہیں تو ان کے دلوں میں مجاہدین کے لئے بہت خلوص اور محبت کے جذبات پیدا ہو گئے اور انہوں نے مجاہدین کی دعوت کا اہتمام کیا۔ چنانچہ جب مولوی خیرالدین صاحب نے فوری طور پر بالاکوٹ روانہ ہونے پر اصرار کیا تو بہرام خاں نے کہا کہ آج گاؤں والوں نے دعوت کا سامان کیا ہے اور بھینس ذبح

لہ منظورۃ السعداء صفحہ ۱۱۵۲

کی ہے۔ اس لئے وُہ آج ہمیں نہیں جانے دیں گے۔[1] دوسرے روز کہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ کی تاریخ تھی مولوی صاحب کو چارپائی پر لٹا دیا گیا اور مجاہدین کا قافلہ بالاکوٹ روانہ ہو گیا۔ اثنائے راہ میں سیّد صاحبؒ کا حکم ملا کہ ہم نے بالاکوٹ کا نیچے والا پُل تڑوا دیا ہے اس لئے آپ لوگ دوسرے پُل سے جو اُوپر کی جانب واقع ہے، دریا عبور کریں۔ ابھی دو میل کا سفر طے کیا تھا کہ سیّد صاحبؒ کا دوسرا فرمان ملا کہ یہاں جنگ درپیش ہے اس لئے تندرست اور ہوشیار لوگ جلدی آ جائیں۔ سیّد صاحبؒ کا یہ فرمان ملتے ہی مولوی خیر الدین صاحب اور ان کے ہمراہی تیزی سے بالاکوٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ صرف دو مجاہد اور دو گُوجر پیچھے رہ گئے۔

---

[1] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۱۵۳

بالاکوٹ

عزم وعمل اور ایمان ویقین کا وہ قافلہ جو رائے بریلی سے روانہ ہوا تھا، مختلف منازل سے گزرتا اور آہن گداز مصائب وآلام برداشت کرتا ہوا بالاکوٹ پہنچتا ہے۔ بالاکوٹ تاریخ کا وہی مقام ہے جہاں اس قافلے کے امیر اور اس امیر کی قیادت میں سینکڑوں جاں نثاروں نے اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی جانِ عزیز قربان کر کے آنیوالی نسلوں کے لئے اپنے خون سے وہ چراغ روشن کر دیئے جن کی روشنی میں بعد کے قافلہ سالارانِ حریت نے اپنا سفر طے کیا۔ اب ہمیں یہی المناک مگر ایمان افروز داستان قلم بند کرنی ہے جو زیرِ نظر کتاب کا اصل موضوع ہے۔ یعنی "شہادت گاہِ بالاکوٹ"۔ یہ تاریخ ساز داستان قلم بند کرنے سے قبل ضروری ہے کہ بالاکوٹ کے حالات، اس کی قدیم تاریخ، اس کا محلِ وقوع اور اس کے اردگرد کے جغرافیائی اور تاریخی ماحول کی ایک تصویر بھی پیش کر دی جائے کہ اس کے بغیر نہ تو بالاکوٹ کی صحیح حیثیت کا تعین ہو سکتا ہے اور نہ ان مقامات کی اہمیت واضح ہو سکتی ہے جن کا ذکر بالاکوٹ اور جنگ بالاکوٹ کے سلسلے میں بار بار آئے گا۔ ایک ناواقف شخص کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ بالاکوٹ کہاں واقع ہے۔ ہزارہ، پکھلی اور تناول کس طرف ہیں اور ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ اس لئے ہم سب سے پہلے ہزارہ کی جغرافیائی اور تاریخی اہمیت بیان کریں گے کہ بالاکوٹ اسی ضلع میں واقع ہے، پھر اس کے ان حصوں کی کیفیت بیان کی جائے گی جو کسی نہ کسی رنگ میں شہادت گاہِ بالاکوٹ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بالاکوٹ کے تاریخی کوائف قلم بند کریں گے تاکہ اس پس منظر میں بالاکوٹ اور سانحۂ بالاکوٹ کی صحیح اہمیت وحیثیت نمایاں ہو سکے۔

ہزارہ کی قدیم تاریخ

رقبہ کے لحاظ سے ہزارہ صوبۂ سرحد کا سب سے بڑا ضلع ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لئے

یہ امر کافی ہے کہ قدیم تاریخوں میں اسے ملک ہزارہ لکھا گیا ہے۔ اس کے شمال میں گلگت، جنوب میں اضلاع راولپنڈی و کیمبل پور، مشرق میں آزاد کشمیر، مغرب میں دریائے سندھ اور اضلاعِ مردان و سوات ہیں۔ اس کا رقبہ ۵ ہزار مربع میل ہے۔ آبادی ۱۴ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ گوجر، گکھڑ، اعوان، افغان، ترک اور سید یہاں کی بڑی بڑی اور قابلِ ذکر قومیں ہیں۔

ہزارہ کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ اس کی حدود مختلف زمانوں میں تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ سکندر کے حملے کے وقت ٹیکسلا کو ایک صوبہ کی حیثیت حاصل تھی اور ہزارہ اس کا ضلع تھا۔ سکندر نے یہ علاقہ ریاست پونچھ کے راجہ ابی ساریز کو عطا کر دیا۔ اس وقت تک اس کا نام ہزارہ نہیں تھا بلکہ سکندر کے حملے کے بعد یہ علاقہ ابی ساریز کے نام کی مناسبت سے اراسہ اور پھر "رش" کے نام سے موسوم ہو گیا۔ چنانچہ تحصیل ایبٹ آباد کے میدانی علاقے کو اب بھی "رش" کا میدان کہتے ہیں۔

اشوک کے عہد میں ہزارہ ٹیکسلا میں شامل تھا اور شہزادگی کے زمانے میں اشوک اس علاقے کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔ مانسہرہ کے قریب اس نے بعض چٹانوں پر بدھ مت کے کچھ اصول بھی کندہ کرائے جو اب تک موجود ہیں اس علاقے سے گوتم بدھ کی بعض مورتیاں بھی برآمد ہوئیں جس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ ایک زمانے میں یہاں کے لوگ بدھ مذہب کے پیرو تھے۔ ساتویں صدی عیسوی میں ہزارہ کشمیر میں شامل ہو چکا تھا اور اس کا ایک ضلع شمار ہوتا تھا۔ اکبر اعظم کے زمانے میں ہزارہ کشمیر میں تو شامل نہیں تھا مگر اس علاقے کا حاکم والیٔ کشمیر کا خراج گزار ضرور تھا۔

زمانۂ قبل از تاریخ میں برصغیر پاک و ہند کے دوسرے علاقوں کی طرح ہزارہ بھی دراوڑ قوم کا مسکن تھا۔ یہ دراوڑ دراصل پنجاب اور سندھ کی وادیوں میں آباد تھے۔ جب آریہ قوم شمال مغربی دروں کے راستے پنجاب اور سندھ میں داخل ہوئی تو دراوڑ آریوں سے شکست کھا کر ہزارہ کے پہاڑوں اور جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔ اور یہیں بود و باش اختیار کر لی۔ اس کے کچھ عرصے بعد آریوں کے کچھ اور قافلے برصغیر میں داخل ہوئے اور انھوں نے ہزارہ کا رُخ کیا اور اس علاقے پر قابض ہو گئے۔ دراوڑوں نے ان کی اطاعت اختیار کر لی۔ دراوڑوں کے علاوہ گوجر اور گکھڑ بھی یہاں کی قدیم اقوام ہیں جنھیں ایک زمانے میں اس علاقے کے مالکانہ حقوق حاصل تھے اور ہزارہ پر ان کی حکومت قائم تھی۔

"تواریخ ہزارہ" کے مولف کے بیان کے مطابق ہزارہ عہدِ اسلام سے قبل پنجاب کے ہندو راجاؤں کے ماتحت تھا۔ چنانچہ اب تک جابجا ان کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ بعض مقامات اور علاقوں کے ناموں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ علاقہ سنسکرت بولنے والی قوموں (آریوں) کے ماتحت تھا۔ چنانچہ

مہابن ، گنڈہ گڑھ ، مانسہرہ ، مانک رائے ، راجکوٹ ، سری کوٹ ، راجدھان اور رانی واہ ہزارہ کے مختلف مقامات کے نام ہیں اور یہ سب الفاظ سنسکرت زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً "مہابن" کہ سنسکرت میں مہا بڑے کو اور بن جنگل کو کہتے ہیں[1]

تیسری صدی ہجری میں یہ علاقہ اسلامی تعلیم سے متعارف ہوا۔ جب اس علاقے کے ایک راجہ نے ۲۷۰ھ میں امیر عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز والیٔ منصورہ سے درخواست کی کہ کسی ایسے شخص کو اس کے پاس بھیجا جائے جو اسلامی تعلیم سے پوری طرح واقف ہو۔ چنانچہ امیر عبداللہ نے ایک مسلمان عالم کو جو عربی کے علاوہ برصغیر کی کئی زبانیں جانتا تھا ہزارہ بھیجا۔ اس نے راجہ کے پاس کئی سال قیام کیا اور اسے اسلامی تعلیم سے بخوبی روشناس کر دیا[2]۔

۱۲۲۱ء میں مغلوں نے ہندوستان پر حملوں کا آغاز کیا اور ان کی خاصی تعداد نے ہزارہ میں سکونت اختیار کرلی۔ ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور وارد ہند ہوا اور علاقہ ہزارہ میں ترک سپاہیوں کو آباد کر دیا۔ یہ لوگ "ہزارہ قارلغ" کہلاتے تھے۔ ان کے نام کی مناسبت سے یہ علاقہ ہزارہ قارلغ کے نام سے موسوم ہو گیا۔ کثرتِ استعمال سے "قارلغ" تو حذف ہو گیا، ہزارہ باقی رہ گیا اور اسی نام سے یہ علاقہ مشہور ہو گیا۔ ہزارہ کا میدانی علاقہ جسے اب ہری پور کہتے ہیں، پکھلی اور تناول ہزارہ کے وہ اہم علاقے تھے جن میں ترک کثیر تعداد میں آباد ہوئے۔ بعد میں افغانوں کی خاصی بڑی تعداد اس علاقے میں آباد ہو گئی اور رفتہ رفتہ انہوں نے ہزارہ کے مختلف حصوں پر اپنی حکومت قائم کرلی۔

پکھلی

آئینِ اکبری سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہزارہ کے بعض علاقوں میں ترک آباد تھے اور انھیں ہزارہ کی پاسبانی کی ذمہ داریاں تفویض کی گئی تھیں۔ اس علاقے کو آئینِ اکبری میں پکھلی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور اس کا محل وقوع نیز جغرافیائی حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ چنانچہ صاحبِ آئین اکبری کا بیان ہے کہ :-

"سرکار پکلی (پکھلی) کی لمبائی ۳۵ کوس اور چوڑائی پچیس کوس ہے۔ اس کے مشرق میں کشمیر، شمال میں کتور، جنوب میں سرحدِ قوم گکھڑ اور مغرب میں اٹک بنارس واقع ہیں۔ امیر تیمور نے کچھ افراد یہاں آباد کر دیئے تھے تاکہ اس علاقے کی حفاظت کر سکیں۔ ان کی اولاد آج تک موجود ہے۔ اس علاقے کے پہاڑوں پر ہر موسم میں برف جمی رہتی ہے اور صحرائی علاقے میں سردی کا موسم گرمی کے موسم سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ یہاں بارش

---

[1] تواریخِ ہزارہ صفحہ ۶۸ [2] ہزار سال پہلے صفحہ ۲۶ مولفہ مولانا مناظر احسن گیلانی

ہندوستان کی طرح ہوتی ہے ۔ یہ علاقہ تین دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے ۔ کشن گنگ ، جہلم اور سندھ ۔ اس علاقے کی زبان نہ تو کشمیری زبان سے مماثلت رکھتی ہے اور نہ ہندوستان یا زابلستان سے ۔ جو اور چنا یہاں بکثرت پیدا ہوتا ہے ۔ خوبانی ، اخروٹ اور آڑو یہاں کے عمدہ پھل ہیں ۔ پھلوں کے باغات لگانے کا اس علاقے میں رواج نہیں ۔ یہاں کے شکاری جانور گھوڑے ، اونٹ اور گائیں درمیانہ درجے کے ہوتے ہیں ۔ یہ علاقہ حاکم کشمیر کا خراج گزار ہے[1]

پکھلی کے قابل ذکر مقامات میں شنکیاری ، بفہ ، بھوگڑمنگ ، سچہ ، ڈھوڈیال ، ڈاڈر اور خاکی شامل ہیں ۔ ان میں سے بعض مقامات کو حضرت سید احمد شہیدؒ ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور آپ کے جاں نثار رفقا کے قیام کا شرف حاصل ہوا اور بالاکوٹ تک سفر کرتے ہوئے یہی مقامات آپ کے سفر کی منزلیں تھیں ۔ موجودہ عہد میں پکھلی تحصیل مانسہرہ کا ایک حصہ ہے ۔

تناول

ہزارہ کا دوسرا قابلِ ذکر علاقہ تناول ہے اور پکھلی کی طرح اس کی بھی تاریخی حیثیت ہے ۔ قدیم کتب تاریخ میں تحصیل مانسہرہ اور دریائے سندھ کے درمیانی علاقے کو تناول سے موسوم کیا گیا ہے ۔ یہ علاقہ بھی ابتدا میں دراوڑوں ، گوجروں اور آریوں کا مسکن تھا ۔ جب افغانستان کے مشہور مجاہد حکمران سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کے ساتھ ترک اور افغان قبائل کے لشکر تھے ۔ ان اقوام کے لوگوں نے یہاں کے قدیم باشندوں کو بے دخل کر کے اس علاقے پر قبضہ کر لیا ۔ جو باشندے یہاں بدستور مقیم رہے ان کی حیثیت مزارعین اور خدمت گزاروں کی ہو گئی ۔ اقتدار و سیادت انہی ترکوں اور افغانوں کو حاصل رہی ۔ اس لحاظ سے ان لوگوں کی اس علاقے میں آمد گیارھویں صدی عیسوی میں ہوئی ۔ ان میں سے بعض قبائل اپنا سلسلۂ نسل ایک برلاس مغل امیر خاں سے ملاتے ہیں ۔ بعض مغربی مورخوں مثلاً ابٹسن نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ لوگ ہندی نژاد ہیں اور پہلے پہاڑوں میں مقیم تھے جہاں سے دو صدی قبل (اب سے تین صدی قبل) یوسف زئی افغانوں نے انہیں شکست دے کر اس علاقے سے بے دخل کر دیا ۔ اس کے بعد یہ لوگ تناول میں آباد ہو گئے ۔ اس لحاظ سے تناول میں ان کے قیام کے آغاز کا زمانہ پندرھویں صدی عیسوی ثابت ہوتا ہے ۔ ایک اور مورخ راورٹی نے تنولی قوموں میں مغل اور پٹھانوں دونوں کو شامل کیا ہے مگر لکھا ہے کہ سرداری مغلوں (ترکوں) کو حاصل ہے ۔

" پنجاب کاسٹس " کے مولف نے لکھا ہے کہ تنولیوں کے جدِ امجد کا نام تخت خاں تھا ۔ یہ امیر تیمور کے ساتھ دہلی آیا اور وہیں مقیم ہو گیا ۔ اس کی نسل میں ایک شخص ضراب خاں شاہجہاں کے زمانے میں نقل مکانی کر کے

---

[1] آئین اکبری جلد ۲ صفحہ ۱۸۶ ۔

کہوٹہ (ضلع راولپنڈی) میں آباد ہوگیا۔ جدوال، ڈھونڈ اور تنولی قوموں کا مورثِ اعلیٰ یہی ضراب خاں ہے[1]

ان بیانات اور تنولیوں کے خدوخال، قدوقامت، رسم و رواج اور عادات و اطوار سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ ہندی نژاد نہیں بلکہ ترکوں اور پٹھانوں کی نسل سے ہیں اور پندرھویں صدی عیسوی میں علاقۂ تناول میں آباد ہوئے۔ نہایت جنگجو اور شجاع ہوتے ہیں۔ ان کی دو مشہور شاخیں ہیں: ہندوال اور پلول۔ دربند، پھولڑہ، شیرگڑھ اور امب میں ان کی اکثریت ہے اور ان علاقوں پر ان کی حکومت رہی ہے۔ اس کے علاوہ مانسہرہ کے بعض مواضعات میں بھی تنولی قوم آباد ہے۔ تاریخی لحاظ سے تناول بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے متعدد مقامات پر سکھوں اور تنولیوں کے درمیان بڑی خونریز جنگیں ہوئیں۔ ہزارہ کے مشہور سردار نواب خاں اور پائندہ خاں اسی علاقے کے حکمران تھے۔ ان میں سے پائندہ خاں نہایت دلیر اور شجاع سردار تھا جس نے سکھوں خصوصاً ہری سنگھ نلوہ کو بہت پریشان کیا اور اس کے چھکے چھڑا دیئے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ نے بھی اس علاقے پر اپنی حکومت قائم کی اور کچھ عرصہ امب آپ کا مستقر رہا۔

کاغان

پکھلی اور تناول کے بعد کاغان ہزارہ کا قابلِ ذکر حصّہ ہے اور مناظرِ قدرت کے لحاظ سے تو اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ کاغان ہزارہ کے انتہائی شمال میں واقع ہے۔ زمانۂ قدیم میں پوٹھہ نامی قوم یہاں آباد تھی۔ اس قوم کے بچے کھچے لوگ اب بھی چیلاس کے علاقے میں آباد ہیں۔ مورخوں نے اس قوم کا سلسلۂ نسب کافرستان کے سرخ کافروں سے ملایا ہے۔ انہی کی اس علاقے پر حکومت تھی۔ اسی قوم کے ایک سردار کی بیوی کاگی کے نام کی مناسبت سے یہ علاقہ کاگان کہلایا جو بعد میں کاغان ہوگیا۔ ایک اور کافر جوالی کے نام کی مناسبت سے اس علاقے کا ایک حصہ راجوال کے نام سے موسوم ہوگیا۔ "تواریخِ ہزارہ" کے مصنف کے زمانے (۱۸۷۴ء) میں کاگان، جیکارلا کاگان، بارلا کاگان، راجوال ترلا، راجوال اوتلا، جھل گراں لڑی، راول کوٹ، لہاری، ماران، باڑی، سھوج اور تر کوندی بیری اس علاقے کے وہ مقامات تھے جہاں تھوڑی بہت آبادی تھی باقی علاقہ غیر آباد تھا[2]

اب کوائی سے لے کر کاغان تک آبادی ہوگئی ہے اور پختہ سڑک جو مانسہرہ سے گڑھی حبیب اللہ اور بالاکوٹ سے گزرتی ہے اس کے آخری سرے تک جاتی ہے۔ موسم سرما میں اس علاقے کے پہاڑوں پر انتہائی شدید برفباری ہوتی ہے کہ بہت سے لوگ میدانی علاقوں میں چلے آتے ہیں اور بالاکوٹ کے آگے راستہ بند ہو جاتا ہے۔ کاغان کے پہاڑوں پر بڑی کثرت سے جنگلات ہیں جن کی لکڑی عمارتوں میں کام آتی ہے۔ مکئی یہاں کی خاص پیداوار ہے

---

[1] پنجاب کاسٹس صفحہ ۱۵۲ مولفہ سر ڈنزل آبٹسن۔ [2] تواریخِ ہزارہ صفحہ ۳۹۰

مگر قابلِ کاشت زمین بہت کم ہے۔ گرمی کے موسم میں لوگ اس علاقے کی سیر کے لئے جاتے ہیں اور برف پوش پہاڑوں، دلفریب جنگلوں، بہار آفریں سبزہ زاروں اور حسین جھیلوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں جو بالیدگی روح کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ لولسر، سیف الملوک اور دودی پت یہاں کی قابلِ دید جھیلیں ہیں۔ کنہار یہاں کا مشہور دریا ہے جو جھیل لولسر سے نکل کر بالاکوٹ اور گڑھی حبیب اللہ سے گزرتا ہے۔ سادات یہاں کے باشندوں میں قابلِ ذکر اور معزز و محترم ہیں۔ انہی کو یہاں کے مالکانہ حقوق حاصل ہیں۔ اسی علاقے کے ایک سردار سید ضامن شاہ اور ان کے برادرِ حقیقی سید نوبت شاہ جو اپنے زمانہ کے بڑے پاکباز بزرگ تھے بمقام سچہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان کی بیعت کی تھی اور انہیں بالاکوٹ تشریف لانے کی دعوت دی تھی۔ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد انہی ضامن شاہ نے بالاکوٹ کے افغانوں سے مل کر دیوان بیلہ کے مقام پر سکھوں کی فوج کو بری طرح شکست دی تھی۔ اس طرح انہوں نے سکھوں سے سید صاحبؒ کی شہادت کا انتقام لیا تھا۔

مضافاتِ بالاکوٹ

اسی کاغان سے ۴۱ میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف بالاکوٹ واقع ہے۔ ایبٹ آباد سے کاغان جاتے ہوئے اس کا محل وقوع شمال کی طرف ہے۔ ایبٹ آباد سے بالاکوٹ کا فاصلہ ۴۵ میل ہے۔ بالاکوٹ تحصیل مانسہرہ میں واقع ہے۔ مانسہرہ اور بالاکوٹ کا درمیانی فاصلہ ۳۰ میل ہے۔ مانسہرہ کے بعد قابلِ ذکر مقام گڑھی حبیب اللہ ہے جو مانسہرہ سے ۱۹ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بالاکوٹ کا محل وقوع گڑھی سے ۱۲ میل جانبِ شمال ہے۔ گڑھی سے بالاکوٹ تک دریائے کنہار اور سڑک دونوں متوازی صورت میں کاغان تک چلے جاتے ہیں۔ دریائے کنہار سڑک کے دائیں طرف بالکل ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ یہ سڑک اگرچہ پختہ اور خاصی چوڑی ہے مگر پہاڑوں میں سے گزرنے کی وجہ سے کہیں بہت زیادہ نشیب اور کہیں اچانک بہت زیادہ فراز آجاتے ہیں۔ راستہ نہایت پُرپیچ ہے۔ سڑک کے بائیں طرف وسیع اور بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ کاغان تک چلا گیا ہے۔ سڑک اور دریا کے دائیں طرف بھی اسی طرح سر بفلک اور سرسبز پہاڑ ہیں۔ درمیان میں دریائے کنہار، زرعی اراضی اور چھوٹے چھوٹے دیہات ہیں جن میں سے بعض میدان میں اور بعض پہاڑوں پر آباد ہیں۔ جو مکانات پہاڑوں کی بلندی پر ہیں وہ دور سے دیا سلائی کی ڈبیوں جیسے دکھائی دیتے ہیں۔

گڑھی حبیب اللہ کے پُل سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ماچس فیکٹری ہے۔ گڑھی سے دوگہ نالے تک جسے یہاں کی اصطلاح میں "کٹھہ دوگہ" کہتے ہیں زرعی اراضی ہے جس کے مالکانہ حقوق گڑھی کے باشندوں خصوصاً افغانوں کو حاصل ہیں۔ "کٹھہ دوگہ" سے شمال کی طرف سڑک کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک دریا کے

بالاکوٹ اور مضافات
سڑک
دریا
پل
پہاڑ
جنگلات
مقامات
کاغان
کمال بن
جہانڈری
پارس
شوگراں
کوائی
زیارت بالا پیر
ست بنی
مٹی کوٹ
بالاکوٹ
گرلاٹ
بلوڑی
بم بھولا
حسہ
شہیدگلی
تمری
چنڈوال
شوہال نجف خاں
اکھڑبلہ
حابہ
ڈمگلہ
کوٹ بھلہ
تلہٹہ
ترنہہ
بسیاں
کشٹڑہ
بانڈہ
بلولہ
جاگیر
حصاری
سکھ دار
گڑھی حبیب اللہ
بڑاسی
پھگلہ
عطرشیشہ
براکوٹ
رام کوٹ
مظفرآباد
شمال
مغرب
مشرق
جنوب
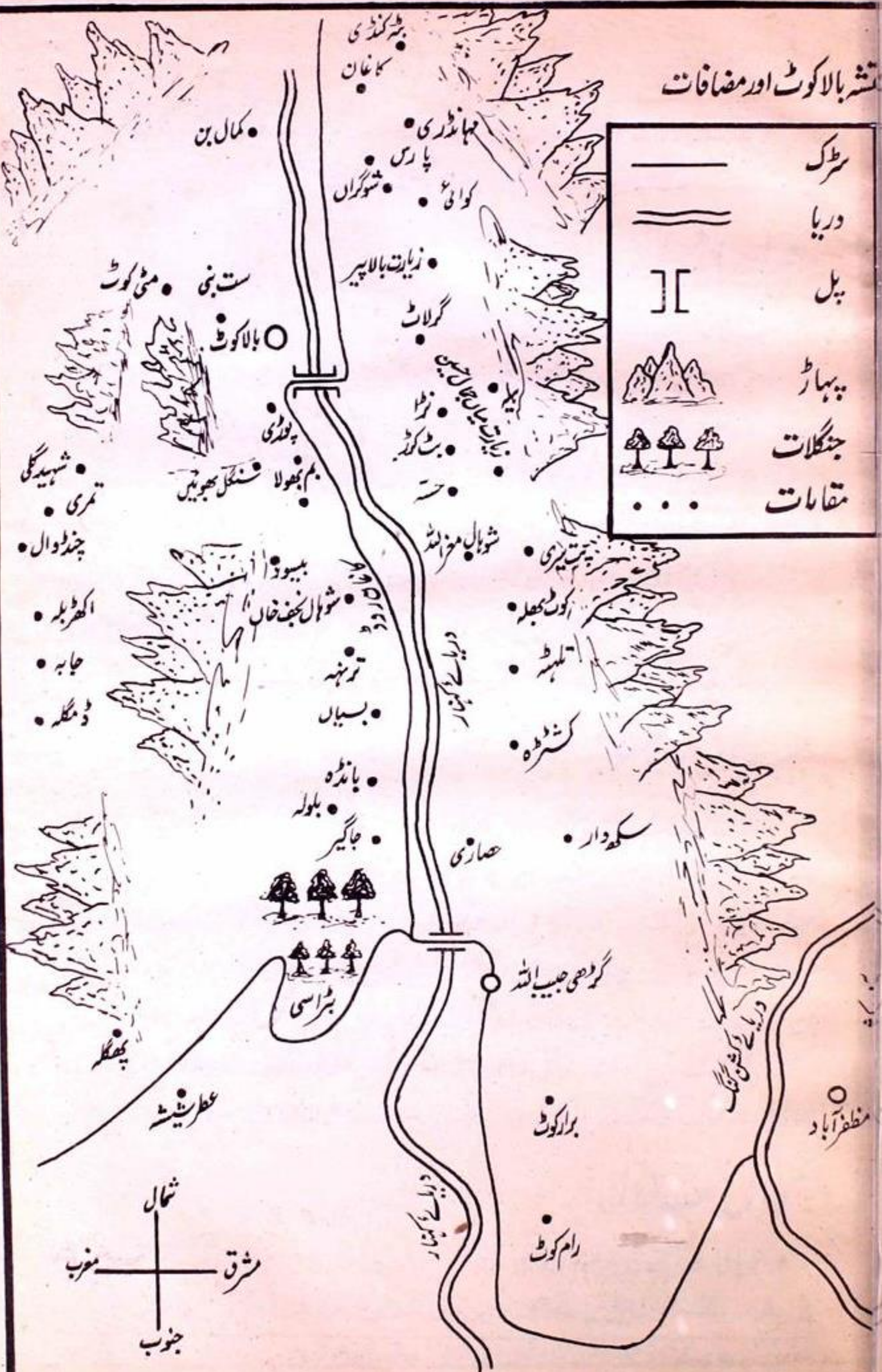
کنارے کنارے بالاکوٹ اور کاغان کی طرف چلی جاتی ہے اور دوسری مانسہرہ کو۔ ایک سڑک دریائے کنہار کا پل عبور کرنے کے بعد گڑھی حبیب اللہ سے ہوتی ہوئی مظفر آباد کو چلی جاتی ہے۔

جاگیر اور بانڈہ بلولہ

جب گڑھی حبیب اللہ سے بالاکوٹ کی طرف سفر شروع کریں تو دریائے کنہار کے جانب مغرب پہلا مقام بیلہ اور دوسرا گل ڈھیری ہے۔ یہ مقام گڑھی سے جانب شمال دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ گڑھی سے تین میل آگے چل کر جاگیر نامی موضع ہے جس کی آبادی سڑک کے مشرق و مغرب دونوں طرف واقع ہے۔ اکثر اراضی قوم خانخیل کی ملکیت ہے۔ گوجر بھی آباد ہیں جن کی اکثریت مزارعوں پر مشتمل ہے۔ یہ موضع پہلے خان آف گڑھی حبیب اللہ کی جاگیر میں شامل تھا۔ اس سے آگے بانڈہ بلولہ[1] نامی موضع ہے جو سڑک اور دریا کی مغربی جانب واقع ہے۔ یہاں کی آبادی سواتی افغانوں، گوجروں اور خدمت پیشہ افراد پر مشتمل ہے۔ یہاں بعض آثارِ قدیمہ بھی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر کسی قوم نے قلعہ یا کوئی محل تعمیر کیا تھا جو مرورِ ایام سے منہدم ہو گیا اب اس کے کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ یہ مقام جاگیر سے کسی قدر بلندی پر واقع ہے۔

بسیاں اور ڈمگلہ

بانڈہ بلولہ سے آگے پانچویں میل پر بسیاں نام کا گاؤں واقع ہے۔ بسیاں کے جانب مغرب اوکھڑیلا نامی نالہ بہتا ہے جس کا پانی زمین میں جذب ہو جاتا ہے اور زمین ہمیشہ تر رہتی ہے۔ "بس" مقامی زبان میں تر جگہ کو کہتے ہیں۔ اس لئے اس مقام کا نام بسیاں ہو گیا۔ اس گاؤں میں چند گھر سواتی افغانوں کے ہیں باقی گوجر، کشمیری اور لوہار آباد ہیں۔ ان کی زبان ہندکو اور گوجری ہے۔ بسیاں کے مشرق میں دریائے کنہار اور مغرب میں ڈمگلہ ہے۔ ڈمگلہ وہی مقام ہے جہاں سید صاحبؒ کے مجاہدین نے میاں محمد مقیم رامپوری کی قیادت میں سکھوں پر حملہ کر کے انہیں شکست دی تھی اور سکھ بہت سا جانی و مالی نقصان اٹھانے کے بعد خوفزدہ ہو کر اپنی چھاؤنی سے بھاگ نکلے تھے۔ یہ پہاڑی مقام ہے اور دور دور تک جنگلات کا وسیع سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔

شوہال نجف خاں

بسیاں سے چھٹے میل پر شوہال واقع ہے۔ شوہال مقامی اصطلاح میں سیر و شکار کی جگہ کو کہتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں یہ جگہ دریا کے کناروں کے ہم سطح تھی۔ دور تک سرسبز میدان تھے جن میں مرغابیاں آکر بیٹھتی تھیں۔ قرب و جوار کے

---

[1] گورنمنٹ برطانیہ کے شائع شدہ نقشوں کے مطابق بانڈہ اور بلولہ دو الگ الگ گاؤں ہیں۔ (مولف)

لوگ یہاں سیر و شکار کے لئے آتے تھے اس لئے اس جگہ کا نام شوہال یعنی سیرگاہ پڑ گیا۔ چونکہ یہاں سواتی افغانوں کی شاخ دودہ ال اور پنج غول کے لوگ آباد تھے۔ اس لئے ان کے مورثِ اعلیٰ نجف خاں کے نام پر یہ مقام شوہال نجف خاں مشہور ہو گیا۔ ۱۸۴۷ء تک یہ علاقہ ریاست کشمیر میں شامل تھا۔ کشمیری حکام کی اس علاقے میں آمد و رفت رہتی تھی اور وہ یہاں قیام بھی کرتے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک پُل تعمیر کیا تھا۔ کشمیری زبان میں پُل کو کدل کہتے ہیں۔ چنانچہ اب تک اس مقام کو کدل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شوہال نجف خاں سے نصف میل کے فاصلے پر سید صاحبؒ کے زمانے میں بھی یہ پُل موجود تھا جس کے کچھ آثار اب تک پائے جاتے ہیں۔ اس پُل کا محل وقوع موجودہ پل سے جانبِ شمال ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ یہ وُہی پُل ہے جس پر سے گزر کر سکھوں کی فوج نے مظفر آباد سے بالاکوٹ کا رُخ کیا تھا۔ یہاں سواتی اور گوجر دونوں قومیں آباد ہیں۔ مالکانہ حقوق سواتیوں کو حاصل ہیں۔ سواتی لوگ ہندکو اور گوجر گوجری زبانیں بولتے ہیں۔ یہاں دو پرائمری اسکول ہیں۔ ایک لڑکوں اور دُوسرا لڑکیوں کے لئے۔ ڈاک خانہ بھی قائم ہے۔ پُل کے قریب سڑک کے مغربی جانب نیا بازار بھی تعمیر ہو گیا ہے جس میں ضروریاتِ زندگی کی جملہ اشیاء دستیاب ہو جاتی ہیں۔ گاؤں پہاڑ کی بلندی پر واقع ہے۔ مکانات دور سے نہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔

ترّنہہ

دریائے کنہار کے جانبِ مغرب ترّنہہ نامی موضع واقع ہے۔ گڑھی حبیب اللہ سے اس کا فاصلہ تقریباً آٹھ میل ہے ترنہ کے قریب لکڑی کے پرنالے لگا کر جنھیں مقامی زبان میں ترنا کہتے ہیں دریائے کنہار کا پانی شوہال نجف خاں اور بسیاں کی زمین سیراب کرنے کے لئے لے جایا جاتا تھا۔ شوہال کے لوگ اس مقام کو ترنا والی جگہ کہتے تھے رفتہ رفتہ اس جگہ کا نام ہی ترّنہہ ہو گیا۔ سواتی افغانوں کی شاخ خواجہ خیلی کے لوگ اس علاقے کے مالک تھے اور گوجر اُن کے مزارع۔ اب بہت سے گوجر بھی اس ملکیت میں شریک ہو گئے ہیں سید صاحبؒ کے زمانے میں موجودہ سڑک نہیں تھی بلکہ معمولی سی پگڈنڈی تھی جو اس سڑک سے جانبِ مشرق کھیتوں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک پہاڑی نالہ بہتا ہے جس پر زمانۂ قدیم میں پُل نہ تھا۔ اسی پگڈنڈی کے راستے سے لوگ نالے میں اتر جاتے تھے اور اس سے گزر کر دوسری جانب چھوٹے ترّنہہ کی طرف جانا پڑتا تھا۔ چھوٹے ترّنہہ سے آگے دریائے کنہار پہاڑوں کے ساتھ جا ٹکراتا ہے۔ اس لئے یہاں سے آگے جانے کے لئے پہاڑوں کے درمیان سے راستہ بنایا گیا تھا جو نہایت تنگ، ناہموار اور دشوار گزار تھا۔ اس زمانے میں یہی شاہی راستہ کہلاتا تھا جو "کھڑیوں" کے اُوپر سے گزرتا تھا۔ کھڑیاں مقامی زبان میں پہاڑوں کے ان ناہموار حصّوں کو کہتے ہیں

جو دریا کے کنارے کنارے آگے کی طرف نکلے ہوتے ہیں۔

بان پھوڑا

ان کھڑیوں پر سے ہوتا ہوا شاہی راستہ بان پھوڑا نامی گاؤں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ یہ مقام موجودہ سڑک سے جانبِ مغرب دو فرلانگ کے قریب بلندی پر واقع ہے۔ ۱۹۴۷ اور ۱۹۵۸ کے درمیان یہاں پاکستانی فوج کا ایک کیمپ بھی تھا۔ یہ مقام تھانہ بالاکوٹ سے جنوب کی طرف تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ گوٹ بھلہ سے روانہ ہو کر سکھ لشکر نے یہیں قیام کیا تھا[1] اور یہیں سے مغربی پہاڑوں کے ساتھ ساتھ گزرتا ہوا اس کا لشکر مٹی کوٹ کی طرف گیا تھا۔ پہلے بان پھوڑا کی آبادی صرف پہاڑی پر تھی مگر اب اس نے وسعت اختیار کر لی ہے اور بہت سے مکانات میدانی علاقے میں بھی جہاں شیر سنگھ کا کیمپ تھا، تعمیر ہو چکے ہیں۔ یہاں کی بہت سی زمین کو قابلِ کاشت بنا لیا گیا ہے۔ محکمۂ موسمیات نے یہاں اپنے آلات نصب کر رکھے ہیں۔

شہید گلی اور مٹی کوٹ

بان پھوڑا سے دائیں طرف ایک درہ ہے۔ اس درے میں داخل ہو کر ایک مقام نکہ پانی آتا ہے۔ اسی راستے سے سکھوں نے مٹی کوٹ کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ یہاں سید صاحبؒ نے مجاہدین اور مقامی لوگوں کا ایک دستہ متعین کیا تھا تاکہ اگر سکھ لشکر مٹی کوٹ کی طرف جانے کی کوشش کرے تو یہ دستہ اس کی مزاحمت کرے۔ یہیں سکھوں اور مجاہدین کے درمیان پہلی لڑائی ہوئی تھی اور بہت سے مجاہدین شہید ہو گئے تھے۔ اس لئے اس جگہ کا نام شہید گلی مشہور ہو گیا۔ بان پھوڑا سے گزر کر سڑک کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد تھوڑے سے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی آتی ہے جس کا نام پوڑی ہے۔ اس کے قریب ہی ایک پہاڑی نالہ ہے جسے ٹھنڈا کھٹہ کہتے ہیں۔ بالاکوٹ کے قریب اور پوڑی کے نیچے اس نالے پر ایک پُل ہے جسے پل پوڑی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس پل سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ٹھنڈا کھٹہ دریائے کنہار سے جا ملتا ہے۔ اس کے بعد مٹی کوٹ نامی گاؤں ہے۔ یہ گاؤں پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ اس کے مکانات دُور دور تک پہاڑوں کے دامن میں بکھرے ہوئے ہیں۔ لوگ نہایت غریب اور غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ مضافاتِ بالاکوٹ میں اس موضع کے لوگوں سے زیادہ پس ماندہ اور غریب لوگ کہیں نظر نہیں آتے۔ ان کا پیشہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا اور بالاکوٹ میں فروخت کرنا ہے۔ اگرچہ اس گاؤں کا ہر فرد بلکہ بچے بوڑھے "تک دن رات محنت کرتے ہیں اور دس بارہ روپیہ روز پیدا کرتے ہیں مگر اس کے باوجود یہ لوگ مفلوک الحال رہتے ہیں۔ موسمِ سرما میں بالاکوٹ کے

---

[1] محترم مولانا غلام رسول مہر نے سکھ لشکر گاہ کا جو مقام متعین کیا ہے راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق وہ درست نہیں۔ (مولف)

قرب وجوار میں ہر موضع کے لوگ برفباری کی وجہ سے اپنے گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر اس بدنصیب گاؤں کے لوگ اس موسم میں بھی لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور بالاکوٹ میں فروخت کرتے ہیں۔ یہی وہ گاؤں ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے کسی باشندے نے سکھوں کی رہنمائی کی تھی۔ مٹی کوٹ تقریباً ۵ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ مٹی کوٹ کی چوٹی پر کھڑے ہوں تو بالکل سامنے نیچے تلی میں بالاکوٹ نظر آتا ہے۔ مٹی کوٹ سے تھوڑا سا نیچے اُتر کر کالی مٹی نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اسے کالی مٹی اس لئے کہتے ہیں کہ یہاں کی مٹی میں فولاد کے ذرات بکثرت ہیں اس لئے اس زمین کا رنگ سیاہی مائل ہوگیا ہے۔

بالاکوٹ سے گڑھی کی طرف

اب ہم گڑھی حبیب اللہ سے بالاکوٹ پہنچ گئے ہیں اور دریائے کنہار کے مغربی سمت کا سفر ختم ہو چکا ہے اب ہم اپنا سفر بالاکوٹ سے گڑھی حبیب اللہ کی طرف شروع کرتے ہیں اور دریائے کنہار کے مشرقی سمت کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ بالاکوٹ سے گڑھی حبیب اللہ جاتے ہوئے دریائے کنہار کے مشرقی جانب کالوخاں کا ٹیلہ ہے۔ یہ آبادی کالوگوجر کے نام سے موسوم ہے اور بالاکوٹ کے عین سامنے واقع ہے۔ یہ ٹیلہ خاصہ بلند ہے اس کے مضافات میں ڈھیریاں اور نڑا نامی دو چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد ہیں۔ نڑا سے آگے بڑھیں تو خواص کٹھہ اور پھر بٹ کرڑ نامی گاؤں آتا ہے۔ اس سے آگے یعنی بالاکوٹ سے تقریباً ۴ میل کے فاصلے پر حسّہ نامی موضع ہے۔ اس موضع میں سواتی قوم کی شاخ خواجہ خیلی اور دوسری شاخ ڈھوڈیاری کے بھی کچھ خاندان آباد ہیں۔ باقی لوگ گوجر اور خدمت پیشہ ہیں۔ یہاں ایک پرائمری سکول بھی قائم ہے۔ اس کے بعد شوہال معزاللہ خاں، پت بیری، جبڑی اور کلیش نامی موضع واقع ہیں۔

شوہال معزاللہ خاں

جانس خیل لغمانی قبیلے کے ایک معزز فرد معزاللہ خاں نے اسے آباد کیا تھا۔ اس لئے یہ گاؤں شوہال معزاللہ کے نام سے مشہور و موسوم ہوگیا۔ اس گاؤں میں اکثریت جانس خیل قبیلے کے افراد کی ہے۔ کچھ گھر خواجہ خیلی قبیلے کے بھی ہیں۔ اس کی آبادی ایک ہزار نفوس کے لگ بھگ ہے۔ بیشتر لوگ کاشت کار اور ملازمت پیشہ ہیں۔ کچھ لوگ تجارت کرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ افراد بہت کم ہیں۔ چھٹی جماعت تک اسکول بھی ہے۔ ڈاک خانہ، یونین کونسل کا دفتر اور مویشیوں کا ہسپتال بھی موجود ہے۔ یہ موضع بالاکوٹ سے پانچ میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف واقع ہے۔ موضع کو جرنیلی سڑک سے ملانے کے لئے دریائے کنہار پر

ایک پل تعمیر کیا جا چکا ہے۔ پل معمولی ہے اور اس پر سے بھاری ٹریفک نہیں گزر سکتی۔

موضع پت سیری

شوہال معز اللہ خاں سے جانب مشرق نصف میل کے فاصلے پر موضع پت سیری واقع ہے۔ یہاں جالنس خیل لغمانی قبیلے کے لوگ آباد ہیں ان کی اکثریت زراعت پیشہ ہے۔ کچھ لوگ بہ سلسلۂ ملازمت باہر رہتے ہیں۔ تعلیم یہاں بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب چند سال سے پرائمری سکول قائم ہے۔

کوٹ بھلہ اور تلہٹہ

شوہال معز اللہ خاں سے جنوب کی طرف تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر کچھ متفرق آبادی ہے یہ جگہ عام سطح زمین سے بلندی پر ہے اور کوٹ بھلہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ایک مسمار شدہ قلعہ کے آثار بھی موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ دو ہزار سال قبل کسی ہندو راجہ نے تعمیر کیا تھا۔ شمال مشرق اور جنوب کی طرف اس ٹیلے کی بعض دیواروں کی بنیادیں اب تک باقی ہیں جن کا عرض تقریباً ساڑھے چار فٹ ہے۔ دریائے کنہار کوٹ بھلہ کے مغربی سمت میں بہتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں گڑھی حبیب اللہ سے بالاکوٹ جاتے ہوئے سکھ لشکر نے پڑاؤ کیا تھا۔

بالاکوٹ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر دریائے کنہار کے جانب مشرق تلہٹہ نامی گاؤں واقع ہے۔ سادات ترمذی کو یہاں کے مالکانہ حقوق حاصل تھے۔ اب بھی یہ لوگ متمول ہیں۔ یہاں دو پرائمری سکول ہیں۔ ایک لڑکوں اور دوسرا لڑکیوں کے لئے۔ یہ وہی مقام ہے جس کے متعلق یہ غلط اور من گھڑت روایت مشہور ہے کہ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ان کا سر بریدہ جسم دریا میں بہتا ہوا یہاں آیا تھا اور موضع کے لوگوں نے اسے دریا سے نکال کر ایک قریبی جگہ دفن کر دیا تھا۔ تاریخی اعتبار سے اس روایت کی کوئی حیثیت نہیں یہ محض ایک افسانہ ہے۔ اس موضوع پر ہم انشاء اللہ کتاب کے آخر میں اظہار خیال کریں گے۔ تلہٹہ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر حصاری نامی چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں کی اکثر آبادی خان خیل قبیلے کے افراد پر مشتمل ہے۔ حصاری کے ساتھ ہی گڑھی حبیب اللہ شروع ہو جاتی ہے۔

بالاکوٹ

ہمارا خیال ہے کہ وادیٔ کنہار اور بالاکوٹ کے مضافات کے متعلق ہم نے خاصی تفاصیل پیش کر دی ہیں اب ہم خاص بالاکوٹ کے کوائف بیان کریں گے۔ ایبٹ آباد سے کاغان جاتے ہوئے ۴۵ میل کے فاصلے پر

دریائے کنہار سے جانبِ مغرب ایک بلند ٹیلے پر چھوٹا سا قصبہ آباد ہے۔ اسی قصبے کا نام بالاکوٹ ہے۔ اس کے مشرق میں وسیع سلسلۂ کوہ ہے جو "بھنگیاں" کے نام سے موسوم ہے۔ شمال کی طرف اس سلسلۂ کوہ کی سب سے بلند چوٹی ہے جو "موسیٰ کا مصلےٰ" کہلاتی ہے اور اپنے حسن و دلفریبی کے لحاظ سے اس علاقے کی ملکہ کہلانے کی مستحق ہے۔ مغرب کی جانب مٹی کوٹ کے پہاڑ ہیں۔ ان کا سلسلہ بھی دُور تک چلا گیا ہے اور آگے جا کر بھنگیاں کے سلسلۂ کوہ سے جا ملتا ہے۔ یہاں پہنچ کر بالاکوٹ کی وادی بند ہو جاتی ہے اور یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے تین طرف سے بلند قامت بلکہ سر بفلک پہاڑی دیواروں نے اس کا محاصرہ کر لیا ہے۔ صرف سرکش اور زور آور دریائے کنہار ہے جو ان پہاڑوں میں راستہ بناتا گزرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سڑک ہے جو کاغان اور گلگت تک جاتی ہے۔

اپنے محل وقوع کی اہمیت کے لحاظ سے بالاکوٹ کاغان کا دروازہ کہلاتا ہے کیونکہ یہ کاغان کے دہانے پر واقع ہے۔ کاغان جانے والوں کو اسی قصبے سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ اس علاقے میں یہ تجارت کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۳۴۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ موسم سرما میں یہاں سخت برفباری ہوتی ہے۔ اس وادی کا مشہور دریا کنہار بالاکوٹ سے جانبِ مشرق شمالاً جنوباً بہتا ہے یہ دریا "لولوسر" نامی جھیل سے نکلتا ہے جو وادیٔ کاغان کے سب سے حسین مقام "ناران" سے تقریباً ۴۰ میل جانبِ شمال واقع ہے۔

بالاکوٹ اور اس کے مضافات کو اللہ تعالیٰ نے بڑی فیاضی سے حسن و رعنائی کی دولت عطا فرمائی ہے سرسبز و شاداب اور سر بفلک پہاڑ، پگھلی ہُوئی چاندی اڑاتا اور بل کھاتا ہوا دریائے کنہار، چیل کے دراز قد اور بہار آفریں درخت، جل ترنگ بجاتے ہُوئے آبشار، خنک اور شیریں پانی کے قدرتی چشمے اور حدِ نگاہ تک مکئی اور دھان کے لہلہاتے ہوئے سرسبز و شاداب کھیت قدم قدم پر سیاحوں کا دامن پکڑ لیتے ہیں۔

وجہ تسمیہ

بالاکوٹ کے سن رسیدہ لوگ اس قصبے کے نام کی دو وجوہ بیان کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں چونکہ یہاں گرو نانکؒ صاحب کے مریدِ خاص "بھائی بالا" نے قیام کیا تھا اس لئے یہ جگہ بالاکوٹ کے نام سے مشہور ہو گئی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کوٹ مقامی زبان میں قلعہ کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ جگہ تین طرف سے بلند پہاڑوں سے گھری ہُوئی ہے اور اصل شہر باقی سطحِ زمین سے بلندی پر آباد ہے۔ اس لئے یہ مقام بالاکوٹ یعنی بلند قلعہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

آب و ہوا

آب و ہوا کے لحاظ سے یہ جگہ نہایت اچھی ہے۔ موسم گرما میں لوگ بحالیٔ صحت کے لئے یہاں آتے ہیں۔ سردیوں میں خوب برف باری ہوتی ہے اور سخت سردی پڑتی ہے۔ گرمیوں میں موسم معتدل رہتا ہے۔ برسات کے موسم میں سخت بارشیں ہوتی ہیں جس سے موسم میں خنکی پیدا ہو جاتی ہے اور یہاں کے مناظر اور بھی دلفریب ہو جاتے ہیں۔

قدیم آبادی

بالاکوٹ قدیم قصبہ ہے۔ یہاں ابتدا میں گوجروں کی آبادی تھی۔ اس کے مضافات سے گوتم بدھ کی بعض مورتیاں ملی ہیں جن سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ یہاں کے قدیمی باشندے بدھ مذہب کے پیرو تھے، کسی زمانے میں یہاں ان کی حکومت بھی تھی۔ چونکہ بالاکوٹ پہاڑی علاقہ ہے اور زمانۂ قدیم میں یہاں زراعت نہ ہونے کے برابر تھی نہ ایسے وسائل تھے اس لئے یہاں کے باشندوں کی اکثریت بھیڑ بکریاں پالتی تھی۔ قدرتی اور خودرو پودوں اور پہاڑوں کے دامن میں گھاس کے قطعات نے اس علاقے کو اچھی خاصی چراگاہ کی حیثیت دے دی تھی۔ یہی چراگاہ یہاں کے قدیم باشندوں کی معاش کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ پس قدرۃً اور یہاں کے گردوپیش کے ماحول نے انہیں ایسے پیشے سے وابستہ کر دیا تھا جس کی بناء پر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ یہ لوگ گوجر تھے اور بھیڑیں بکریاں پال کر گزر اوقات کرتے تھے۔ ہزارہ گزیٹر کے مولف نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے چنانچہ ان کا بیان ہے کہ " قصص معتبر اور موجودہ تحقیقات بندوبست و ملاحظۂ اسنادِ قوم گوجر سے واضح ہوتا ہے کہ دراصل آبادی قوم گوجر کی اس ملک میں بہت پرانی ہے۔ شاہانِ چغتائی (مغل) کے وقت بھی یہ لوگ آباد تھے"[1]۔

سواتی افغان

گوجر لوگ متعلقہ عہد سے قبل ہی دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اس علاقے پر انہی کا اقتدار قائم تھا مگر سترھویں صدی عیسوی میں ان کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا اور افغانوں کے سواتی قبیلہ نے اس علاقے پر تسلط قائم کر لیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سواتی قبیلہ کا مختصر تعارف

---

[1] تواریخ ہزارہ صفحہ ۱۰ مرتبہ محمد اعظم بیگ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع ہزارہ

کرا دیا جائے کہ اس کتاب کے موضوع سے اس قبیلے کا گہرا تعلق ہے۔ سواتی افغانوں کے قبیلۂ خلجی کی ایک شاخ ہے۔ یہ نام مختلف زبانوں میں مختلف طریقوں سے لکھا اور بولا جاتا ہے۔" ترکی اور عربی زبانوں میں سوادی، فارسی میں صواتی، پشتو میں سواتے، انگریزی اور اردو میں سواتی اور ہندکو زبان میں سواتھی استعمال ہوتا ہے[۱]۔

سواتی قبیلہ کی افغانستان اور پھر وہاں سے ہندوستان آنے کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ " جب حکومتِ ایران سے بنی اسرائیل کو آزادی کا پروانہ مل گیا تو افغان یا پختون آزاد ہو کر خراسان کی طرف آ گئے۔ یہاں قوم غوری (بنی ضحاک) آباد تھی۔ اس واسطے خراسان کا یہ حصہ غورستان بھی کہلاتا تھا۔ غوریوں نے افغانوں کو غورستان کی ایک وادی موسومہ " خلج " گزارہ کے لئے دی جہاں کی رہائش (قیام) کے باعث خلجی کے نام سے پکارے جانے لگے۔ خلجیوں میں سے ہی صواتی و پٹھان اور بنگش نکلے جو علیحدہ قوم مشہور ہوئے[۲]۔"

" جب اس قوم کی سمائی خلج کے پیمانے سے بڑھ گئی تو ایک گروہ جدید مسکن کی تلاش میں خلج سے نکل کر موجودہ افغانستان سے ہوتا ہوا جہاں سے ایک گروہ آ کر ڈیرہ ڈال کر " فرملی " مشہور ہو چکا تھا، خیبر کے اس پار آ کر قابض ہو گیا۔ اس گروہ کے سردار ایک بلند آواز تھے جن کی قیادت میں یہ خلج سے نکلے تھے وہ اپنی بلند بانگی کے باعث عوام میں صوات مشہور تھے اور یہ گروہ ان کی طرف مشہور ہو کر صواتی کہلایا اور علاقہ ان کے نام سے صوات مشہور ہو گیا[۳]۔"

سواتی نہایت جنگجو قوم تھی۔ اس میں بڑے نامور سلاطین اور فاتح گزرے ہیں۔ افغانستان کے علاقہ لمغان سے لے کر کشمیر، باجوڑ، سوات، بونیر، کوہ ہندوکش اور دریائے سندھ کا درمیانی حصہ اور دریائے سوات کے دونوں کناروں پر واقع علاقوں پر طویل زمانے تک ان کی حکومت قائم رہی۔

سواتیوں کی بالاکوٹ میں آمد

مغل بادشاہ اکبر کے عہد حکومت میں مشہور روحانی پیشوا حضرت سید علی ترمذیؒ ہندوستان تشریف لائے اور سوات کے قریب بونیر نامی علاقے میں فروکش ہوئے۔ باباؒ پیر کے نام سے جو مزار آج بھی مرجع خلائق ہے وہ انہی حضرت سید علی ترمذیؒ کا ہے۔ حضرت سید علی ترمذیؒ کی چوتھی پشت میں ایک بزرگ پیدا ہوئے کہ ان کا نام سید جلال باباؒ تھا۔ یہ سید جلال بابا اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور ظاہری وجاہت کے لحاظ سے

---

[۱] تحقیق الافغان ص۲۷ مولفہ مولوی سمیع اللہ جان۔ [۲]، [۳]۔ تبصرات اسماعیلی (قلمی) ص۴، ۵ مولفہ محمد اسمٰعیل لغانی مرحوم (مملوکہ محمد ہمایوں خاں۔ بالاکوٹ)

نہایت ممتاز اور بڑی پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ بونیر سے کشمیر جاتے ہوئے علاقہ پکھلی میں جو بالاکوٹ سے متصل ہے قیام فرما ہوئے۔ اس زمانے میں سلطان شاہ محمود ترک مغلوں کی طرف سے اس علاقے کا حاکم تھا۔ حضرت جلال باباؒ نے گلی باغ میں قیام کیا۔ اس زمانے میں گلی باغ نہایت پُر رونق شہر اور علاقہ پکھلی کا صدر مقام تھا۔ حضرت جلال باباؒ کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور نورانی شکل و صورت نے اس علاقے کے لوگوں کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔ حاکم پکھلی نے بھی ان کی شہرت سن کر ان سے ملاقات کی۔ دونوں میں مخلصانہ تعلق پیدا ہو گیا اور سلطان شاہ محمود حضرت جلال باباؒ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی دختر ان کے نکاح میں دے دی۔ بھوگڑ منگ جو علاقہ پکھلی کا مشہور قصبہ ہے حضرت جلال باباؒ کو جہیز میں ملا۔[1] شادی کے بعد آپ نے اسی قصبہ میں قیام کیا۔

کچھ عرصہ تو حضرت سید جلال باباؒ اپنی بیگم اور خُسر کے ساتھ نہایت امن و سکون سے زندگی گزارتے رہے۔ مگر یہ پُرامن ماحول زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکا۔ حضرت جلال باباؒ ایک درویش انسان تھے۔ انہیں حکومت و امارت سے کوئی غرض نہ تھی لیکن مشکل یہ آ پڑی کہ علاقہ پکھلی کے عوام ان کے حد درجہ عقیدتمند ہو گئے تھے اور ان کے پاس لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ کچھ عرصہ تو حاکم پکھلی نے تعرض نہ کیا مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ تو لوگوں کی نگاہوں سے اتر گیا ہے اور مرجعِ خلائق حضرت جلال باباؒ ہیں تو کچھ ذاتی تاثر اور کچھ حاسد مصاحبوں کے ورغلانے سے اسے اپنے اقتدار کو خطرہ محسوس ہوا۔ چنانچہ ایک روز اس کے اشارے پر چند مسلح افراد نے حضرت جلال باباؒ پر حملہ کر دیا۔ جلال باباؒ زخمی ہو کر وہاں سے نکلے اور بونیر پہنچ کر اپنی دردناک داستان بونیر کے افغانوں کو سنائی۔ اس زمانے میں سوات پر یوسف زئی قبیلہ نے حملہ کر کے سواتی افغانوں کو اس علاقے سے پسپا کر دیا تھا اور یہ لوگ بونیر میں مقیم تھے۔ اپنے مرشد کے ساتھ یہ بدسلوکی انہیں نہایت ناگوار گزری اور انتقام لینے کے لئے حضرت جلال باباؒ کی سرکردگی میں بونیر سے روانہ ہوئے۔ گلی باغ پہنچ کر سواتیوں کے لشکر کا ترکوں سے مقابلہ ہوا۔ ترک حاکم اس وقت اپنے علاقے میں موجود نہ تھا بلکہ کسی ضرورت سے دہلی گیا ہوا تھا۔ اس کا بھائی محمد خان اس کا قائم مقام تھا وہ مقابلہ نہ کر سکا اور راہِ فرار اختیار کی۔ سواتیوں نے گلی باغ اور پکھلی کا علاقہ فتح کر لیا۔ رفتہ رفتہ تناول کا بہت سا علاقہ نیز بالاکوٹ اور کاغان بھی سواتیوں کے قبضے میں آ گئے۔ فتح کے بعد حضرت جلال باباؒ اور سواتی افغانوں نے مفتوحہ علاقہ باہم تقسیم کر لیا۔ پکھلی، تناول کا کچھ حصہ اور بالاکوٹ افغانوں کے حصے میں آئے، کوائی اور کاغان حضرت جلال باباؒ کو ملا۔ سیدانِ کاغان اور سیدانِ کوائی انہی حضرت جلال باباؒ کی اولاد میں سے ہیں اور اب بھی ان علاقوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

---

[1] تاریخ ہزارہ صفحہ ۱۰۳ از مسٹر ویس

سواتیوں کی بالاکوٹ میں آبادی

فتح کے بعد سواتی قبیلہ کے لوگ پہلے الائی، بفہ، نندھیاڑ اور بگرام میں آباد ہوئے۔ اس کے بعد پھران کے بعض خاندانوں نے بالاکوٹ کا رُخ کیا اور اس قصبے کو مستقل طور پر اپنا مستقر بنالیا۔ بالاکوٹ میں سواتیوں کے چھوٹے خاندان آباد ہوئے۔ ۱۔ لہاڑی، ۲۔ ڈھوڈیاڑی ۳۔ تیتوال ۴۔ لغمانی ۵۔ بجوری، ۶۔ خواجہ خیلی، چنانچہ انہی چھ قوموں کے نام پر بالاکوٹ میں چھ محلے آباد ہیں اور انہی چھ قوموں کے نام سے بفہ میں بھی چھ محلے موسوم ہیں ان چھ قوموں کے علاوہ سواتیوں کے ساتھ کچھ اور قومیں بھی آئیں اور علاقہ پکھلی میں آباد ہوئیں، ان میں جہانگیری زیادہ مشہور ہوئی مگر اکثریت اور اقتدار انہی چھ قوموں کے حصے میں آیا۔ سواتی افغانوں کے آنے سے قبل بالاکوٹ کی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی۔ پہاڑوں کے دامن میں دور دور گوجروں کے معمولی مکانات تھے جو دن بھر بھیڑیں بکریاں چرانے یا تھوڑی بہت کاشت کرنے اور شام کو اپنے منتشر و متفرق مکانوں میں جا سوتے۔ سواتیوں نے اس علاقے میں آکر اسے باقاعدہ شہر کی صورت دی محلے آباد کئے، ہر محلے میں ایک مسجد تعمیر کی، بازار قائم کیا۔ یہاں کے لوگوں کی روایت ہے کہ سواتی جب اپنے وطن سے آئے تو اپنی عورتوں بچوں اور اثاث البیت کے ساتھ ہندو کھتریوں کو بھی لائے جنہوں نے یہاں آکر تجارت شروع کی۔ افغانوں نے انہیں پورا تحفظ دیا اور یہ کھتری نہایت کامیاب تاجر ثابت ہوئے۔

موجودہ بالاکوٹ

موجودہ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء کے بالاکوٹ سے بہت حد تک مختلف ہے۔ اب اس شہر نے خاصی وسعت اختیار کرلی ہے، یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ قدیم بالاکوٹ جس کی آبادی اندازاً تین چار ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ بیشتر مکانات پرانی وضع کے ہیں۔ تعمیر میں لکڑی اور پتھر استعمال کیا گیا ہے، گزشتہ چند سال سے قدیم شہر میں بھی نئی وضع کے خوبصورت اور بنگلہ نما مکان تعمیر ہورہے ہیں، پرانا بالاکوٹ بلندی پر واقع ہے جسے یہاں کی اصطلاح میں "ڈھیری" کہتے ہیں۔

بالاکوٹ کے دوسرے حصے کا نام "بلیانی" ہے، یہ دریا کے کنارے کے غربی حصے میں واقع ہے۔ قدیم بالاکوٹ سے بالکل مختلف ہے اور برطانوی عہد حکومت میں تعمیر ہوا ہے۔ اس میں پختہ خوبصورت اور ہوادار سرکاری عمارتیں ہیں جن میں گورنمنٹ ہائی اسکول، پولیس اسٹیشن، ہسپتال، ڈاک بنگلہ، تار گھر، ریسٹ ہاؤس، پی ڈبلیو ڈی کا دفتر، یوتھ ہوسٹل، ڈاک خانہ اور بڑا بازار شامل ہے، حضرت سید احمد شاہ صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا

مزار بھی اسی حصے میں ہے اور ان کے نام کے ایک حصہ کی نسبت سے "بریلی بازار" کہلاتا ہے۔ نہایت خوبصورت جامع مسجد اور اس سے ملحقہ دینی مدرسہ "جامعہ محمدیہ" بھی اسی علاقے میں قائم ہے۔ اس علاقے کی آبادی تقریباً ایک ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ بالاکوٹ کا تیسرا حصہ گرلاٹ کہلاتا ہے۔ یہ دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر آباد ہے۔ جنداں والی کا ہسپتال اس علاقے کا قابل ذکر رفاہی ادارہ ہے جو نہایت خوبصورت اور کشادہ عمارت میں واقع ہے۔ جرمنی کی خواتین ڈاکٹر یہاں معالج کی حیثیت سے متعین ہیں اور نہایت دلسوزی سے اپنے فرائض ادا کرتی ہیں۔ گرلاٹ سے تھوڑے فاصلے پر گندھک کا ایک چشمہ ہے۔ اس کا پانی خارش اور فسادِ خون کے مریضوں کے لئے نہایت مفید بتایا جاتا ہے۔ مریض دور دور سے آکر یہاں غسل کرتے ہیں۔ چشمے کا پانی روک کر پائپ کے ذریعے ایک مقام پر جمع کر دیا گیا ہے کسی نیک دل انسان نے اس کے قریب غسل خانے بنوا دیے ہیں مگر دیکھ بھال کا مستقل انتظام نہ ہونے کی وجہ سے چشمہ، حوض اور غسل خانوں میں صفائی کا انتظام غیر تسلی بخش ہے۔

گرلاٹ کی آبادی کم و بیش ایک ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اس کی رونق کا دارومدار بازار پر ہے جب بازار بند ہو جاتا ہے تو رونق بھی ختم ہو جاتی ہے۔ "بلیانی" کی طرح "گرلاٹ" بھی نئی آبادی ہے اور انگریزوں کے زمانے میں قائم ہوئی اسی علاقے میں دریائے کنہار کے دونوں پل واقع ہیں۔ پہلا پل قدیمی ہے اور ۱۸۹۰ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس میں لکڑی اور لوہا استعمال کیا گیا ہے اور فولادی کمانیوں کے ذریعے پانی میں معلق ہے۔ دوسرا پل صوبہ سرحد کے سابق وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خاں کے عہد حکومت میں تعمیر ہونا شروع ہوا تھا۔ مگر تکمیل کے وقت سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں برسرِ اقتدار تھے اس لئے انہوں نے ہی ۸ جون ۱۹۵۹ء کو اس کا افتتاح کیا۔

گرلاٹ اور بالاکوٹ ۱۹۴۲ء سے قبل ایک ہی حصہ تھا مگر ۱۹۴۲ء کے بندوبست کے بعد گرلاٹ کو بالاکوٹ سے الگ کر دیا گیا۔

بالاکوٹ کی اقوام

یہاں کی اقوام میں گوجر اور سواتی افغان تعداد میں سب سے زیادہ ہیں، اس کے بعد بیرونجات کے لوگ ہیں جو تجارت یا ملازمت کے سلسلے میں یہاں مقیم ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے گوجر سرِفہرست ہیں، ان کے بعد سواتی افغان۔ مگر اقتدار سواتی افغانوں ہی کو حاصل رہا۔ گوجروں کی حیثیت ہمیشہ افغانوں کے مزارعوں اور خدمت گذاروں کی رہی۔ اپنی شکل و صورت، جسمانی حالت، وضع قطع اور معاشرت کے لحاظ سے دونوں صاف پہچانے جاتے ہیں۔ گوجر عام طور پر غریب، پس ماندہ اور جاہل ہیں۔ ان کے رنگ سیاہی مائل خدوخال معمولی اور قد پستہ ہیں۔ بعض قدآور لوگ بھی ہیں مگر ان کی تعداد کم ہے۔ ان کے چہروں پر مایوسی اور پژمردگی برستی ہے جبکہ

ان کی غربت کی غمازی کرتی ہے۔ نرم خو اور امن پسند ہیں۔ لباس عام طور پر سلیٹی رنگ کا استعمال کرتے ہیں جو اکثر میلا اور بوسیدہ ہوتا ہے۔ بہت محنتی اور جفاکش ہیں، ان کی اکثریت جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر لاتی ہے کچھ کھیتوں میں اجرت پر کام کرتے ہیں۔ کچھ گائیں بکریاں چرانے اور ان کا دودھ بیچ کر گذر اوقات کرتے ہیں۔ یہاں کے مویشی عام طور پر چھوٹے اور کمزور ہوتے ہیں، دودھ بھی کم دیتے ہیں، شاید اس کی وجہ چارے کی کمی ہو۔

بالاکوٹ کی دوسری قابل ذکر قوم سواتی افغان ہے۔ ان کے رنگ گورے، چہروں پر سرخی، جسم مضبوط، قد دراز اور خدوخال دلکش ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پائی جاتی ہے۔ خوش خلق اور متواضع ہیں مگر غیر قوم میں عرصہ دراز تک رہنے بسنے کی وجہ سے ان میں افغانوں کی بعض صفات معدوم ہوگئی ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل اس قوم کو جو اقتدار حاصل تھا اب اس میں کمی ہوگئی ہے۔ اس کی وجہ وہ جدید حالات ہیں جو تقسیم ملک کے بعد رونما ہوئے لیکن اس کے باوجود انہیں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اب بھی ایک قسم کی سیادت انہی کو حاصل ہے۔ یہ لوگ گوجروں کے مقابلے میں اب بھی متمول ہیں۔ ان کی اچھی خاصی تعداد تعلیم یافتہ ہے اور نہایت تیزی سے تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے پرائمری سکول اور ورنا کولر مڈل اسکول اور لڑکوں کے لئے ہائی اسکول قائم ہیں جن کا انتظام خود گورنمنٹ کرتی ہے۔ سواتی افغان عام طور پر مذہبی ہیں، اکثریت نماز روزے کی پابند ہے۔ غیرت اور حیا ان میں آج بھی اسی طرح پائی جاتی ہے جس طرح ان کے اجداد میں تھی۔ ان کی عورتیں پردہ کرتی ہیں اور یہ پردہ نہایت سخت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زنا کاری اور اس کے لوازم سے یہ علاقہ پاک ہے۔ یہ لوگ صاف لباس پہنتے اور عام طور پر صاف ستھرے رہتے ہیں متمول ہونے کے باوجود ان کے طرز زندگی میں سادگی ہے۔

زرعی پیداوار

پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے قابل کاشت زمین یہاں کم ہے مگر یہاں کے محنتی باشندوں نے پہاڑوں کے نشیب میں ناقابل کاشت زمین کو اپنی محنتِ شاقہ سے قابل کاشت بنایا ہے اور ایک انچ زمین بھی ضائع نہیں ہونے دی۔ یہاں سال میں دو فصلیں ہوتی ہیں۔ زمین بارانی ہے۔ پہاڑی چشموں سے بھی آبپاشی ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے دریا کے کنارے سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکالی ہیں اور ان کا پانی کھیتوں میں پہنچایا ہے۔ مکئی، چاول، گندم، جو اور سرسوں یہاں کی خاص پیداوار ہے۔

قصبہ بالا کوٹ کا ایک منظر

جامع مسجد بالا کوٹ

عقب میں بھنگیاں کا سلسلہ کوہ نظر آرہا ہے۔
یہ مسجد قیام پاکستان کے بعد دریائے کنہار کے کنارے تعمیر کی گئی

مسجد بالا

قصبہ بالا کوٹ کی وہ تاریخی مسجد جس میں حضرت سید صاحب رح نے اپنے قیام کے دوران نمازیں پڑھائیں اور درس دیا ۔ یہ مسجد آج تک اپنی اصلی حالت پر قائم ہے

حویلی واصل خاں کا اندرونی منظر
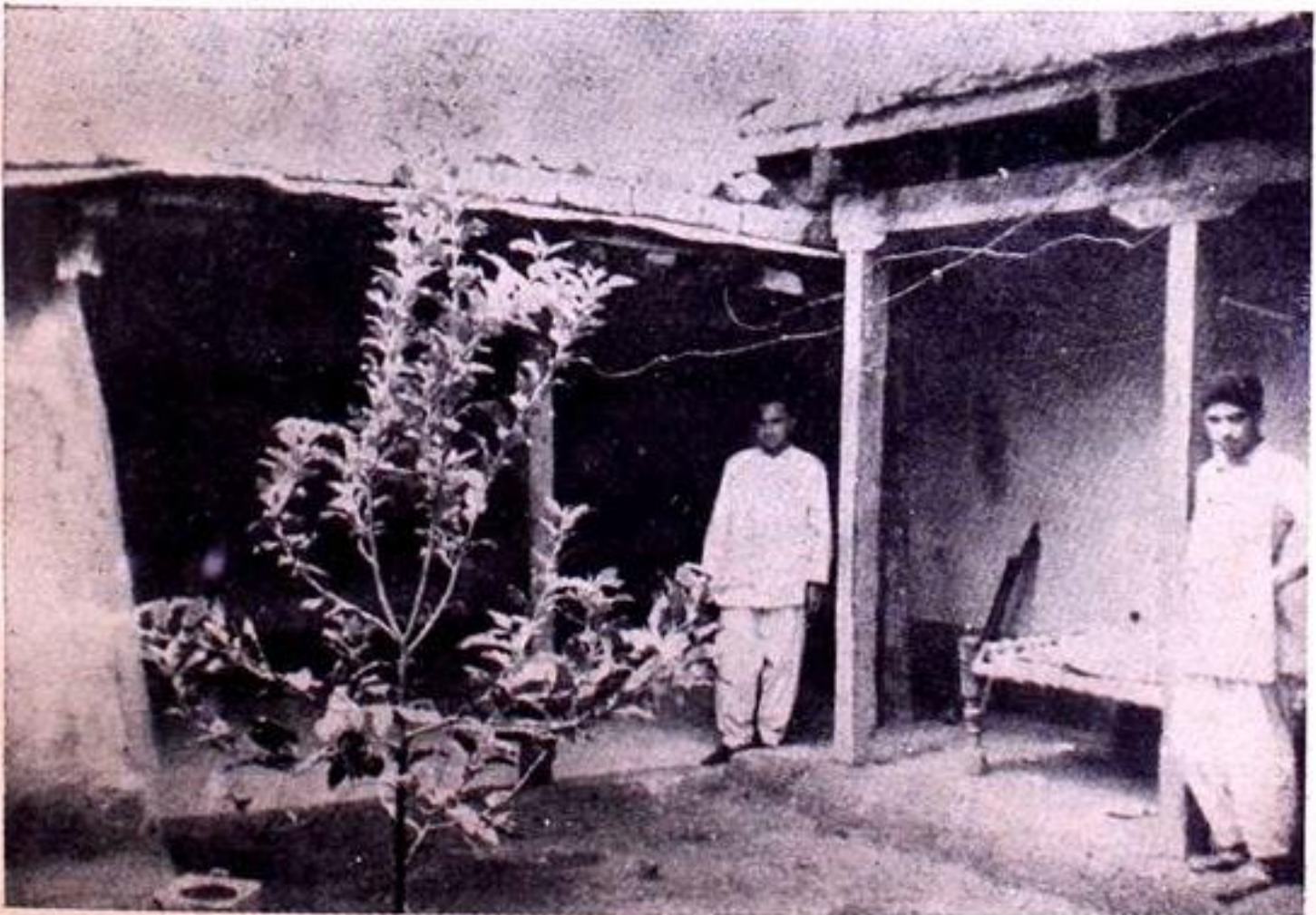
اسی حویلی میں حضرت سید صاحب رح نے قیام فرمایا تھا

بالاکوٹ کے محلے

قصبۂ بالاکوٹ چھ محلوں پر مشتمل ہے۔ ۱؎ محلہ لغمانی یہ بالاکوٹ کا سب سے بلند محلہ ہے اور یہاں سے وادیٔ کہنار کے تمام نشیب و فراز اور حسن و رعنائی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ۲؎ محلہ خواجہ خیلی یہ لغمانی محلہ سے ذرا نیچے آباد ہے ۳؎ اس کے بعد محلہ بجوری ۴؎ پھر محلہ لہاڑی ۵؎ اس کے بعد محلہ ڈھوڈہ باڑی اور آخر میں ۶؎ محلہ تیتوال ہے۔ ڈھوڈہ باڑی اور تیتوال تقریباً ہم سطح ہیں اور سب سے نیچے واقع ہیں۔ ان کی حدیں دھان کے ان سرسبز و شاداب کھیتوں سے جا ملتی ہیں جو سید صاحبؒ کے زمانے میں میدانِ جنگ بنے تھے۔ یہ چھ محلے سواتیوں کے چھ قبیلوں کے نام سے موسوم ہیں۔ ہر محلے کا ایک سرگروہ یا میرِ محلہ ہوتا ہے۔ اہل محلہ اس کا بڑا احترام کرتے ہیں، تنازعات کے فیصلے بھی یہی کرتا ہے۔

بالاکوٹ کی مساجد

بالاکوٹ کے ہر محلے میں ایک مسجد ہے البتہ محلہ بجوڑی میں دو مسجدیں ہیں ایک مسجدِ بالا کے نام سے موسوم ہے اور دوسری چھوٹی مسجد کہلاتی ہے۔ یہ مسجدیں پرانے طرز کی ہیں۔ ایک برآمدہ اور صحن پر مشتمل ہیں، ہر مسجد کے ساتھ ایک مسافر خانہ ہے۔ ان مسافر خانوں میں عام طور پر وہ طلبہ رہتے ہیں جو مضافاتِ بالاکوٹ سے دینی تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں۔ مسافروں اور طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام ہر محلے کے لوگ خود کرتے ہیں۔ باقی مساجد تو اپنی اصلی حالت پر قائم ہیں البتہ محلہ خواجہ خیلی کی قدیم مسجد گرا کر نئی مسجد بنائی گئی ہے یہ بنگلہ نما اور ظاہری لحاظ سے دوسری مساجد سے زیادہ خوبصورت ہے لغمانی مسجد میں بھی توسیع کی گئی ہے۔ دیواریں پختہ کر دی گئی ہیں محرابیں بھی نئی بنائی گئی ہیں۔

مسجدِ بالا

یہ بالاکوٹ کی وہ تاریخی مسجد ہے جس میں حضرت سید صاحبؒ نماز پڑھاتے اور درس دیتے تھے۔ یہ حویلی واصل خاں کے قریب بلکہ اس سے چند گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ وہی حویلی ہے جس میں سید صاحبؒ نے قیام کیا تھا مسجد بالا ابھی تک اپنی اصلی حالت میں قائم ہے البتہ کچھ اضافہ ضرور ہوا ہے۔ یہ ایک کمرہ دو دالانوں اور ایک صحن پر مشتمل ہے۔ کمرہ کا طول ۱۵½ فٹ اور عرض ۲۲ فٹ کے قریب ہے۔ دیواریں پتھر کی ہیں جن پر مٹی کا پلستر کیا گیا ہے۔ درمیان میں لکڑی کے تین کاردار ستون ہیں۔ درمیانی ستون پر جو عبارت کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا

ہے کہ لعل خاں نامی ایک خان نے اس کی مرمت کی تھی اور یہ ستون انہوں ہی نے نصب کرائے تھے۔ یہ لعل خاں واصل خاں کے فرزند اور اپنے زمانے میں بالاکوٹ کے بہت غیور اور دلیر خان تھے۔ کمرے کے سامنے دو دالان ہیں، ایک شمالاً جنوباً، دوسرا شرقاً غرباً۔ برآمدوں میں اندازاً تیس افراد کے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے کمرے میں تین صفیں بچھ سکتی ہیں، برآمدے لکڑی کے ستونوں پر قائم ہیں۔ محرابیں بھی لکڑی کی ہیں جس وقت جنگ کا آغاز ہوا ہے تو حضرت سید صاحبؒ اسی مسجد میں تھے اور سکھوں کی توپوں کے گولے اس مسجد کے قریب دائیں بائیں گرے تھے مگر گولہ باری سے مسجد محفوظ رہی تھی۔

مسجدِ زیریں

قصبہ کی مساجد میں یہ سب سے وسیع خوبصورت اور مضبوط مسجد ہے یہ ایک وسیع ہال کمرے، دو برآمدوں اور ایک صحن پر مشتمل ہے۔ کمرے کا طول تقریباً ۱۸ فٹ اور عرض ۲۷½ فٹ کے قریب ہے۔ درمیان میں لکڑی کے نہایت مضبوط ستون ہیں جن پر خوبصورت کام کیا گیا ہے۔ کمرے کا فرش خام ہے اس کے ساتھ دو برآمدے ہیں، ایک شمالاً جنوباً، دوسرا شرقاً غرباً۔ دونوں برآمدے لکڑی کے ستونوں پر قائم ہیں محرابیں بھی لکڑی کی ہیں۔ ہر برآمدے میں پانچ در ہیں۔ صحن کا فرش خام ہے اور اس میں ایک کنواں بھی ہے۔ دیواریں پتھر کی ہیں، جن پر مٹی کا پلستر کیا گیا ہے۔ یہاں سے میدانِ جنگ اور مٹی کوٹ کا پہاڑ صاف نظر آتا ہے بلکہ یہ مسجد ان کھیتوں سے متصل ہے جو سید صاحبؒ کے زمانے میں میدانِ جنگ بنے تھے۔ ابتدا میں یہی قصبے کی جامع مسجد تھی بلکہ سید صاحبؒ کے بعد تقریباً ایک صدی تک جمعہ کی نماز اسی مسجد میں ادا کی جاتی تھی، یہ وہی مسجد ہے جس میں سید صاحبؒ نے اپنی شہادت سے قبل چند منٹ قیام فرمایا تھا یہیں آپ نے کچھ غیبی آوازیں سنی تھیں جو آپ کو میدانِ جنگ کی طرف بلا رہی تھیں، یہ آوازیں سنکر اسی مسجد سے آپ اپنی شہادت گاہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔

بیرونی مساجد

ان مساجد کے علاوہ کچھ مسجدیں قصبہ سے باہر ہیں جن میں مسجد ناڑہ، مسجد کونڈیاں والی اور جامع مسجد گرلاٹ شامل ہیں مسجد ناڑہ کا محلِ وقوع بالاکوٹ شہر سے جانبِ شمال ہے، اس کے ایک جانب یعنی جنوب مشرق کی طرف "ست بنی" کا نالہ ہے، تین طرف کھیت اور ان کے پیچھے پہاڑ ایستادہ ہیں، یہ ایک وسیع کمرہ برآمدہ اور نہایت کشادہ صحن پر مشتمل ہے عمارت نہایت مضبوط ہے اور خوبصورت بھی، صحن کے وسط میں دو بلند و بالا درخت ہیں ایک سرو کا اور دوسرا شرون کا۔ دیواروں کی بنیادیں خاصی چوڑی ہیں مگر ابھی ان پر بالائی دیواریں تعمیر نہیں کی گئیں۔ اس مسجد کی بغل میں بائیں طرف

نئے کمرے تعمیر ہو رہے ہیں۔ پہلے قصبہ کے لوگ جمعہ کی نماز اسی مسجد میں ادا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ اب بھی جمعہ یہیں پڑھتے ہیں اس مسجد کے کمرے میں ایک قدرتی چشمہ ہے جس کا پانی پائپ کے ذریعہ صحن کے قریب سے گزار کر مسجد سے باہر غسل خانوں میں لے جایا گیا ہے۔ موسم گرما میں اس چشمے کا پانی نہایت خنک اور موسم سرما میں خاصا گرم ہوتا ہے۔

قصبہ سے باہر جو مسجدیں واقع ہیں ان میں ایک چھوٹی سی مسجد اور ہے جو کونڈیاں والی مسجد کہلاتی ہے۔ یہ مسجد دو پہاڑی نالوں کے درمیان واقع ہے۔ اس کے مشرق میں برنہ نالا اور جنوب میں ست بنی کا نالہ ہے۔ اس میں ایک کمرہ اور دو طرف برآمدے ہیں، یہ بھی مسجد نارہ کی طرح پختہ اور خوبصورت ہے۔ کونڈیاں مقامی اصطلاح میں چمڑہ صاف کرنیکے حوض کو کہتے ہیں، چونکہ اس مسجد کے قریب چمڑہ صاف کرنے کے متعدد چھوٹے چھوٹے حوض سے بنے ہوئے ہیں۔ اسی مناسبت سے اسے کونڈیاں والی مسجد کہتے ہیں۔ اس کی تعمیر میں پتھر ریت، سیمنٹ لکڑی اور ٹین استعمال ہوا ہے۔ بالاکوٹ کی سب سے بڑی اور خوبصورت مسجد وہ ہے جو دریائے کنہار کے کنارے حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے اس کے کچھ ستون دریا میں ہیں اور صحن ان ہی ستونوں پر قائم ہے نمازِ جمعہ کا سب سے بڑا اجتماع اسی مسجد میں ہوتا ہے۔ بالاکوٹ کے مشہور قاضی خاندان کے فرد قاضی خلیل احمد صاحب اس کے خطیب ہیں۔ اس کا اندرونی حصہ، برآمدہ اور صحن تینوں حصے بہت وسیع ہیں، اس کے قریب خنک اور شیریں پانی کے چشمے ہیں۔ اس مسجد کا منظر نہایت خوبصورت اور پرکشش ہے۔

بالاکوٹ کے مزارات

بالاکوٹ کے مشہور مزارات تو دو ہی ہیں، ایک مزار حضرت سید احمدؒ شہید اور دوسرا مزار حضرت شاہ اسمٰعیلؒ شہید۔ سیدؒ صاحب کا مزار دریائے کنہار کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول بالاکوٹ کے سامنے سے ایک چھوٹی سی پختہ سڑک کاغان روڈ سے نکل کر دریائے کنہار کی طرف جاتی ہے۔ اسی سڑک پر تھوڑی دور چل کر دائیں طرف یہ مزار واقع ہے۔ چاروں طرف قصبے کے بہت سے لوگوں کی قبریں ہیں۔ رئیس المجاہدین مولانا فضل الہٰی وزیر آبادی کی قبر بھی اسی احاطے میں ہے۔ سید صاحبؒ کی قبر پہلے خام تھی مگر قیام پاکستان کے بعد اسے پختہ کر دیا گیا۔ اس کی کرسی سطح زمین سے کافی بلند ہے۔ سرہانے کتبہ لگا ہوا ہے۔ جن صاحب نے کتبہ نصب کیا ہے ان کا نام قاضی محمد یوسف ہے پشاور کے رہنے والے تھے۔ ان کے نام کے ساتھ کچھ اور الفاظ بھی تھے جنہیں رگڑ رگڑ کر مٹا دیا گیا ہے اس لئے پڑھے نہیں جا سکے۔ اس لوحِ مزار پر ایک قطعۂ تاریخ اور حضرت سید صاحبؒ کا اسم مبارک کندہ ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی کتبہ کی عبارت یہاں نقل کر دی جائے۔

لوحِ مزار

حضرت سید احمد بریلوی غازی رحمتہ اللہ علیہ مدفون بالاکوٹ ضلع ہزارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سید احمد بریلوی غازی — ہست مدفون اندریں مرقد
مومن و متقی، ولی اللہ — بُد مجدد براسِ سیزدہ صد
آمد از ہند با گروہِ کثیر — بہر امداد مردم سرحد
جنگ با سکھ نمود گشت شہید — باد راضی ازو خدائے احد
بست و چارم بُد از ذیقعد — سال غم در بداں در ابجد
کاف و حا را کشیدہ گو یوسف
رحمتِ رب بود بایں مرقد

۱۲۴۶ھ

قاضی محمد یوسف ...... پشاور پنجاب ... سرحد، ۱۳۴۶ھ

اس لوحِ مزار کے قریب ہی ایک چھوٹا سا پتھر رکھا ہوا ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے۔

"غازی سید احمد صاحبؒ بریلوی شہید مجدد تیرھویں صدی"

اس پتھر کے کونے میں سنہ ۱۹۱۱ء کندہ ہے یہ وہی کتبہ ہے جو زیدہ کے خان عجب خاں نائب تحصیلدار مانسہرہ نے سید صاحبؒ کی شہادت کے تقریباً پون صدی بعد قبر کی نشاندہی کرا کے نصب کرایا تھا۔ پتھر ناتراشیدہ ہے اور عبارت نہایت شکستہ حروف میں کندہ کی گئی ہے۔

دوسرا قابلِ ذکر مزار حضرت شاہ اسماعیل شہید کا ہے۔ یہ قصبہ سے چند فرلانگ کے فاصلے پر جانب شمال واقع ہے۔ اس کے قریب سے برنہ نالہ گذرتا ہے۔ یہ پہاڑی نالہ ہے اور امسال (سنہ ۱۹۷۱ء) کی شدید بارشوں کی وجہ سے نالہ نے مزار کی زیریں زمین کو کاٹ دیا ہے۔ مزار کے احاطے کی ایک دیوار کا کچھ حصہ بھی منہدم ہو گیا ہے۔ اگر محکمۂ اوقاف یا حکومت نے اس طرف توجہ نہ کی تو اندیشہ ہے کہ مزار کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہو گا اور آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی۔ بالاکوٹ کا تیسرا مزار ایک بزرگ بابا روشن قلندر کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مزار برنہ اور ست بنی کے پہاڑی نالوں کے درمیان واقع ہے۔ قبر پختہ اور سیمنٹ کی ہے۔ چوتھا مزار شاہ جی بابا سے منسوب کیا جاتا ہے یہ نائرہ والی مسجد کے قریب واقع ہے۔ ان مزارات کے علاوہ ایک زیارت بھی بالاکوٹ کی

دونق کا باعث ہے اسے زندہ پیر کی زیارت کہتے ہیں۔ بعض لوگ اسے بالا پیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہاں کسی قبر کا وجود نہیں بلکہ ایک چہار دیواری میں ایک نشست بنی ہوئی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں گورو نانکؒ کے مرید خاص بھائی بالا نے قیام کیا تھا۔ سکھوں کے زمانے میں اس زیارت کو متبرک مقام کی حیثیت حاصل تھی۔ انگریزوں کے عہد میں بھی سکھ اور ہندو یہاں آتے اور نذریں پیش کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد ہندو اور سکھ تو چلے گئے مگر اس زیارت کی رونق کم نہ ہوئی۔ اب یہ فریضہ نواحِ بالاکوٹ کے جاہل اور ضعیف الاعتقاد مسلمان ادا کر رہے ہیں۔ ہر جمعرات کو صبح سے دیہات کے مرد، عورتیں اور بچے چڑھاوے لے کر آنا شروع ہو جاتے ہیں اور دوپہر کے بعد تک یہاں میلہ سا لگا رہتا ہے۔

بالاکوٹ

بالاکوٹ ہمیشہ سے پسماندہ علاقہ ہے۔ دور افتادہ ہونے کی وجہ سے علمی ترقی کی روشنی یہاں کم ہی پہنچی۔ قصبہ بھی چھوٹا سا ہے اور آج سے ڈیڑھ سو سال قبل اور بھی مختصر تھا۔ آبادی بھی تھوڑی سی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کوئی ایسا عالم پیدا نہیں ہوا جس نے ملک گیر شہرت حاصل کی ہو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بالاکوٹ کی سرزمین نے کسی عالم کو جنم ہی نہیں دیا۔ یہاں علما پیدا ہوئے گو کم سہی مگر جتنے عالم پیدا ہوئے وہ اپنے علم میں کامل تھے۔ ان علما میں حافظ جی نامی عالم بہت پائے کے بزرگ تھے۔ یہ حافظِ قرآن بھی تھے چھپر گرام (علاقہ غیر) سے آکر بالاکوٹ میں مقیم ہوئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ پٹھانوں کے سواتی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لغمانی مسجد میں خطیب تھے۔ دن میں دو بار درس دیتے تھے۔ صبح کو دریائے کنہار کے کنارے چلے جاتے تھے۔ وہیں طلبہ آجاتے اور حافظ صاحب یہیں انھیں درس دیتے۔ سہ پہر کو ظہر اور عصر کی نمازوں کے درمیان لغمانی مسجد میں درس شروع ہوتا تھا۔ بالاکوٹ کے علاوہ مضافات اور علاقہ غیر سے بھی طلبہ آتے اور حافظ جی سے تعلیم حاصل کرتے۔ ان کے بکثرت شاگرد تھے۔ ان میں اخوندزادہ عباس خاں نے اس علاقے میں بڑی شہرت حاصل کی۔ یہ لغمانی قبیلے کے سردار تھے۔ ان کے والد حبیب خاں چھپر گرام (علاقہ غیر) سے آکر بالاکوٹ میں مقیم ہوئے تھے۔ اخوندزادہ عباس خاں عربی فارسی اور فلسفہ و منطق کے عالم تھے۔ اپنے مکان پر طلبہ کو درس بھی دیتے تھے جب سید صاحبؒ بالاکوٹ تشریف لائے تو جن لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی ان میں اخوندزادہ عباس خاں بھی شامل تھے۔ سید صاحبؒ نے انہیں ایک تلوار بھی عطا فرمائی تھی جو تبرک کے طور پر اس خاندان میں عرصے تک رہی مگر افسوس کہ اس خاندان کے موجودہ رکن رکین حاجی شراب خاں سے یہ تاریخی یادگار ضائع ہو گئی۔ بالاکوٹ کے علما میں اخوندزادہ مولوی محمد فیروز خاں کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ لہاڑی لغمانی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ عربی زبان کے فاضل اور عالم دین تھے۔ ایک عربی کتاب کی فارسی میں شرح بھی لکھی تھی۔ افسوس کہ اس کتاب کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

مولوی فخر الدین جی بالاکوٹ کے علما میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے اور اس علاقے میں "جی صاحب" کے نام سے مشہور رہے تھے۔ ان کا تعلق گکھڑ قوم سے تھا۔ ان کے والد نور محمد صاحب خان پور کے گکھڑ حکمرانوں کی اولاد میں

سے تھے۔ جب گکھڑوں پر زوال آیا تو نور محمد صاحب اپنے فرزند مولوی فخرالدین جی صاحب کو لے کر بالاکوٹ چلے آئے سید صاحبؒ کے زمانے میں جی صاحب کی عمر چھ سال کے لگ بھگ تھی۔ جی صاحب ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوئے تعلیم بالاکوٹ ہی کے علما سے حاصل کی۔ بڑے پایے کے عالم اور عربی و فارسی کے مصنف بھی تھے، علم کلام حدیث، تفسیر اور فلسفہ و منطق پر متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے بعض ان کے خاندان میں محفوظ ہیں۔ افسوس کہ یہ سب غیر مطبوعہ ہیں۔ مولوی نور محمد جان انہی مولوی فخرالدین جی صاحب کے فرزند اور دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں اور آج کل گورنمنٹ ہائی اسکول بالاکوٹ میں دینیات کے مدرس ہیں۔

بالاکوٹ کے علم دوست خاندانوں میں قاضی خاندان کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ رحیم دادخاں تھے۔ ان کے والد نے سیدصاحبؒ کا زمانہ پایا تھا اور جنگ بالاکوٹ کے وقت کوائی علاقۂ کاغان کے قاضی تھے۔ والد کے انتقال کے بعد قاضی رحیم دادخاں کوائی سے ترکِ وطن کر کے بالاکوٹ آگئے اور یہاں کے قاضی مقرر ہوئے۔ ان کا تعلق سواتی افغانوں سے نہیں بلکہ سلیمان خیل قبیلے سے تھا۔ قاضی رحیم دادخاں کے انتقال کے بعد ان کے فرزند قاضی محمد اسماعیل صاحب قضا کے منصب پر فائز ہوئے۔ یہ نہایت عالم اور علم پرور بزرگ تھے۔ تعلیم ہری پور میں پائی۔ مولانا فضل احمد سکندر پوری سے فنون اور مولوی عبدالاحد صاحب خانپوری سے حدیث پڑھی۔ باقی علوم کی تحصیل بھی سکندر پور ہی میں کی۔ سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد بالاکوٹ کے قاضی مقرر ہوئے اور آخر وقت تک اس منصب پر فائز رہے ۶۲ سال کی عمر پا کر ۱۳۱۷ھ میں وفات پائی۔ اُن کے چھوٹے بھائی قاضی محمد اسحاق صاحب بھی نہایت صاحب علم و فضل انسان تھے۔ اپنے برادر اکبر قاضی محمد اسماعیل صاحب کے ہم درس تھے۔ ان کے ساتھ ہی تعلیم کے مراحل طے کئے۔ سندِ فراغت حاصل کرنیکے بعد گیدڑپور، مضافاتِ مانسہرہ میں قاضی مقرر ہوئے۔ اپنے بھائی قاضی محمد اسماعیل صاحب کی وفات کے بعد بالاکوٹ چلے آئے اور پھر یہاں کا منصبِ قضا ان کے سپرد ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند قاضی محمد ادریس صاحب بالاکوٹ کے قاضی مقرر ہوئے۔ یہ دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کے دوسرے بھائی قاضی محمد یونس صاحب بھی نہایت علم دوست اور عالم شخص تھے۔ اپنے بھائی (قاضی محمد ادریس صاحب) کی وفات کے بعد بالاکوٹ کے منصبِ قضا پر فائز ہوئے۔ قاضی خلیل احمد صاحب انہی قاضی محمد یونس صاحب کے فرزند اور بالاکوٹ کے موجودہ قاضی ہیں۔ نہایت خوش خلق اور ملنسار انسان ہیں۔ آج کل سیاست کی طرف زیادہ مائل ہیں۔

بالاکوٹ کے موجودہ علما میں قاضی محمد اسرائیل صاحب نہایت فاضل، منکسر المزاج، مرنجاں مرنج اور خلیق انسان ہیں۔ اپنے اندر تو کل کی عجیب شان رکھتے ہیں، ہر قسم کی گروہ بندی سے بالا کفر بازی و کفر سازی سے دامن کشاں اور

خدمتِ علم و ادب میں منہمک رہتے ہیں ۔ دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں ۔ "جامع محمدیہ" بالاکوٹ کے صدر مدرس اور عربی زبان کے نہایت اچھے نثر نگار ہیں ۔ دیوان متبنیؔ کا حاشیہ عربی میں تحریر کیا ہے ۔ اصولِ فقہ کی کتاب "نور و نار" کا بھی حاشیہ عربی میں لکھا ہے ۔ یہ دونوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔ بالاکوٹ کے ممتاز عالم قاضی محمد اسماعیل صاحب مرحوم کے فرزند ہیں ۔ عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی ہے ۔ مگر درس و تدریس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے ۔ ان کے بکثرت شاگرد ہیں جن میں سے بعض بڑے ممتاز عالم ہیں ۔

بالاکوٹ کی سڑکیں

بالاکوٹ کی سب سے بڑی سڑک جسے یہاں جرنیلی سڑک کہتے ہیں وہ ہے جو ایبٹ آباد سے آتی ہے اور بالاکوٹ سے گذرتی ہوئی کاغان اور گلگت تک چلی جاتی ہے ۔ یہ تارکول کی پختہ سڑک ہے اور کاغان روڈ بھی کہلاتی ہے ۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کے سامنے سے اسی سڑک سے ایک چھوٹی سی سڑک نکل کر دریائے کنہار کے قدیمی پل کی طرف جاتی ہے ۔ یہ بھی تارکول کی پختہ سڑک ہے ۔ اس کے دونوں طرف بازار ہے ۔ حضرت سید صاحبؒ کا مزار اسی سڑک پر دائیں جانب واقع ہے ۔ جرنیلی سڑک یا کاغان روڈ پر جنوب کی طرف ایک فرلانگ کے قریب جانے کے بعد بائیں طرف ایک سڑک نکلتی ہے جو بالاکوٹ کے قصبے میں داخل ہوتی ہے ۔ یہ سڑک مٹی اور پتھروں سے بنائی گئی ہے اور بتدریج بلند ہوتی چلی جاتی ہے ۔ اس کا نام شاہ اسماعیل روڈ ہے ۔ اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں ۔ ایک حضرت شاہ اسماعیل صاحبؒ کے مزار کی طرف چلی جاتی ہے اور دوسری قصبے کی طرف ۔ قصبے کی طرف جانے والی سڑک کی بھی کچھ آگے بڑھ کر دو شاخیں ہو جاتی ہیں ۔ ایک پرائمری اسکول کے پاس سے گذرتی ہوئی محلہ تنبتوال میں پہنچکر ختم ہو جاتی ہے اور دوسری شاخ بتدریج بلندی کی طرف چڑھتی ہوئی محلہ خواجہ خیلی میں داخل ہو کر محلہ بجوری میں ختم ہو جاتی ہے ۔ ان شاخوں کو سڑکوں کی بجائے گلیاں کہنا زیادہ صحیح ہوگا ۔ یہ سب گلیاں ناتراشیدہ پتھروں سے تعمیر کی گئی ہیں اور ناہموار ہیں ۔

بالاکوٹ کے بازار

۱۹۴۷ء تک قصبہ میں نہایت بارونق اور وسیع بازار تھا ۔ تجارت عام طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی اور یہ بہت اچھے بیوپاری تھے ۔ اس بازار میں ضروریاتِ زندگی کی جملہ اشیاء دستیاب ہوتی تھیں ۔ کاغان بلکہ چیلاس تک کے چھوٹے تاجر قصبہ بالاکوٹ کے اسی بازار سے اشیاء تھوک کے بھاؤ خرید کر لے جاتے تھے ۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں اس بازار کو نذرِ آتش کر دیا گیا ۔ اس کے کھنڈرات رہ گئے تھے وہ بھی معدوم ہوتے

چلے جا رہے ہیں۔ اب قصبہ میں اکا دکا چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں۔ بڑے بازار قصبہ سے باہر ہیں۔ ان میں سب سے بڑا بازار بریلی بازار کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کاغان روڈ سے نکلنے والی سڑک کے دونوں جانب واقع ہے جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے مزار کو جاتی ہے۔ یہ نہایت بارونق بازار ہے بلکہ اسے منڈی کہنا زیادہ صحیح ہے۔ قرب و جوار کے دیہات کے لوگ کاغان وناران کے تاجر اور باہر سے آنے والے سیاح اسی بازار سے ضروریاتِ زندگی کی اشیاء خریدتے ہیں۔ بازار صاف ہے۔ بہت سی دوکانیں پختہ ہیں۔ چند خام ہیں۔

دوسرا بازار دریائے کنہار کے پار گرلاٹ میں واقع ہے۔ یہ نسبتاً تنگ ہے جس سڑک کے کنارے یہ بازار واقع ہے وہ بھی ناہموار اور کچی ہے۔ البتہ بڑی اور تھوک سامان کی دوکانیں بکثرت ہیں۔ تیسرا بازار کٹرہ داصل خاں کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بازار حضرت سید احمد شہیدؒ کے مزار کے قریب بائیں جانب واقع ہے۔ یہ چھوٹا سا بازار ہے مگر دوکانیں پختہ ہیں۔ نیشنل بنک آف پاکستان کی ایک شاخ اسی بازار میں قائم ہے۔ بالاکوٹ میں یہی ایک بنک ہے۔ ڈاک خانہ کی عمارت بھی اسی بازار سے ذرا آگے بلندی پر واقع ہے۔ چوتھا بازار رضا بازار ہے یہ شاہ اسماعیل شہید روڈ پر واقع ہے۔ اس بازار کی دوکانیں پختہ ہیں اور بیشتر دوکانیں سڑک کے شمالی جانب واقع ہیں۔ ایک چھوٹا سا بازار کاغان روڈ پر بھی پٹرول پمپ کے قریب حال ہی میں تعمیر ہوا ہے۔ اس بازار کی دوکانیں بھی پختہ اور نسبتہً صاف ہیں۔

سواتی افغانوں کے نسب نامے

بالاکوٹ میں سواتی افغانوں کے جو خاندان آباد ہیں ان کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ یہاں اتنا اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سواتیوں کے علاوہ افغانوں کے بعض اور قبائل نے بھی مختلف علاقوں سے آکر بالاکوٹ کو اپنا مستقر بنایا جن میں سے سلیمان خیل خاندان قابلِ ذکر ہے۔ اس کے اکابر کو مدتِ مدید تک کوائی (وادی کاغان) اور بالاکوٹ کی قضا کا منصب بھی حاصل رہا۔ ذیل میں بالاکوٹ کے افاغنہ کے شجرے درج کئے جاتے ہیں۔ ان شجروں میں ان خاندانوں کی وہی شاخیں شامل کی گئی ہیں جنہوں نے بالاکوٹ میں مستقل قیام کیا۔ جن خاندانوں کے لوگ ترکِ سکونت کر کے دوسرے علاقوں میں منتقل ہو گئے، ان افراد کا تذکرہ قلم انداز کر دیا گیا کیونکہ یہ تاریخ بالاکوٹ کی ہے مانسہرہ، ایبٹ آباد، کشمیر یا پشاور کی نہیں۔

شجرۂ نسب نجوری (بالاکوٹ)

مجید خاں

رستم خاں ← رحمت خاں ← انعام خاں ← انز اللہ خاں (سوات میں آکر آباد ہوئے) ← واصل خاں

- زوجہ دوم
  - عبدالغنی خاں ← (اولاد نرینہ نہیں ہوئی)
- بادشاہ بیگم (زوجہ اول)
  - جہاں داد خاں ← ※ (در سے مفقود)
    - فیض طلب خاں
      - واصل خاں
        - رستم خاں
  - نجیم خاں
    - افضل خاں
      - شیر خاں
        - علی اصغر خاں
          - توقیر اصغر خاں
  - دوست محمد خاں
    - تاج محمد خاں
      - خالد خاں
    - فقیر خاں
      - عبدالرشید خاں
      - محمد یوسف
        - محمد طاہر
      - محمد اشرف خان
        - محمد طارق
    - گل زمان خاں (لاولد)
  - باز خان
    - عالم خاں
      - علی گوہر خاں
    - حاکم خاں
      - سرفراز خاں
    - مقرب خاں
      - بہرام خاں
        - خوشحال خان
        - شہزاب خان
        - فیروز خان
        - فاروق خان
        - شادمحمد خان
      - مدت خاں
        - عمیر زیب خاں
        - جہانزیب خاں
  - لعل خاں
    - محمد خاں
      - محمد عرفان خاں
        - محمد معروف خاں
      - محمد یعقوب خاں
        - شہزاد خان
        - محمد طارق خان
        - عبدالقدوس خان
        - محمد انور خان
        - محمد نواز خان
        - اورنگزیب خان
        - داود خان
      - محمد حسین خاں
        - محمد بشیر خاں
        - محمد پرویز خاں
        - جہان زیب خاں
          - محمد عابد خاں
        - میر افضل خاں
          - احتشام افضل، اشفاق افضل، نیاز افضل
      - محمد طاؤس خاں
        - شاہجہان خان
        - سلطان خان
        - اورنگزیب خان
        - علام خان
        - ارباب خان

(مرتبہ۔ محمد عرفان خاں بگوری)

شجرہ نسب جلی خیل (ڈھوڈیاری) بالاکوٹ
سرور خان
قمر خان
لطیف اللہ خان
رحمت اللہ خان
سلطان محمد خان
جمعہ خان
لاولد
حبیب اللہ خان
لاولد
محمد قلیچ خان
شیر محمد خان
ملک امان خان
محمد فرید
محمد اقبال
محمد الیاس
غلام سرور خان
لاولد
غلام ربانی خان
نواب خان
محمد شفقت
شاہ عالم
محمد طیب
محمد طاہر
محمد ظریف خان
فیض طلب خان
اللہ داد خان
سعادت خان
محمد زمان خان
محمد سعید خان
محمد ارشد خان
محمد عجیب خان
شبیر احمد خان
محمد وسیم خان
محمد نصیر خان
محمد اکرم خان
خان زمان خان (لاولد)
غلام جیلانی (لاولد)
غلام حسین
فضل الٰہی
غلام جیلانی خان
محمد طارق خان
محمد سلیم خان
علی اکبر خان
محمد اکرم خان
علی افضل خان
محمد اسلم خان
(ان کی اولاد نہیں ہے)
محمد فاروق خان
محمد فرید خان
طاہر علی خان
ذوالفقار علی خان
احمد علی خان
ظفر علی خان
محمد وقار خان
محمد افتخار خان
محمد سجاد خان
محمد امتیاز خان
داؤد فاروق خان
مسعود فاروق

شجرۂ نسب ٹل خواجہ خیلی سرخیلی (بالاکوٹ)

خواجہ عبداللہ خان الموسوم بہ حاجی بہادر کوہاٹی

خواجہ محمد عمر خان ۔ اسماعیل خان ۔ سلیمان خان ۔ کمالا خان ۔ یعقوب خان

خواجہ محمد عمر خان
خواجہ عبدالکریم خان
خواجہ محمد اکبر خان

عبدالجبار خان ۔ خواجہ حمزہ خان ۔ خواجہ زرین خان
(اولاد علاقہ سوات میں ہے)

عبدالجبار خان
ملاں عبدالکریم خان
(ٹل ملاں خیل)

ملاں شمیم خان ۔ محمد صدیق ۔ ابو فا خان (لاولد) ۔ معذوب خان

ملاں شمیم خان:
عبدالستار خان ۔ حسام خان ۔ عبدالغفار خان

عبدالستار خان ← ان کی اولاد سنکیاری وغیرہ میں ہے
حسام خان ← ان کی اولاد حسام آباد و مضافات بالاکوٹ میں ہے
عبدالغفار خان ← ہندوستان کے مقام جے پور میں ہے

عبدالرزاق خان، فتح محمد خان، عبدالرحمن خان، ولایت خان

خواجہ حمزہ خان:
کمال خان (ٹل کمال خیل) ۔ صوبیا خان ۔ اسماعیل خان ۔ جوری بابا

ولایت خان ۔ عمر خان

عمر خان
فرید خان یا مزید خان

دوستم خان ۔ صوبہ خان

دوستم خان:
بہادر خان ۔ رستم خان (لاولد) ۔ راج ولی خان (لاولد)

علی خان ۔ قمر علی خان ۔ میرزمان خان
○ صفحہ ۲ پر
○○○ صفحہ ۲ پر

نادر خان (لاولد)

بوستان خان ۔ جہانگیر خان
× (صفحہ ۲ پر)
۳۲ صفحہ ۲ پر

سعید خان:
مدد خان ۔ آزاد خان ۔ بائیز خان ۔ احمد خان (لاولد)

مدد خان
گلاب خان
(نمبر ۲ صفحہ ۲)

بائیز خان
جان خان (لاولد)

محمد افضل خان (۰۰۰) صفحہ ۲ پر

بوستان خاں (مذکور)
آدم خاں
خوایدداد خاں
آزاد خاں
سائیں خاں
مظفر خاں
امداد خاں
حق نواز خاں (لاولد)
نواز خاں
نسیم خاں
خالد خاں
پرویز خاں
عطا محمد خاں
اکرم خاں (لاولد)
غلام ربانی خاں
مقدس رحمان
نذر خاں
جہانگیر خاں (مذکور)
شاہداد خاں
الہ داد خاں
دلاور خاں (لاولد)
محمد اکبر خاں المعروف کالا خاں
عبدالرحمٰن خاں
صداقت حسین
شوکت حسین
محمد ارشد علی
راشد علی عمران
مرشد علی
شفقت علی
علی خاں (مذکور)
سمندر خاں
محبت خاں
غلام حیدر خاں
محمد اکرم خاں
محمد فرید خاں
اورنگ زیب خاں
گوہر امان خاں
شراب خاں
ملک امان خاں المعروف بہ سائیں
فدا محمد خاں (ستر ہیں ہیں)
ہیبت خاں
امیر اللہ خاں
محمد زمان خاں
ظفر خاں (لاولد)
الہ داد خاں
سمندر خاں
محمد اشرف خاں
میر افضل خاں
زمرد حسین
فخر عالم
فدا محمد خاں
محمد اجمل خاں
محمد فرید خاں
عبدالروف خاں
عبدالسلام
شاہ عالم خاں

مرتبہ: مولوی عبدالقادر صاحب

ساکن پنیسیری تحصیل مانسہرہ

شجرۂ نسب تینوال (بالاکوٹ)

مرتبہ - عبدالقادر صاحب

پت سری

شجرۂ نسب ٹل اللہ یار خیل ز شاخ خیرو خیل محلہ الغمانی (بالاکوٹ)

شجرۂ نسب (ملاں خیل) لہاڑی لغمانی (بالاکوٹ)

④ جمال خاں
(لاولد)
رسول خاں
جہاں داد خاں
محمد عرفان
محمد ایوب خان
⑤ لعل خاں
احمد خاں
خوشحال خاں
عزت خاں
پیر خاں
سید خاں
لاولد
ارسلہ خاں
سکندر خاں
سمندر خاں
محمد ریاض
عبدالرحمٰن خاں
حسین خاں
شراب خاں
سید الرحمٰن
محمد اشرف خاں
محمد فرید خاں
صاحب علی خاں
افسر خاں
محمد شوکت خاں
عالم زیب خاں
جہاں زیب خاں
نام معلوم نہیں
گوہر امان
انور زیب
محمد آصف
محمد عارف
⑥ الہ داد خاں (لاولد)
شاہداد خاں
گل زمان خاں
محمد حسین خان
محمد زمان خاں
محمد اشرف خاں
حاکم خاں
ڈاکٹر یوسف خاں
ذوالفقار علی خاں
نیر سلطان
افتخار راشد
محمد ارشد

شجرۂ نسب لُغمانی لہاڑی بابوخیل (بالاکوٹ)

ملک لوکو خاں

- قادر خاں
  - میر احمد خاں
    - دری خاں
      - یٰسین خاں
        - احمد خاں
          - فیض طلب خاں
            - خان گل خاں (لاولد)
            - میر گل خاں
              - عبدالجبار خاں
                - بختیار خاں
                  - انور خاں
              - عبدالخالق خاں
                - علی افسر
                - حق نواز
                - شاہ نواز
      - شاہزادہ خاں
        - محمد خاں
          - خان ولی خاں (لاولد)
      - محمد شاہ خاں
        - عبید خاں
          - اثر علی خاں
            - خیر اللہ خاں
              - بوستان خان لاولد
              - باز خان
                - اورنگ زیب خاں
              - احمد خاں لاولد
      - محمد دین خاں
      - دائم خاں
  - باٹی خاں (یا باقی خاں)
  - احمد خاں
- ملک دریا خاں

شجرہ نسب ٹل پنجموہری محلہ نعمانی (بالاکوٹ)
پنجمیر خاں
دی خاں
موسیٰ خاں
(بالاکوٹ میں)
عیسیٰ خاں
عثمان خاں
(اولاد بفہ میں ہے)
رسول خاں
(لاولد)
داؤد خاں
(لاولد)
احمد خاں
(اولاد بالاکوٹ میں بنیں ہے)
غریب خاں
(لاولد)
شاہ خاں
عبدالرحیم خاں
محمد خاں
عالم خاں
(بفہ میں ہیں)
روڑ خاں
رحم خاں
صحبت خاں
قبول خاں
(لاولد)
اجمیر خاں
گمبت خاں
قمراں خاں
(لاولد)
نجیب اللہ خاں
سبز علی خاں
(لاولد)
ابدالی خاں
لاولد
کالا خاں
لاولد
احمد خاں
لاولد
غیب خاں
متولی خاں
صفدر علی خاں
لاولد
حبیب خاں (لاولد)
میرولی خاں (لاولد)
شاہ ولی (لاولد)
جلال خاں
ہدایت اللہ خاں
قبول خاں
زمان خاں
شیخ مست
الہ داد خاں (لاولد)
شاداد خاں
خواہداد خاں
(لاولد)
سمندر خاں
؟
خطاب خان
غلام رسول خاں
غلام حیدر خاں
سرور خاں
یونس خاں
سائیں خاں
محمد تماز خاں

نوٹ: گمبت خاں کے صرف ایک بیٹے منیب خاں کی اولاد دکھائی گئی ہے باقی سب لاولد ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایبٹ آباد کے محکمۂ مال میں جو شجرہ نسب درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گمبت خاں کے باقی بھائی بالاکوٹ سے چلاس (مضافات گلگت) چلے گئے تھے یہ سب لاولد نہیں تھے بالاکوٹ میں منیب خاں سے نسل چلی اس لئے یہیں سے شجرہ درج کیا گیا ہے۔

شجرۂ نسب خیر و خیل سرخیلی محلہ نُعمانی (بالاکوٹ)

شجرۂ نسب ٹل جانس خیل محلہ لُغمانی (بالاکوٹ)

٭ احمد خاں مذکور
میر محمد خاں
اسحاق خاں
مبین خاں
عبدالرؤف خاں یا عبدالرزاق خاں
نکی محمد
عبدالستار خاں
لاولد
انبار خاں
معظم خاں
معزت خاں
محمد شاہ
(لاولد)
(اولاد علاقہ غیر میں ہے)
(اولاد علاقہ غیر میں ہے)
بہرام خاں
(لاولد)
محمد خاں
عطائی خاں یا عظمت اللہ خاں
(لاولد)
حیات خاں
میرا خاں
عنایت اللہ خاں
سید گل خاں
فقیر خاں
نوزہ گل خاں
(لاولد)
محمد گل خاں
حیدر خاں
شیر زمان خان
گل خاں
فتح خاں
آزاد خاں
غلام نور خاں
(لاولد)
غلام حیدر خاں
غلام رسول خاں
ہمایوں
پیر خاں
(لاولد)
خائستہ خاں
محمد اکرم خاں
محمد اسلم خاں
٭ (۱) میر عبداللہ خاں مذکور
عزت اللہ خاں
غور خاں
لاولد
بوستان جاں
لاولد
جہان زیب خاں
انور بیگ
سخی سلطان

(۳) اکبر خاں (مذکور)

شجرۂ نسب ٹل باماں خیل لُغمانی (بالاکوٹ)

(۱) جہاں خاں مذکور
عالم خاں
کرم خاں
پائندہ خاں
رحمت اللہ خاں
امان خاں
برات خاں
حمزہ خاں
برہ خاں
حیات خاں
لاولد
مرزا خاں
لعل خاں
صوبہ خاں
خانزادہ خاں
فیض اللہ خاں
لاولد
نصر اللہ خاں
احمد خاں
لاولد
مدت خاں
بہادر خاں
محمد خاں
لاولد
اکرم خاں
رحم خاں
لاولد
علی خاں
عزیز خاں
نور خاں
لاولد
احمد علی خاں
ہاشم علی خاں
خانولی خاں
حمید اللہ خاں
رسول خاں
جمال خاں
فقیر خاں
عبدالجبار
لاولد مرگیا
غلام یحییٰ خاں
موسیٰ خاں
محمد حیات
شیر زمان
آزاد خاں
ملک ایان خاں
ہر دو لاولد
فوت ہوگئے
غلام ربانی خاں
واصل خاں
حاکم خاں
عبدالحکیم خاں
نذیر احمد خاں
بشیر احمد خاں
رشید احمد خاں
مبارک خاں
ظہور خاں
نواب خاں
پائندہ خاں
معزت خاں
سکندر خاں
کالا خاں
فدا محمد خاں
علی گوہر خاں
محمد رزاق خاں
انور زیب خاں
محمود خاں
حبیب خاں
لاولد
محمد حی خاں
سید احمد خاں
معزت خاں
سبقت اللہ خاں
کالا خاں
محب اللہ خاں
لاولد

شجرۂ نسب سلیمان خیل (بالاکوٹ)
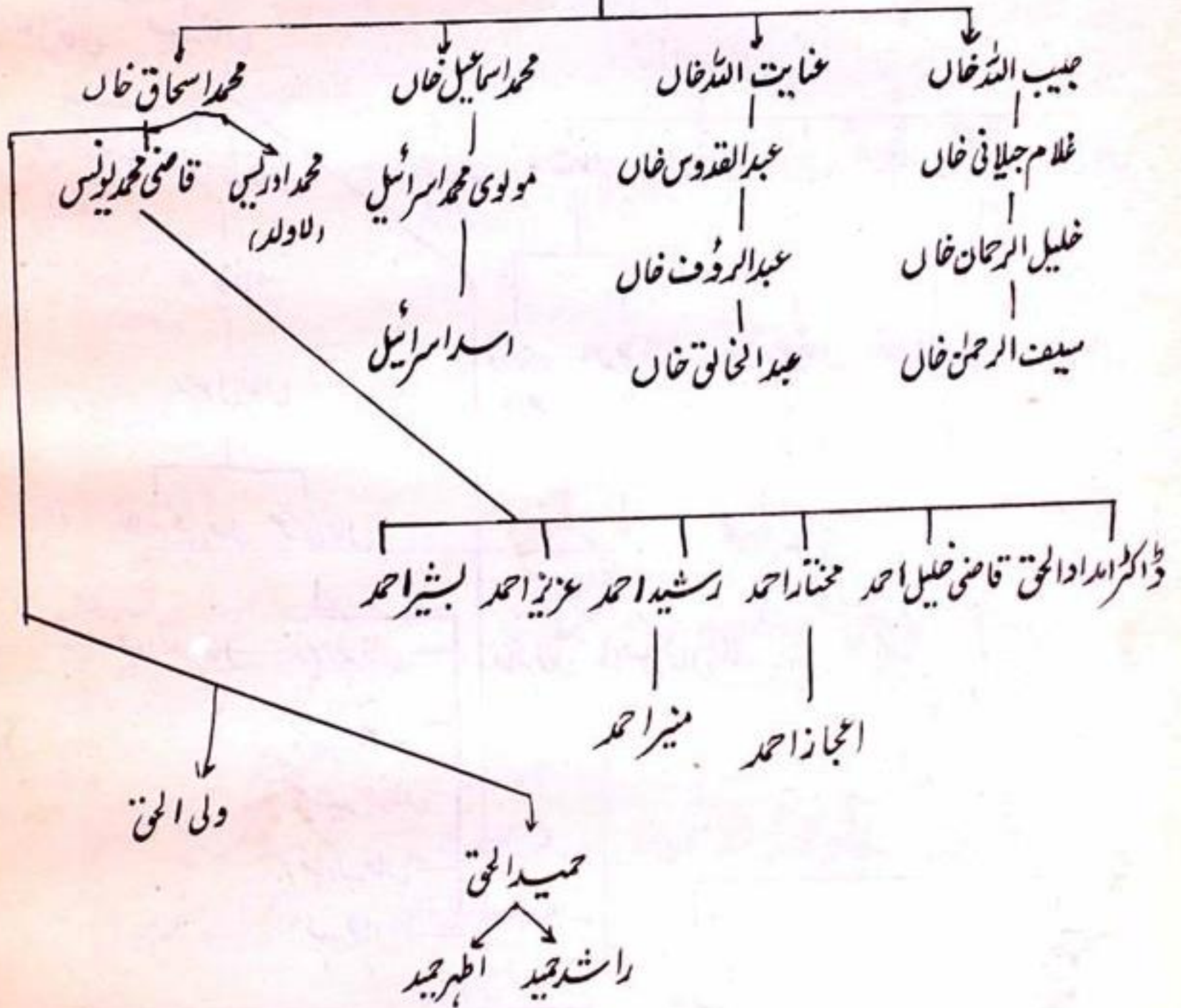
مشہدِ بالاکوٹ

یہ ارضِ بالاکوٹ شہیدوں کا مستقر
یہ سرزمیں بنی تھی جو میدانِ خیر و شر

اے راہرو! ادھر سے ہو جب بھی ترا گذر
رکھنا قدم یہاں پہ بہت دیکھ بھال کر

ہیں اس زمیں میں دفن وہ گوہر وفاؤں کے
جن کی چمک دمک پہ خجل انجم و قمر

ہر برگِ گل ہے خون کے چھینٹوں سے لالہ رنگ
اک داستاں ہے درج یہاں ہر چٹان پر

یہ گھاٹیاں، یہ کھیت، یہ کہسار سربلند
یہ پتھروں کے سینے سے اُڑتے ہوئے شرر

یہ سبزہ زار، سرد یہ جھونکے ہواؤں کے
بے شک یہاں کے سارے مناظر ہیں خوش نظر

لیکن اگر ہو چشمِ حقیقت تجھے نصیب
ہر منظرِ حسیں نظر آئے لہو میں تر

شاید تجھے خبر ہو کہ یہ ہے وہ سرزمیں
برپا ہوا تھا حشر کبھی جس کی خاک پر

اُترا تھا اس زمین پہ اک ایسا کارواں
جس کا ہر ایک فرد تھا آہن سے سخت تر

روشن ہر ایک دل میں تھی قندیلِ آگہی
سر کیا تھا اک وبال تھا ہر اک کے دوش پر

دیوانہ وار دوڑ پڑے سوئے رزم گاہ
آیا انہیں غنیم جو کہسار پر نظر

تعداد میں قلیل تھے اسباب میں حقیر
ٹکرا گئے حریف سے لیکن وہ بے خطر

انجام جو ہوا سو ہوا اس سے کیا غرض
چل کر دکھا گئے ہمیں خنجر کی دھار پر

اُن کے جنوں پہ لاکھ خردمندیاں نثار
عقبیٰ خرید لے گئے دنیا کو بیچ کر

(پیام شاہجہانپوری)

سید صاحبؒ کا نادر خط

ذیل میں حضرت سید احمد شہیدؒ کا وہ نادر خط درج کیا جاتا ہے جس کا ذکر ہم اپنے دیباچہ میں کر چکے ہیں، یہ خط پہلی بار کسی کتاب کی زینت بن رہا ہے اس کا اردو ترجمہ "سید صاحبؒ کی مہمانِ جہاد" کے زیرِ عنوان درج کیا جا چکا ہے۔ (مؤلف)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

از امیر المومنین بہ مطالعہ عالیجاہاں رفیع جائیگاہان عظمت دستگاہاں عمدة السلاطین العظام ذبدة الارکین انعام سلطان زبردست خاں و سلطان نجف خاں کھوڑی والا و سلطان احمد خاں سلمہم اللہ تعالیٰ بعد از سلام مسنون و دعائے اجابت مقرون واضح آنکہ الحمد للہ علیٰ ذالک الایام کہ او تعالے بہ مبد کرم خود ابواب فتح بروئے بندگان خود کشاد ساختہ و بہ انواع انعام خویش نواختہ یعنی در آں ایام کہ ایں جانب بنا بر بندوبست ملک سمہ و سرانجام مہم پشاور از مقام آنب معہ لشکر کوچ نمودے و مولانا محمد اسماعیل صاحب را معہ مردم قلیل بنا بر محافظت آں مقام گذاشتہ دراں وقت بر لشکر کافر و فرانسیس معہ منافق تنولی با تمامی قوت و جمعیت خود با توپخانہ و شاہین خانہ بر قلعہ ہائے آنب و چتر بائی زور آوردہ بودند اما از فضلِ الہٰی ہیچ مضرت و نقصان بہ مجاہدین ابرار آید نشدے و بسیار مردم از کفار مردار گردیدند آخر الامر بہ ذلت و خواری تمام از آں دیار باز رفتند و از کردہ خود بجز پشیمانی ہیچ حاصل نساختند و ایں جانب کہ معہ لشکرِ اسلام در بندوبست ملک سمہ بودے کہ تمام سرداران تورانیاں با ہمگی قوت و تمامی جمعیت و توپخانہ و شاہین خانہ بر ارادہ جنگ بہ تدبیر تمام بیرون آمدے چنانچہ فی ما بین میدان موضع تورو دہوتی مقابلہ مومنین با منافقین پیش آمدے تا یک نیم پاس رود معرکہ قتل قتال گرم بودہ انجام کار حمایت ایزد مختار شاملِ حال مجاہدین ابرار شدہ و قہرِ قہار بر منافق فجار مستولی گشتے کہ با وجود کثرت خود شکست فاش خوردے رو بہ فرار نہادند و منافقین بسیار و اسپانِ بے شمار مقتول گردیدند و بسیار مجروح اند اکثرے سردارانِ آنہا کشتہ شدند و ازیں طرف قریب بست کس از مجاہدین بہ درجہ شہادت فائز گردیدند و ہمیں طور مجروح ہستند و سردارانِ ایں طرف مثل مولانا صاحب و ارباب بیرام خاں وغیرہ بخیریت اند و اخلاص نشان سید اسماعیل را نزد خود داشتہ ام انشاء اللہ تعالیٰ آنچہ احوال از فضلِ الہٰی بروکار خواہد آمد بہ نگارش خواہد رفت و باقی احوال زبانی قاصد ایشاں خواہد شد والسلام مع الاکرام ہفتم ربیع الاول ۱۲۴۶ھ

مہر

احمد ۱۲۳۵
اسمہ

جنگِ بالاکوٹ

شیر سنگھ نے گڑھی حبیب اللہ پہنچ کر اپنے لشکر کی از سر نو تنظیم کی۔ مانسہرہ سے گڑھی حبیب اللہ تک سکھوں کی جتنی گڑھیاں تھیں ان سب میں سے توپیں، شاہینیں اور فوج کے دستے طلب کئے اور ایک بڑا لشکر لے کر بالاکوٹ کے قریب دریائے کنہار کے کنارے پہنچ گیا۔ اس وقت گڑھی کے خان، حبیب اللہ خاں سید صاحبؒ کی طرف سے بالاکوٹ کے ناظم تھے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۵ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو سید صاحبؒ کی خدمت میں عریضہ بھیجا کہ شیر سنگھ کا لشکر بالاکوٹ کے قریب جانب جنوب دریائے کنہار کے کنارے پہنچ گیا ہے لہٰذا آپ تشریف لے آئیں۔

سیّد صاحبؒ کا عزمِ بالاکوٹ

جس وقت خان حبیب اللہ خاں کا یہ عریضہ سید صاحبؒ کی خدمت میں پہنچا آپ نے فوراً بالاکوٹ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ وہ چند اشخاص جو آپ کی حرم محترم اور دیگر غازیوں کی ازواج کی حفاظت کے لئے متعین تھے وہیں مقیم رہے۔ اپنی روانگی سے قبل آپ نے میاں ضیاء الدین اور خضر خاں قندھاری کو کچھ افراد کے ساتھ بھوگڑمنگ کی حفاظت کے لئے وہاں قیام کرنے کی ہدایت فرمائی۔ خضر خاں نے یہ کہہ کر اس مقام پر ٹھہرنے سے معذرت کی کہ جب کفار کے ساتھ ہماری جنگ درپیش ہے تو میں ایسی حالت میں حضرت امیرالمومنین کی رفاقت ترک نہیں کر سکتا۔ لیکن سیّد صاحبؒ کی تاکید کے بعد طوعاً وکرہاً وہ بھوگڑمنگ میں ٹھہرنے پر رضامند ہو گئے۔ سید صاحبؒ اور آپ کا لشکر سچہ سے روانہ ہو کر دوپہر کو پہاڑ کی چوٹی پہ پہنچ گیا۔

شاہ اسماعیلؒ کی بالاکوٹ کو روانگی

چوٹی پر پہنچ کر سیّد صاحبؒ نے لشکر کو قیام کرنے کا حکم دیا۔ اس مقام پر کئی چشمے تھے۔ لوگ ان چشموں کے پانی

سے طہارت اور وضو کرنے میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ نمازِ ظہر کا وقت آپہنچا اور اہلِ لشکر نے سید صاحبؒ کے پیچھے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد لشکر کوچ کرنے کا حکم ملا۔ اس مقام کے بعد اُترائی شروع ہو گئی۔ کچھ آگے چل کر پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع میدان آگیا۔ یہاں پہنچکر سید صاحبؒ نے شاہ اسماعیلؒ صاحب سے فرمایا کہ آپ مع لشکر بالاکوٹ روانہ ہو جائیں اور وہاں پہنچکر اہلِ لشکر کے لیے کھانے پینے کا انتظام کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ نمازِ عصر کے بعد ہم بھی آجائیں گے۔ چنانچہ شاہ اسماعیل صاحبؒ سید صاحبؒ سے رخصت ہوکر بالاکوٹ پہنچے اور نمازِ عصر وہیں ادا کی۔ اتنے میں ایک شخص نے بالاکوٹ آکر شاہ صاحبؒ کو سید صاحبؒ کا یہ پیغام دیا کہ "میرا دل چاہتا ہے کہ آج کی شب یہیں گذاردوں۔ انشاء اللہ کل خیریت سے آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

عبد القیوم صاحب کا بیان ہے کہ اس مقام پر شدید سردی تھی اور لوگوں کے پاس گرم کپڑے بھی موجود نہ تھے اس لیے لوگ آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ اگر ہم نے یہاں قیام کیا تو سردی برداشت کرنا مشکل ہو جائے گا، ہم بھوکے بھی ہیں اور یہاں دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہیں۔ لوگوں کی یہ گفتگو کسی شخص نے سید صاحبؒ تک پہنچادی آپ نے ارشاد فرمایا کہ "ہمارے پروردگار نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ خود ہماری مہمانی فرمائے گا۔"[1]

مغرب کے وقت چشمے کے پانی سے وضو کر کے نمازِ مغرب ادا کی گئی۔ اس کے بعد سید صاحبؒ چشمے کے کنارے بیٹھ گئے۔ لوگوں نے آپ کے گرد حلقہ بنالیا۔ سید صاحبؒ اللہ تعالیٰ کی رزاقی اور صفاتِ ربوبیت پر وعظ فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ عشاء کا وقت آگیا۔ ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اس عالم میں سید صاحبؒ کی تاثیرِ بیان سے لوگوں پر رقت طاری ہو گئی۔ اس کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا فرمائی اور نمازِ عشاء باجماعت ادا فرمائی۔ موضع "ست بنی" اس مقام سے دائیں جانب اور بالاکوٹ مغرب و جنوب کے گوشے میں واقع ہے۔ اس کے بائیں طرف جنگلی درختوں کا وسیع سلسلہ تھا۔ سید صاحبؒ قضائے حاجت کے لیے جنگل کی طرف تشریف لے گئے اور واپسی میں بہت دیر فرمادی۔ خیال ہے کہ قضائے حاجت اور طہارت سے فارغ ہوکر اسی جنگل میں آپ کسی مقام پر تنہائی پاکر یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے تھے۔ چونکہ یہ جنگل شیروں اور بعض دوسرے درندوں کا مسکن تھا اس لیے سید صاحبؒ کی واپسی میں تاخیر سے آپ کے ہمراہیوں کو تشویش پیدا ہوئی کہ انہیں کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ اتنے میں سید صاحبؒ تشریف لے آئے۔ آپ کو دیکھ کر لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بعض افراد نے سید صاحبؒ سے دریافت کیا کہ آپ نے واپسی میں اتنی تاخیر کیوں فرمادی۔ اس کے جواب میں آپ نے صرف اتنا فرمایا کہ "ہاں دیر تو بہت ہو گئی۔" اس کے بعد آپ نے سونے کا ارادہ فرمایا۔ ایک شخص نے چادر بچھادی اور آپ اس پر لیٹ گئے۔ بعض لوگ آپ کے ہاتھ پیر دبانے میں مشغول ہو گئے۔ آپ فرماتے جاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ

---

[1] منظورۃ السعداء ص ۱۱۶۶

نے ہمارا رزق جا بجا منتشر کر دیا ہے اور ہم اسی جگہ جا کر پرندوں کی مانند اپنی قسمت کا رزق کھائیں گے جہاں تقدیر نے ہمارا رزق لکھا ہوگا۔

خدا تعالیٰ کی میزبانی

اس پہاڑ پر پہنچنے کے بعد جب بعض لوگوں نے سردی کی شدت اور بھوک کا اظہار کرتے ہوئے اس مقام پر ٹھہرنے میں تردد ظاہر کیا تھا تو سید صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ "ہمارے پروردگار نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ خود ہماری مہمانی فرمائے گا۔" چنانچہ آپ کے اس ارشاد پر چند ساعتیں ہی گزری تھیں کہ خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اچانک دو تین مشعلیں نمودار ہوئیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ہمارے ساتھیوں میں سے جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں شاید وہ آرہے ہیں، بعض کا خیال تھا کہ دشمن کے آدمی ہیں۔ جب یہ لوگ بالکل قریب آگئے تو پہرے داروں نے ان لوگوں کو للکارا۔ ادھر سے جواب ملا کہ ہم سید بادشاہ کی ملاقات کے لئے آرہے ہیں۔ ہمیں رات گئے معلوم ہوا کہ سید بادشاہ تشریف لائے ہیں...... اور یہیں شب بسر کریں گے۔ ان لوگوں کی آمد کی خبر سن کر سید صاحبؒ اٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ "یہ دعوت ہے جو ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہے۔" ان لوگوں کا لباس اون کا تھا...... شلوار قمیص اور پگڑی ان کے زیب تن تھی۔ اُن میں سے بعض دراز قد بعض سپید ریش اور بعض کے چہرے گندم گوں تھے۔ ان میں سے سب سے آگے والے کے ہاتھ میں عصا تھا اور کچھ لوگ سروں پر چارپائیاں اور بستر اٹھائے ہوئے تھے، کچھ لوگوں نے کمبلوں کے گٹھے اٹھا رکھے تھے۔ ان کے پیچھے ایک شخص کے سر پر روٹیوں سے بھری ہوئی ٹوکری تھی اور دو آدمی دودھ سے بھرے ہوئے برتن لئے آرہے تھے۔ ان لوگوں نے یہ سامان سید صاحبؒ کے قریب رکھ دیا۔ آپ سے مصافحہ کیا اور عرض کیا کہ ہم کو آپ کی تشریف آوری کی خبر دیر سے پہنچی اس لئے اس تھوڑے سے وقت میں اسی قدر کھانا آپ کی خدمت میں پیش کر سکے ہیں۔ تھوڑی دیر گفتگو کر کے سید صاحبؒ نے انہیں رخصت کر دیا۔[1]

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ چارپائیاں بچھا دو اور کھانا تقسیم کرو۔ جس کے پاس کمبل نہ ہو وہ ان میں سے کمبل لے لے۔ لوگوں نے خوب سیر ہو کر دودھ کے ساتھ روٹی کھائی اور پہرہ دار پہرہ پر متعین ہو گئے۔ صبح ہونے پر اہلِ لشکر نے سید صاحبؒ کے پیچھے نماز فجر ادا کی اور بالاکوٹ کی طرف روانگی کا قصد کیا۔ اس موقع پر ہمراہیوں میں سے ایک شخص نے عرض کیا کہ یہ چارپائیاں اور کمبل کس کے سپرد کئے جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ سامان یہیں چھوڑ دو اُن کے مالک خود آکر لے جائیں گے۔ پس لشکر آپ کے ساتھ روانہ ہو گیا البتہ ایک شخص وہیں ٹھہر گیا بعد میں اس سے معلوم ہوا کہ سید صاحبؒ کی روانگی کے بعد ایک نوجوان ان درختوں میں سے نمودار

---

[1] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۱۶۸

ہوا اور پوچھا کہ چارپائیاں اور کمبل کہاں ہیں۔ اس شخص نے اشارہ کرکے ان اشیاء کی نشاندہی کی۔ اسکے بعد وہ شخص بھی روانہ ہوکر سید صاحبؒ سے آملا۔ اس وقت آپ "ستت بنی" کے نالے پر تھے۔

سیّد صاحبؒ کی بالاکوٹ میں تشریف آوری

جس وقت سیّد صاحبؒ "ستت بنی" کے نالے پر پہنچے تو شاہ اسماعیلؒ ایک جماعت کے ساتھ استقبال کے لئے موجود تھے، انہی کی معیت میں آپ بالاکوٹ میں داخل ہوئے۔ یہاں کے خوانین نے آپ کی آمد سے پہلے ہی متعدد مکان مجاہدین کے قیام کے لئے خالی کرا دیئے تھے، بالاکوٹ کے ایک خان واصل خاں نے اپنی حویلی سید صاحبؒ کے لئے مخصوص کر دی۔ اسی حویلی میں آپ نے قیام فرمایا۔ اس حویلی کے ساتھ ایک مسجد تھی جس میں سید صاحبؒ نماز پڑھاتے، درس دیتے اور بیشتر وقت اسی میں گزارتے۔ حویلی واصل خاں کے جانب شمال متعدد مکانات تھے جن میں مجاہدین کو ٹھہرایا گیا۔ انہی میں سے ایک مکان میں لنگرخانہ قائم کیا گیا۔ حویلی واصل خاں اور مسجد بالاکوٹ کے غرب رویہ ایک مکان میں شاہ اسماعیلؒ اور مولانا احمداللہ ناگپوری نے مع اپنی جماعت کے قیام کیا۔ کچھ مجاہدین نے مسجد زیریں میں قیام کیا۔ واصل خاں کے پاس غلے کا جو ذخیرہ موجود تھا وہ انہوں نے مجاہدین کے لئے وقف کر دیا اور اپنے قبیلے کے لوگوں کو بھی مجاہدین کی امداد کے لئے تحریک کی۔ یہاں کے بعض خاندانوں نے گائیں بھینسیں اور بیل مجاہدین کے لئے بطور عطیہ دیئے۔ بعض نے چارپائیاں فراہم کیں۔ اس طرح اہل بالاکوٹ نے سید صاحبؒ کی میزبانی اور خدمت میں بڑے خلوص کا مظاہرہ کیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بالاکوٹ کے عوام اور خوانین نے سیّد صاحبؒ کے دستِ مبارک پر ان کی بیعت بھی کی لیکن ان میں سے صرف تین افراد کے ناموں کی تصدیق ہوسکی اور یہ تینوں بالاکوٹ کے خاں تھے۔ ان کے نام یہ ہیں (۱)، واصل خاص (۲) اخوندزادہ عباس خاں (۳) قمر خاں۔ ان میں سے عباس خاں عالم آدمی تھے۔

اسی دوران میں کاغان کے سردار سید ضامن شاہ سید صاحبؒ سے ملاقات کے لئے بالاکوٹ آئے ان کی زیارت کی اور دیر تک تبادلۂ خیال کرتے رہے، انہوں نے بھی مجاہدین کے لئے عطیات دیئے جن میں پچاس کے قریب بھیڑ بکریاں اور بیل اور سو من مکئی شامل تھی بعض روایتوں میں پچاس من اور بعض میں تیس من بیان کی گئی ہے۔

بالاکوٹ کے دفاعی انتظامات

جیسا کہ قبل ازیں تحریر کیا جا چکا ہے کہ شیر سنگھ کا لشکر سیّد صاحبؒ کے بالاکوٹ تشریف لانے سے قبل ہی

گڑھی حبیب اللہ سے آگے بڑھ کر دریائے کنہار کے جانب مشرق خیمہ زن ہو چکا تھا۔ یہ مقام بالاکوٹ سے کم و بیش دو کوس[1] کے فاصلے پر تھا اس لئے ضروری ہو گیا تھا کہ بالاکوٹ کے دفاع کا مستحکم انتظام کیا جائے اس وقت بالاکوٹ تک پہنچنے کے دو ہی راستے تھے۔ ایک راستہ پچھلی کی طرف سے گذرتا ہوا مٹی کوٹ کے پہاڑ پر آ نکلتا تھا۔ دوسرا دریائے کنہار کے ساتھ ساتھ مشرق کی جانب سے ہوتا ہوا بالاکوٹ کے عین سامنے پہنچتا تھا۔ پہلا راستہ نہایت دشوار تھا اور اس پر سے توپ خانے کا گزرنا ناممکن تھا۔ دوسرے راستے میں یہ دشواری نہ تھی۔ سید صاحبؒ نے احتیاطاً دونوں راستوں کی حفاظت کا انتظام کیا۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلے دریائے کنہار کا پل تڑوا دیا جسے عبور کر کے سکھ لشکر بالاکوٹ پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ اس کی بجائے بالاکوٹ کے قریب لکڑی اور مٹی کا ایک نیا پل باندھا گیا[2]۔ سکھ لشکر نے بھی بالاکوٹ کے قریب میدان کی طرف آمد و رفت کے لئے پل تعمیر کر لیا تھا۔ سید صاحبؒ نے پل کی حفاظت کے لئے مُلا لال محمد قندھاری کو مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ متعین فرمایا۔ بالاکوٹ کے جنوب کی طرف بھی ایک مورچہ قائم کیا گیا۔ اس مقام کی حفاظت پر بالاکوٹ کے پٹھانوں کا ایک دستہ متعین کیا گیا۔ یہ جگہ دونوں پلوں کے درمیان واقع تھی۔ سکھوں نے جو پل تعمیر کیا تھا اس پر سے وہ اپنے اونٹ، اور خچر گزار کر دریا کی دوسری جانب چرانے کے لئے لے جاتے تھے۔ ملا لال محمد قندھاری کی جماعت جو دونوں پلوں کے درمیان متعین تھی اکثر حملہ کر سکھوں کے مویشی پکڑ لاتی بلکہ کبھی کبھی مجاہدین سکھوں کا تعاقب کرتے ہوئے اس پل تک جا پہنچتے جہاں سکھوں کا لشکر مقیم تھا اور پل کو نقصان پہنچا کر واپس آ جاتے۔ بعض دفعہ سکھ لشکر پر اس کثرت سے گولیاں برسائی جاتیں کہ وہ مبہوت رہ جاتے[3]۔ بالاکوٹ کے جانب مغرب ایک بلند و بالا پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر مٹی کوٹ نامی ایک گاؤں آباد ہے۔ سکھوں کی لشکر گاہ سے پہاڑوں پر سے ہوتا ہوا ایک راستہ اس مقام تک آتا تھا۔ یہ راستہ ہندوستان کے پرانے بادشاہوں مثلاً جلال الدین اکبر وغیرہ کا تعمیر کردہ تھا۔ تاریخی روایتوں کے مطابق اس مقام سے گذرتے ہوئے مغلوں کے ایک لشکر کو مقامی لوگوں نے فریب دے کر تباہ کر دیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب سے ڈیڑھ سو سال قبل تک ان پہاڑوں کی گھاٹیوں میں گھوڑوں کی رکابیں اور بعض زنگ آلود آہنی اشیاء پائی جاتی تھیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ راستہ کتنا دشوار اور خطرناک تھا۔ منظورۃ السعداء کے مصنف مولانا سید جعفر علی نقوی نے بچشم خود یہ راستہ دیکھا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ یہ پہاڑ اتنا دشوار گذار تھا کہ اس پر سے سوار کا گزرنا ناممکن تھا اور دو پیادے بڑی دقت سے آگے پیچھے ہو کر گزر سکتے تھے یعنی دو شخصوں کا کندھے سے کندھا ملا کر اس راستے سے گذرنا ممکن نہ تھا۔ زمانہ دراز گزرنے کے بعد اس مقام پر بڑے بڑے درخت اُگ آئے اور بہت بڑا جنگل ہو گیا۔ وقتاً فوقتاً پہاڑوں کے اوپر سے بھاری بھاری پتھر گرتے رہے اس طرح یہ راستہ

---

[1] سوانح احمدی صفحہ ۱۳۴ [2] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۱۶۹ [3] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۱۷۱

بالکل بند ہو گیا۔ البتہ مقامی لوگ اس راستے سے واقف تھے۔ گڑھی کے خان حبیب اللہ خاں نے سید صاحبؒ کو مشورہ دیا کہ اس مقام کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ آپ نے ساٹھ ستر مجاہدین کی ایک جماعت مرزا احمد بیگ پنجابی کی قیادت میں اس مقام کی حفاظت کے لئے متعین فرمادی۔ اس کے بعد بالاکوٹ کے پٹھانوں کا ایک دستہ بھی بھیج دیا گیا تاکہ اس راستے کی حفاظت کا انتظام اور مستحکم ہو جائے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ملّا لعل محمد قندھاری کو اس مقام کی حفاظت کے لئے متعین کیا گیا تھا مگر جب انہوں نے سید صاحبؒ سے درخواست کی کہ انہیں پلوں کے درمیانی حصے کی حفاظت پر متعین کر دیا جائے تاکہ وہ سکھوں پر حملے کر کے انہیں لوٹتے رہیں تو یہ تبدیلی عمل میں آئی اور ملّا لعل محمد قندھاری کو پلوں کے درمیانی حصے کی حفاظت پر متعین کر دیا گیا اور مرزا احمد بیگ پنجابی کو ان کی جماعت کے ہمراہ مٹی کوٹ کی چوٹی کے قریب اس تنگ راستے کی حفاظت پر مقرر کر دیا گیا جو کسی زمانے میں مٹی کوٹ سے بالاکوٹ کو آتا تھا۔

سکھوں کے جنگی انتظامات

سید صاحبؒ اور معرکۂ بالاکوٹ پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب میں سید صاحبؒ اور مجاہدین کی نقل وحرکت نیز ان کے دفاعی انتظامات کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے لیکن ہماری نظر سے اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جس میں سکھوں کے اس لشکر کی نقل وحرکت اور جنگی تدابیر وغیرہ کا بھی مفصل ذکر ہو جس نے بالاکوٹ پر حملہ کیا تھا۔ یہ تفصیلات منشی مہتاب سنگھ نے اپنی (غیر مطبوعہ) کتاب میں درج کی ہیں جو تیس سال تک سکھوں سے وابستہ رہا۔ اس کی تصریحات کے مطابق جب سید صاحبؒ راج دواری سے روانہ ہو کر اور کچھ دن درہ بھوگڑ منگ میں گزار کر بالاکوٹ آئے تو یہ افواہ عام تھی کہ آپ کشمیر فتح کرنے کیلئے جا رہے ہیں۔ جب یہ حالات کنور شیر سنگھ کو معلوم ہوئے تو وہ سید صاحبؒ کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لئے روانہ ہوا۔ اس وقت اس کے لشکر میں آٹھ ہزار افراد تھے۔ اس کے ساتھ متعدد جنگ جو سکھ سردار بھی تھے جن میں سردار عطر سنگھ کالیانوالا، سردار شام سنگھ اٹاری والا، سادھو سنگھ نہنگ، رتن سنگھ گونکلو، وزیر سنگھ زنگر یکلہ، گورکھ سنگھ اور لکھی سنگھ شامل تھے۔ ان میں سے لکھی سنگھ علاقہ یوسف زئی میں مالیہ وصول کرنے اور سردارانِ پشاور سے گھوڑے حاصل کرنے گیا ہوا تھا۔ اسے وہاں سے طلب کر کے اس مہم پر مامور کیا گیا۔ اس زمانے میں خلیفہ صاحبؒ[1] درہ بھوگڑ منگ میں مقیم تھے جو شنکیاری سے آٹھ یا دس کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ جب کنور شیر سنگھ اپنا لشکر لے کر شنکیاری کے مقام پر پہنچا تو اس کے سرداروں نے اس

---

[1] سکھ لوگ سید صاحبؒ کو خلیفہ صاحب، افغان لوگ سید بادشاہ اور مجاہدین آپ کو امیر المومنین کے لقب سے یاد کرتے تھے (مولف)

سے کہا کہ جب تک خلیفہ صاحب سکھوں کی حدودِ سلطنت میں خلل انداز نہ ہوں اس وقت تک ہمیں ان سے جنگ نہیں کرنی چاہیئے۔ آج کل وہ جس علاقے پر قابض ہیں یہ ہری سنگھ کی ذاتی جاگیر میں شامل ہے اس لئے اس کا تدارک اُسی کو کرنا چاہیئے۔ چنانچہ شیر سنگھ نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور یہ رائے ٹھہری کہ لشکر مظفر آباد کی طرف روانہ ہو۔ ہر چند کہ سردار مہاں سنگھ کہتا رہا کہ خلیفہ صاحب اپنی جمعیت کے ساتھ درہ بھوگڑمنگ میں مقیم ہیں ان سے مقابلہ کرنے کے بجائے مظفر آباد جانے میں کون سی مصلحت ہے لیکن شیر سنگھ اور اس کے سرداروں نے مہاں سنگھ کی رائے پر عمل نہ کیا اور مظفر آباد کی طرف کوچ کر دیا۔[1]

مظفر آباد کا انتظام

مظفر آباد پہنچ کر سلطان نجف خاں کنور شیر سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیر سنگھ نے سلطان موصوف کی نہایت تواضع اور تکریم کی۔ اس موقع پر دونوں کے درمیان ایک عہدنامہ ہوا۔ یہ عہدنامہ زعفران کے قلم سے لکھا گیا۔ اس عہدنامے کے مطابق ملک مظفر آباد کی سلطانی شیر سنگھ کی طرف سے سلطان نجف خاں کو تفویض کر دی گئی اور عہدنامے میں لکھ دیا گیا کہ سلطان بلا شرکتِ غیرے مظفر آباد کا حاکم ہوگا۔ چند روز کے بعد شیر سنگھ اپنا لشکر لے کر مظفر آباد سے روانہ ہو گیا۔ اس اثناء میں خلیفہ صاحب (سید صاحبؒ) درہ بھوگڑمنگ سے بالاکوٹ پہنچ چکے تھے اور علاقے کے سرداروں اور عوام دونوں نے ان کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ پکھلی سے لے کر بالاکوٹ تک تمام علاقوں کے سردار مالیے کی رقم سکھوں کو ادا کرنے کے بجائے خلیفہ صاحب کو ادا کر رہے تھے۔ چنانچہ سردار مہاں سنگھ نے کنور شیر سنگھ سے عرض کیا کہ ان علاقوں کا مالیہ خلیفہ صاحب وصول کر رہے ہیں اور رعایا بھی ان کی تابع فرمان ہے۔ اس صورت میں قلعوں میں متعین سپاہیوں کی تنخواہ کیسے ادا کی جا سکے گی۔ اس پر کنور شیر سنگھ نے حکم دیا کہ سردار مہاں سنگھ اپنا لشکر لیکر وزیر سنگھ ڈنگر بکلہ، سادھو سنگھ نہنگ اور رتن سنگھ کو نکلو کے ہمراہ گڑھی حبیب اللہ جائیں اور وہاں قیام کریں۔ مہاں سنگھ کو اختیار ہوگا کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں انتظام کریں، باقی سرداروں کو ان کی امداد کرنی ہوگی۔ چنانچہ شیر سنگھ کی ہدایت پر یہ سکھ سردار گڑھی حبیب اللہ روانہ ہو گئے۔ اس وقت مہاں سنگھ کا لیا کے ساتھ دو سو سپاہی تھے، اتنے ہی وزیر سنگھ ڈنگر بکلہ اور اتنے ہی رتن سنگھ کو نکلو کے ہمراہ تھے البتہ سادھو سنگھ نہنگ کے ساتھ صرف سو سپاہی تھے۔

---

[1] تاریخ منشی مہتاب سنگھ ص ۹۲

سکھوں پر مجاہدین کی دہشت

گڑھی حبیب اللہ پہنچ کر سکھ لشکر دریائے کنہار کے کنارے مقیم ہوا اور سردار مہان سنگھ نے گڑھی کی تعمیر شروع کر دی جسے فتح گڑھی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ دو تین روز میں قلعے کی دیواریں کہیں ایک ہاتھ اور کہیں نصف ہاتھ تک تیار ہوئی تھیں کہ ایک دن شام ہونے میں چار گھڑیاں باقی تھیں کہ کسی مخبر نے اطلاع دی کہ خلیفہ صاحب بالاکوٹ سے نکل کر دریائے کنہار کے کنارے آگئے ہیں اور آج رات کو سکھوں کی لشکر گاہ پر شب خون ماریں گے۔ یہ خبر سن کر سکھ لشکر بید کی طرح لرزنے لگا اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ منشی منہاب سنگھ کے الفاظ یہ ہیں :۔

"چوں بید از بادلرز بدند و نمی داشتند کہ چوں کنند[1]"

آخر کار انہوں نے بڑی ہمت کر کے لشکر گاہ کے چاروں طرف خندق کھود لی اور پتھر اور لکڑیاں فراہم کر کے خاربندی کر لی (تاکہ لشکر گاہ دشمن کے حملے سے محفوظ ہو جائے) چار گھڑی رات گزرنے کے بعد جو سوار تھے وہ گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور جو پیادے تھے وہ مسلح ہو کر کبھی مشرق کی طرف بھاگتے تھے کبھی مغرب کی طرف اور ڈھول اور نقارے بجا رہے تھے۔ طلوعِ آفتاب تک ان کی لشکر گاہ میں زلزلہ برپا رہا کوئی کہتا کہ (مجاہدین) اس طرف سے آگئے کوئی کہتا کہ اُس طرف سے آرہے ہیں، اس دوران میں گھبراہٹ اور خوف کی وجہ سے کوئی شخص نہ سو سکا اور یہ سارا وقت خوف و دہشت میں گزرا، چنانچہ منشی منہاب سنگھ لکھتے ہیں :۔

"بعد گذشتن چار گھڑی شب ہر کس کہ سوار بر اسپ سوار شدہ و ہر کس کہ پیادہ بود مسلح گردیدہ گاہے بہ طرفِ مشرق و گاہے بہ طرفِ شمال میرفتند و ڈھول و نقارہ مے نواختند تا طلوع شدن آفتاب ہمیں زلزلہ و شور در ڈیرہ ماند کہ کسے میگفت کہ ایں آمدند و کسے میگفت کہ ازیں براہ آمدند۔ وقتیکہ چار پہر شب گذشت و کسے یک ساعت آرام نیافت اما خوف گذشت[2]"

مجاہدین کے ہاتھوں سکھوں کا قتل

نصف شب گزرنے کے بعد سکھ سرداروں نے باہم مشورہ کر کے کنور شیر سنگھ کو اطلاع دینے کے لئے ایک عرضی لکھی کہ مخبر کی اطلاع کے مطابق خلیفہ صاحب دریائے کنہار عبور کر کے گڑھی کی طرف آرہے

---

[1] تاریخ منشی منہاب سنگھ صہ ۹۳

[2] تاریخ منشی منہاب سنگھ صہ ۹۴

ہیں اور ہم پر شب خوں مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس وقت قلعے میں آٹھ سو فوج ہے۔ اگر خلیفہ صاحب نے حملہ کر دیا تو ہم میں سے ایک بھی زندہ نہ بچے گا۔ اس لیے جتنی جلدی ہو سکے آپ ہماری مدد کے لئے آجائیں [1]

سکھ سرداروں کی یہ عرضی پہنچتے ہی کنور شیر سنگھ نے اپنی فوج کو اسی وقت تیار ہونے کا حکم دیا۔ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے گھوڑوں کی تیاری اور زینیں کسنے میں کچھ دیر لگی۔ دو تین گھڑی رات باقی تھی کہ شیر سنگھ گوجرہ [2] سے لشکر لے کر روانہ ہو گیا اور طلوع آفتاب کے وقت گڑھی حبیب اللہ پہنچ گیا۔ اس لشکر کے پہنچنے سے گڑھی حبیب اللہ کی سکھ فوج کے حوصلے بلند ہو گئے اور انہوں نے گڑھی کی تعمیر کا کام پھر شروع کر دیا۔ سولہ دن میں قلعہ تیار ہو گیا۔ اس کے بعد شیر سنگھ اپنا لشکر بکر کوٹ بھلہ کے مقام پر آ گیا۔ یہ جگہ بالاکوٹ سے تین کوس کے فاصلے پر دریائے کنہار کے دوسری جانب واقع ہے۔ اس وقت خلیفہ سید احمد شاہ بالاکوٹ میں موجود تھے۔ کنور شیر سنگھ ایک دو بار گھوڑے پر سوار ہو کر بالاکوٹ کی طرف گیا اور کنہار کے کنارے کھڑے ہو کر دوربین کے ذریعے بالاکوٹ کا مشاہدہ کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس طرف سے خلیفہ صاحب کی لشکر گاہ پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ ہر روز مختلف تجویزوں پر غور و خوض ہوتا رہا۔ اسی دوران میں ایک روز خلیفہ صاحب نے غنیم کو فریب دینے کے لئے پانچ سو مقامی افراد کو بندوقیں دے کر سروٹ کے جنگل میں چھپا دیا۔ یہ جنگل سکھوں کی لشکر گاہ سے نصف میل کے فاصلے پر تھا اور کچھ چاول پکا کر اپنی لشکر گاہ (بالاکوٹ) کے سامنے بکھیر دیئے۔ بہت سے پرندے چاول چگنے کے لئے آ گئے۔ دو تین گھڑی دن باقی رہتا تھا کہ کنور شیر سنگھ نے دوربین سے بالاکوٹ کا مشاہدہ کیا اور (مجاہدین کی لشکر گاہ کے قریب کثیر تعداد میں پرندوں کو دانہ چگتے دیکھ کر) آواز دی کہ خلیفہ بالاکوٹ سے فرار ہو گیا ہے۔ اس کے بعد اس نے پانچ سوار اور پانچ پیادے اس خبر کی تصدیق کے لئے روانہ کئے۔ جس وقت یہ لوگ سرکوٹ کے جنگل میں پہنچے تو خلیفہ صاحب کے مجاہدین نے جو پہلے سے روپوش تھے یک بارگی ان پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں پانچوں سوار اور تین پیادے ہلاک ہو گئے۔ البتہ دو پیادے جو تیراک تھے اپنی جان بچا کر نکل بھاگے اور دریائے کنہار کے ذریعے تیر کر اپنی لشکر گاہ میں پہنچے۔ انہوں نے شیر سنگھ کو یہ اطلاع دی کہ ان کے ساتھی پانچ سوار اور تین پیادے قتل ہو گئے ہیں اور وہ بہ مشکل تمام دریا میں تیر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک دام فریب تھا جو خلیفہ نے (ہمیں قتل کرنے کے لئے) بچھایا تھا [3]

---

[1] تاریخ منشی مہتاب سنگھ صہ۹۴ [2] گوجرہ ایک موضع ہے جو دریائے کشن گنگ کے کنارے مظفرآباد کے قریب واقع ہے۔ کشن گنگ مظفرآباد کے نیچے سے بہتا ہے۔ [3] تاریخ منشی مہتاب سنگھ صہ۹۵

سکھ فوج کی مٹی کوٹ کو روانگی

اس واقعے کے بعد سکھ فوج کے افسر یکجا ہوئے اور صلاح مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ یہیں بھی دریا عبور کر کے خلیفہ صاحب کی فوج سے جنگ کرنا چاہیئے لیکن دشواری یہ تھی کہ بالاکوٹ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ سیّد صاحبؒ اور ان کے جرنیلوں نے بالاکوٹ کے دفاع کا اس خوبی اور مہارت فن سے انتظام کیا تھا کہ دشمن کسی طرف سے حملہ آور ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اور کئی روز کی جدوجہد کے بعد تھک ہار کر واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ مقامی گوجروں میں سے ایک گوجر نے سکھ لشکر کی رہنمائی کی اور اسے مٹی کوٹ تک پہنچا دیا۔ یہ اتنی مشہور روایت ہے اور اتنے ثقہ مؤرخوں نے اپنی کتابوں میں درج کی ہے کہ آج تقریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد اس کی تردید کرنا حقائق کا صریح انکار ہے۔ اگر یہ روایت صرف سید صاحبؒ کے عقیدت مند ہی بیان کرتے تو کہا جا سکتا تھا کہ انہوں نے اپنی شکست پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ روایت وضع کر لی۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ سکھوں کے ایک معتبر مورخ منشی مہتاب سنگھ نے بھی اپنی کتاب میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ ایک مقامی گوجر نے سکھ فوج کو مٹی کوٹ کی چوٹی تک پہنچایا تو ہمیں اس روایت کے درست ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ منشی مہتاب سنگھ لکھتے ہیں کہ آخر کار فیصلہ ہوا کہ فوج کا مرکز یہیں رہے اور اس کی حفاظت کے لئے کشمیر کی وہ ایک ہزار بندوق بردار فوج جو جمعدار ٹیک سنگھ کی قیادت میں قلعہ "کرنا" سے آئی ہے متعین کر دی جائے اور باقی تمام فوج دریا عبور کر کے خلیفہ صاحب کی فوج سے نبرد آزما ہو:۔

"چنانچہ ہمی طور کردند یک کس گوجر	چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ایک گوجر نے راستہ دکھایا
کہ از رہبر شد فوج را از راہِ بسیاں	اور سکھ فوج بسیاں دلولہ سے ہوتی ہوئی
دلولہ بر سر کوہ ڈنا مٹی کوٹ برود	مٹی کوٹ کے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئی
و آں کہ فوجِ ہزارہ کہ در شنکیاری	اور فوج ہزارہ بھی جو شنکیاری میں موجود تھی
بود آں ہم از راہ تمری بالا ہماں	تمری بالا سے گزر کر اس پہاڑ پر آ گئی۔
کوہ آمد[1]"	

جنگِ نکہ پانی

جس وقت سکھ فوج اپنی لشکر گاہ سے روانہ ہو کر مٹی کوٹ کی طرف جا رہی تھی تو راستے میں نکہ پانی کے

---

[1] تاریخ منشی مہتاب سنگھ (قلمی) صہ ۹۶
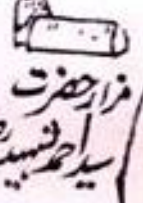
کاغان
موضع تیلنگ
نوری میدان
مزار شاہ اسماعیل شہیدؒ
برنہ کی پہاڑی
برنہ نالہ
ست بنی کی پہاڑی
ست بنی کا نالہ
مسجد زیریں
میدانِ جنگ
مسجد بالا
قصبہ بالاکوٹ
دریائے کنہار
کاغان روڈ
پل جدید
بریلی بازار
پل قدیم
ہائی اسکول
گرلاٹ
مزار حضرت سید احمد شہیدؒ
جامع مسجد بالاکوٹ
بلوڑی
گڑھی حبیب اللہ
نقشہ جنگِ بالاکوٹ
علامات
مجاہدین
سکھ لشکر
پل
پہاڑ
دریا
سڑک
نالہ
شمال
مشرق
مغرب
جنوب
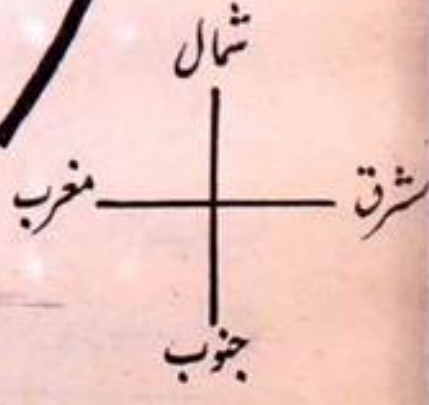
مقام پر جہاں ایک تنگ راستہ تھا مجاہدین کا ایک دستہ مرزا احمد بیگ پنجابی کی قیادت میں اس کی حفاظت کے لیے متعین تھا۔ اُن کے ساتھ ہی بالاکوٹ کے پٹھانوں کی ایک جماعت بھی اس مقام کی حفاظت کر رہی تھی۔ رات کے آخری حصے میں سکھوں کا لشکر اس مقام پر پہنچا۔ مرزا احمد بیگ کی جماعت نے پوری مستعدی اور جرأت سے سکھوں کو للکارا۔ طرفین میں جنگ شروع ہو گئی اور بڑی شدت سے گولیاں برسائی گئیں۔ اس جنگ میں مجاہدین کے آٹھ افراد شہید ہو گئے چونکہ ان کی تعداد نہایت قلیل اور سکھوں کا لشکر نہایت کثیر تھا اس لیے یہ مقام ان کے ہاتھ سے نکل کر سکھوں کے قبضے میں چلا گیا۔ شیر سنگھ کے لشکریں میں سے بعض سوار اور اکثر پیادے پہاڑ کی بلندی پر پہنچ گئے۔

مرزا احمد بیگ کے لئے کمک

جس وقت سکھوں اور مجاہدین کے دستے کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو مرزا احمد بیگ نے فوراً ایک شخص کو سید صاحبؒ کی خدمت میں اس واقعے کی اطلاع دینے اور کمک طلب کرنے کے لئے بھیجا۔ سید صاحبؒ نے ان کا پیغام ملتے ہی ابراہیم خان نشان بردار کو مع ان کی جماعت کے ایک طرف سے اور ارباب بہرام خان کو دوسری طرف سے روانہ کیا تاکہ جہاں تک ممکن ہو مرزا احمد بیگ کی امداد کر کے سکھ لشکر کو روکنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے بعد سید نور اللہ شاہ کو ایک دستے کے ساتھ روانہ کیا پھر سید جعفر نقوی مع ان کی جماعت کے سکھ لشکر کو روکنے کے لئے بھیجے گئے اور ایک رہبر بھی ان کے ہمراہ کر دیا گیا[1] لیکن جس وقت یہ امدادی دستے بکہ پانی کے قریب پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ مقام مجاہدین کے قبضے سے نکل چکا ہے اور سکھوں نے مٹی کوٹ سے بالاکوٹ آنے والے راستے پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ پہلی جنگ تھی جو بالاکوٹ کے قریب سکھوں اور مجاہدین کے درمیان لڑی گئی۔ چونکہ یہاں مجاہدین کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تھا اس لئے یہ جگہ "شہید گلی" کے نام سے مشہور ہو گئی۔

بہرام خاں کا سیّد صاحبؒ کو مشورہ

ارباب بہرام خان اور سید جعفر علی نقوی کے امدادی دستوں کے پہنچنے کے بعد جب مرزا احمد بیگ نے انہیں بتایا کہ یہ مقام سکھوں کے قبضے میں چلا گیا ہے تو ارباب نے سید صاحبؒ کی خدمت میں اپنے ہمراہیوں میں سے ایک شخص کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ کفار پہاڑ پر چڑھ گئے ہیں اور ان کی یہ بدنصیبی ہے کہ وہ ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں کہ اگر آپ اپنے لشکر کے ساتھ ان کی مرکزی لشکر گاہ پر حملہ کر دیں جو پہاڑ کے نیچے واقع ہے تو وہ بڑی مشکل میں پھنس جائیں گے۔ آپ کے پاس توپیں بھی ہیں اگر آپ دشمن کی لشکر گاہ پر جا کر توپیں سر کریں تو وہ بھاگ کھڑا ہوگا اور ادھر ہم سامنے

---

[1] منظورۃ السعدا صفحہ ۱۱۷۲

والے لشکر پر حملہ کردیں گے۔ اس طرح وہ ان پہاڑوں میں محصور ہو جائے گا اور سامانِ رسد نہ پہنچنے کی وجہ سے ہلاک ہو جائے گا کیونکہ یہاں کھانے پینے کا سامان مہیا کرنا بڑا دشوار ہے۔[۱]

ارباب بہرام خاں کے قاصد نے سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کا پیغام دیا اور اسی وقت سید صاحبؒ کا یہ پیغام لے کر واپس چلا گیا کہ "آپ فوراً میرے پاس آجائیں"۔ یہ سن کر ارباب بہرام خان نے قاصد سے دریافت کیا کہ حضرت امیر المومنین نے میری درخواست سن کر کیا جواب دیا۔ اس نے کہا کہ انہوں نے سوائے اس کے کوئی جواب نہیں دیا کہ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔

بہرام خان کی درخواست اور سید صاحبؒ کا جواب

چنانچہ سید صاحبؒ کا پیغام ملتے ہی ارباب بہرام خان اور سید جعفر علی نقوی نماز مغرب ادا کرنے کے بعد روانہ ہوگئے۔ سید صاحبؒ کی خدمت میں پہنچ کر ارباب بہرام خان نے پھر وہی تجویز پیش کی جو انہوں نے قاصد کے ذریعے بھجوائی تھی۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ سکھوں کی مرکزی لشکرگاہ پر حملہ کرنے کے لئے دریا عبور کرنا ضروری ہے مگر ہم نے پل تڑوا دیا ہے۔ کیونکہ ہر شب غازیوں کو اس کی پاسبانی کرنی پڑتی تھی، جو کچھ ہونا ہے اسی جگہ ہوگا۔ اس پر ارباب بہرام خان نے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم یہ پل راتوں رات ٹھیک کر لیں گے۔ سید صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہ "چھوڑو جو کچھ ہونا ہے اسی جگہ ہوگا"۔ یہ سن کر ارباب بہرام خان نے انگشتِ شہادت سے اپنی گردن کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا کہ "یہ سر راہِ خدا میں حاضر ہے"۔[۲]

سید صاحبؒ کی دفاعی تدابیر

مٹی کوٹ کی چوٹی پر سکھوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور اب ان کے لئے بالاکوٹ کی طرف آنا کچھ مشکل نہ تھا مگر چونکہ رات ہو چکی تھی اور تاریکی میں پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اترنا دشوار تھا اس لئے انہوں نے رات کو اوپر ہی قیام کیا۔ سید صاحبؒ اور ان کے تمام جرنیلوں کو یقین ہو گیا تھا کہ صبح جنگ پیش آکر رہے گی۔ اس لئے انہوں نے رات ہی کو دفاعی انتظامات مکمل کر لئے۔ موضع مٹی کوٹ بالاکوٹ کے مغربی جانب پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ مٹی کوٹ اور بالاکوٹ کے درمیان جو ہموار زمین ہے اس میں دھان کے کھیت تھے۔ سید صاحبؒ کے حکم سے چشموں کے منہ کھول دیئے گئے تاکہ کھیتوں میں پانی بھر جائے۔ اس طرح دلدل کی صورت پیدا ہوگئی۔[۳] یہ تدبیر اس لئے کی گئی تاکہ سکھوں کا راستہ مسدود ہو جائے اور دلدل میں سے گزر کر بالاکوٹ تک پہنچنا ان کے لئے دشوار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ جنگ کے

---

[۱] منظورۃ السعداء ص ۱۱۷۵، [۲] منظورۃ السعداء ص ۱۱۷۷، [۳] منظورۃ السعداء ص ۱۱۷۷

وقت حملہ کرنے کے لئے نہایت تیزی سے قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے مگر دلدل میں داخل ہونے والا لشکر تیزی سے قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اس اثنا میں مجاہدین نہایت آسانی سے گولیاں برسا کر ان کا صفایا کر دیتے جنگی نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت عمدہ تجویز تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ اور آپ کے جرنیل فنونِ جنگ میں نہایت ماہر تھے۔

اس کے بعد "ست بنی" کے نالے سے بالاکوٹ کے شمالی جانب تک متعدد مقامات پر مورچے قائم کئے گئے اور یہ مورچے اس طرح تشکیل دیئے گئے تھے کہ سکھوں کا بالاکوٹ پر قبضہ کرنا تو کجا اس تک پہنچنا بھی مشکل تھا۔ سب سے پہلا مورچہ اس ٹیلے کے دامن میں تجویز ہوا جو ست بنی کے نالے اور مٹی کوٹ ٹیلے کے درمیان واقع ہے۔ اس مقام پر ملا لعل محمد قندھاری کو ان کی جماعت کے ساتھ متعین کیا گیا۔ ملا لعل محمد کے مورچے کے بائیں جانب یعنی بالاکوٹ کی سمت میں مولانا شاہ اسماعیلؒ کی جماعت متعین کی گئی، لیکن شاہ صاحبؒ اس جماعت میں شامل نہ تھے۔ شاہ صاحبؒ کے مورچے کے بائیں طرف شیخ ولی محمد پھلتی اور ان کی جماعت کا مورچہ قائم ہوا۔ شیخ صاحب بھی اپنی جماعت کے ساتھ نہ تھے۔ شیخ صاحبؒ کے مورچے کے بائیں طرف ناصر خاں بٹ گرامی اور گڑھی کے خاں، حبیب اللہ خان کی جماعتیں متعین ہوئیں۔ بعض جماعتوں کے مورچے مسجد زیریں یا اس کے آس پاس قائم کئے گئے۔ مولانا شاہ اسماعیلؒ کو مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ مسجد بالا کے قریب جانب شمال متعین کیا گیا۔ ان کے سامنے مسجد کی غربی سمت میں مولوی احمد اللہ ناگ پوری کی جماعت متعین ہوئی۔ اس مسجد سے دس پندرہ قدم نیچے اتر کر ایک نشیب میں شاہینوں والے دستے کا مورچہ قائم کیا گیا۔ سید صاحبؒ نے مرکزی مقام یعنی مسجد بالا میں بیٹھ کر جنگی انتظامات کی نگرانی کا فیصلہ کیا۔

جو لوگ فنِ جنگ میں ادنیٰ سی بھی مہارت رکھتے ہیں اگر وہ دشمن کی پوزیشن، اس کی کثرت، بالاکوٹ کا محل وقوع اور سید صاحبؒ کے لشکر کی قلت کو سامنے رکھ کر جب ان کے دفاعی انتظامات پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں گے تو انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو حالات سید صاحبؒ کو درپیش تھے ان میں اس سے بہتر دفاعی انتظامات نہیں ہو سکتے تھے اور بقول مولانا غلام رسول مہر اگر " رزم گاہ کے نقشے پر ایک نظر ڈال لی جائے تو واضح ہو جائے گا کہ سکھ مٹی کوٹ سے اتر کر قصبے میں پہنچنے تک برابر تمام مورچوں کا ہدف بنتے رہتے۔ اول تو سو میں سے دس بھی قصبے (بالاکوٹ) تک سلامت نہ پہنچ سکتے جو پہنچ جاتے ان پر قصبے کی سمت سے یورش ہوتی"۔

یہ انتظامات کرنے کے بعد پہرے دار اپنے پہروں پر مستعد ہو گئے اور مولانا سید جعفر علی نقوی ساری رات جاگتے اور پہاڑوں کے ساتھ ساتھ گشت لگاتے رہے۔

ا۔ سید احمد شہیدؒ ص ۲۸۵ مولفہ مولانا غلام رسول مہر

سیدؒ صاحبؒ کا لباس اور اسلحہ

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دفاعی انتظامات کرنے اور ہدایات دینے کے بعد سید صاحبؒ اپنی قیام گاہ (حویلی واصل خان) میں تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر سو کر نمازِ تہجد کے لیے بیدار ہوئے۔ رات کا باقی حصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور تسبیح و تہلیل میں گزارا۔ کہ یہ ان کی زندگی کی آخری رات تھی۔ صبح کی اذان ہوئی مسجد میں تشریف لا کر آپ نے نمازِ با جماعت ادا فرمائی پھر لبیں ترشوائیں نیا لباس زیب تن کیا۔ سیاہ رنگ کی قبا پہنی اور ہتھیا باندھ کر مسجد بالا کے سائبان کے نیچے بیٹھ گئے۔ اس وقت جو اسلحہ آپ کی زیب کمر تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ ایک طپنچہ، ایک ولائتی چھُرا جو شیخ غلام علی الٰہ آبادی نے بطور ہدیہ دیا تھا اور ایک تلوار جو ارباب بہرام خان نے آپ کی خدمت میں پیش کی تھی، اس کے علاوہ دو بندوقیں جو قریب ہی رکھی ہوئی تھیں۔ آپ کی انگوٹھی جو خطوط اور فرامین پر مہر کرنے کے لئے استعمال ہوتی تھی منشی محمدی انصاری کی تحویل میں تھی وہ انہوں نے اپنی انگلی سے اتار کر سید صاحبؒ کی انگشت مبارک میں پہنا دی۔ آپ نے مولوی جعفر علی نقوی سے فرمایا کہ مولانا اسماعیلؒ کی انگشتری بھی ان کی انگلی میں پہنا دو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔[۱]

گنڈاسوں کی تقسیم

سید صاحبؒ کے حکم سے خاصی تعداد میں گنڈاسے تیار کروائے گئے تھے جو بوقت جنگ دشمن کے قریب آجانے کی صورت میں استعمال ہوتے تھے۔ یہ گنڈاسے مجاہدین میں تقسیم کئے گئے۔ یہ گنڈاسے عام طور پر ان لوگوں کے کام آتے تھے جن کا ایک ہاتھ زخمی ہو کر بیکار ہو جاتا تھا اور وہ بندوق نہیں چلا سکتے تھے۔ مولانا جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ میں نے ایک گنڈاسا شیخ محمد اسحاق کے لئے بھی منگوایا جو میرے ہمراہ تھے۔ اس پر سید صاحبؒ نے مجھے پیغام بھیجا کہ اپنے اس بھائی (شیخ محمد اسحاق) کو میرے پاس بھیج دو۔ میں نے تعمیلِ ارشاد میں انہیں سید صاحبؒ کی خدمت میں روانہ کر دیا جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ اے برادر تم بندوق اٹھاؤ۔ انہوں نے عرض کیا کہ میرا بایاں ہاتھ بندوق پکڑنے کے قابل نہیں اس لئے مجھے گنڈاسا دیا جائے۔

مولانا جعفر علی نقوی کی افسری

اسی اثنا میں مولوی احمد اللہ ناگ پوری نے جو مولانا عبدالحئیؒ کے چچا زاد بھائی اور مولانا جعفر علی نقوی کے افسر تھے انہیں (جعفر علی نقوی) کو طلب کیا اور کہا کہ میں تمہیں تمہاری جماعت کا افسر مقرر کرتا ہوں۔ مولانا جعفر نقوی نے

---

[۱] منظورۃ السعدا صد ۱۱۷۹

عرض کیا کہ جناب کہاں جا رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں حضرت امیر المومنین کی خدمت میں جاؤں گا مولانا جعفر نے عرض کیا کہ حافظ مصطفیٰ کاندھلوی کو جماعت کا افسر مقرر فرما دیجئے وہ اس سے پہلے بھی متعدد بار افسر رہ چکے ہیں اور میں اس معاملے میں ناتجربہ کار ہوں۔ مولوی احمد اللہ ناگ پوری نے فرمایا کہ حافظ مصطفیٰ ابھی میرے ساتھ جائیں گے، اس کے بعد میں نے شیخ محمدی کا نام پیش کیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ تند مزاج ہیں، مولانا جعفر نقوی نے عرض کیا کہ یہ عام حالات نہیں کہ تند مزاجی ناپسندیدہ ہو۔ یہ جنگ کا وقت ہے اور ایسی حالت میں ایسے ہی شخص کو افسر مقرر کیا جائے جو خوب تند مزاج ہو تاکہ وہ کفار پر اپنا غصہ ظاہر کرے۔ اس پر مولانا احمد اللہ نے فرمایا کہ ہم تم ہی کو افسری کے لئے تجویز کرتے ہیں، آخر میں مولانا جعفر نقوی نے کہا کہ حسن خاں بنارسی کو کیوں نہ مقرر فرمادیں، اس پر انہوں نے ناراض ہو کر فرمایا کہ تم میرے حکم کی نافرمانی کرتے ہو، میں نے عرض کیا کہ میں آپ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا بلکہ حضرت امیر المومنین کی اطاعت کے بعد آپ کی اطاعت اپنے اوپر لازم سمجھتا ہوں، میں نے تو صرف اپنی کمزوری اور ناتجربہ کاری کے پیش نظر یہ باتیں عرض کی ہیں۔ اگر اس میں مجھ سے قصور سرزد ہوا تو معافی کا خواستگار ہوں۔ انہوں نے تبسم فرماتے ہوئے تمام جماعت کو حکم دیا کہ تم سب ان (مولانا جعفر علی نقوی) کی اطاعت کرو۔ یہ کہہ کر وہ سید صاحبؒ کی خدمت میں چلے گئے۔[1]

سکھوں کے حملے کا آغاز

صبح کی نماز پڑھنے کے ساتھ ہی سید صاحبؒ نے حکم دے دیا تھا کہ مجاہدین کھانے پینے سے جلدی فارغ ہو جائیں اور ہر شخص تختوں وغیرہ سے مورچہ بندی کرے۔ چنانچہ چند افراد نے مسجد بالا کی تختہ بندی کر دی جہاں سید صاحبؒ مقیم تھے۔ سورج نکلنے کے ساتھ ہی سکھوں کے پیدل دستے آہستہ آہستہ بالاکوٹ کی طرف اترنا شروع ہوئے جو مسجد بالا سے صاف نظر آرہے تھے۔ اس کے بعد ہی سکھوں کی گولیاں اور ان کی چھوٹی توپوں کے گولے بالاکوٹ کے مکانات تک پہنچنے لگے۔ اس طرف سے بھی مسجد کے دروازے کے باہر چھوٹی توپیں رکھ کر فائرنگ شروع کر دی گئی، ہر شخص نے ہتھیار سنبھال لئے اور اپنے دوسرے بھائی سے اپنی خطائیں معاف کرائیں۔ شیخ محمد اسحاق نے مولانا جعفر علی نقوی سے کہا کہ آج تک وطن اور اہل و عیال کی محبت نے کئی بار میرے دل پر غلبہ کیا مگر آج شہادت حاصل کرنے اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے کے سوائے میرے دل میں کوئی آرزو نہیں۔[2]

---

[1] منظورۃ السعدا صد ۱۱۸۰

[2] منظورۃ السعدا صد ۱۱۸۱

سیّد صاحبؒ کی میدانِ جنگ کو اچانک روانگی

دونوں طرف سے توپیں چل رہی تھیں اور گولیوں کا مینہ برس رہا تھا کہ سید صاحبؒ مسجدِ بالا سے اچانک نیچے اترے اور مسجدِ زیریں کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ دیکھ کر غازیوں کی جماعت بھی آپ کے ساتھ ہوگئی۔ سید صاحبؒ کی اچانک روانگی پر ہر مورچے میں گفتگو ہونے لگی کہ آپ کفار کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں جارہے ہیں۔ ہر شخص متعجب تھا کیونکہ سید صاحبؒ کی میدانِ جنگ کو اچانک روانگی اس منصوبے کے برعکس تھی جو رات کو تیار کیا گیا تھا منصوبہ یہ تھا کہ جب سکھوں کا لشکر پہاڑ سے نیچے اتر کر دلدل عبور کرنے لگے تو اس وقت مجاہدین کی طرف سے اس پر حملہ کیا جائے۔

سید صاحبؒ نے مسجدِ بالا سے اتر کر وہ راستہ اختیار کیا جس کے ایک جانب سید جعفر علی نقوی کا مورچہ تھا اور دوسری جانب شاہ اسماعیلؒ صاحب کا۔ اس راستے سے گزر کر آپ مسجدِ زیریں پہنچے اور وہاں کچھ دیر قیام فرمایا۔

غیبی آوازیں

سید صاحبؒ کو مسجدِ زیریں میں قیام کئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ آپ نے کچھ غیبی آوازیں سنیں اور ان کے جواب میں تین بار فرمایا کہ :-

"ہمیں کون بُلا رہا ہے۔ ہمیں کون بُلا رہا ہے"۔[۱]

اسی دوران میں سکھوں کے ایک دستے نے ایک توپ لاکر دریائے کنہار کے قریب نصب کر کے بالاکوٹ پر گولہ باری شروع کر دی۔ جب سکھوں کا لشکر "میرتاب" کے قریب پہنچا تو اس کثرت سے گولہ باری ہوئی کہ ان کے گولے مسجدِ بالا کی چھت اور اس احاطے میں دائیں بائیں گر رہے تھے جہاں مجاہدین مقیم تھے۔ ان گولوں کی بارش سے تو کوئی جانی نقصان نہ ہوا، البتہ دشمن کی گولیوں سے بہت سے غازی مجروح ہوگئے۔ چنانچہ بندوق کی ایک گولی شیخ محمد اسحاق گورکھ پوری کے دائیں ہاتھ میں لگی۔ ان کا بایاں ہاتھ پہلے ہی ایک سابق جنگ میں تلوار کے زخم سے بیکار ہو چکا تھا۔ مولانا سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ جس وقت شیخ محمد اسحاق گورکھ پوری کے گولی لگی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اب میرے لئے دعا کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد وہ میدانِ جنگ سے نکل گئے اور ست بنی کے نالے کے قریب پہنچ کر بکثرت خون بہہ جانے کی وجہ سے بیہوش ہو کر گر پڑے اور وہیں شہادت پائی۔ شیخ حفیظ اللہ کے تیر لگا اور آنکھ کے نیچے سے گزرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

---

[۱] منظورۃ السعداء صہ ۱۱۸۳۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ نے یہ آوازیں مسجدِ بالا میں اس وقت سنی تھیں جب وہ جنگ کے لئے روانہ ہونے سے قبل دعا میں مشغول تھے۔ (مولف)

سید چراغ علی کی شہادت

سید صاحبؒ کے مجاہدین میں پٹیالہ کے سید چراغ علیؒ نہایت جوشیلے مجاہد تھے۔ ابھی جنگ کا آغاز نہیں ہوا تھا اور سکھوں نے مٹی کوٹ کے پہاڑ سے نیچے اترنا ہی شروع کیا تھا کہ سید چراغ علی کی نظر ان پر پڑی اس وقت وہ کھیر پکا رہے تھے۔ سکھوں کو دیکھ کر اچانک ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی اور یہ کہہ کر کفگیر کو زور سے دیگچے پر مارا کہ "بھائیو وہ دیکھو حور سرخ کپڑے پہنے چلی آ رہی ہے بس اب اسی کے ہاتھ سے کھانا کھائیں گے"[1]۔ یہ کہا اور نہایت تیزی سے مسجد سے نکل کر مٹی کوٹ کے پہاڑ کی طرف دوڑ پڑے۔ یہ واقعہ اچانک اور اتنی تیزی سے رونما ہوا کہ کسی کو انہیں روکنے کا بھی موقع نہ ملا اور وہ مٹی کوٹ کی طرف جاتے ہوئے راستے ہی میں گولی لگنے سے شہید ہو گئے۔ یہ سب سے پہلا خون تھا جو بالاکوٹ کی جنگ میں ایک فنا فی الاسلام مجاہد نے اپنے اللہ تعالیٰ کے حضور نذر کیا۔

سید صاحبؒ مسجد زیریں سے میدان جنگ کی طرف

مسجد زیریں میں چند منٹ قیام کرنے کے بعد سید صاحبؒ اچانک دلدل کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ دیکھ کر شاہ اسماعیل صاحبؒ نے بلند آواز سے فرمایا کہ لمبی مار کی بندوقوں والے لوگ حضرت امیر المومنینؒ کے ارد گرد ہو جائیں۔ سید صاحبؒ کی مسجد زیریں سے روانگی کے وقت بعض مجاہدین نے عرض کیا کہ لوگ زخمی ہو رہے ہیں اس طرف سے بھی حملے کی اجازت دی جائے۔ آپ نے فرمایا کہ لمبی مار کی بندوقیں چلاؤ اور اگر ہو سکے تو منتشر ہو کر مورچے بناؤ۔ سید صاحبؒ کے ساتھیوں میں سے ہر ایک آہستہ آہستہ تکبیر کہہ رہا تھا۔ دلدل کے قریب پہنچ کر سید صاحبؒ نے ایک پتھر پر اپنے دونوں بازو رکھے اور اسے تکیہ بنا کر بیٹھ گئے[2]۔ اس کے بعد آپ نے شیخ ولی محمد پھلتی کو حکم دیا کہ مسجد بالا سے شاہین لا کر یہاں نصب کرو اور دشمن پر گولہ باری کرو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ارباب بہرام خاں جو مضافات پشاور کے ایک معزز رئیس اور سید صاحبؒ کے قدیمی جاں نثار تھے اس وقت آپ کے بائیں طرف مسلح بیٹھے تھے۔ اسی دوران میں ایک شخص نے سید صاحبؒ سے عرض کیا کہ قندھاریوں کی جماعت جو دامن کوہ سے دشمن کے دائیں بازو پر حملہ کر رہی ہے بہت تھوڑی ہے اور دشمن کا زور اس طرف بہت زیادہ ہے۔ قندھاریوں کی مدد کے لئے کچھ اور آدمی بھیج دیئے جائیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ اسی قدر کافی ہیں اور بھیجنے کی ضرورت نہیں[3]۔

اس موقعے پر بعض لوگوں نے بار بار عرض کیا کہ سکھوں کی بہت بڑی تعداد پہاڑ پر آ گئی ہے اگر اجازت ہو تو ان پر حملہ کر دیا جائے مگر سید صاحبؒ نے منع کیا اور فرمایا کہ لوگ اپنے مورچوں میں بیٹھے فائرنگ کرتے رہیں کوئی شخص

---

[1] سید احمد شہیدؒ صفحہ ۳۹۰ ، [2] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۱۸۴ ، [3] سوانح احمدی صفحہ ۱۳۶

باہر نہ نکلے۔ جب تک کہ ہم نہ نکلیں، مورچوں سے نکل کر یورش نہ کی جائے۔

سیّد صاحبؒ اچانک دلدل میں داخل ہو گئے

جنگ کا پہلے سے طے شدہ منصوبہ یہ تھا کہ مجاہدین اپنے مورچوں میں بیٹھے دشمن پر گولیاں چلاتے رہیں اور جب وہ مٹی کوٹ کے پہاڑ سے نیچے اتر کر دلدل میں داخل ہو تو اس پر دائیں بائیں اور سامنے سے حملہ کیا جائے تاکہ اسے دلدل ہی میں گھیر کر ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد بھی اگر اس کے باقی ماندہ افراد قصبے پر حملہ آور ہونے کی کوشش کریں تو اوپر کے مورچوں والے مجاہد گولیاں مار مار کر ان کا خاتمہ کر دیں۔ جنگی نقطۂ نظر سے یہ بڑی کامیاب اور مؤثر اسکیم تھی مگر اچانک ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے مجاہدین کی متوقع فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔ سکھوں کا ایک گروہ پہاڑ سے اتر کر دلدل میں داخل ہوا اور مجاہدین پر بارش کی طرح گولیاں برسانے لگا۔ یہ دیکھ کر ایک مجاہد نے تلوار کھینچ کر جست لگائی اور دشمن پر حملہ کرنے کی خاطر دلدل میں کود پڑا۔ چونکہ دلدل میں کیچڑ بہت زیادہ تھی اس لئے سید صاحبؒ نے منع فرمایا مگر وہ جوش کے عالم میں آگے بڑھنے لگا۔ یہ دیکھ کر لوگوں نے اسے آواز دی کہ آگے مت بڑھو حضرت امیرالمومنین منع فرماتے ہیں۔ آپ کی خلاف ورزی کا نتیجہ بُرا ہو گا۔ چنانچہ وہ شخص واپس آ گیا۔ اسی اثنا میں سید صاحبؒ نے ارباب بہرام خان سے فرمایا کہ اب دل چاہتا ہے کہ اس بدبخت گروہ پر حملہ کر دوں جو پہاڑ سے نیچے اتر آیا ہے۔ ارباب نے عرض کیا کہ آپ کے حملہ کرنے سے دشمن کا وہ گروہ تو تہہ تیغ ہو جائے گا جو پہاڑ کی نچلی طرف ہے لیکن جو لوگ پہاڑ پر ہیں ان پر حملہ کرنا مشکل ہو گا۔ اس کے بعد سید صاحبؒ نے ایک لمحے کا توقف کیا اور کسی کو اطلاع دیئے بغیر اچانک "بسم اللہ اللہ اکبر" کہہ کر دلدل میں داخل ہو گئے۔

خُدا داد طاقت

اگرچہ دلدل میں داخل ہونے کے بعد گھٹنوں تک پاؤں دھنس جاتے تھے اور پاؤں کھینچنا مشکل ہو جاتا تھا مگر سید صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی روحانی اور جسمانی طاقت عطا فرمائی تھی کہ وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح چشم زدن میں دلدل سے پار ہو گئے۔ آپ دشمن کی طرف یوں بڑھتے جا رہے تھے گویا جست لگا رہے ہوں اور تن تنہا ہزاروں دشمنوں کو یوں اپنے آگے رکھ لیا جیسے شیر بھیڑوں اور بکریوں کے گلّے میں آ جاتا ہے۔[1]

---

[1] سوانح احمدی ص۱۳۶ و منظورۃ السعداء ص۱۱۸۶

بالا کوٹ کا وہ تاریخی میدان جنگ جہاں مجاہدین اور سکھ لشکر کے درمیان ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو خون ریز جنگ ہوئی ۔ پس منظر میں مٹی کوٹ کے پہاڑ نظر آرہے ہیں جن سے اُتر کر سکھوں نے مجاہدین پر حملہ کیا تھا ۔

نوری میدان
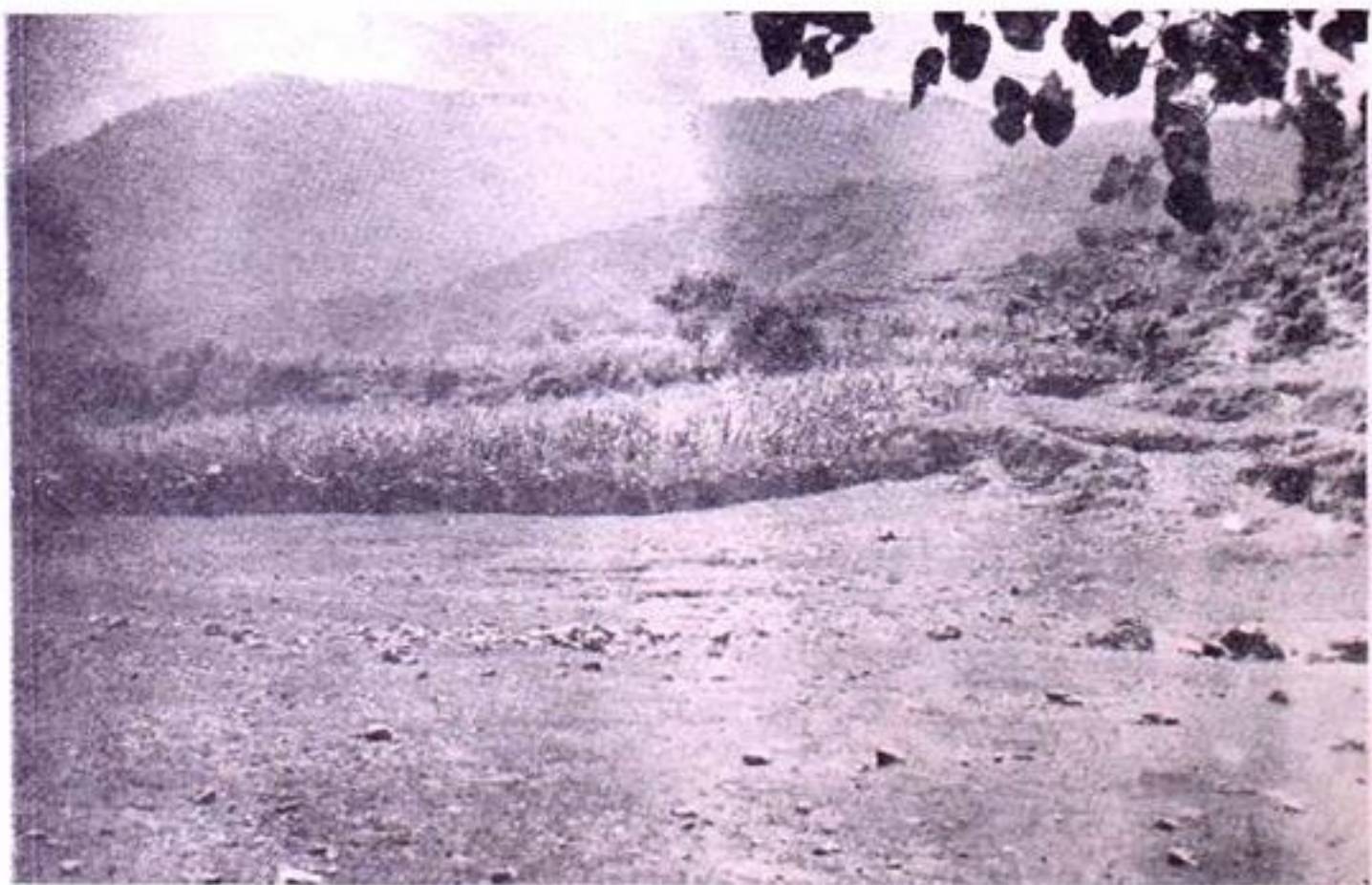
جہاں حضرت سید احمد شہید رح حضرت شاہ اسماعیل رح کی شہادت کے بعد مجاہدین اور سکھوں کے درمیان تیسرا اور آخری مقابلہ ہوا

مٹی کوٹ کے نشیب میں وہ تاریخی چٹان جس پر سید صاحب رح کو
آخری بار دیکھا گیا اور اسی چٹان کے عقب میں سکھوں سے جنگ کرتے
ہوئے آپ نے شہادت پائی

مزار حضرت سید احمد شہید رح
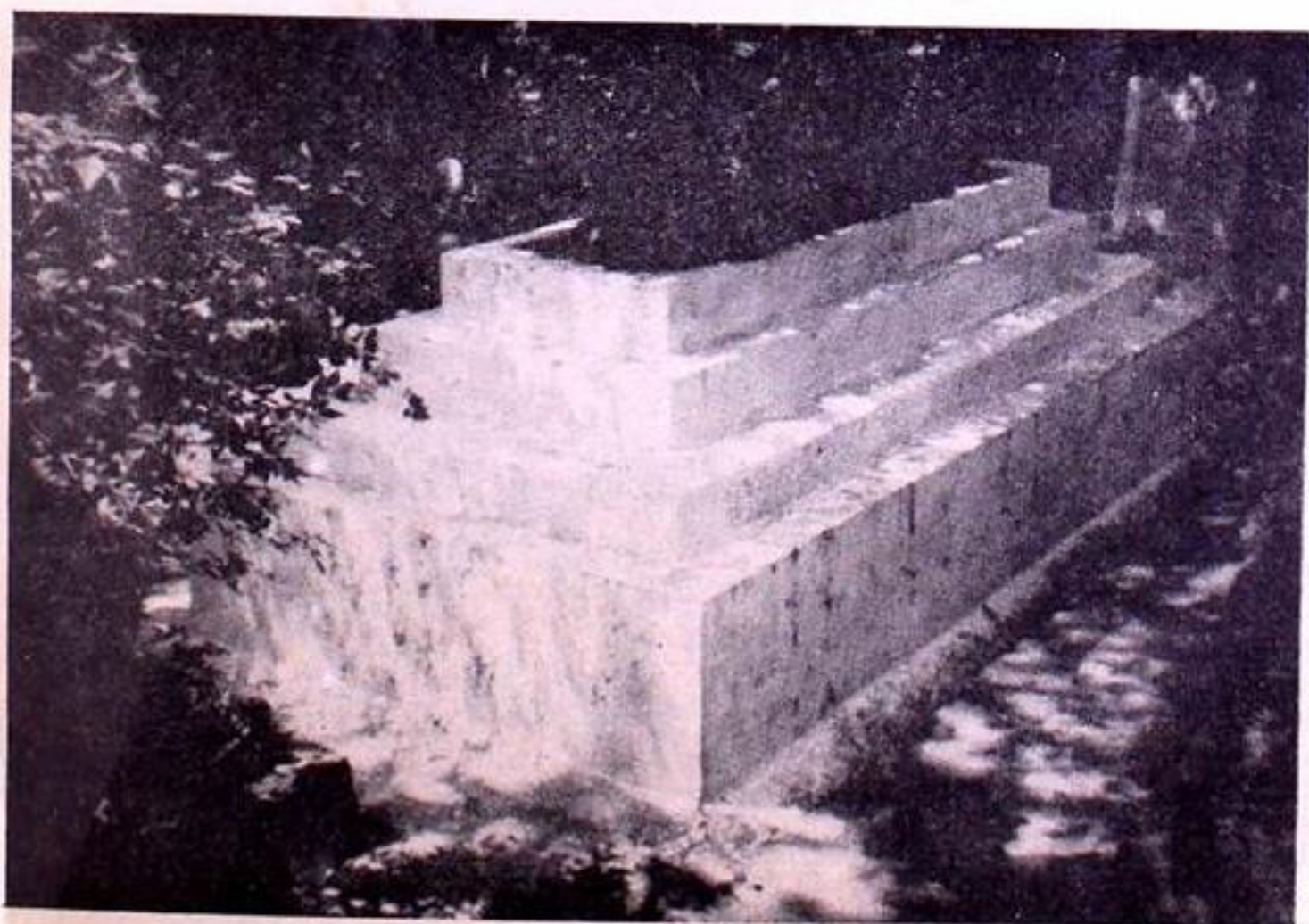
گھمسان کا رَن

اس کے بعد سکھوں اور مجاہدین میں شدید جنگ ہوئی۔ اس گھمسان کے رن کی تفصیل ایک غیر مسلم مصنف منشی مہتاب سنگھ نے جو سکھ دربار سے وابستہ رہ چکا ہے اور اکثر جنگوں میں سکھ فوج کے ساتھ تھا یوں درج کی ہے۔

"رات مٹی کوٹ کے پہاڑ پر گزارنے کے بعد صبح کو سکھ لشکر کے سردار کنور شیر سنگھ کی خدمت میں جمع ہوئے اور مشورہ ہوا کہ اس پہاڑ پر قبضہ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ قرار پایا کہ سردار مہاں سنگھ مع فوج ہزارہ اور لکھی سنگھ اپنی فوج کے ساتھ ہراول دستوں کے طور پر پیش قدمی کر کے خلیفہ صاحب کے ساتھ جنگ کریں اور باقی ماندہ فوج ان کی امداد کے لئے پیچھے رہے۔ چنانچہ سردار مہاں سنگھ اور سردار لکھی سنگھ اپنے لشکر لے کر بالاکوٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان دونوں نے دو کوس کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ سردار شام سنگھ اٹاری والے نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ بات تو اچھی نہیں ہے کہ اگر ان دونوں نے جنگ کی اور فتح حاصل کر لی تو ہم لوگ کس شمار میں ہوں گے اور اگر خدا نخواستہ ان دونوں کو شکست ہوئی تو پھر بھی ہمارا شمار کسی حساب میں نہ ہو گا۔ یہ سن کر سکھ فوج کے دوسرے افسروں کو فکر لاحق ہوئی اور یہ فیصلہ کر کے سب اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہم سب مل کر حملہ کریں گے۔ اگر ہماری فتح ہو گئی تو اس پہاڑ پر قبضہ رکھنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی اور اگر خدا نخواستہ ہمیں شکست ہو گئی تو ہمیں لاہور تک کون پہنچنے دے گا۔ راستے میں مسلمانوں کی آبادی ہے وہ ہمیں ہرگز اس قابل نہیں رکھیں گے کہ ہم لاہور پہنچ سکیں۔ اس صورت میں ہم سب کو مجتمع ہو کر حملہ کرنا چاہیئے۔ اس گفتگو کے بعد سارا لشکر مٹی کوٹ سے بالاکوٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ بالاکوٹ میں خلیفہ صاحب اور ان کا لشکر تیر و تفنگ اور زنبورک سے آراستہ اور ہوشیار و مستعد تھا۔ طرفین میں بندوقوں اور زنبورکوں سے جنگ شروع ہو گئی۔ سکھوں کے پاس ایک توپ تھی جو وہ کشمیر سے اپنے ساتھ لائے تھے اس سے انہوں نے گولہ باری شروع کر دی۔ طلوع آفتاب کے بعد ایک پہر سے لیکر دوسرے پہر تک شدید جنگ ہوتی رہی۔ اسی اثناء میں خلیفہ صاحب کی طرف سے ایک گولی آئی اور سکھوں کی فوج ہزارہ کے علمبردار کا سینہ چیرتی ہوئی نکل گئی اور دوسری گولی جوالا سنگھ بھدانیہ کی فوج کے نشان بردار کو لگی دونوں ہلاک ہو گئے اور ان کے علم زمین پر گر گئے۔"[1]

"اگرچہ دوسروں نے آگے بڑھ کر یہ علم اٹھا لئے لیکن خلیفہ اور ان کے غازیوں نے نہایت عجلت سے حملہ کر دیا

---

[1] تاریخ منشی مہتاب سنگھ (قلمی)، ص ۹۶

خلیفہ سید احمد شاہ اور مولوی اسماعیل جو دونوں اپنے لشکر کے افسرانِ اعلیٰ تھے بذاتِ خود حملہ کی قیادت کر رہے تھے انہوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے اور عالم جوش میں داڑھیاں دانتوں میں دبا کر دھان کے کھیتوں میں آئے اور بآوازِ بلند کہا کہ :۔

"کافراں رفتند۔ حملہ بکنید" (کافر بھاگے زور سے حملہ کرو)

چنانچہ خلیفہ صاحب کی آواز پر سب نے دھان کے کھیت سے گزر کر پہاڑ کے دامن میں سکھوں پر یک بارگی حملہ کر دیا۔ اس مقام پر ایک طرف سردار شام سنگھ و پرتاپ سنگھ اٹاری والا کی فوج تھی اور دوسری طرف سردار عطر سنگھ کالیانوالہ و گورمکھ سنگھ بھلہ وغیرہ کی فوج متعین تھی۔ خلیفہ صاحب کے لشکر کا مقابلہ مہاں سنگھ و کنور شیر سنگھ کی فوجوں سے ہوا۔ اس مقابلے میں سکھوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے۔

"پائے سنگھاں از میدان پس شدہ"

یہ دیکھ کر کنور شیر سنگھ تلوار کھینچ کر آگے بڑھا اور بھاگنے والوں کو گالیاں دینے اور پتھر مارنے لگا اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے جرنیلوں سردار شام سنگھ و پرتاپ سنگھ اٹاری والا اور عطر سنگھ کالیانوالہ کے پاس آدمی بھیج کر ان کے دل بڑھائے اور مقابلہ پر ڈٹے رہنے کی ہدایت کی۔ اس طرح سکھوں کا مفرور لشکر دوبارہ مجاہدین کے مقابلے پر آ گیا۔ [1]

جعفر تھانیسری اور جعفر نقوی کے بیانات

منشی ہتاب سنگھ کے مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں ان مسلمان مؤرخین کے بیانات کی تائید کرنی پڑتی ہے جن پر بعض لوگوں نے جانب داری اور مبالغہ آمیزی کا الزام عائد کیا ہے۔ چنانچہ مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں کہ دشمنوں پر آپ (سید صاحبؒ) کی تاخت (حملہ) سے قیامت برپا ہو گئی جو مجاہدین اس وقت کنارۂ دلدل پر موجود تھے وہ سب آپ کے ساتھ ہی دلدل میں کود پڑے اور بمشکل تمام اس سے پار ہو کر یکے بعد دیگرے آپ سے جا کر مل گئے۔ ایک لمحے میں وہ ہزاروں دشمن جو پہاڑ کے نیچے سے اتر کر پرلے کنارۂ دلدل پر تھے مجاہدین کے ہاتھ سے مارے گئے اور غازی دشمنوں کو مارتے ہوئے پائینِ پہاڑ تک پہنچ گئے تھے۔ بعد صاف کرنے میدان کے سید صاحبؒ مثلِ شیر کے اپنی جماعت میں کھڑے تھے"۔ [2]

مولانا جعفر نقوی اس گھمسان کے رن کی تفصیلات یوں بیان کرتے ہیں کہ "سید صاحبؒ اور آپ کے ساتھی نہایت برق رفتاری سے سکھوں کے لشکر پر جا پڑے۔ سکھوں میں سے بعض نے نیزوں اور تلواروں سے حملہ کیا مگر ان میں

---

[1] تاریخ منشی ہتاب سنگھ (قلمی)، ص ۹۸ ، [2] سوانح احمدی ص ۱۳۶

سے اکثر فرار ہو گئے لیکن بھاگنے کا راستہ نہ تھا کیونکہ پہاڑ سے نیچے آ چکے تھے اور بھاگ کر پہاڑ پر چڑھنا مشکل تھا
پس وہ تمام سکھ جو نیچے اتر چکے تھے مارے گئے اور دشمن کے جو لوگ پہاڑ کے اوپر تھے انہوں نے بندوقوں کی گولیاں
اس طرح برسائیں کہ اپنوں اور بیگانوں میں تمیز نہ ہو سکی۔ اس وقت بندوقوں سے گولیاں اولوں کی طرح برس
رہی تھیں اور کارتوسوں کے کاغذ ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ دونوں طرف سے پتھروں کی بوچھاڑ بھی ہو رہی تھی۔ مولوی
جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ میں اور منشی محمدی انصاری میدانِ جنگ میں اس وقت پہنچے جب سکھوں میں سے تھوڑے
لوگ پہاڑ کے نیچے زندہ باقی تھے۔ چشم زدن میں انہیں بھی تنکا کی طرح تہہ تیغ کر دیا گیا۔"[1]

وقائع کا بیان

"وقائع احمدی" سید صاحبؒ اور مجاہدین کے حالات پر ایک مبسوط کتاب ہے جو متعدد جلدوں پر مشتمل ہے۔
اگرچہ اس میں بعض ضعیف روایات بھی ہیں لیکن پھر بھی سید صاحبؒ کے متعلق سب سے زیادہ معلومات اسی کتاب
میں موجود ہیں۔ میاں لکھمیر اس کتاب کے ایک چشم دید راوی ہیں۔ انہوں نے اس گھمسان کے رن کا جو آنکھوں دیکھا
واقعہ بیان کیا ہے وہ یوں ہے۔ میاں لکھمیر روایت کرتے ہیں کہ سید صاحبؒ بآوازِ بلند تکبیر کہتے ہوئے مسجدِ زیریں
سے نکل کر حملہ آور ہوئے:

> "دھان کی کیاریوں میں تفنگچے اور تلوار چلنی شروع ہو گئی۔ اس وقت یہ حال تھا کہ جو سکھ غازیوں کے
> مقابلے پر تھے ان کے ہاتھوں اور بدنوں پر رعشہ پڑ گیا۔ بندوقیں نہ چلا سکے۔ غازی لوگ ایک ہاتھ
> سے ان کی بندوق پکڑتے، دوسرے ہاتھ سے تلوار مارتے۔ قرابین والے قرابین مارتے تھے اور
> سکھ پیچھے ہٹتے ہٹتے پہاڑ کی طرف چلے جاتے تھے۔ بے شمار سکھ اس وقت مارے گئے۔"[2]

سید صاحبؒ کی شہادت

جنگ اپنے شباب پر تھی اور غازی سکھوں کا قلع قمع کر رہے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں سکھوں کی لاشوں پر
لاشیں پڑی تھیں اور سید صاحبؒ غازیوں کے جھرمٹ میں کھڑے ان سکھوں پر گولیاں چلا رہے تھے جو پہاڑ کی بلندی
سے مجاہدین پر فائرنگ کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں شیر سنگھ کے للکارنے پر بھاگتے ہوئے سکھوں نے پھر میدانِ
جنگ کا رخ کیا اب وہ پہاڑ سے نیچے اتر کر اس مقام کے قریب آ گئے تھے جہاں سید صاحبؒ اور ان کے مجاہدین سکھوں
پر بندوقیں سر کر رہے تھے۔ اسی دوران میں پہاڑ پر کھڑے ہوئے سکھوں نے پوری شدت سے گولیوں

---

[1] منظورۃ السعداء ص ۱۱۸۷ ، [2] وقائع ۲۴۶-۲۴۸ بحوالہ سید احمد شہید ص ۲۴

کی بارش شروع کردی۔ لڑائی کا سارا زور اسی طرف تھا اور مجاہدین سید صاحبؒ کی رفاقت میں تلواریں چلانے لگے۔ مولانا جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ غازیوں کا لشکر سکھوں کو تہہ تیغ کرتا ہوا حضرت امیر المومنین کے ہمراہ دامنِ کوہ تک پہنچ گیا۔ دشمن کے قتل عام کے بعد پہاڑ کی بلندی سے بندوقوں کی گولیاں برس رہی تھیں اور بڑی شدید سنگ باری ہو رہی تھی۔ اسی اثناء میں حضرت امیر المومنین میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے منشی محمدی انصاری سے پوچھا کہ حضرت امیر المومنین کہاں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے پیچھے بائیں جانب۔ میں نے کہا کہ الحمد للہ اس مقام پر تو ہم آپ سے آگے ہیں۔ اس کے بعد ہم دونوں بیٹھ گئے اور اپنی بندوقیں بھرنے لگے۔ اس مقام پر دھان کے کھیتوں کی اوٹ میں بیٹھ کر ہم دشمن کی سنگ باری اور گولیوں کی بوچھاڑ سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ جب ہم کھڑے ہوتے تو سکھوں کو نشانہ بنا کر فائر کرتے اور پھر بیٹھ جاتے۔

دریں اثناء قاضی علاؤالدین اور بعض دوسرے لوگ جنگ سے دست کش ہو گئے اور میدانِ کارزار میں سید صاحبؒ کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ اس وقت اُن کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ "حضرت کہاں ہیں، حضرت کہاں ہیں"۔ منشی محمد بخش بھی یہی دریافت کرتے تھے۔ اس کے بعد ہی قاضی علاؤالدین اور منشی محمد بخش دونوں سید صاحبؒ کو تلاش کرنے کے دوران شہید ہو گئے۔ اسی طرح شیخ بلند بخت بھی سید صاحبؒ کو تلاش کر رہے تھے کہ دشمن کی گولی سے منصبِ شہادت پر فائز ہوئے۔[1]

معرکۂ بالاکوٹ اور سید صاحبؒ کی آخری جنگ کے متعلق جو روایات مختلف کتابوں میں درج ہیں ان میں بڑا الجھاؤ ہے اور ایک سرسری نظر سے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ سید صاحبؒ کب، کیسے اور کہاں شہید ہوئے۔ انہی روایات کے الجھاؤ سے بعض لوگوں نے یہ غلط نتیجہ اخذ کر لیا کہ سید صاحبؒ میدانِ جنگ سے اچانک غائب ہو گئے اور پھر یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ وہ دنیا میں دوبارہ تشریف لا کر مسلمانوں کو کفار پر غلبہ عطا فرمائیں گے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی سی بات بھی صحیح نہیں۔ اگر روایات کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ نے بالاکوٹ کی اسی رزم گاہ میں مٹی کوٹ کے نالے کے قریب شہادت پائی۔ چنانچہ مولانا جعفر نقوی کا بیان ہے کہ مجاہدین کی شکست کے بعد ہم بہت سے لوگ نالہ عبور کر کے پن چکیوں کے پاس پہنچ گئے اور حضرت امیر المومنین اور دوسرے رفیقوں اور دوستوں کے متعلق معلومات حاصل کرنی شروع کیں۔ وہیں ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت امیر المومنین کی ران میں بندوق کی گولی لگی، سر میں پتھر کا زخم آیا اور آپ نے شہادت پائی۔[2]

---

[1] منظورۃ السعداء ص ۱۱۸۸ [2] منظورۃ السعداء ص ۱۱۹۳

منشی مہتاب سنگھ کا بیان

ہمارے خیال میں اس موضوع پر سب سے مستند بیان منشی مہتاب سنگھ کا ہو سکتا ہے جو سکھ حکومت سے وابستہ تھا اور جس نے براہِ راست ان سکھ جرنیلوں سے معلومات حاصل کیں جو جنگِ بالاکوٹ کی کمان کر رہے تھے۔ اس مرحلے پر یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد مجاہدین ان کے پاس سے منتشر ہو چکے تھے اور کسی کو اتنا وقت نہ مل سکا کہ وہ سید صاحبؒ کی لاشِ مبارک اور ان کے زخموں کا بغور مشاہدہ کرتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے بعض نے سید صاحبؒ کو شہید ہوتے دیکھا لیکن جنگ کے بعد سید صاحبؒ کی نعشِ مبارک سکھوں کے قبضے میں آئی اور وہی آپ کے جسم مبارک کے زخموں کی نوعیت سے پورے طور پر واقف ہو سکتے تھے۔ اس بارے میں ان کی روایت زیادہ صحیح اور مستند ہو سکتی ہے۔ منشی مہتاب سنگھ نے انہی سکھ جرنیلوں سے معلومات حاصل کر کے مندرجہ ذیل واقعہ اپنی تاریخ میں سپردِ قلم کیا۔

چنانچہ از طرفین کہ بندوق ہا جاری شد یک صد و ہشتاد نفر مع خلیفہ سید احمد شاہؒ در ہماں زمین ہوتر ہا لاشہ بر لاشہ مردہ شوند و ہمیں قسم در زمینِ ہوتر ہا چہار صد مردم ہندوستانی کہ بدل وجاں بر قبضۂ خلیفہ بودند ہمہ ہا جاں دادند و لاشۂ خلیفہ ہم بہ زخمِ بندوق کہ یک گولی بر بازوی راست دیگر گولی بر سینہ متصل پستانِ چپ چسپیدہ بودند[1]

چنانچہ دونوں جانب سے بندوقیں سر ہونے لگیں اور ایک سو اسی آدمی مع خلیفہ سید احمد شاہ چادلوں کی اس دلدلی زمین پر یوں شہید ہو گئے کہ ان کی لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں۔ اسی طرح چار سو ہندوستانی مجاہدوں نے کہ جو دل و جان سے خلیفہ صاحب پر فدا تھے اس مقام پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ خلیفہ صاحب کے جسم پر گولیوں کے دو زخم آئے۔ ایک گولی ان کے دائیں بازو پر لگی اور دوسری ان کے سینے کے بائیں جانب پستان کے مقام پر لگی۔

منشی مہتاب سنگھ کی غیر مطبوعہ کتاب کی اس روایت کے منظرِ عام پر آجانے کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا کہ سید صاحبؒ مٹی کوٹ کے پہاڑ کے نیچے سکھوں سے مردانہ وار جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے ان کے جسم پر دو گولیاں لگیں ایک دائیں بازو پر اور دوسری سینے کے بائیں طرف دل کے مقام پر۔ ان کے میدانِ جنگ سے غائب ہو جانے کا واقعہ بالکل بے اصل ہے۔ اسی طرح اس واقعے کی بھی کوئی حقیقت نہیں کہ عین اثنائے جنگ میں گوجر انہیں اٹھا لے گئے اس قیامت خیز جنگ میں جب کہ ہر طرف توپوں کے گولے اور بندوقوں کی گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں گوجروں کا میدانِ جنگ میں جانا ہی بعید از عقل ہے۔ انہیں میدانِ جنگ

---

[1] تاریخ منشی مہتاب سنگھ (قلمی) ص ۹۰ ، ص ۵۹

سے نکال لے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سید صاحبؒ کی جائے شہادت

اب سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ سید صاحبؒ نے شہادت کہاں پائی، عام روائتوں میں آپؒ کی شہادت کا مقام مٹی کوٹ کے پہاڑ کے قریب سے گذرنے والا نالہ بتایا گیا ہے۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ رائے قائم کرلی کہ آپ "ست بنی" کے نالے میں شہید ہوئے، یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ ست بنی کا نالہ اور مٹی کوٹ کا نالہ دونوں ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں لیکن اگر ان روائتوں پر ذرا گہری نظر سے غور کیا جاتا تو یہ غلط فہمی پیدا نہ ہوتی اور سید صاحبؒ کی شہادت کا صحیح مقام متعین کرنے میں دشواری پیش نہ آتی۔ اس روایت سے سب متفق ہیں کہ سید صاحب سکھوں پر یورش کرتے ہوئے اور انہیں قتل کرتے ہوئے مٹی کوٹ کے پہاڑ کی جڑ میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد پہاڑ کی چڑھائی شروع ہو جاتی تھی اور اس چڑھائی سے لیکر مٹی کوٹ کی چوٹی تک سکھ فوج مور و ملخ کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس حالت میں پہاڑ پر چڑھ کر جنگ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اس لئے لازمی طور پر تسلیم کرنا پڑے گا کہ سید صاحبؒ پہاڑ کے دامن ہی میں رہے۔ یہیں جنگ کا سب سے زیادہ زور تھا۔ غازیوں کی اکثریت بھی اس مقام پر اپنے امیرؒ کے ادرگرد پروانہ وار فدا ہو رہی تھی۔ یہیں سید صاحبؒ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور جب آپؒ ہجوم کارزار میں جنگ کرتے ہوئے نظر نہ آئے تو یہیں سے مجاہدین نے سید صاحبؒ کی تلاش کا آغاز کیا۔ روایات میں آتا ہے کہ تلاش کرنے والے جب آپؒ کی بابت دریافت کرتے کہ حضرت امیر المومنین کہاں ہیں تو اکثر لوگ یہی جواب دیتے کہ "امیر المومنین اس نالے کے قریب ہیں"۔ بعض نے آپ کی جائے قیام خاص نالے میں بتائی۔

مجاہدین کے بیانات

چنانچہ میاں لکھیر جو سید صاحبؒ کے قریب دادِ شجاعت دے رہے تھے بیان کرتے ہیں کہ "حضرت المومنین سکھوں کو مارتے ہوئے ہم لوگوں سے آگے بڑھ گئے۔ ہمارے دہنے طرف نالہ تھا، چھ آدمی ہمارے اس نالے میں ہو کر حضرت امیر المومنین کے پاس چلے گئے۔ اس عرصے میں حضرت علیہ الرحمۃ کی طرف سے زخمی ہو کر ناصر خاں بھٹ گرامی آئے۔ انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کرکے کہا (سید صاحبؒ) اس ہجوم میں تشریف رکھتے ہیں"۔

لعل محمد جگدیش پوری بیان کرتے ہیں کہ:-

حضرت علیہ الرحمہ نالے میں پہنچے جہاں سکھوں کا بڑا ہجوم تھا اور تلوار بندوق جانبین سے چلنے لگی"۔ شیر محمد خاں رامپوری نے اپنے دستے کے افسر شیخ وزیر پھلتی سے دریافت کیا کہ حضرت کا معلوم ہے کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں نے دیکھا نہیں لیکن سنا ہے کہ کہیں اس نالے میں ہیں"۔

شیخ حفیظ اللہ دیوبندی کی روایت ہے کہ:-

"دھانوں کے کھیت میں میں نے دیکھا کہ مولانا اسماعیلؒ صاحب کھڑے بندوق لگا (چلا) رہے ہیں۔ میں نے دور ہی سے پکار کر پوچھا کہ مولانا صاحب! حضرت امیر المومنین کہاں ہیں، انہوں نے کہا کہ

شور نہ کر دسکھ سنتے ہیں، حضرت آگے نالے میں ہیں وہیں چلے جاؤ۔ پھر میں وہاں گیا تو دیکھا کہ حضرت ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں بندوق پکڑے قبلہ رُخ نالے میں بیٹھے ہیں اور ایک طرف آپ کے قریب پچیس غازی صف باندھے آڑ میں بیٹھے بندوقیں لگا رہے (سر کر رہے) ہیں۔"

حاجی وجیہ الدین باغپتی بیان کرتے ہیں کہ :۔

"غازی سکھوں کا تعاقب کرتے ہوئے مٹی کوٹ کی جڑ تک پہنچ گئے۔ میں بھی بندوق لگاتے لگاتے ایک نالے پر جا پہنچا کیا دیکھتا ہوں کہ چند آدمیوں میں سے حضرت امیرالمومنین بیٹھے ہوئے بندوقیں چلا رہے ہیں اور آپ کے قریب کئی لاشیں شہیدوں کی پڑی ہیں۔ اس وقت حضرت نے میرے روبرو دہنی چھاتی پر بندوق جما کر فیر کی تو مجھ کو آپ کے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی یا اس کے پاس والی انگلی میں تازہ خون نظر آیا۔ میں نے اپنے قیاس سے معلوم کیا کہ شاید آپ کے مونڈھے میں گولی لگی ہے اس کا خون آپ کی انگلی میں بندوق چھاتی پر رکھنے کے وقت لگ گیا ہے۔"

بہرام خاں تنولی جو علاقہ تنول کے سردار تھے اور جنگ بالاکوٹ میں شریک تھے کہتے ہیں کہ :۔

"غازیوں نے دشمن کو مار مار کر دامن کوہ تک میدان صاف کر دیا۔ پہاڑ پر چڑھنا دشوار تھا۔ سید صاحبؒ دامنِ کوہ میں اپنی جماعت میں ایک پتھر پر کھڑے تھے۔ دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ آتی۔ پھر دیکھا تو سید صاحب نہ تھے۔ سب ساتھی بھی شہید ہو گئے۔"

میاں عبدالقیوم داروغہ لنگرخانہ کی روایت ہے کہ :۔

"سکھ (پہاڑ سے) اتر کر ہماری طرف آتے تھے اور حضرت امیرالمومنین اس پتھر مندکور کی آڑ میں اس نیت سے ٹھہرے تھے کہ جب سکھوں کا ہلہ بہت نزدیک آئے تب ایک باڑھ قرابینوں کی مار کر تلوار سے لڑیں۔"[1]

یہ چند بیانات ہیں جو اس خزینۂ روایات میں سے نکال کر بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں۔ ان سب میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ سید صاحبؒ مسجد زیریں سے روانہ ہوئے اور دامنِ کوہ میں سکھوں کا جو لشکر موجود تھا اس پر حملہ کرتے اور مارتے ہوئے مٹی کوٹ کے پہاڑ کی جڑ تک پہنچ گئے۔ اس کے قریب ایک نالہ تھا اس میں مورچہ بنا کر پہاڑ سے نیچے اترنے والے سکھوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ یہیں ان کے گولی لگی اور یہیں انہوں نے شہادت پائی۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ سید صاحبؒ جس نالے میں یا اس کے کنارے جنگ کر رہے تھے وہ خشک[2] تھا۔ جن لوگوں نے ست بنی کا نالہ دیکھا ہے وہ اس امر کی شہادت دیں گے کہ یہ نالہ خشک نہیں رہتا خصوصاً مئی کے مہینے میں اس میں خاصہ پانی ہوتا ہے۔ خشک نالہ وہی ہے جو مٹی کوٹ نامی پہاڑ کی جڑ کے قریب سے گزرتا ہے۔ اس لئے تسلیم کرنا

---

[1] یہ روایات "وقائع احمدی" جلد سوم اور کتاب العبرۃ مولفہ سید عبدالجبار شاہ ستھانوی سے ماخوذ ہیں۔ بحوالہ "سید احمد شہیدؒ"
[2] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۱۹

پڑے گا کہ سید صاحبؒ نے ست بنی کے نالے میں نہیں بلکہ مٹی کوٹ کے نالے کے قریب شہادت پائی۔ بہرام خاں تنولی کی چشم دید روایت کے مطابق سید صاحبؒ دامنِ کوہ میں ایک پتھر پر کھڑے (گولیاں چلا رہے تھے) کہ دشمن کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ پھر دیکھا تو سید صاحبؒ نہ تھے اور سب ساتھی بھی شہید ہو چکے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ پتھر آج بھی موجود ہے اور مٹی کوٹ کے پہاڑ کی جڑ میں اسی خشک نالے کے قریب ہے جس کے کنارے مختلف راویوں نے سید صاحبؒ کو جنگ کرتے دیکھا تھا۔ پس اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سید صاحبؒ نے اسی چٹان کے قریب کھڑے ہو کر دشمن پر فائرنگ کی۔ یہیں ان کے گولی لگی اور اسی چٹان کے عقب میں ان کی شہادت ہوئی۔

سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد

اس میں شک نہیں کہ سید صاحبؒ مجاہدین کے سردار اور امیر المومنین تھے۔ ان کے زخمی شہید یا گم ہو جانے کی خبر سن کر مجاہدین کا بے قرار ہو جانا ایک طبعی امر تھا۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ سید صاحبؒ کی حفاظت و مدافعت اور اس کے بعد ان کی تلاش میں دیوانہ وار دوڑنے بھاگنے کے دوران سیکڑوں مجاہدین شہید و مجروح ہو گئے لیکن ابھی مجاہدین کے جرنیل حضرت مولانا شاہ اسماعیلؒ موجود تھے اور بعض مورچوں پر مجاہدین بدستور ڈٹے ہوئے تھے۔ اس لئے جنگ جاری رہی لیکن دشمن کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ ہماری تحقیق کے مطابق اب مجاہدین کی قیادت شاہ اسماعیل کر رہے تھے اگرچہ ان کی پیشانی پر زخم لگ چکا تھا اور ان کی ریش مبارک خون سے تر تھی لیکن وہ اپنے مٹھی بھر مجاہدوں کے ساتھ مٹی کوٹ کے پہاڑ سے جانب شمال بدستور جنگ کر رہے تھے۔ اس مقابلے میں سکھوں کے ٹڈی دل لشکر نے یورش کر کے بہت سے مجاہدین کو شہید کر دیا۔ مجبوراً شاہ اسماعیلؒ اور ان کے بچے کھچے ساتھیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ روایات کے مطابق اس کے بعد شاہ صاحبؒ اور ان کے بقیۃ السیف مجاہدین نے ست بنی کا نالہ عبور کر کے دشمن پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ اب مجاہدین کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی اور ان میں سے اکثر کی بندوقیں دلدل میں بھیگ جانے کی وجہ سے خراب ہو چکی تھیں اسلئے سکھ لشکر نے یورش کی اور ست بنی کا نالہ عبور کر کے مجاہدین کے سروں پر جا پہنچا یہاں پھر گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ اس جنگ میں حضرت شاہ اسماعیلؒ متعدد مجاہدین کے ساتھ شہید ہو گئے۔ اب مجاہدین کی بچی کھچی فوج کا کوئی سردار نہ تھا اس لئے انہوں نے پسپائی اختیار کی۔ سکھوں نے تعاقب شروع کیا۔ موضع تپانگ کے پاس جا کر مجاہدین پھر ٹھہر گئے یہاں ایک اور جنگ ہوئی یہ جنگ بندوقوں اور تلواروں سے لڑی گئی۔ یہ معرکہ بالاکوٹ کی آخری جنگ تھی۔ مجاہدین نے تلواریں کھینچ کر بڑی بے جگری سے سکھوں پر حملہ کیا مگر انکی تعداد دشمن کے مقابلے میں نہایت قلیل تھی اس لئے اکثر وہیں شہید ہو گئے اور جو افراد باقی رہ گئے تھے وہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ اس مقام کو نوری میدان کہتے ہیں۔ اس کے قریب ہی قبرستان ہے جس میں بہت سے شہیدوں کی قبریں ہیں۔

مزار حضرت سید احمد شہید کا صدر دروازہ
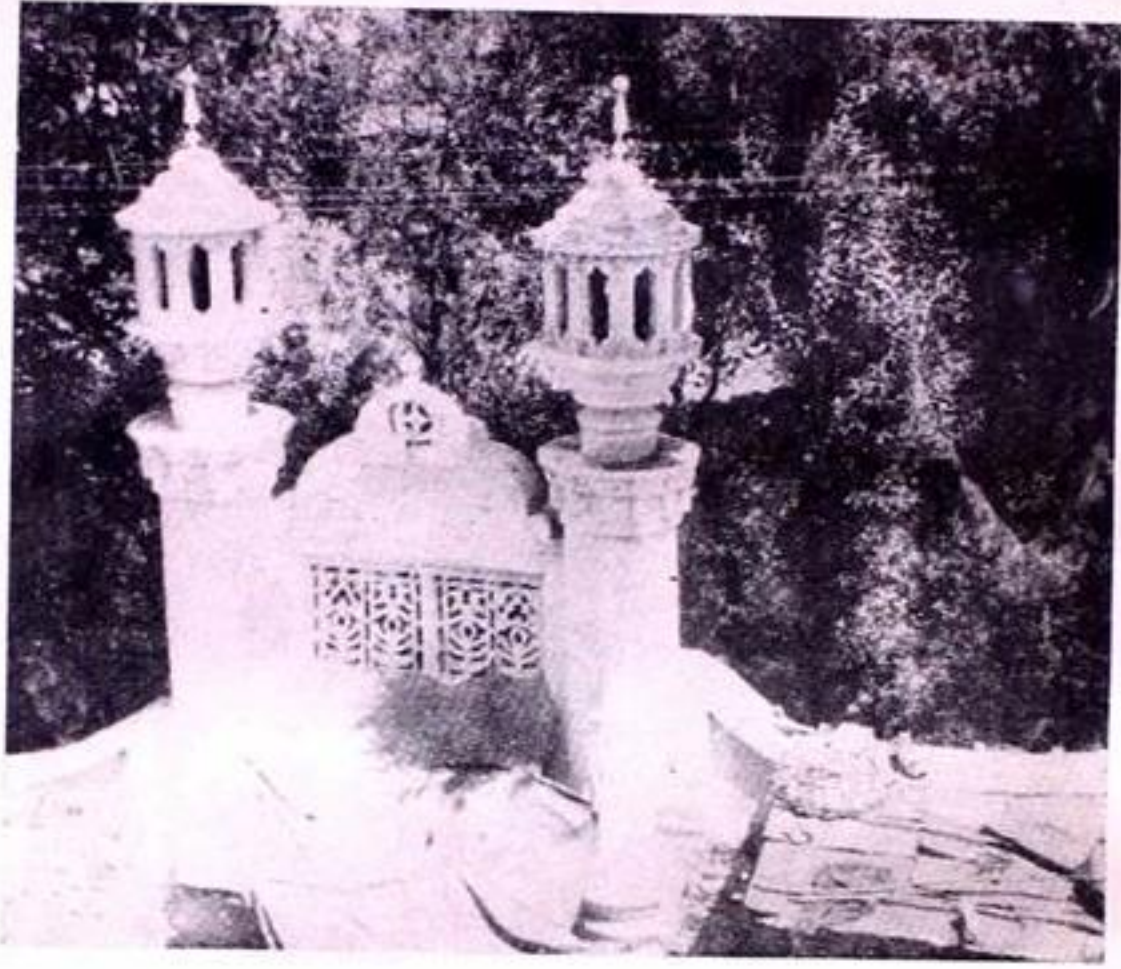
مسجد زیریں
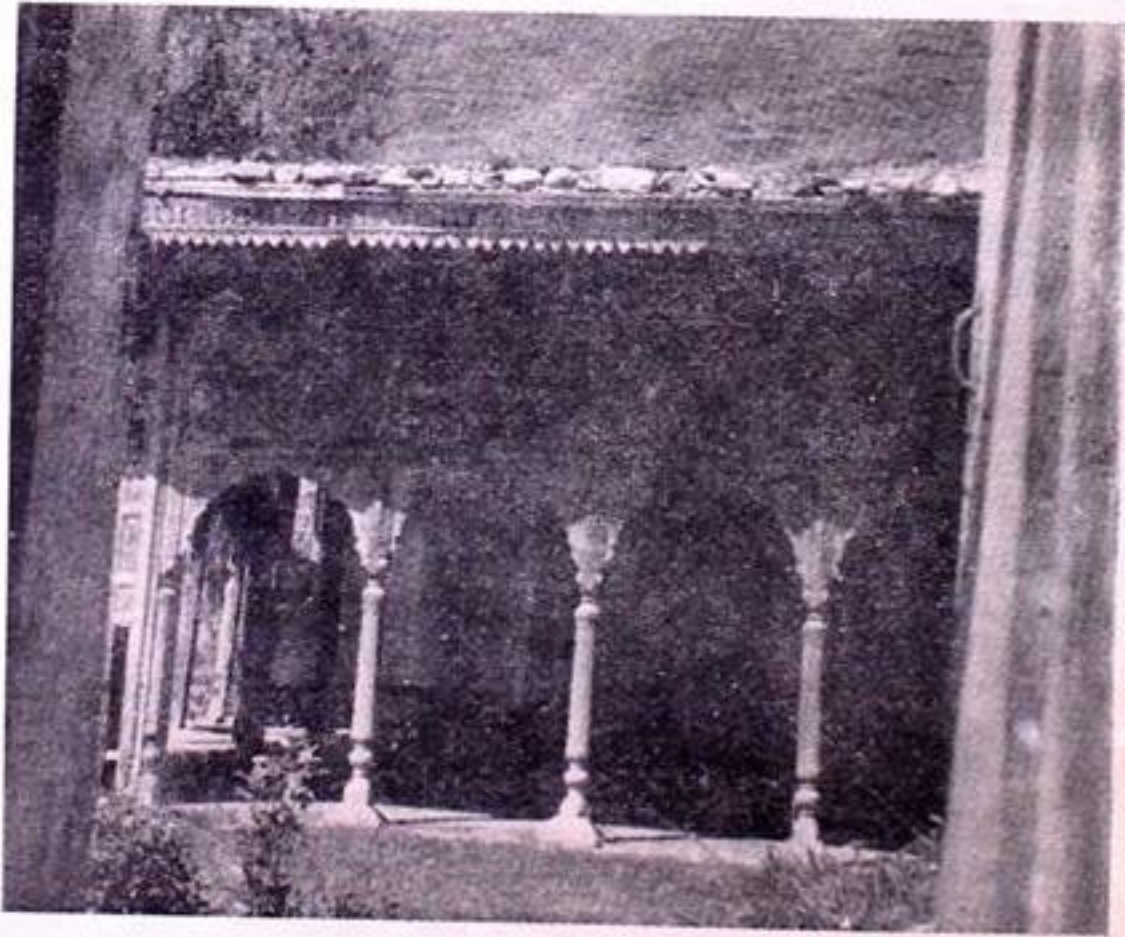
وہ تاریخی مسجد جس میں شہادت سے قبل حضرت سید صاحب رح نے کچھ دیر قیام فرمایا اور یہیں آپ نے غیبی آوازیں سنیں جو آپ کو میدان جنگ کی طرف بلا رہی تھیں۔ یہ مسجد اب تک اپنی اصلی حالت پر قائم ہے۔

مجاہدین کی ایک اور کوشش

مجاہدین کی شکست کے بعد اس جنگ میں زندہ بچ رہنے والے بعض لوگوں شلاً مولانا سید جعفر علی نقوی، ابراہیم خان، امان اللہ خان لکھنوی، شیخ ولی محمد پھلتی اور خضر خان قندھاری نے فیصلہ کیا کہ جب میدانِ جنگ مجاہدین سے خالی ہو گیا ہے تو ہمارے یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں، کچھ اور مجاہدین بھی قصبۂ بالاکوٹ کی طرف جا رہے ہیں پس اگر ہم بھی یہاں سے چلے جائیں اور جو لوگ بالاکوٹ چلے گئے ہیں انہیں اکٹھا کر کے دشمن سے جنگ کریں تو اگرچہ بظاہر فتح کی صورت ممکن نظر نہیں آتی لیکن جب ہم بالاکوٹ میں پناہ لے کر جنگ کریں گے تو عجب نہیں کہ دشمن اپنی جان کے خوف سے بالاکوٹ کی بستی پر حملہ نہ کرے اور اس طرح لشکر اسلام کے دامن سے شکست کا داغ مٹ جائے۔

چنانچہ مولانا سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ :۔

"شیخ ولی محمد آگے آگے اور ہم ان کے پیچھے پیچھے "متحرفاً للقتال" اور "متحیزاً الی فئۃ" (جنگ کی خاطر یا لشکر کے دستے سے ملنے کی خاطر پیچھے ہٹنے میں کوئی حرج نہیں) پر عمل کرتے ہوئے بالاکوٹ کی طرف دوڑ پڑے اور یہ عاجز اپنے دل میں دعا کر رہا تھا کہ خداوندا! تو جانتا ہے کہ ہم جنگ سے نہیں بھاگ رہے بلکہ اصلاحِ جنگ کی خاطر جا رہے ہیں۔ اسی اثناء میں لشکرِ کفار کی بندوقوں کی گولیاں ہماری طرف آئیں جن کی وجہ سے ہمارے کپڑے سوراخ سوراخ ہو گئے۔ راستے میں دھان کے کھیت تھے جن میں سے بعض کمر کمر اور بعض جگہ ان کی اونچائی اس سے بھی زیادہ تھی۔ یہ کھیت ہمارے لئے پناہ گاہ کا کام دے رہے تھے جب ہم اس مقام سے چھلانگ لگا کر نیچے چلے گئے تو بندوقوں کی گولیوں کی زد سے کھیتوں کے قریب کی خشک مٹی اڑ اڑ کر ہمارے سروں پر پڑنے لگی یہاں تک کہ ہم پھر اسی دلدل میں داخل ہو گئے اور اسے عبور کر لیا۔ اس وقت سکھ بالاکوٹ میں داخل ہو کر نعرے مار رہے تھے اور ہمارے تعاقب کا ارادہ کر رہے تھے۔ ہم نے چاہا کہ بالاکوٹ میں داخل ہو کر مورچے بنانے کی تدبیر کریں مگر جب ہم مسجد زیریں کے پاس سے گزرے تو معلوم ہوا کہ سکھوں کا ایک لشکر جنوب کی طرف سے بستی میں داخل ہو گیا ہے۔"[1]

اس صورتحال نے مجاہدین کی اس آخری کوشش کو بھی ناکام بنا دیا اور یہ مختصر سا گروہ دریائے کنہار کی طرف روانہ ہو گیا۔

بالاکوٹ کو آگ لگا دی گئی

مجاہدین کی شکست کے بعد سکھ فوج نعرے مارتی ہوئی بالاکوٹ میں داخل ہو گئی اور اس نے سید صاحبؒ اور مجاہدین کی قیام گاہوں کے علاوہ مکانوں کو بھی آگ لگانی شروع کر دی۔ بالاکوٹ کے اکثر لوگ ایک دن پہلے ہی شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے اسلئے سکھوں کی مزاحمت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ انہوں نے مکانوں کو لوٹ لیا، بیمار مجاہدین کو ان کے بستروں پر ہی شہید کر دیا۔ اکا دکا مجاہد جو اپنے فرائض کے سلسلے میں متعدد مقامات پر متعین تھے، سکھ لشکر کے نظالم کا نشانہ بنے اور ان میں سے کوئی زندہ نہ بچا۔ اس لوٹ مار میں علاوہ اور چیزوں کے سید صاحبؒ کی قیامگاہ سے آٹھ زنبورکیں، ایک ہاتھی، بارہ گھوڑے اور چند خچر سکھوں کے قبضے میں آئے۔ چنانچہ منشی مہتاب سنگھ لکھتے ہیں :۔

"ڈیرہ خلیفہ مع خان ہا ساکنانِ دہ بالاکوٹ غارت نمودند کوٹھہائے بالاکوٹ را آتش دادند و سوختند ہشت زنبورہ یک فیل، دوازدہ راس اسپاں و چند راس قاطراں غارت ڈیرہ خلیفہ بدست سپاہیانِ لشکرِ سکھاں را بدست آمدہ۔"[2]

---

[1] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۱۸۰ تا ۱۱۹۱

[2] تاریخ منشی مہتاب سنگھ (قلمی) صفحہ ۹۹

دو مجاہدوں کی سرفروشی

دریا عبور کرنے کے بعد یہ لوگ پن چکیوں کے قریب پہنچ گئے۔ اسی اثنا میں الٰہی بخش رامپوری بھی چند مجاہدین کے ساتھ آگئے۔ بقیۃ السیف مجاہدین کی یہ جماعت ایک پشتے پر کھڑی تھی کہ بعض سکھوں نے دریا عبور کرکے ان پر بندوقیں سر کرنا شروع کر دیں۔ اس موقعے پر دو غازی جو شاید پن چکیوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے تلواریں کھینچ کر نکلے اور ان سکھوں پر حملہ کر دیا۔ سکھوں نے بھی تلواریں کھینچ لیں۔ یہ دیکھ کر شیخ ولی محمد نے کہا کر چلو ہم بھی ان غازیوں کی مدد کریں۔ ابھی یہ لوگ چند قدم ہی آگے گئے تھے کہ وہ دونوں مجاہد کفار کے محاصرے میں داد شجاعت دیتے ہوئے مقام شہادت پر فائز ہو گئے۔ اس مقابلے میں چند سکھ بھی ہلاک و مجروح ہوئے۔

حسن خان بنارسی کی غیرت ایمانی

جب سکھ بالاکوٹ میں داخل ہو کر ہتھیاروں اور سامان پر قبضہ کر رہے اور زخمیوں کو شہید کر رہے تھے تو ان میں سے چند سکھ حسن خان بنارسی کی طرف بڑھے جو غشی کی حالت میں تھے۔ سکھوں نے انہیں مردہ سمجھ کر ان کا طپنچہ کمر سے کھینچا۔ یہ طپنچہ چمڑے کی پٹی کیساتھ بندھا ہوا تھا۔ اسلئے جھٹکا لگنے سے انہیں ہوش آگیا۔ انہوں نے دیکھا کہ سامنے کافر کھڑے ہیں۔ چونکہ ان کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر تھا پس سکھوں کو دیکھ کر ان پر ایک جوش کی کیفیت طاری ہوئی اور انہوں نے تلوار کھینچ کر ان میں سے ایک سکھ کا کام تمام کر دیا۔ بعد میں سکھوں نے حملہ کرکے انہیں شہید کر دیا[1]۔ یہ واقعہ بیان کرکے مولوی جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ:۔

سبحان اللہ ان دین دار غازیوں میں کیسی جرأت تھی کہ آخری دم تک خدا کے دشمنوں سے انتقام لیتے رہے۔

ارباب بہرام خان کی شہادت و تدفین

ارباب بہرام خان مضافات پشاور کے مقام تہکال کے مشہور سردار تھے۔ یہ مقام پشاور سے جنوب کی طرف واقع ہے۔ جس وقت سید صاحب علاقہ یوسف زئی میں تشریف لائے تو وہ آپ کے دست مبارک پر بیعت کرکے زمرۂ مجاہدین میں شامل ہو گئے۔ ارباب بہرام خاں سید صاحبؒ کے ان جانثاروں میں سے تھے جنہوں نے ہر قدم پر آپ کی رفاقت کی اور آخر کار اپنی جان بھی اُن پر سے قربان کر دی۔ وہ ہر معرکے میں سید صاحبؒ کے ساتھ رہے اور جنگ بالاکوٹ میں انہیں متعدد مقامات پر مختلف دستوں کا سردار مقرر کیا گیا۔ انہوں نے ہر مرحلے میں اپنے فرائض نہایت بے خوفی اور جرأت سے ادا کئے۔ افسوس کہ اُن کی زندگی کے آخری لمحات اور کیفیت شہادت کے متعلق معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ جس وقت سید صاحبؒ مسجد زیریں سے نکل کر راستے میں چند منٹ کے لئے ٹھہرے تو ارباب بہرام خاں آپ کے بائیں پہلو میں تھے۔ اس کے بعد جنگ کے نشیب و فراز نے ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا اور سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ارباب بہرام خاں سکھوں سے جنگ کرتے ہوئے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی قیادت میں ست بنی کے نالے کی طرف پسپا ہوئے، وہیں داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے اور اسی مقام پر شاہ اسماعیل شہیدؒ کے مزار مبارک کے قریب انہیں سپرد خاک کیا گیا۔ اس واقعے کے چھ ماہ بعد ارباب بہرام خان کے بھتیجے محمد خان نے اپنی قوم کے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ میرا چچا خالص نیت سے لشکر اسلام میں شریک ہوا تھا۔ میں اس کا جسم بالاکوٹ سے لا کر اپنے وطن میں دفن کروں گا۔ اُسکے قبیلے کے لوگوں نے اسے اس اقدام سے روکا اور کہا اس واقعے پر چھ ماہ گزر چکے ہیں معلوم نہیں نعش کا کیا حال ہو چکا ہو گا۔ ان ہڈیوں کو وہاں سے اکھیڑ کر لانیکی کیا ضرورت ہے جہاں وہ دفن ہیں وہیں رہنے دو۔ محمد خاں نے کہا کہ جس شخص نے اپنا

---

[1] منظورۃ السعداء صفحہ ۱۱۹۶

تمام مال خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیا۔ یہانتک کہ اپنی جان بھی جانِ آفریں کے سپرد کر دی تو میں خیال بھی نہیں کر سکتا کہ اس کے بدن کو زمین نے کھالیا ہوگا۔ غرض اس نے ایک صندوق تیار کروایا اور اپنی قوم کے چالیس افراد کو لیکر بالاکوٹ پہنچا جب اس نے چاہا کہ اپنے چچا کی قبر کھودے تو بالاکوٹ کے مسلمانوں نے منع کیا مگر اس نے کسی کی نہ سنی جب قبر کھولی گئی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ارباب بہرام خان کا جسم مبارک ابھی دفن ہوا ہے۔ البتہ ان کے ایک پیر کی ایک انگلی میں ذرا سا تغیر رونما ہوا تھا پس نعش کو صندوق میں رکھ کر تہکال لے جایا گیا۔ وہاں کے ہزارہا لوگوں نے ارباب شہید کی زیارت کی اور تہکال ہی میں سپرد خاک کر دیا گیا جہاں آج بھی ان کا مزار موجود ہے۔[1]

متفرق واقعات

سید صاحبؒ کے بالاکوٹ تشریف لانے کے وقت سے لیکر آپ کی شہادت تک جو اہم اور قابلِ ذکر واقعات پیش آئے ان کی تفصیل درج کر دی گئی ہے کچھ متفرق واقعات جو سلسلۂ بیان میں نہ آسکے وہ یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ مظفر آباد میں سلطان زبردست خاں کی کمزوری اور سکھ لشکر کی آمد کے بعد جب مجاہدین وہاں سے روانہ ہوئے تو ان میں سے بعض راستوں کی خرابی کی وجہ سے تاخیر سے پہنچے اُسوقت بالاکوٹ کا معرکہ ختم ہو چکا تھا چنانچہ مولینا سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ :۔ "جس روز مجاہدین کو شکست ہوئی اور بالاکوٹ کو آگ لگا دی گئی اسی روز مولوی خیرالدین شیر کوٹی کے بعض ہمراہی جو بڑے شوق سے جنگ میں شرکت کرنے کیلئے آرہے تھے بالاکوٹ پہنچے اور ہماری شکست کی خبر سن کر پژمردہ ہو گئے اور آخر وہ ہمارے رفیق بن گئے جب ہم نے اُن سے مولوی خیرالدین صاحبؒ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ بیمار ہونے کی وجہ سے کاغان کے راستے میں ہیں"۔ جنگ بالاکوٹ میں جو لوگ شہید اور زخمی ہوئے ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔

یہاں بعض غازیوں اور شہداء کے متعلق سرسری اشارے کئے جاتے ہیں۔ ان شہداء میں نور احمد نگرامی نہایت پائے کے اہل قلم تھے۔ انہوں نے نورِ احمدی کے نام سے سید صاحبؒ کا تذکرہ بھی لکھا تھا۔ دھان کے کھیتوں میں سکھوں پر گولیاں چلا رہے تھے کہ دشمن کی ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور انکے بازو میں پیوست ہو گئی۔ یہ دیکھکر انہوں نے مولوی محمد امیر خاں قصوری کو آواز دی کہ بھائی میں معذور ہو گیا۔ میرے پاس جو چیزیں ہیں وہ لے لو۔ امیر خاں قصوری نے بندوق کی گولیاں ان سے لے لیں۔ اسکے بعد ان کے ایک اور گولی لگی اور وہ وہیں بیٹھ گئے۔ ان کی شہادت کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ وہیں شہید ہوئے کہ کہیں آگے جاکر۔ الٰہی بخش خاں رامپوری سکھوں کے ایک نرغے میں آگئے۔ انہوں نے بڑی مردانگی سے سکھوں کے اس گروہ پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ سکھ بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اسی دوران میں دشمن کی ایک گولی ان کے دائیں بازو پر لگی اور وہ زخمی ہو گئے۔ امام الدین بودھانوی بڑے پرجوش نوجوان تھے عمر یہی کوئی سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ ایک دیوقامت سکھ نے تلوار کھینچ کر ان پر حملہ کیا۔ اسوقت ان کی گولیاں ختم ہو چکی تھیں اسلئے انہوں نے اپنی خالی بندوق کی نالی کا رخ اس سکھ کی جانب کر دیا سکھ گھبرا گیا۔ اسی دوران میں ایک غازی نے سکھ مذکور پر کسی چیز سے حملہ کیا۔ اس نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا یہ دیکھ کر امام الدین بودھانوی نے بڑی تیزی سے تلوار کا ایک ہاتھ مارا سکھ زخمی ہو کر گر پڑا مگر گلا پوری طرح نہ کٹ سکا۔ ایک اور مجاہد نے پتھر مار کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ جسوقت مجاہدین کے زوردار حملے کے بعد سکھ شکست کھا کر مٹی کوٹ کے پہاڑ پر چڑھنے لگے تو جن مجاہدین نے ان کا تعاقب کیا ان میں محمود خان لکھنوی بھی شامل تھے۔ انہوں نے تلوار اپنے دانتوں میں دبائی اور ایک بھاگتے ہوئے سکھ کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر پہاڑ سے نیچے کھینچنے لگے۔ پہاڑ کے اوپر والا سکھ اپنے ساتھی کو اوپر کی جانب کھینچ رہا تھا محمود خاں نے اس زور سے جھٹکا دیا کہ دونوں سکھ لڑھکتے ہوئے نالے میں آن گرے اور دونوں کا خاتمہ ہو گیا کریم اللہ خاں میواتی اگرچہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں گولی لگنے سے زخمی

---

[1] منظورۃ السعداء ص ۱۲۰۳

ہو چکے تھے لیکن ہمت و شجاعت کا یہ حال تھا کہ جب زرہ بکتر میں غرق ایک سکھ ان پر تلوار کھینچ کر حملہ آور ہوا تو انہوں نے اس زور سے وار کیا کہ اس کی زرہ سے ٹکرا کر انکی تلوار ٹیڑھی ہو گئی۔ اسی دوران میں سکھ کسی غازی کی گولی کھا کر زمین میں گر چکا تھا اسکے بعد دو اور سکھوں نے ان پر حملہ کرنا چاہا۔ کریم اللہ خان نے اپنی بندوق کی نالی کا رخ ان کی طرف کیا اور وہ دونوں وہیں ٹھٹھک کر رہ گئے۔ کریم اللہ خان کا شمار ان لوگوں میں ہے جو اگر چہ اس جنگ میں زخمی ہوئے مگر میدان سے صحیح سلامت نکل گئے۔ سید صاحبؒ کے دستہ خاص میں جو لوگ شامل تھے ان میں سے اکثر شہید ہو گئے چنانچہ شیخ عبدالرؤف بھلتی، شاہ محمد، دادا ابوالحسن نصیر آبادی اور نور بخش جراح کی لاشیں پہچان لی گئیں۔ بلو خان دیوبندی اور میاں جی چشتی بھی ان لوگوں میں تھے جو سید صاحبؒ کے قریب جنگ کر رہے تھے۔ خیال ہے کہ ان لوگوں نے وہیں کہیں شہادت پائی۔ پانی پت کے ایک نوجوان مجاہد نے تلوار کھینچی اور ایک دیو قامت سکھ پر حملہ کر دیا حملے کے دوران دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اسلئے دونوں میں سے کوئی کسی کی ایسا زخم نہ لگا سکا جو مہلک ثابت ہوتا۔ البتہ دونوں کے زخم ضرور آئے جن سے خون بہہ جانیکی وجہ سے دونوں زمین پر گر پڑے۔ اتنے میں ایک شمشیر بدست سکھ نے دوڑ کر اس بہادر پانی پتی مجاہد کا سر کاٹ دیا۔

ناصر خاں بٹ گرامی

ناصر خاں بٹ گرامی اپنے علاقے کے سردار اور سید صاحبؒ کے نہایت مخلص فدائی تھے۔ اثنائے جنگ میں زخم لگنے سے ایک ہاتھ بیکار ہو گیا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ آپ میدان سے چلے جائیں مگر ان کی حمیت نے گوارا نہ کیا اور ایک ہاتھ سے تلوار چلاتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے ہاتھ پر بھی گولی لگی جب دونوں ہاتھ بیکار ہو گئے تو میدان سے نکلے۔ یہی ناصر خاں اپنی رہنمائی میں بقیۃ السیف مجاہدین کو لیکر بٹ گرام گئے تھے اور انہوں نے ان مجاہدین کے قیام و طعام کا انتظام کیا تھا۔

سید صاحبؒ کی شہادت کی خبر سن کر اس خبر کی تصدیق اور سید صاحبؒ کی تلاش کے دوران جو لوگ شہید ہوئے اُن میں آپ کے مشہور جاں نثار مرزا احمد بیگ پنجابی بھی شامل تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ مرزا صاحب میدان جنگ میں سید صاحبؒ کو تلاش کرتے ہوئے دیوانہ وار دوڑ رہے تھے کہ دشمن کی گولی سے جاں بحق ہوئے۔

عبدالجبار خاں شاہجہان پوری

شاہجہان پور صوبہ جاتِ متحدہ آگرہ و اودھ کا نہایت مشہور و مردم خیز خطہ اور سیکڑوں سال سے جنگجو افغانوں کا مسکن ہے۔ اس سرزمین نے بڑے بڑے صاحبانِ علم و فضل اور اہل اللہ کو بھی جنم دیا۔ خود حضرت سید صاحبؒ کے عہدِ مبارک میں ایک بزرگ خلیل شاہ نامی شاہجہانپور میں موجود تھے جو اپنی روحانی بلندی کے علاوہ علم و فضل میں بھی یگانہ تھے۔ سید صاحبؒ اپنے تبلیغی سفر میں ان بزرگ سے ملنے شاہجہان پور تشریف لے گئے تھے۔ شاہ اسماعیلؒ نے بھی سید صاحبؒ کی معیت میں خلیل شاہؒ سے ملاقات کی تھی۔ شاہجہانپور کے دوران قیام میں وہاں کے بہت سے افغانوں نے آپ کی زیارت و بیعت کی اور ان میں سے بعض مہماتِ جہاد میں بھی آپ کے رفیق ہوئے۔ ان میں سے عبدالجبار خاں کا ذکر تاریخ میں آتا ہے جو شاہجہانپور کے افاغنہ میں سے تھے۔ ابتدا ہی میں سید صاحبؒ کی تحریک سے وابستہ ہو گئے اور متعدد جنگوں میں دادِ شجاعت

دی۔ آخر بالاکوٹ کی جنگ میں شہادت پائی افسوس کہ کیفیتِ شہادت کا پتہ نہ چل سکا۔

شہدائے بالاکوٹ کی تعداد

مورخین اور تذکرہ نویسوں کا اس امر میں اختلاف ہے کہ سید صاحبؒ کے ساتھ بالاکوٹ میں کتنے مجاہد شریک تھے اور ان میں سے کتنوں نے شہادت پائی۔ مگر جب ہم ان بیانات کا تجزیہ کرتے اور مستند روایات کی روشنی میں اصل حقائق معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا جعفر علی نقوی کا بیان ہے کہ جنگِ بالاکوٹ ختم ہونے کے بعد جب غازی جمع ہوئے نو سات سو کے قریب تھے (ان میں کثرت ان لوگوں کی تھی جو زخمی ہو جانے کی وجہ سے جسمانی لحاظ سے ناکارہ ہو چکے تھے) منشی مہتاب سنگھ لکھتے ہیں کہ جنگِ بالاکوٹ میں چار سو مجاہدین نے خلیفہ (سید احمد صاحبؒ) پر سے پروانہ وار اپنی جانیں فدا کر دیں۔ ہمارے خیال میں یہ دونوں مستند مورخ تھے اور دو چار ضعیف روایات کے علاوہ ان دونوں نے واقعات نہایت محتاط طریقے سے قلم بند کئے ہیں۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ بالاکوٹ میں سید صاحبؒ کے ساتھ گیارہ سو غازی تھے جن میں سے چار سو نے شہادت پائی۔ سکھوں کے سات سو افراد اس جنگ میں ہلاک ہوئے۔

مجاہدین کی بالاکوٹ سے واپسی

سید صاحبؒ کی شہادت اور مجاہدین کی شکست کے بعد جو لوگ صحیح سلامت میدانِ جنگ سے نکل آئے ان میں سے کچھ ستن بنی کے راستے بالاکوٹ سے روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک چشمہ آیا وہاں غازیوں نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ اس کے بعد یہ قافلہ یہاں سے روانہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد ایک گاؤں میں پہنچ کر شیخ محمد پھلتی نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر کہا کہ میرے پاس یہی کچھ ہے۔ چنانچہ اس روپے کی مکئی تقسیم کر دی گئی۔ شیخ محمد پھلتی نے اس مقام کے بعض گوجروں کو بلا کر کہا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص بالاکوٹ جا کر حضرت امیر المومنین اور ہمارے لشکر والوں کا حال معلوم کر آئے تو ہم اس کو انعام دیں گے۔ گوجروں نے کہا یہ وقت بالاکوٹ جانے کا نہیں۔ اپنی جان کو کون ہلاکت میں ڈالے۔ دیکھو سکھوں نے بالاکوٹ کو آگ لگا دی ہے اور وہ جل رہا ہے۔

بچے کھچے مجاہدین کا یہ قافلہ شام کے قریب موضع اکرائی پہنچا جو ناصر خاں کا گاؤں ہے۔ رات اس بستی میں گزار کر صبح کو ناصر خاں اور ان کے ہمراہیوں کی قیادت میں یہ قافلہ پہاڑی راستے سے روانہ ہوا۔ غازیوں کو پہاڑ پر چڑھتے وقت تو کوئی دقت پیش نہ آئی البتہ نیچے اُترتے وقت بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا جعفر علی نقوی جو اس قافلے میں تھے لکھتے ہیں کہ ہم میں سے جو افغان تھے وہ تو اس طرح تیزی سے اُتر گئے جس طرح کوئی کشتی کے ذریعے دریا عبور کرتا ہے[۲] مگر ہندوستانیوں کے لئے بہت مشکل تھی۔ ایک تو مصائب اٹھا اٹھا کر

---

[۱] "متعدد واقعات" کے تحت جو کوائف درج کئے گئے ہیں، وہ "منظورۃ السعدا" کے علاوہ "وقائع احمدی" جلد سوم سے ماخوذ ہیں بحوالہ سید احمد شہیدؒ صـ ۴۲۳ تا صـ ۴۲۶۔

[۲] منظورۃ السعدا صـ ۱۱۹۵

کمزور ہو گئے تھے۔ پھر فاقہ زدہ بھی تھے۔ بڑی مشکل سے عصا اور بندوق کے سہارے سے نیچے آئے اور ایک بستی میں پہنچے۔ اس دیہہ کے رہنے والوں نے ہماری خوب تواضع کی اور مہمان نوازی کا حق ادا کر دیا۔ صبح وہاں سے کوچ کر کے عصر کے قریب موضع شملئی پہنچے جہاں ہمارا ایک دستہ پہلے سے مقیم تھا۔

سید صاحبؒ کی حرمِ محترم کی خدمت میں

دوسرے دن یعنی ۲۷ ذی قعدہ کو ہم چند لوگ شیخ ولی محمد کے ساتھ تمام بنے سر سید صاحبؒ کی زوجۂ محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب سیدہ محترمہ نے ہماری آمد کی خبر سُنی تو آپ نے سولہ روپے فرخ آبادی ہمارے خرچ کے لئے عطا کئے۔ یہ رقم سیدہ محترمہ کو ہندوستان کے بعض مخلصین نے بھیجی تھی شیخ ولی محمد نے فرمایا کہ جناب حرمِ محترم (ہم پر کتنی مہربان ہیں، کہ اپنے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ ہمیں گمان بھی نہ تھا کہ وہ اتنی رقم بھیج دیں گی۔ اس وقت ہم نے ممدوحہ کی دختر کو بھی دیکھا۔ اس بچی کی شکل و صورت اپنے والد گرامی کا نمونہ تھی اسے دیکھ کر ہم میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھیں اشک بار نہ ہو گئی ہوں۔ اس موقعہ پر شیخ ولی محمد نے جناب مخدومہ سے دریافت کیا کہ اگر آں جناب کا ارادہ اپنے والدین کے پاس کا شغر جانے کا ہو تو آپ کو وہاں پہنچانے کی تدبیر کی جائے اور اگر آپ حضرت امیر المومنین کی دوسری بیویوں کے ساتھ رہنا پسند فرمائیں تو سامانِ سفر اس طرف کے لئے باندھا جائے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ مجھے اپنے والدین کے پاس جانا منظور نہیں کیونکہ ان کا عقیدہ خراب ہے۔ مجھے سید صاحبؒ کی دوسری بیویوں کے ساتھ رہنا پسند ہے تاکہ ان کی صحبت کی برکتوں سے ہدایت کا نور حاصل کر سکوں۔ (منظورۃ السعداء ص ۱۱۹۶)

چونکہ جنگ کے بعد غازی بے سروسامان ہو چکے تھے اور اس لباس کے سوائے جو اُن کے جسم پر تھا اور کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی۔ اس لئے سید صاحبؒ کی حرم محترم نے خیموں کو کاٹ کر اُن کے ٹکڑے ہر شخص کو دیئے تاکہ بستر کا کام دے سکیں۔

جنگِ بالاکوٹ کی شکست کے اسباب

بالاکوٹ کے محلِ وقوع اور اس کے قدرتی دفاع کو دیکھتے ہوئے بہ ظاہر حیرت ہوتی ہے کہ اس محفوظ ترین مقام پر سید صاحبؒ کیسے شکست کھا گئے؟ بالاکوٹ تین طرف سے بلند و بالا پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ آجکل ایبٹ آباد اور مانسہرہ سے جو سڑک بالاکوٹ سے ہوتی ہوئی کاغان کو جاتی ہے سید صاحبؒ کے زمانے میں اس کا کہیں وجود نہ تھا۔ پہاڑوں میں سے پتلی پتلی پگڈنڈیاں گزرتی تھیں جن پر سے آمد و رفت بہت دشوار تھی۔ جنوب کی طرف سے آنے کے لئے دریا عبور کر کے گذرنا پڑتا تھا۔ اس راستے کی حفاظت کا سید صاحبؒ نے نہایت معقول انتظام کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سکھ لشکر نے اس طرف سے حملہ آور ہونے کی کوشش میں ناکام ہو کر پہاڑوں کا راستہ اختیار کیا۔ مٹی کوٹ کے پہاڑ تک پہنچنے کے لئے شہید گلی کے مقام پر سید صاحبؒ نے ایک چوکی قائم کر دی تھی جس پر مجاہدین کے علاوہ مقامی لوگوں کی بھی ایک جمعیت متعین تھی۔ مزید احتیاطی اور دفاعی تدابیر کے طور پر حملہ سے ایک رات قبل چشموں کے منہ کھلوا کر دھان کے

کھیتوں میں پانی بھروا دیا گیا تھا تاکہ اگر دشمن کا لشکر پہاڑ سے نیچے اُترنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو کھیتوں میں دلدل کی صورت پیدا ہو جانے کی وجہ سے اسے نقل و حرکت کرنے میں دشواری پیش آئے۔ ادھر مجاہدین خشک جگہ پر ہونے کی وجہ سے نہایت تیزی سے نقل و حرکت کریں اور دشمن پر پھرتی سے پے در پے حملے کرکے اسے دلدل ہی میں تباہ کر دیں۔ پھر آپ نے خاص بالاکوٹ کی حفاظت کا بھی نہایت مستحکم انتظام کر دیا تھا۔ قصبے کے شمال، جنوب اور سامنے تینوں جانب مورچے قائم کر دیئے تھے تاکہ اگر دشمن دلدل میں سے بھی بچ نکلے تو تینوں طرف سے مجاہدین اس پر تابڑ توڑ حملے کرکے اسے غارت کر دیں۔ بالاکوٹ کی بلندی پر بھی مورچے قائم تھے تاکہ ان مورچوں میں متعین غازی اوپر سے دشمن پر فائرنگ کرکے اس کا صفایا کر دیں۔ بظاہر یہ نہایت موثر دفاعی اسکیم تھی مگر اس کے باوجود سید صاحبؒ شکست کھا گئے۔ اس کے کچھ اسباب تھے۔ افسوس کہ ان اسباب کو نظر انداز کرکے بعض لوگوں نے یہ "فتویٰ" دے دیا کہ سید صاحبؒ فنِ جنگ سے واقف نہ تھے۔

سید صاحبؒ کی جنگی صلاحیت

جن لوگوں نے سید صاحبؒ کے سوانح کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ بالاکوٹ کی جنگ پہلا معرکہ نہ تھا جس کی آپ نے قیادت کی۔ اس سے پہلے آپ متعدد جنگوں میں حصہ لے چکے تھے اور دشمن کو متعدد بار شکست بھی دے چکے تھے۔ ایسا بھی نہ تھا کہ اچانک مسندِ رُشد و ہدایت سے اُٹھ کر آپ نے سیدھا میدانِ جنگ کا رُخ کیا اور بلا کسی سابقہ تجربے کے دشمن سے نبرد آزما ہو گئے۔ آپ کے تمام سوانح نگار جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں متفق ہیں کہ سید صاحبؒ نے علومِ ظاہری و باطنی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد باقاعدہ عسکری زندگی کا آغاز کیا اور وسطِ ہند کے ایک بہادر حکمران نواب امیر خاں کے لشکر میں شامل ہو کر سات سال تک فنِ جنگ کی تربیت حاصل کی۔ شہ سواری، نیزہ بازی، شمشیر زنی اور بندوق چلانے کی نہ صرف تربیت حاصل کی بلکہ اس میں کمال بھی حاصل کر لیا۔ اس سات سالہ عسکری زندگی کا آغاز آپ نے ایک معمولی سوار کی حیثیت سے کیا مگر اپنی ذاتی شجاعت، جذبۂ جہاد اور قائدانہ صلاحیتوں کی بدولت اتنی ترقی کی کہ ایک جنگ میں آپ نے ہراول دستے کی قیادت بھی کی۔ نواب امیر خاں نے اپنے دشمنوں سے جتنی جنگیں کیں ان میں سے اکثر میں آپ نے شرکت کی اور ایک جنگ میں گولی لگنے سے زخمی بھی ہوئے۔ اس طرح سید صاحبؒ کو فنِ جنگ میں نہ صرف پوری طرح مہارت حاصل ہو گئی بلکہ جنگ کے نشیب و فراز سے واقف ہونے کے علاوہ انہیں میدانِ جنگ میں قیادت کا بھی تجربہ حاصل ہو گیا۔

سید صاحبؒ کی جنگی صلاحیت کا پہلا اظہار

اس کے بعد آپ کی مہمات جہاد کا آغاز ہوا۔ پہلی جنگ اکوڑہ کے مقام پر ہوئی۔ اس جنگ کا سارا نقشہ آپ ہی نے تیار کیا۔ جنگجو افراد کا خود انتخاب کیا۔ مجاہدین کو جنگ کے لئے روانہ کرنے کے بعد دریائے

لُنڈہ کے کنارے ایک دستہ متعین کر دیا تاکہ اگر سکھ لشکر مجاہدین کا تعاقب کرنے کی کوشش کرے تو یہ دستہ اس کی مزاحمت کر کے جنگ میں اُلجھائے اور ادھر غازی سکھوں کی لشکرگاہ کا صفایا کرتے رہیں۔ یہ اسکیم نہایت کامیاب ثابت ہوئی اور مجاہدین نے سکھوں کو سخت مالی و جانی نقصان پہنچایا، کثیر مقدار میں اسلحۂ جنگ، گھوڑے اور دوسری قیمتی اشیا مجاہدین کے ہاتھ لگیں۔ اس جنگ میں ۸۲ افراد مجاہدین کے شہید ہوئے اور ایک ہزار سکھ ہلاک ہوئے اور ان پر ایسی ہیبت طاری ہُوئی کہ بہت سے افراد اپنی لشکرگاہ سے بھاگ نکلے۔ حتیٰ کہ سکھ جرنیل سردار بُدھ سنگھ نے گھبرا کر اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دیا اور اکوڑہ سے پسپا ہو کر جنوب کی طرف چار میل پیچھے شیدو کے مقام پر پڑاؤ ڈالا حالانکہ اس وقت سکھ فوج کی تعداد سات ہزار سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھی اور سردار بدھ سنگھ سندھانوالہ، سردار شام سنگھ اٹاری والا، سردار گلاب سنگھ اور سردار سوچیت سنگھ جیسے تجربہ کار اور جنگجو سکھ جرنیل اس لشکر میں موجود تھے۔ ادھر حملہ آور مجاہدین کی تعداد صرف نو سو تھی اور ان میں سکھ جرنیلوں کے پایہ کا ایک شخص بھی موجود نہ تھا مگر اس کے باوجود مجاہدین کی کامیابی اور سکھوں کا نقصانِ عظیم اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے بعد سیّد صاحبؒ کی جنگی تدابیر نہایت موثر ثابت ہوئیں اگر مقامی لوگ لوٹ مار میں مصروف نہ ہو جاتے تو یقیناً اس جنگ کے نتائج اور زیادہ حوصلہ افزا اور سکھوں کے لئے کہیں زیادہ تباہ کُن ثابت ہوتے۔ یہ پہلی جنگ تھی جو مجاہدین اور سکھوں کے درمیان ہُوئی۔ اس کے نتائج کو دیکھ کر یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ سیّد صاحبؒ فنِ جنگ سے واقف نہ تھے۔

سیّد صاحبؒ کی جنگی صلاحیت کا دوسرا اظہار

سیّد صاحبؒ کی غیر معمولی جنگی صلاحیت کا دوسری بار اظہار اس وقت ہُوا جب سکھ فوج نے جرنل ونٹورا کی قیادت میں سیّد صاحبؒ کے مرکز پنجتار (واقع ضلع مردان) پر حملہ کیا۔ اس موقع پر آپ نے جنگ کا جو دفاعی نقشہ تیار کیا اسے دیکھ کر ہر منصف مزاج اور فنِ جنگ کے ماہر کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ میں ذاتی شجاعت کے علاوہ غیر معمولی قائدانہ صلاحیتیں بھی تھیں اور آپ اپنے زمانے کے بہترین جرنیل تھے۔

اب سیّد صاحبؒ کا دفاعی نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔ دشمن کے لئے پنجتار تک پہنچنے کے دو ہی راستے تھے ایک پگڈنڈی تھی جس سے توپ خانہ اور بڑا لشکر نہیں گزر سکتا تھا صرف دستی اسلحہ اور مختصر پیدل فوج گزر سکتی تھی۔ دوسرا راستہ درے میں سے ہو کر پنجتار تک پہنچتا تھا اس میں سے توپ خانہ اور سواروں کے بڑے بڑے لشکر گزر سکتے تھے۔ سیّد صاحبؒ نے دونوں کی حفاظت کا نہایت مستحکم انتظام کیا۔ ایک دیوار درّے کے سامنے اس طرح بنوائی کہ دائیں اور بائیں طرف کے پہاڑوں سے مل گئی اور باہر سے آنے والوں کا راستہ بند ہو گیا۔ یہ دیوار بلندی میں قدِ آدم اور چوڑائی میں چار ہاتھ تھی۔ اس کے عقب میں آپ نے چار چوکیاں قائم کیں، دو پر قندھاری غازیوں کو اور دو پر ہندوستانی مجاہدین کو مقرر کیا۔ دو دو مورچے دائیں اور بائیں جانب پہاڑوں پر بنوائے۔ ان میں مجاہدین کو متعین کر کے حکم دیا کہ جب تمہیں دشمن کی آمد کا علم ہو جائے تو اپنی بندوقیں سر کر دینا تاکہ دفاعی دیوار کے قریب متعین مجاہدین آگاہ ہو جائیں اور پھر ان کے پاس پہنچ جانا۔ سواروں کا ایک دستہ اس غرض کے لئے مقرر کیا تاکہ رات کو گشت لگا کر دشمن کی

ا؎ ظفر نامۂ رنجیت سنگھ صفحہ ۱۷۲ مولف دیوان امرناتھ۔

نقل و حرکت پر نظر رکھے۔ دوسری دیوار پگڈنڈی کے سامنے تعمیر کروائی۔ یہ چالیس گز سے کچھ زیادہ طویل تھی۔ اس طرح اس طرف سے بھی دشمن کا راستہ مسدود ہو گیا اور پنجتار نے ایک مستحکم قلعے کی صورت اختیار کر لی۔ جس وقت دشمن کی آمد کا علم ہوا تو سید صاحبؒ نے مرزا احمد بیگ پنجابی کو مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ جو سو افراد پر مشتمل تھی حکم دیا کہ تم دائیں طرف کے پہاڑ پر چلے جاؤ مگر دشمن پر اس وقت تک حملہ نہ کرنا جب تک وہ درے کے اندر داخل نہ ہو جائے اور ہم خود اس پر حملہ نہ کریں۔ اسی طرح ایک جماعت بائیں طرف کے پہاڑ پر متعین کر دی اور اسے بھی یہی حکم دیا۔ دونوں دیواروں کے درمیان مقامی باشندوں کو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر متعین کر دیا۔ مجاہدین کی تعداد تین اور چار ہزار کے درمیان تھی مگر سید صاحبؒ نے انھیں پہاڑوں پر اس ترکیب سے بٹھایا تھا کہ جب ونٹورا نے قریب پہنچ کر دُوربین لگا کر دیکھا تو اسے یہ تعداد بہت زیادہ نظر آئی اور اس نے خادے خاں پر جو اسے مقابلے کے لئے لایا تھا سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ ونٹورا نے سکھ لشکر کو حکم دیا کہ دفاعی دیوار گرا دی جائے۔ جب سکھوں نے دیوار توڑنا شروع کی تو سید صاحبؒ نے حکم دیا کہ سوار آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ کریں اور توپ خانہ گولہ باری کرے۔ ادھر پہاڑوں پر دُور تک جو غازی بیٹھے تھے وہ حملہ کرنے کے لئے اترنا شروع ہوئے۔ مجاہدین کی گولیاں اور توپوں کے گولے اس شدت سے برسے کہ ونٹورا اور سکھ لشکر کے حوصلے پست ہو گئے اور انھوں نے خیال کیا کہ معلوم نہیں سید صاحبؒ کے پاس کتنی فوج اور کتنا بڑا توپ خانہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ونٹورا نے لشکر کو پسپا ہونے کا حکم دے دیا۔ مجاہدین نے دُور تک دشمن کا تعاقب کیا اور ان کے کچھ افراد کو قتل کر دیا جن کی تعداد میں اختلاف ہے۔ مجاہدین میں سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ اس طرح سید صاحبؒ کی ان دفاعی تدابیر کی وجہ سے ایک طاقت ور دشمن خوفزدہ ہو کر پسپا ہو گیا اور ایسا پسپا ہوا کہ دریائے سندھ عبور کر کے لاہور میں دم لیا۔ سید صاحبؒ اور مجاہدین کی شجاعت و عسکری مہارت کا دُور دُور تک شہرہ ہو گیا اور ان کے قدم مضبوطی سے جم گئے۔ اس معرکے کی اس اجمالی تفصیل کے مطالعے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ سید صاحبؒ فنِ جنگ سے ناواقف تھے یا وہ اچھے سپاہی نہ تھے۔

سید صاحبؒ اور آپ کے مجاہدین نے کافروں اور منافقوں سے کم و بیش اٹھارہ جنگیں لڑیں۔ ان میں سے بعض میں آپؒ نے بہ نفسِ نفیس شرکت کی اور خود ہی قیادت فرمائی۔ بعض کی قیادت آپ نے مختلف جرنیلوں مثلاً مولانا شاہ اسماعیلؒ، سید احمد علیؒ، مولانا خیر الدین شیر کوٹیؒ اور میاں محمد مقیم رام پوریؒ وغیرہ نے کی۔ ان میں سے بعض جنگوں میں سید صاحبؒ اور مجاہدین کو کامیابی نہ ہوئی اور اکثر میں فتح و نصرت نے آپ کے قدم چومے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جب ان جنگوں میں طرفین کی فوجی طاقت کا موازنہ کیا جائے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہر معرکہ میں سید صاحبؒ کے لشکریوں اور اسلحۂ جنگ کی تعداد دشمن کی طاقت کے مقابلے میں نہایت کم بلکہ بظاہر بالکل حقیر تھی مگر اس کے باوجود مظفر و منصور سید صاحبؒ ہی ہوئے۔ مثلاً:

جنگِ اکوڑہ میں سیّد صاحبؒ کے اہلِ لشکر کی تعداد صرف نو سو تھی، جبکہ سکھ لشکر سات ہزار سواروں اور پیادوں پر مشتمل تھا۔ پنجتار پر سکھ لشکر کے حملے کے وقت سیّد صاحبؒ کے پاس تین ہزار کے قریب مجاہدین تھے جبکہ دشمن کے لشکریوں کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی مگر اس کے باوجود دونوں جنگوں میں دشمن کو نقصانِ عظیم اٹھانا پڑا اور دوسری جنگ (جنگِ پنجتار) میں تو اس پر سیّد صاحبؒ کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وُہ میدانِ جنگ سے بغیر لڑے ہی فرار ہو گیا۔

جنگِ مہیار کے موقع پر سیّد صاحبؒ کے ساتھ تین ہزار سے کچھ زیادہ مجاہد تھے جن میں سواروں کی تعداد صرف پانچ سو تھی۔ اسلحہ بھی صرف دستی تھا یعنی بندوقیں، تلواریں اور قرابین توپ نام کی کوئی چیز آپ کے لشکر میں نہ تھی جبکہ درانیوں کے لشکر کی تعداد بارہ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ان میں آٹھ ہزار سوار اور چار ہزار پیادے شامل تھے۔ ایک توپ خانہ بھی تھا۔ فریقین میں جنگی قوت کے اس زبردست تفاوت کے باوجود سیّد صاحبؒ نے درانیوں کو ایسی شکست دی کہ ان کے سارے کس بل نکل گئے۔ اسی جنگ کے بعد فتحِ پشاور کے لئے راستہ صاف ہو گیا اور جلد ہی پشاور پر سیّد صاحبؒ کی حکومت کا علم لہرانے لگا۔

ہر منصف مزاج شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اگر سیّد صاحبؒ کو فنِ جنگ میں مہارت نہ تھی تو دور دراز اور اجنبی علاقے میں آ کر بیک وقت سکھوں اور درانیوں سے مقابلہ کرنا اور قلیل جماعت کے باوجود کثیر لشکروں کو شکست دے کر ایسی عظیم الشان کامیابی حاصل کرنا کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ بلا شبہ اس میں سیّد صاحبؒ کی ایمانی غیرت، توکل الی اللہ اور غیر معمولی جذبہ کو بھی دخل تھا مگر ایمانی غیرت اور غیر معمولی جذبہ اسی وقت نتیجہ خیز ہوتا ہے جب اس کے ساتھ تدبیر اور لیاقت بھی ہو ورنہ صرف خدا کا نام لے کر اور آنکھیں بند کر کے میدانِ جنگ میں کود پڑنے کا نتیجہ ہلاکت کے سوائے اور کچھ نہیں ہوتا۔ پس تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سیّد صاحبؒ فنِ جنگ کے ماہر اور اپنے زمانے کے بہت بڑے جرنیل تھے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی معرکہ آرائیوں میں کامیابی حاصل کرنے والا اور اپنے سے دس گنا طاقت در دشمن کو پے در پے شکستیں دینے والا جرنیل بالاکوٹ کے محاذِ جنگ پر کیوں ناکام ہُوا؟ یہ کہانی عبرتناک بھی ہے اور دردناک بھی۔

اہلِ بالاکوٹ کا سیّد صاحبؒ سے تعاون

سیّد صاحبؒ کو علاقہ پکھلی، کشمیر، نندھیاڑ اور دورہ کاغان کے سرداروں نے مسلسل دعوت دے کر اپنی امداد کے لئے بلایا تھا۔ یہ علاقے سکھوں کے حملوں کی زد میں تھے اور بعض علاقوں پر ان کی مستقل حکومت قائم ہو چکی تھی۔ سیّد صاحبؒ کے بلند مقاصد کے لئے یہ دعوت نہایت مفید تھی کہ اگر ان علاقوں کے سرداروں میں اتحاد قائم ہو جاتا اور وُہ سب سیّد صاحبؒ کے جھنڈے تلے متحد ہو جاتے تو ایک بڑے علاقے پر آپ کی حکومت کا علم لہرانے لگتا۔ یہاں کا انتظام مستحکم کرنے کے بعد سیّد صاحبؒ کی ایک بڑی اور اہم منزل یعنی

کشمیر کی طرف پیش قدمی کے لئے راستہ کھل جاتا۔ چنانچہ سید صاحبؒ نے یہ دعوت قبول کر لی اور ننڈھیاڑ کے راستے ہزارے میں داخل ہوئے۔ راستے کے تمام افغان سرداروں نے آپ کا نہایت پُر جوش استقبال کیا۔ اُن کے قیام و طعام کا انتظام کیا اور اُن کے ساتھ پُورا تعاون کیا۔ جب آپ بالاکوٹ تشریف لائے تو یہاں کے خوانین اور عوام دونوں نے خلوصِ دل سے آپ کو خوش آمدید کہا۔ بٹگرام کے خان ناصر خاں، گڑھی حبیب اللہ کے خان، حبیب اللہ خان اور کاغان کے سردار سید ضامن شاہ بالاکوٹ میں سید صاحبؒ کے دست و بازو اور رفیقِ کار بنے۔ خود بالاکوٹ کے خوانین واصل خاں، قمر خاں اور اخوند عباس خاں نے سید صاحبؒ سے بھرپور تعاون کیا۔ انہوں نے اپنی حویلیاں اور مکانات سید صاحبؒ اور آپ کے مجاہدین کے لئے خالی کروا دیئے، اپنے غلّے کے ذخائر ان کے لئے وقف کر دیئے۔ ان کے لنگر خانے کے لئے جانور بطور عطیہ دیئے۔ سبزیوں اور ترکاریوں کے کھیتوں پر تصرف کا انہیں اختیار دے دیا اور تقریباً اٹھارہ دن ان کی مہمان نوازی کی۔ ایک چھوٹے سے قصبے کے رہنے والوں کے لئے گیارہ سو افراد کی اٹھارہ دن تک مہمان نوازی آسان بات نہیں۔

سید صاحبؒ کا اعتراف

خود سید صاحبؒ نے نواب وزیر الدولہ کے نام ایک خط میں اہلِ بالاکوٹ کی مہمان نوازی اور ان کے حُسنِ اخلاق کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں "میں پکھلی کے پہاڑوں میں آ گیا ہوں یہاں کے باشندے حسنِ اخلاق سے پیش آئے اور انھوں نے کاروبارِ جہاد میں امانت کے پختہ وعدے کئے۔ ہمیں قیام کے لئے جگہ دی۔ چنانچہ فی الحال قصبہ بالاکوٹ میں جو درہ کنہار میں ہے دل جمعی سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ کفار کا لشکر بھی مجاہدین کے مقابلے کی غرض سے تین چار کوس پر ڈیرے ڈالے پڑا ہے۔ چونکہ یہ مقام نہایت محفوظ ہے۔ لشکر خدا کے فضل سے یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں اگر مجاہدین خود پیش قدمی کریں اور نکل کر لڑیں تو جنگ ہو سکتی ہے مجاہدین کا ارادہ ہے کہ دو تین روز میں جنگ کی جائے۔ بارگاہ واجب العطایا سے امید ہے کہ فتح و نصرت کے دروازے کھل جائیں۔ اگر تائیدِ ربانی شاملِ حال رہی اور ہم اس جنگ میں کامیاب ہوئے تو انشاء اللہ دریائے جہلم پر ملک کشمیر تک مجاہدین کا قبضہ ہو جائے گا۔ دن رات دین کی ترقی اور لشکر مجاہدین کی کامرانی کے لئے دعائیں مانگتے رہیں۔[1] (نواب وزیر الدولہ کے نام خط۔ محررہ ۱۳۔ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے اہلِ بالاکوٹ خلوصِ قلب سے سید صاحبؒ کے ساتھ اور اُن کے وفادار تھے لیکن اچانک جنگ سے ایک دو دن پہلے حالات کا نقشہ بدل گیا اور یہاں کے خوانین آپ کی امداد سے دست کش ہو کر پہاڑوں پر چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب سکھ لشکر نے بالاکوٹ پر حملہ کیا تو سید صاحبؒ

---

[1] سیرت سید احمد شہید مولفہ مولانا ابو الحسن علی ندوی

اور اُن کے مٹھی بھر مجاہدین کو ہی دشمن کے اس قوی اور ٹڈی دل لشکر کا مقابلہ کرنا پڑا۔

علمائے سوٗ کے فتوے

بالاکوٹ کے خوانین کا سید صاحبؒ کی امداد سے اچانک دست کش ہو جانا بلاوجہ نہ تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ علمائے سوٗ کے وہ فتوے تھے جنہوں نے خوانینِ بالاکوٹ کو سید صاحبؒ سے برگشتہ کر دیا۔ اس قسم کا ایک فتویٰ رنجیت سنگھ کے ایک معتمد سردار کرتار سنگھ نے پشاور کے بہت سے ملاؤں سے حاصل کیا۔ یہ فتویٰ پہلے پشاور میں تقسیم کیا گیا اور پھر اس کی نقول بالاکوٹ بھیجی گئیں۔ اُس زمانے میں بالاکوٹ کے لوگ عام طور پر اَن پڑھ تھے۔ ضعیف الاعتقاد ہونے کی وجہ سے ملاؤں کے فتووں سے آنِ واحد میں متاثر ہو جاتے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ سید صاحبؒ کو کافر و واجب القتل قرار دے دیا گیا ہے تو قدرتی طور پر اُن کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور سید صاحبؒ سے اُن کی عقیدت کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اُدھر بالاکوٹ کے ملا یہاں کے لوگوں کو سید صاحبؒ سے برگشتہ کرنے میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ اس کا پس منظر بھی بڑا دردناک ہے۔ اُس زمانے میں ان ملاؤں نے یہاں کے لوگوں کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی اجارہ داری قائم کر لی تھی اور ایسی بیہودہ اور شرمناک رسوم جاری کر دی تھیں جن کا اسلام تو کیا کوئی ادنیٰ درجے کا معاشرہ بھی روادار نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جب کوئی شخص وفات پا جاتا تو مُلا اس وقت تک اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھاتا جب تک کہ اسے مقررہ مقدار کے مطابق گھی، چینی اور آٹا نہ دے دیا جاتا۔ مذہب کے نام پر یہ ظلم عظیم کسی طرح قابلِ برداشت نہ تھا مگر اہل بالاکوٹ اپنی ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے یہ ظلم برداشت کر رہے تھے۔ مذہب کے نام پر لوٹ کھسوٹ کی یہ صرف ایک مثال ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ان ملاؤں نے یہاں کے لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی اور بچے کی پیدائش سے لے کر اس کی شادی اور موت تک کوئی مرحلہ ایسا نہ تھا جس میں ملا نے اپنی غلط قسم کی بالادستی سے اسلامی معاشرے کی روح کو مجروح نہ کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسا شخص اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکتا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے تجدیدِ دین

۱؎ اہل بالاکوٹ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں بلکہ اس کے بعد بھی سالہا سال تک یہاں کے خوانین کا دستور رہا تھا کہ اپریل کے آخر یا مئی کے شروع میں وہ اپنے مویشی اور اہل و عیال کو لے کر پہاڑوں پر چلے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سید صاحبؒ کی سکھوں سے جنگ ہوئی تو وہ لوگ بالاکوٹ میں موجود نہ تھے۔ یقیناً ایسا ہی ہو مگر اس وقت عام حالات نہ تھے کہ اس معمول پر عمل کیا جاتا۔ خود ان خوانین نے سید صاحبؒ کو اپنی امداد کے لئے بلایا تھا۔ ایسے وقت میں جب سکھوں سے مقابلہ درپیش تھا انہیں تنہا چھوڑ کر خوانین بالاکوٹ کا پہاڑوں پر چلا جانا معمول کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انہیں ملاؤں کے فتووں نے گمراہ کر دیا۔ اگر یہ فتوے بالاکوٹ تک نہ پہنچتے اور بالاکوٹ کے ملا فتنہ نہ پھیلاتے تو یہاں کے خوانین ملک و ملت کی سربلندی کے لئے اپنا دیرینہ معمول ترک کر دیتے اور جنگ کے وقت بالاکوٹ میں موجود رہتے۔ (مولف)

کے لئے مامور فرمایا تھا اور جسے امامت کے منصب پر فائز کیا گیا تھا۔ چنانچہ سید صاحب نے بالاکوٹ تشریف لاکر اس صورت حال کی اصلاح فرمائی۔ اس وقت بالاکوٹ کے چھ محلّے تھے اور ہر محلّے میں ایک مسجد تھی۔ سید صاحبؒ نے ان چھ کی چھ مساجد کے اماموں کو الگ کر دیا اور ایسے لوگوں کو منصبِ امامت پر مقرر فرمایا جو صرف خدا کی رضا کے لئے یہ فرض ادا کرتے تھے اور اس کا کوئی معاوضہ نہ لیتے تھے۔ آپ نے اس قسم کی تمام رسوم منسوخ فرما دیں جو نہ صرف غیر اسلامی تھیں بلکہ ان کی وجہ سے غربا جو پہلے ہی پیسے پیسے کو محتاج تھے، مقروض ہو کر اور بھی زیر بار ہو جاتے تھے۔

سید صاحبؒ کی اس اصلاح کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالاکوٹ کے "مُلّا" جنہیں مساجد سے الگ کیا گیا تھا آپ کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے اپنے بعض زیرِ اثر افراد کو بھی ورغلا کر سید صاحبؒ سے برگشتہ کر دیا۔ مخالفت کا یہ لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا کہ علماءِ پشاور کا وہ فتویٰ موصول ہوا جس میں سید صاحبؒ کو کافر قرار دیا گیا تھا اور ان سے جہاد کرنے کو سکھوں کے خلاف جہاد کرنے سے افضل بتایا گیا تھا۔ اس فتوے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور رفتہ رفتہ بالاکوٹ کے لوگوں نے مقامی ملاؤں کے بہکانے سے اور پھر علماءِ پشاور کے اس فتوے سے متاثر ہو کر سید صاحبؒ سے رُو گردانی اختیار کر لی۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ اگر جنگ بالاکوٹ کے وقت یہاں کے جنگجو خوانین پورے خلوص اور ثابت قدمی سے سید صاحبؒ کا ساتھ دیتے تو اس معرکے کا نتیجہ مختلف ہوتا۔

سید ضامن شاہ کا اختلاف

سید ضامن شاہ علاقہ کاغان کے بہت بہادر اور ذی اثر سردار تھے۔ انہیں اس علاقے پر جو اقتدار حاصل تھا اس کے پیشِ نظر وہ لوگوں میں "ضامن بادشاہ" کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے پاس پانچ سو جنگجو سواروں اور پیادوں کی جمعیت بھی تھی جو اس زمانے میں خاصی بڑی طاقت تھی۔ جب سید صاحب سچہ تشریف لائے تو سید ضامن شاہ اور ان کے چھوٹے بھائی سید نوبت شاہ دونوں سیدِ شہیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی بیعت کی۔ سید نوبت شاہ ضامن کے مقابلے میں بہت زیادہ نیک، دین دار اور متقی انسان تھے ان کا سید صاحبؒ سے مخلصانہ اور عقیدت مندانہ تعلق آخر وقت تک قائم رہا مگر سید ضامن شاہ دنیادار قسم کے انسان تھے۔ ان کی نگاہ صرف ظواہر پر تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے سید صاحبؒ کی مہمان نوازی، خدمت اور تعاون میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ جنگِ بالاکوٹ سے ایک روز قبل تک وہ بالاکوٹ میں مقیم تھے اور ان کے ساتھ کاغان کے سیدوں کی ایک جماعت بھی تھی جس کی تعداد میں اختلاف ہے۔ جس وقت سکھ لشکر نے مٹی کوٹ کے پہاڑ پر قبضہ کر لیا تو ضامن شاہ سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں مشورہ دیا کہ دشمن مٹی کوٹ کے پہاڑ پر پہنچ چکا ہے۔ اس کے لئے یہ بالکل نئی جگہ ہے۔ اگر آج رات اس پر شبخون مارا جائے تو اس کا بیشتر حصہ تباہ ہو جائے گا اور صبح کو یہ بالاکوٹ پر حملہ کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ سید ضامن شاہ نے یہ رائے نہایت خلوص سے دی تھی مگر ان کا یہ خیال درست نہ تھا کہ "سکھ فوجی لاہور سے آئے ہیں اس لئے یہ لوگ ان پہاڑوں میں مجاہدین کے شب خون کے سامنے نہ ٹھہر سکیں گے کیونکہ ان کے لئے یہ نئی جگہ ہے" حقیقت یہ ہے کہ سکھوں کے اس لشکر میں بیشتر وہی لوگ تھے جو سالہا سال سے ہزارہ کے ان پہاڑوں میں ترک و تاز کر رہے تھے اور مانسہرہ سے لے کر پکھلی اور گڑھی حبیب اللہ تک انتہائی دشوار گزار راستوں اور پہاڑی گھاٹیوں میں بیسیوں جنگیں لڑ چکے تھے۔ اگر یہ سکھ فوجیں سیدھی لاہور سے ان علاقوں میں پہلی بار آئی ہوتیں تو ان کے لئے مٹی کوٹ کے پہاڑوں میں مجاہدین کے شب خون کے سامنے ٹھہرنا دشوار ہوتا مگر ایسا نہ تھا۔ سید صاحبؒ نے ضامن شاہ کی اس رائے سے اختلاف کیا۔ اُن کا موقف یہ تھا کہ شبخون کا مقصد صرف دشمن کو ہراساں کرنا اور اسے وقتی طور پر نقصان پہنچانا ہوتا ہے۔ یہ باقاعدہ اور فیصلہ کُن جنگ نہیں ہوتی۔ اگر اس شبخون میں سکھوں کے کچھ آدمی قتل بھی ہو جائیں تو ان کے لشکر کا باقی حصہ جو کمک کے لئے پیچھے موجود ہے، وُہ صبح ہوتے ہی پہاڑوں پر آ جائے گا۔ دوسرے یہ کہ مجاہدین کی تعداد پہلے ہی نہایت قلیل ہے اگر انہیں اس شبخون میں جانی نقصان پہنچا تو کل صبح جب کھلے میدان میں جنگ ہو گی۔ اُس وقت ان کی طاقت اور کمزور ہو چکی ہو گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دشمن جلد غالب آ جائے گا۔ سید صاحبؒ نے ضامن شاہ کے اس خیال سے بھی اتفاق نہ کیا کہ مٹی کوٹ کا پہاڑ صرف سکھوں کے لئے نئی جگہ ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ مجاہدین بھی نووارد ہونے کی وجہ سے اس علاقے کے نشیب و فراز سے ناواقف ہیں۔ اس لئے شبخون کے وقت پُورے اعتماد کے ساتھ کارروائی کرنے کے بعد بحفاظت بالاکوٹ واپس آ جانا ان کے لئے بھی مشکل ہوگا۔

سید ضامن کا یہ جواب سُن کر ضامن شاہ نے کہا کہ "اگر آپ نے آج شبخون نہ مارا تو پھر کل صبح جب جنگ ہو گی تو آپ سب مارے جائیں گے۔" ضامن کے یہ الفاظ سن کر سید صاحبؒ کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا اور انہوں نے جوش کے عالم میں فرمایا کہ :

> "ضامن شاہ! تمہیں خیال نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے والوں کے متعلق کہتے ہو کہ وُہ مارے جائیں گے۔ حالانکہ قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ خدا کی راہ میں جان دیں وہ مردہ نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔"

اس کے بعد آپ نے ضامن شاہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "ضامن شاہ! تم چلے جاؤ ورنہ صبح مارے جاؤ گے۔" یہ الفاظ آپ نے تین مرتبہ کہے۔ اس اختلاف کی بنا پر سید ضامن شاہ اپنی مختصر سی جمعیت لے کر رات ہی کو بالاکوٹ سے چلے گئے۔ اس طرح سید صاحبؒ کی طاقت میں اور کمی پیدا ہو گئی۔

شہادت کے غیبی اشارے

جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے کہ سید صاحبؒ نے جنگِ بالاکوٹ سے ایک رات قبل قصبے اور مٹی کوٹ کے پہاڑوں کے درمیان واقع دھان کے کھیتوں میں پانی بھروا دیا تھا اور مقصود یہ تھا کہ جب

سکھ پہاڑ سے اُتر کر اس دلدل میں داخل ہو جائیں تو مجاہدین یکبارگی ان پر حملہ کریں۔ اگر اس منصوبے پر عمل کیا جاتا اور سید صاحبؒ پہلے سے متعینہ مقام (مسجدِ بالا) ہی میں تشریف فرما رہتے تو ہمیں یقین ہے کہ جنگ کا فیصلہ سید صاحبؒ اور مجاہدین کے حق میں ہوتا۔ مگر قبل اس کے کہ سکھ لشکر دلدل میں داخل ہونے کے بعد قصبے پر حملہ آور ہوتا۔ سید صاحبؒ مسجدِ بالا سے اُتر کر مسجدِ زیریں تشریف لے گئے اور وہاں چند منٹ قیام کرنے کے بعد اچانک کسی کو اطلاع دیئے بغیر دلدل میں داخل ہو گئے۔ اس صورت نے جنگ کا سارا نقشہ بدل دیا اور انہوں نے خود اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے امیر کو دلدل میں داخل ہوتا دیکھ کر مجاہدین کی جماعتیں بھی اُن کے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ ان میں سے اکثر مجاہدین کے پیر گھٹنوں تک دلدل میں دھنس جاتے اور پھر انہیں پیر کھینچ کر آگے بڑھنے کے لئے اپنی بندوقوں کا سہارا لینا پڑتا۔ اس طرح بہت سی بندوقیں پانی میں بھیگ جانے کی وجہ سے استعمال کے قابل نہ رہیں۔ اس کے بعد جب سید صاحبؒ دشمن کے نرغے میں آکر شہید ہو گئے تو مجاہدین میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ ہر شخص کی زبان پر یہی نعرہ تھا کہ "حضرت کہاں ہیں، حضرت کہاں ہیں؟"[1] یہ کہتے ہوئے وہ میدانِ جنگ میں دیوانہ وار سید صاحبؒ کو تلاش کرتے پھرتے تھے۔ اس بھاگ دوڑ اور تلاش میں بھی بکثرت مجاہدین دشمن کی گولیوں سے شہید ہو گئے۔

بظاہر جنگِ بالاکوٹ کی اس ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ سید صاحبؒ نے خود ہی اپنے منصوبے کے خلاف قدم اٹھایا۔ ایک ظاہر بیں نظر یقیناً یہی فیصلہ کرے گی۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ اگر سید صاحبؒ کو قصبے میں بیٹھنے کی بجائے نیچے اتر کر ہی جنگ کرنا ہوتی تو وہ جنگ سے ایک رات قبل دھان کے کھیتوں میں کبھی پانی نہ بھرواتے اور اس طرح مجاہدین کی نقل و حرکت میں دشواریاں پیدا نہ کرتے۔ وہ شخص جس نے کم و بیش اٹھارہ جنگوں میں سے ہر جنگ میں نہایت عمدہ دفاعی منصوبہ بنایا اس پر خود بھی سختی سے عمل کیا اور اپنے جرنیلوں اور غازیوں کو بھی سختی سے عمل کرنے کا حکم دیا۔ یکایک جنگِ بالاکوٹ میں اپنی دفاعی تدبیروں سے کیوں بے نیاز ہو گیا؟ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی گئی لیکن اگر سید صاحبؒ کے سوانح اور ان پر لکھی جانے والی مستند کتابوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ قضا و قدر کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ سید صاحبؒ بالاکوٹ کی سرزمین کو اپنے خون سے لالہ زار بنائیں گے اور آپ کے بہت سے ساتھیوں کا خون بھی اسی مٹی میں جذب ہو گا۔ چنانچہ سید صاحبؒ کے کاتبِ خاص مولانا سید جعفر علی نقوی جو اس جنگ میں بھی موجود تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ:

"حضرت امیر المومنین نے خواب دیکھا کہ آپ کے پلنگ کے پائے سرخ ہیں۔ آپ نے خواب میں محسوس کیا کہ یہ پلنگ آپ ہی کے لئے آیا ہے۔"[2]

---

[1] منظورۃ السعدا صفحہ ۱۱۱۶ [2] منظورۃ السعدا صفحہ ۱۱۹۳

اس مستند ترین روایت سے صاف طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ سید صاحبؒ کو غیب سے شہادت کا اشارہ کردیا گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ نمازِ فجر کے بعد جب سکھ پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اترنا شروع ہوئے تو آپ اپنے منصوبے کے خلاف اپنی جائے قیام چھوڑ کر مسجد زیریں کی طرف روانہ ہو گئے۔ پھر یہی مولانا سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ:

"سید صاحبؒ مسجد زیریں میں مقیم تھے کہ آپ کو غیب سے ایک آواز آئی جس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

"کدام کس مارا ندا میدہد"[1] (ہمیں کس نے آواز دی)

مولانا فرماتے ہیں کہ یہ آواز انہیں تین مرتبہ آئی اور اس کے جواب میں آپ نے "تین مرتبہ فرمایا کہ:

"ہمیں کون بلا رہا ہے؟"

یہ روایت بالاکوٹ کے کہن رسیدہ لوگوں سے بھی سُنی گئی۔ راویوں کا بیان ہے کہ یہ آواز سننے کے بعد سید صاحبؒ اچانک دلدل کی طرف روانہ ہونے لگے اور جب کسی نے انہیں روکنا چاہا تو آپ نے عالمِ جذب و جوش میں فرمایا کہ "مجھے غیب سے آواز آرہی ہے۔ اب میں نہیں رُک سکتا۔" اس کے بعد وہ دل گداز اور رُوح فرسا واقعہ پیش آگیا کہ جو پیش نہ آتا تو تاریخ کا رُخ بدل چکا ہوتا مگر قضا و قدر کے فیصلے کو کون بدل سکتا ہے۔ مامور کی کیا مجال ہے کہ وہ آمر کے حکم کے سامنے دم بھی مار سکے۔ تدابیر اپنی جگہ درست سہی لیکن حکمِ الٰہی ہر چیز پر مقدم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید صاحبؒ نے غیب کا اشارہ بلکہ واضح حکم پا کر تمام ظاہری تدابیر کو نظر انداز کر دیا اور اس حکم کی تعمیل کے لئے روانہ ہو گئے، قطع نظر اس سے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ سیدِ شہیدؒ دنیا دار انسان نہ تھے اور نہ انہیں اس جنگ سے سلطنت و حکومت کا حصول منظور تھا۔ اُن کا مقصد صرف رضائے الٰہی تھا جو اُنہوں نے بالاکوٹ کی سرزمین پر اپنا خُون بہا کر حاصل کر لیا۔

اے سرزمینِ بالاکوٹ! تجھ پر اللہ کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں کہ تیرے سینے میں وہ مقدس وجود محفوظ ہیں جن کی زندگیاں اسلام کی چلتی پھرتی تصویریں تھیں، جو زندہ رہے تو اسلام کی سربلندی کے لئے اور شہید ہوئے تو اس لئے کہ اسلام زندہ ہے۔

---

[1] منظورۃ السعدا صفحہ ۱۱۸۳

سیدؒ صاحبؒ کے مدفن کی تحقیق

جنگِ بالاکوٹ ختم ہو جانے کے بعد شیر سنگھ کو سب سے زیادہ فکر سید صاحبؒ کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سکھ حکومت کے لئے سب سے زیادہ مشکلات سید صاحبؒ ہی نے پیدا کیں۔ اگر وہ اس جنگ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو دوبارہ کہیں اور مرکز قائم کر لیں گے۔ ان کے اردگرد پھر مجاہدین جمع ہو جائیں گے اور طاقت فراہم کر کے کچھ عرصے کے بعد وہ از سرِ نو سکھ حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہو جائیں گے۔ اس لئے قدرتی بات ہے کہ اس نے پوری کوشش کی کہ سید صاحبؒ کی شہادت یا زندہ بچ نکلنے کی تصدیق ہو جائے چنانچہ وہ خود میدانِ جنگ میں آیا اور گھوم پھر کر ایک ایک نعش کو دیکھا۔ روایت ہے کہ ایک نعش کے پاس سے اس کا گذر ہوا۔ اس کے لباس اور وضع قطع سے اندازہ لگایا کہ یہ کسی بڑے آدمی کی نعش ہے۔ چنانچہ اس نے یہ نعش اٹھوائی اور دریائے کنہار کے کنارے اپنے کیمپ میں لایا۔ یہاں اس نے ان مجاہدین کو طلب کیا جو اس جنگ میں زخمی ہو کر سکھوں کے ہاتھوں اسیر ہو چکے تھے۔ اس نے ان مجاہدین سے کہا کہ شناخت کرو یہ نعش کس کی ہے؟ ان مجاہدین نے اسے سید صاحبؒ کی نعش قرار دیا۔ دوسرے روز اس نے سید صاحبؒ کا جسدِ مبارک دریائے کنہار کے کنارے دفن کرا دیا۔ یہ ایسی صداقت ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن افسوس کہ بعد میں کچھ خاص مقاصد کے تحت سید صاحبؒ کی قبر کو مشکوک قرار دے دیا گیا۔ ہمارے خیال میں اس کے مندرجہ ذیل اسباب تھے۔

اوّل یہ کہ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد عرصے تک یہ غلط روایت مشہور رہی کہ آپ شہید نہیں ہوئے بلکہ عارضی طور پر غائب ہو گئے ہیں اور عنقریب واپس آ کر اپنا مشن مکمل کریں گے۔ کفار کو شکست ہو گی اور اسلام کا بول بالا ہو گا ظاہر ہے کہ جس شخص کو زندہ قرار دیا جائے۔ اس کی قبر کہاں ہو گی اور اسے کیسے صحیح قرار دیا جائے گا؟

دوم یہ کہ بعض بدباطن سکھوں نے سید صاحبؒ کی تحقیر کرنے کی غرض سے بعض اہانت آمیز روایات مشہور کیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ "ہم نے سید صاحبؒ اور شاہ اسماعیل صاحبؒ کی نعشیں جلا دیں۔" فری ینڈ ایٹ نے بھی یہی روایت بیان کی ہے کہ "سید صاحب کی نعش سکھوں نے نذرِ آتش کر دی تھی۔" بعض سکھوں نے یہ مشہور کیا کہ

سید صاحبؒ اور شاہ اسماعیل صاحبؒ کی نعشیں دریا میں بہا دی گئیں۔ کچھ سکھوں نے اس روایت کو شہرت دی کہ سید صاحبؒ کو دفن ضرور کیا گیا مگر بعد میں ان کی نعش قبر سے نکال کر دریا میں ڈال دی گئی تھی[۱] ان روایات کو شہرت دینے کے دو بڑے مقاصد تھے اول یہ کہ سید صاحبؒ کی ہتک ہو، دوم یہ کہ بعض سکھ افسروں کو اندیشہ پیدا ہوا کہ سید صاحبؒ کے عقیدت مند ان کی قبر کو زیارت گاہ بنا کر مسلمانوں میں پھر کوئی تحریک جاری نہ کر دیں جس کے نتیجے میں از سرِ نو جنگ و جدال شروع ہو جائے اسلئے بعد میں سوچ بچار کے بعد اس قسم کی غلط اور گمراہ کن روایات وضع کی گئیں اور انہیں خوب شہرت دی گئی تاکہ لوگوں کی توجہ اصل قبر سے ہٹا دی جائے۔ تعجب اس پر ہے کہ آج کے روشن زمانے میں جب کہ تمام حقائق منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اب بھی بعض لوگ سید صاحبؒ کے حقیقی مدفن کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہیں۔

سیّد صاحبؒ کی پیش گوئیاں

سیّد صاحبؒ کے مدفن کو مشکوک بنانے میں ان کی بعض مبینہ پیش گوئیوں کو بھی بڑا دخل ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنی ہمشیرہ سے فرمایا تھا کہ :۔

"لوگ کہیں گے کہ سید احمد کا انتقال ہو گیا یا شہادت ہو گئی لیکن جب تک ہندوستان کا شرک ایران کا رفض اور سرحد کا غدر نہ جائے میرا کام ختم نہیں ہو گا۔"

اس روایت سے یہ نتیجہ نکال لیا گیا کہ چونکہ یہ تینوں صورتیں ابھی موجود ہیں، اس لئے سید صاحبؒ زندہ ہیں اور جب وہ زندہ ہیں تو ان کی قبر کیسی؟ حالانکہ اس پیش گوئی سے ان کے غائب ہو جانے کا قطعاً جواز نہیں نکلتا۔ اگر یہ روایت درست بھی مان لی جائے تو اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جب تک ہندوستان سے شرک، ایران سے رفض اور سرحد سے غدر ختم نہیں ہو جاتا اس وقت تک سید صاحبؒ فوت نہیں ہوں گے بلکہ سید صاحبؒ کے اس ارشاد کا مطلب صرف اتنا ہے کہ جب تک یہ تینوں فتنے ختم نہیں ہو جاتے اس وقت تک میرا مشن مکمل نہیں ہو سکتا یعنی میں موجود رہوں یا نہ رہوں میرا مشن جاری رہے گا اور کوئی دوسرا اسے مکمل کرے گا۔ ورنہ اگر اس پیش گوئی کو اس کے ظاہری معنی کی رو سے صحیح قرار دیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ پیش گوئی پوری نہیں ہوئی کیونکہ آج بھی ہندوستان میں شرک اور ایران میں رفض موجود ہے۔ لیکن سید صاحبؒ کی قبر کو فرضی ثابت کرنے والوں کو جس روایت سے فائدہ پہنچا وہ سید صاحبؒ کی ایک اور مبینہ پیش گوئی ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے بھی یہ پیش گوئی اپنی کتاب میں درج کی ہے موصوف لکھتے ہیں کہ :۔

---

[۱] انہی سکھ افسروں سے سن کر یہ روایت منشی جتھا سنگھ نے بھی اپنی تاریخ میں درج کر دی (مولف)

وقائع میں ہے کہ مولوی محمد یوسف پھلتی، میاں جی محی الدین پھلتی، میاں نظام الدین چشتی اور مولوی امام الدین بنگالی نے کئی مرتبہ بے تکلف عرض کیا کہ ہندوستان میں لوگ ادنیٰ ادنیٰ پیروں کی قبریں پوجتے ہیں۔ آپ تو پیروں کے پیر ہیں لہٰذا آپ کے مزار کی تو خوب پوجا ہوگی اور اس پر چڑھاوے چڑھائے جائیں گے۔

سید صاحب نے فرمایا: بے فکر رہو مجھے جناب الٰہی سے کئی مرتبہ اشارہ ہوا ہے کہ کوئی شخص مجھ پر جادو کرے یا زہر دے ان صدموں سے تو نہیں مرے گا اور جب تیری موت کا وقت آئے گا کوئی تیری لاش نہ پائے گا۔ جب لاش نہیں ملے گی تو قبر کیونکر بنے گی اور اس کی پوجا کس طرح کی جائے گی۔"[1]

اگر سید صاحبؒ نے کوئی پیش گوئی کی تھی تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اس شکل میں نہ ہوگی جس میں بیان کی جاتی ہے کیونکہ یہ پیش گوئی اپنی موجودہ شکل میں پوری نہیں ہوئی۔ سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:۔

"جب میری موت کا وقت آئے گا تو کوئی میری لاش نہیں پائے گا" حالانکہ خود مولانا مہرؔ کے ارشاد کے مطابق سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ان کی نعش ملی۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں کہ:۔

"بہرحال حقیقت خواہ کچھ ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میدانِ جنگ میں دیکھ بھال کر ایک لاش کے متعلق بتایا گیا کہ یہ سید صاحبؒ کی معلوم ہوتی ہے اس کا سر نہ تھا۔ سر بھی تلاش کر کے ساتھ ملایا گیا تو جاننے والوں نے اقرار کیا کہ واقعی سید صاحبؒ کی ہے۔ اسے اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔"[2]

اس سے صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ سید صاحبؒ کی پیش گوئی پوری نہیں ہوئی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ "کوئی میری لاش نہیں پائے گا" مگر ان کی لاش پالی گئی اور اسے اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا گیا!

پھر سید صاحبؒ کی اس مبینہ پیش گوئی میں ان سے یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ "قبر کیونکر بنے گی اور اس کی پوجا کس طرح کی جائے گی۔"

سید صاحب کی پیش گوئی کا یہ حصہ بھی پورا نہ ہوا ان کی قبر بھی بنی اور اس کی پوجا بھی ہو رہی ہے۔ خود مولانا مہرؔ تسلیم فرماتے ہیں کہ جب سید صاحبؒ کو بالاکوٹ میں دفن کر دیا گیا اور شیر سنگھ فوج لیکر چلا گیا تو نہنگ سکھوں کی ایک جماعت نے آپ کی لاش کو قبر سے نکلوا کر ندی میں ڈلوا دیا۔ آگے چل کر مولانا مہر فرماتے ہیں:۔

"لاش دریا میں گرتے ہی تیرتی تیرتی "تلہٹہ" پہنچی ... سر بہتا ہوا گڑھی حبیب اللہ کے پاس اس جگہ کے قریب پہنچ گیا جہاں آج کل پل بنا ہوا ہے... ایک بڑھیا پانی بھرنے کے لئے آئی اس نے دیکھ کر خان کو خبر

---

[1] سید احمد شہیدؒ ص۱۱۱ [2] سید احمد شہیدؒ ص۳۰۸ جلد دوم

پہنچائی وہ دوڑا ہوا آیا اور سر کو دریا سے نکال کر کنارے پر دفن کر دیا۔ یہ مدفن پل سے گزرتے ہی کنہار کے مشرقی کنارے پر بائیں ہاتھ ملتا ہے [۱]

گویا جسم کا اصل حصہ جس سے انسان پہچانا جاتا ہے یعنی سر مل گیا اس کی قبر بھی بن گئی اور آج تک موجود ہے۔ ہر سال اس سر کے مزار پر عرس ہوتا ہے۔ کئی روز میلہ لگتا ہے۔ دور دور سے لوگ آتے ہیں اور وہ تمام لغویات ہوتی ہیں جو عام طور پر بزرگانِ دین کے مزار مقدس مزارات پر روا رکھی جاتی ہیں۔ پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سید صاحبؒ کی پیش گوئی پوری ہو گئی۔ ان کی پیش گوئی تو یہ تھی کہ ۔۔۔۔۔۔ نہ ان کی لاش کسی کو ملے گی، نہ اس کی قبر بنے گی اور نہ اسے پوجا جائے گا۔ لیکن پیش گوئی کے تینوں حصوں کے برعکس ہوا۔ لاش بھی مل گئی اس کے ایک حصہ یعنی سر کی قبر بھی بن گئی اس کی پوجا بھی شروع ہو گئی اور اب اس پر شاندار گنبد بھی تعمیر کیا جا رہا ہے۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ سید صاحبؒ نے اس قسم کی کوئی پیش گوئی نہیں کی۔ یہ سب بعد کے لوگوں کے وضع کئے ہوئے افسانے ہیں کیونکہ حضرت سید صاحب اللہ تعالیٰ کے مقدس بندے تھے۔ اگر خدا انہیں مخاطب کر کے کوئی بات کہتا تو ناممکن تھا کہ وہ پوری نہ ہوتی۔

سید صاحبؒ کی نعش کی شناخت

جہاں تک ہم نے اس معاملے کی تحقیق کی ہے اور غور کیا ہے حقیقت کچھ اور ہے۔ اس سلسلے میں جو روایتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سب سے معتبر روایت "منظورۃ السعدا" کے مولف مولوی سید جعفر علی نقوی کی ہے جو خود بالاکوٹ کے میدانِ جنگ میں موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ:۔

"دوسرے روز (مجاہدین کے) توپ خانے کے ایک رکن شیخ وزیر کا بیٹا جس کی عمر تخمیناً ۸ یا ۹ سال کی تھی آگیا۔ تمام غازی اس کے ارد گرد جمع ہو گئے اور اس سے حالات معلوم کئے کہ تو کیونکر سلامت آگیا اور کہاں رہا۔ اس نے بیان کیا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد سکھوں نے مجھے پکڑ لیا اور شہدا کے میدان میں لے گئے۔ پھر مجھ سے کہا کہ ان نعشوں کو شناخت کر کے بتا کہ خلیفہ صاحب کی نعش کون سی ہے۔ میں نے ایک نعش کو پہچان کر بتایا کہ یہ ان کی نعش ہے۔ اس کے بعد مجھے سکھوں کے سردار کے پاس لے گئے اس نے اپنے لشکر کے ایک مسلمان رکن سے کہا کہ اس لڑکے کو تو لے لے اور اپنا غلام بنا لے چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور مجھ سے پوچھا کہ تیرے والدین ہیں؟ میں نے کہا ہیں۔ اس نے کہا کہ جا اپنے والدین کے پاس چلا جا۔ اس کے بعد میں وہاں سے روانہ ہو گیا اور "ست بنی"

---

[۱] سید احمد شہید ص ۴۳۹ جلد دوم

کے راستے یہاں آگیا جس وقت اس لڑکے نے یہ ماجرا سنایا کہ میں نے سیّد صاحبؒ کی نعش شناخت کی تو بعض لوگوں نے کہا کہ زخمی شخص کو تو ہوشیار آدمی بھی مشکل ہی سے پہچان سکتا ہے اس طفل بیچارہ نے کیا شناخت کیا ہوگا۔ اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ یہ لڑکا تم سے زیادہ سید صاحبؒ کی نعش پہچان سکتا ہے کیونکہ یہ انکی خدمت میں رہتا تھا اور سید صاحبؒ سے بہت زیادہ مانوس تھا۔[1]

اس معتبر ترین روایت سے دو باتیں ثابت ہوگئیں کہ سید صاحبؒ کی نعش شناخت کر لی گئی اور نعش شناخت کرنے والے نے اسے سربریدہ دیکھا کیونکہ اگر یہ سر کٹا ہوا ہوتا تو ۸ ۹ برس کے بچے کے لئے اس نعش کا پہچاننا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھا پھر اگر اس نعش کا سر نہ ہوتا تو راوی یہ واقعہ ضرور بیان کرتا۔ حیرت ہے کہ اس نے سکھوں کے ہاتھوں اپنی گرفتاری کی روداد بیان کر دی۔ اپنے غلام بنائے جانے کا واقعہ سنا دیا پھر غلامی سے آزادی کا قصہ بھی بیان کر دیا اور براہ "ست بنی" پہنچنے کا ماجرا بھی سنایا مگر اتنا بڑا واقعہ بیان نہیں کیا کہ اس نے اپنے مرشد کی نعش کو سربریدہ دیکھا۔ اس سارے واقعے میں سب سے زیادہ لرزا دینے والا حصہ تو یہی تھا کہ سید صاحبؒ کی نعش میدان میں پڑی تھی اور اُس کا سر غائب تھا۔ پس اس لڑکے کا نعش کو دیکھ کر اس کے سر بریدہ ہونے کے متعلق کچھ نہ کہنا صاف طور پر ظاہر کرتا ہے بلکہ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ سیّد صاحبؒ کا سر مبارک جسم سے جدا نہیں ہوا تھا اور ان کے سر اور دھڑ الگ ہونے کی روایت غلط ہے، یہ روایت اس لئے بھی غلط ہے کہ آپ کی شہادت اندھا دھند فائرنگ کے دوران ہوئی اور آپ کے دو گولیاں لگیں ایک گولی دائیں بازو پر اور دوسری دل کے مقام پر۔ اس دوسری گولی سے آپ کی شہادت واقع ہوئی۔

سیّد صاحب کا سر کٹنے کی حقیقت

چنانچہ منشی مہتاب سنگھ کا بیان ہے کہ :۔

"لاشۂ خلیفہ ہم بر زخم بندوق کہ یک گولی بر بازوئے راست و دیگر گولی بر سینہ متصل پستانِ چپ چسپیدہ بودند[2]"

غور طلب امر یہ ہے کہ جب آپ کی شہادت سینے میں گولی لگنے سے ہوئی تو سر کٹنے کا واقعہ درمیان میں کہاں سے آگیا۔ اگر آپؒ دست بدست جنگ کے دوران شہید ہوتے تو کہا جا سکتا تھا کہ دشمن کی تلوار نے آپ کا سر تن سے جدا کر دیا مگر جیسا کہ روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ مٹی کوٹ کے پہاڑ کی جڑ میں ایک خشک نالے کے کنارے پتھر کے پاس بیٹھے بندوق چلا رہے تھے وہیں آپ کے گولیاں لگیں اور آپ شہید ہو گئے۔

---

[1] منظورة السعدا صـ ۱۲۰۰ [2] تاریخ منشی مہتاب سنگھ صـ ۵۹

چنانچہ مولانا غلام رسول مہر نے سید صاحبؒ کی شہادت کا واقعہ قلمبند کرتے ہوئے بابا بہرام خاں تنولی کی روایت درج کی ہے اور راوی کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"شرکاء جنگ بالاکوٹ میں سے ایک بابا بہرام خاں تنولی بھی تھے جو لمبی عمر پا کر ۱۹۲۱ء میں فوت ہوئے یہ تنول کے رؤسا میں سے تھے۔ نوجوانی کے عالم میں سیّد صاحبؒ کے ساتھ وابستہ ہو گئے حملہ اٹک میں شریک تھے ان کا بیان ہے کہ:۔

'غازیوں نے دشمن کو مار مار کر دامنِ کوہ تک میدان صاف کر دیا۔ پہاڑ پر چڑھنا دشوار تھا۔ سید صاحبؒ دامنِ کوہ میں اپنی جماعت میں ایک پتھر پر کھڑے تھے۔ دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ پھر دیکھا تو سید صاحبؒ پتھر پر نہ تھے۔ سب ساتھی بھی شہید ہو گئے'[1]"

گویا سید صاحبؒ کے ایک مخلص فدائی کی روایت کے مطابق آپؒ دست بدست اور تلوار کی جنگ میں شہید نہیں ہوئے بلکہ گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور ایک گولی نے آپؒ کا رشتۂ حیات منقطع کر دیا۔ اس روایت سے منشی مہتاب سنگھ کی روایت کی بھی تائید ہو گئی کہ سیّد صاحبؒ کی شہادت بائیں طرف دل کے مقام پر گولی لگنے سے ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ سیّد صاحبؒ کی شہادت دست بدست جنگ میں نہیں ہوئی اور ان پر تلوار سے حملہ کیا ہی نہیں گیا تو ان کا سر کیسے کٹا اور کس نے کاٹا۔ جو سکھ پہاڑ پر کھڑے گولیاں چلا رہے تھے خود انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ سید صاحبؒ کہاں سے بندوق سر کر رہے ہیں۔ شاہ اسماعیلؒ کس مقام پر ہیں اور نہ وہ سید صاحبؒ کو پہچانتے تھے۔ جب سکھ پہاڑ سے نیچے اتر کر میدان میں آئے تو ہر طرف شہیدوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں اور دھان کے کھیتوں میں سے ان پر فائر نگ ہو رہی تھی۔ اس صورت میں ان کی ساری توجہ اس طرف ہونی چاہئے تھی جدھر سے گولیاں آ رہی تھیں۔ ان کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ جتنی جلد ہو سکے زندہ افراد کو قتل کر کے قصبہ بالاکوٹ پر قبضہ کر لیں نہ کہ بے جان جسموں کے سر کاٹتے پھریں اور نہ کسی جنگ میں ایسا ہوا ہے کہ غالب آنے والی فوج میدانِ جنگ میں پڑی ہوئی لاشوں کے سر کاٹتی پھرے۔ ہاں اگر سکھ سید صاحبؒ کی نعش پہچان لیتے تو یقیناً وہ آپ کا سر کاٹ لیتے۔ اس صورت میں وہ لاش کو تو وہیں پڑا رہنے دیتے اور سر لے جا کر اپنے سپہ سالار کی خدمت میں پیش کرتے اور منہ مانگا انعام پاتے لیکن یہاں اسکے بالکل الٹ ہوا کہ سر تو غائب اور لاش پیش کر دی گئی جس کا پہچاننا بھی مشکل تھا۔ پس اس روایت کے جس پہلو پر غور کیا جائے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل فرضی اور من گھڑت روایت ہے اور سکھوں نے سید صاحبؒ کی تحقیر کرنے کے لئے مشہور کی۔ نہ سید صاحبؒ کے تلوار کا زخم آیا اور نہ ان کا سر کٹا بلکہ ان کی شہادت بندوق کی گولی سے ہوئی۔ جہاں تک "منظورۃ السعدا" کی اس روایت کا تعلق ہے جس کے مطابق خضر خاں سے یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ "شیر سنگھ

---

[1] سید احمد شہیدؒ صہ ۴۱۳ جلد دوم

نے زندہ گرفتار ہونے والے غازیوں کو بلاکر کہا کہ ان نعشوں کو دیکھ کر بتاؤ کہ ان میں سے خلیفہ صاحب کی نعش کونسی ہے۔ پس انہوں نے میدانِ جنگ میں جاکر ایک نعش دیکھی جس کا سر نہیں تھا۔ ان غازیوں نے اس نعش کو سید صاحبؒ کی نعش قرار دیا۔[1]"

اکثر و بیشتر غلط فہمیاں اسی روایت سے پیدا ہوئیں لیکن اس روایت کی حقیقت یہ ہے کہ خضر خاں قندھاری جو اس کے راوی ہیں خود موقع پر موجود نہ تھے بلکہ انہوں نے محض سنی سنائی روایت بیان کی ہے اور انہوں نے جن لوگوں سے یہ روایت سنی انہیں یہ واقعہ سکھوں نے بتایا چنانچہ منظورۃ السعدا کے الفاظ یہ ہیں کہ :-

"بعد ازاں خضر خاں وغیرہم آمدند و ظاہر کردند کہ ما در مقامِ بالاکوٹ رفتیم و نزد بعضے ملکیاں کہ ہمراہ لشکر سکھاں بودند شب باش شدیم پس ازانہا استفسار حال حضرت امیر المومنین نمودیم آنہا ظاہر کردند کہ[2] ......"

اس کے بعد خضر خاں وغیرہ آگئے اور انہوں نے ظاہر کیا کہ وہ بالاکوٹ گئے اور بعض ملکیوں کے ساتھ رات گذاری جو سکھوں کے لشکر کے ساتھ تھے۔ ان سے حضرت امیر المومنین کے بارے میں دریافت کیا انہوں نے بتایا کہ ......

اگر یہ واقعہ خود خضر خاں قندھاری نے دیکھا ہوتا تو ہمیں اس کی صداقت میں ذرہ برابر شبہ نہ ہوتا کیونکہ خان موصوف نہایت بہادر، سید صاحب کے جاں نثار اور صاحبِ کردار انسان تھے مگر انہوں نے یہ روایت کچھ ایسے لوگوں سے سنی جو حدودِ پکھلی یا مظفرآباد وغیرہ کے باشندے تھے اور سکھوں کے ساتھ تھے۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ انہوں نے جو واقعہ بیان کیا وہ درست ہے۔ دشمن کی فوج یا اس کے ساتھیوں کے بیان پر اعتماد کرنا پرلے درجے کی نادانی ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک وہ روایت ہے جس کا راوی سید صاحبؒ کے عاشق صادق کا فرزند تھا۔ سید صاحب کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ آپ سے بے حد مانوس تھا۔ اس نے سید صاحبؒ کی نعش کو پہچانا یہ نعش بے سر کے نہیں تھی کیونکہ اس نے اسے سربریدہ بیان نہیں کیا اور یہی نعش شیر سنگھ کی موجودگی میں دریائے کنہار کے کنارے بالاکوٹ میں دفن کی گئی۔ جہاں تک لاش کو قبر سے نکال کر دریا میں پھینکنے کا واقعہ ہے اس کی حقیقت افسانے سے زیادہ کچھ نہیں۔

سیّد صاحبؒ کی نعش کو دریا میں بہانے کا افسانہ

کہا جاتا ہے کہ سیّد صاحبؒ کی نعشِ مبارک شناخت ہو جانے کے بعد شیر سنگھ نے اعزاز کے ساتھ دریائے کنہار کے کنارے دفن کرا دیا۔ اس کے جانے کے بعد سکھوں کی کچھ فوج تین چار دن تک بالاکوٹ میں مقیم رہی۔

---

[1] منظورۃ السعدا صد ۱۲۰۱

[2] منظورۃ السعدا صد ۱۲۰۱

اس جماعت کے بعض افراد نے ازراہِ تعصب سید صاحبؒ کی نعش مبارک قبر سے نکال کر دریا میں ڈال دی تاکہ مسلمان آپ کی قبر کو یادگار بنا کر پھر کوئی فتنہ کھڑا نہ کریں، منشی مہتاب سنگھ لکھتے ہیں کہ:۔

"شیر سنگھ کی ہدایت کے مطابق سکھ لشکر کے دو سردار اور ان کی ماتحت فوج بالاکوٹ ہی میں ٹھہر گئی۔ ان دونوں سرداروں نے آپس میں مشورہ کیا کہ خلیفہ اپنی زندگی میں اس ملک میں فساد کرتا رہا اگر اس کی نعش قبر میں موجود رہی تو مسلمان اس کی پرستش کریں گے اور اس سے کرامات منسوب کریں گے اس لئے بہتر یہ ہے کہ اسے قبر سے نکال کر دریا کے کنارے میں بہا دیا جائے، چنانچہ ان سکھ سرداروں نے ۵۲ روپے دیکر آٹھ نہنگ سکھوں کو اس کام کے لئے آمادہ کیا اور ان سے کہا کہ یہ کارِ ثواب ہے چنانچہ ان نہنگوں نے اسی وقت خلیفہ کی نعش قبر سے نکال کر تلوار سے اس کا ایک ایک عضو جدا کیا اور پھر دریا میں بہا دیا۔"[1]

اس روایت پر غور کرنے کے بعد ذہن میں سب سے پہلا سوال یہ ابھرتا ہے کہ منشی مہتاب سنگھ کا ذریعہ معلومات کیا تھا، ظاہر ہے کہ وہ سکھ حکومت سے وابستہ تھا، ہری سنگھ کا میر منشی تھا، جنگ کے بعد اس نے سکھوں ہی سے جنگ کی روایات سنیں اور سکھوں کو سید صاحبؒ کے ہاتھوں نقصان پر نقصان اٹھانا پڑا تھا، ان کے بڑے بڑے سورما مارے گئے تھے اس لئے ان کے دلوں میں سید صاحبؒ کے خلاف سخت بغض تھا، وہ ان کی اہانت کے درپے تھے، اس لئے ان کے متعلق ایسی روایات مشہور کرتے تھے جن سے ان کی تحقیر ہو۔ چونکہ کسی شخص کا مثلہ کرنا یعنی اس کے ہاتھ پیر ناک کان اور سر کاٹنا انتہائی ذلت و رسوائی کا باعث ہوتا ہے، اس لئے انہوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے یہ بے سروپا روایت مشہور کی کہ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ان کی نعش اکھیڑی گئی اور اس کا ایک ایک عضو کاٹا گیا اور پھر دریا میں بہا دیا گیا۔ افسوس کہ سید صاحبؒ کے بعض تذکرہ نگاروں نے بھی یہ روایت قبول کر لی اور یہ نہ سوچا کہ اس روایت سے سید صاحبؒ کی کس قدر اہانت ہوتی ہے۔ اگر حقیقت میں ایسا واقعہ پیش آیا ہوتا اور اس کا ناقابلِ تردید ثبوت بھی موجود ہوتا تو ہم بلا پس و پیش یہ روایت قبول کر لیتے خواہ اس سے سید صاحبؒ کی عزت افزائی ہوتی یا ہتک کیونکہ تاریخ نویس کا کام لوگوں کی عزت بچانا نہیں بلکہ واقعات کو ان کی صحیح صورت میں پیش کرنا ہوتا ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ اس روایت کو جس رخ سے دیکھئے انتہائی لغو اور بے بنیاد ہے۔

سید صاحبؒ کی نعش نکالنے کا مقصد

سوال یہ ہے کہ سید صاحب کی نعش قبر سے کیوں نکالی گئی؟ اس کا ایک ہی جواب دیا جاتا ہے کہ سکھوں کا خیال تھا کہ اگر آپ کی نعش قبر میں موجود رہی تو مسلمان اسے زیارت گاہ بنا کر اس سے کرامات منسوب کریں گے اور

---

[1] تاریخ منشی مہتاب سنگھ قلمی ص ۱۰۱

یہ قبر ان کیلئے مرکز کی حیثیت اختیار کر لیگی۔ اسلئے انہوں نے آپکی نعش قبر سے نکال کر دریا میں ڈال دی ظاہر ہے کہ جب سکھوں نے قبر کھود کر آپکی نعش نکالی ہوگی تو قبر اسی طرح کھلی اور خالی پڑی ہوگی کیونکہ سکھوں کو اس دردسری کی کیا ضرورت تھی کہ آپ کی نعش نکالنے کے بعد پھر خالی قبر میں مٹی ڈالتے اور اس کے بعد اسے چوٹی تک لاکر اصل قبر کی شکل دیتے کیونکہ یہ امر تو انکے بنیادی مقصد ہی کے خلاف تھا۔ ان کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ آپ کی قبر بغیر نعش کے ہو اور مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ سید صاحبؒ کی قبر اکھڑی پڑی ہے اور اس میں نعش نہیں ہے تاکہ وہ اس کو زیارت گاہ نہ بنائیں۔ اگر واقعی اسی طرح ہوا تو سکھ لشکر کے بالاکوٹ سے واپس جانے کے بعد جب مقامی لوگ اپنے گھروں میں واپس آئے ہوں گے اور انہوں نے سید صاحبؒ کی قبر کو بغیر نعش کے دیکھا ہوگا تو یہ ایسا واقعہ نہ تھا کہ اس کی کسی کو خبر نہ ہوئی ہوگی...... بالاکوٹ چھوٹی سی جگہ ہے اور اس وقت تو اور بھی معمولی تھی۔ اگر سید صاحب کی قبر بغیر نعش کے ہوتی تو یہاں کے بچے بچے کو اس واقعہ کی خبر ہو جاتی۔ آج بھی اگر کسی چوہڑے کی قبر کھود کر نعش نکال لی جائے تو بڑے سے بڑے شہر میں بھی یہ واقعہ شہرت پا جاتا ہے اور ہزاروں افراد موقع پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بالاکوٹ جیسی معمولی سی بستی میں اتنے بڑے انسان کی نعش اس کی قبر سے نکال لی گئی اور اہل شہر اس واقعہ سے بے خبر رہے۔ جہاں تک ہم نے تحقیق کی ہے بالاکوٹ کا ایک شخص بھی ایسا نہیں جو اس امر کی تصدیق کرتا ہو کہ اس نے اپنے کسی بزرگ سے یہ واقعہ سنا یا اس کے کسی بزرگ نے اسے بتایا کہ جب ہم لوگ بالاکوٹ واپس آئے تو سید صاحبؒ کی قبر کھلی پڑی تھی اور اس میں نعش نہیں تھی۔ سید صاحبؒ کی قبر کے بے نعش ہونے کے سب سے پہلے شاہد اہل بالاکوٹ ہو سکتے ہیں اور وہ اس کی تصدیق نہیں کرتے۔

مہرؔ صاحب کی روایت

اس سلسلے میں مولانا غلام رسول مہرؔ کی ایک روایت خاص طور سے قابلِ ذکر بلکہ قابلِ غور ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:۔

"۱۸۹۳ء میں خان عجب خاں برادرزادہ خان ارسلا خاں (زیدہ) مانسہرہ میں نائب تحصیلدار مقرر ہو کر گئے تو انہوں نے سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ دونوں کی قبروں کا سراغ لگانا چاہا۔ وہ اس خاندان کے ایک فرد تھے جو سید صاحبؒ کی عقیدت میں ثابت قدم رہا۔ رسن رسیدہ اور واقف کار آدمیوں کو جمع کر کے پوری چھان بین کرائی پھر کم و بیش باسٹھ برس کے بعد ان قبروں کے نشان قائم کئے۔[1]"

---

[1] سید احمد شہید صفحہ ۴۹۴

ہمارے خیال میں اس روایت نے فیصلہ کر دیا کہ سید صاحبؒ کو شہادت کے بعد بالاکوٹ میں دریائے کنہار کے کنارے اسی قبر میں دفن کیا گیا جو آج بھی موجود ہے اور ان کی نعش کو دریا میں بہانے کا واقعہ بالکل بے بنیاد ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ خان عجب خاں نائب تحصیلدار نے بالاکوٹ کے سن رسیدہ اور واقف لوگوں کے ذریعہ سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کی قبروں کی نشان دہی کرائی۔ یہاں دو اشکال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) بالاکوٹ کے جن واقف لوگوں نے حضرت سید احمد صاحبؒ کی قبر کی نشان دہی کی انہوں ہی نے حضرت شاہ اسماعیل صاحبؒ کی قبر کی نشان دہی کی۔ اگر انہوں نے سید صاحبؒ کی قبر کی غلط نشان دہی کی تو حضرت شاہ صاحبؒ کی قبر بھی مشتبہ ہو جاتی ہے لیکن آج تک کسی ایک شخص نے بھی شاہ اسماعیل صاحبؒ کی قبر کے حقیقی ہونے میں شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ سید صاحبؒ کی قبر بھی اصلی اور حقیقی ہے اور وہ اسی مقام پر دفن ہیں۔

(۲) اگر سید صاحبؒ کی قبر میں سے نعش نکال لی گئی تھی اور وہ خالی تھی تو جس وقت خان عجب خاں اُن کی قبر کی نشان دہی کرا رہے تھے اس وقت بالاکوٹ کے یہ واقف لوگ عجب خاں کو بتا دیتے کہ "جناب! سید صاحبؒ کی قبر کیسی؟ ان کی نعش تو سکھوں نے قبر میں سے نکال کر دریا میں بہادی تھی"۔ مگر انہوں نے ایسی کوئی روایت بیان نہیں کی اور سید صاحبؒ کی قبر کی نشان دہی کردی۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ سید صاحبؒ کی نعش قبر میں سے نکال کر دریا میں بہائے جانے کا واقعہ بالکل فرضی اور بے بنیاد ہے اور بالاکوٹ کے واقف لوگ اس وقت تک اس واقعے سے بالکل بے خبر تھے یا اسے بے اصل سمجھتے تھے۔

سیّد صاحب کا مدفن اور اہلِ بالاکوٹ

اب ہم ذیل میں بالاکوٹ کے معزز اور ذمہ دار اصحاب کے بیانات درج کرتے ہیں جن کے بزرگ اس واقعہ کے وقت بقیدِ حیات تھے اور خاتمہ جنگ کے تین چار روز بعد اور بعض دوسرے روز شہر میں واپس آگئے تھے ان اصحاب نے اپنے بزرگوں سے جو روایات سنیں ان کی صداقت میں اس لئے شک و شبہ نہیں ہو سکتا کہ گذشتہ صفحات میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ بھی ان کی تائید کرتے ہیں۔ ان اصحاب کے بیانات کے عکس بھی شائع کئے جا رہے ہیں تاکہ قارئین کے دلوں میں ان بیانات کی صداقت کے بارے میں کوئی شبہ پیدا نہ ہو۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان اصحاب کا تعارف کرا دیا جائے۔

قاضی محمد اسرائیل صاحب

قاضی محمد اسرائیل صاحب بالاکوٹ کے مشہور قاضی خاندان کے رکنِ رکین ہیں۔ دیوبند کے فارغ التحصیل نہایت صاحب علم و فضل بڑے دیندار اور مرنجان مرنج بزرگ ہیں۔ عرصے تک جامعۂ رحمانیہ دہلی میں مدرس رہے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور تشریف لے آئے اور مدرسہ ضیاء العلوم حنفیہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۵۱ء سے محمدیہ بالاکوٹ کے صدر مدرس ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد افغانستان سے ترکِ وطن کر کے حضرت سید احمد صاحبؒ شہید کے زمانے سے کچھ عرصہ قبل کاغان کے علاقہ کوائی میں اقامت پذیر ہوئے۔ مدت تک عہدۂ قضا پر فائز رہے۔ قاضی محمد اسرائیل صاحب کے والد بزرگوار قاضی محمد اسماعیل صاحب بالاکوٹ کے قاضی تھے آپ کے دادا نے حضرت سید صاحبؒ کا زمانہ پایا تھا۔ اس لحاظ سے قاضی محمد اسرائیل صاحب کی روایت نہایت مستند ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے اپنے اکابر سے جو ننھیال اور ددھیال دونوں سے تعلق رکھتے تھے جو کچھ روایتہً معلوم ہوا اس سے میں یہی سمجھا ہوں کہ حضرت سید احمد صاحب شہید بریلوی کی اصل قبر یہی ہے جو بالاکوٹ میں جامع مسجد (پل والی) کے عقب میں چند قدم کے فاصلے پر احاطے میں واقع ہے۔ اس کے علاوہ جو مقامات ان کی قبر کے متعلق بتائے جاتے ہیں مثلاً گڑھی حبیب اللہ وغیرہ، میرے بزرگوں کی روایت اور

علم و ادراک کے مطابق بالکل بے بنیاد اور فرضی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں۔

قاضی محمد اسرائیل

صدر مدرس مدرسہ دار العلوم محمدیہ بالاکوٹ ۸/۵/ ۹۳ء

حکیم سیّد عبدالرؤف شاہ کا بیان

حکیم سیّد عبدالرؤف شاہ صاحب کاغان کے مشہور خاندانِ سادات کے اکابرین سے ہیں۔ سید ضامن شاہ سردارِ کاغان جنہوں نے سید صاحبؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی اور آپ کے ساتھ بالاکوٹ میں بھی مقیم رہے تھے حکیم صاحب کے پردادا تھے۔ حکیم صاحب زمانۂ دراز سے بالاکوٹ میں مقیم ہیں۔ مستند اور حاذق طبیب نہایت صاحب علم و فضل، بہت عالی ظرف، خوش خلق اور متواضع بزرگ ہیں۔ عمر ۸۲، ۸۳ سال کے لگ بھگ ہے:

میرا تعلق کاغان کے سردار سید ضامن شاہ صاحب کے خاندان سے ہے جو میرے پردادا تھے۔ سید ضامن شاہ صاحب کے برادر خورد سید سکندر شاہ صاحب مرحوم میری اوائل عمر تک زندہ تھے۔ میں نے اپنی زبانی اور اپنے والد ماجد اور دیگر ریش سفید بزرگان خاندان سے جو کچھ سنا اس کا ما حصل یہ ہے کہ بعد ختم ہو جانے جنگ کے سکھ لشکر کے جرنیل سردار شیر سنگھ نے شہدا کی نعشوں میں سے زخمی مجاہدین کے ذریعے حضرت سید احمد صاحب بریلوی کی نعش مبارک شناخت کروائی اور ...

جنگ سے اُٹھوا کر اپنے کیمپ میں لایا جو دریائے کنہار کے کنارے قائم تھا۔ دوسرے دن اُسنے اپنی فوج کے مسلمان ملازموں اور بالاکوٹ کے اُن لوگوں کو جمع کیا جو گاؤں میں واپس آچکے تھے اسکے بعد اُسنے اُن سب سے کہا کہ تم لوگ خلیفہ صاحب کو اپنے طریقہ کے موافق دفن کر دو۔ اُسنے کچھ نقدی بھی دی اور ایک دوشالہ بھی دیا اور کہا کہ خلیفہ صاحب کی نعش پر میری طرف سے ڈالدو۔ اسکے بعد حضرت سید صاحب کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور آپکی نعش مبارک کنہار ندی کے کنارے اس جگہ دفن کیگئی جہاں آج بھی آپکی قبر مبارک موجود ہے۔ معلوم نہیں انکی نعش کو قبر سے نکالکر اور دریا میں بہانے کا جھوٹا واقعہ کیسے مشہور ہو گیا۔ اہل بالاکوٹ اور میرے خاندان کے بزرگوں کو اس غلط واقعہ کا قطعاً علم نہیں وہ لوگ آخر وقت تک اسی مزار پر فاتحہ خوانی کیلئے آیا کرتے تھے اگر وہ اس قبر کو اندر سے خالی یا فرضی سمجھتے تو اس پر فاتحہ پڑھنے کبھی نہ آتے۔

حکیم سید عبداللہ شاہ ساکن بالاکوٹ ضلع ہزارہ
۱۷ اگست ۱۹[illegible]ء
بقلم السید

حاجی عبدالجبار خاں صاحب کا بیان

حاجی عبدالجبار خاں صاحب مانسہرہ کے رؤسا میں سے ہیں۔ واصل خاں جن کی حویلی میں سید صاحبؒ نے قیام فرمایا تھا آپ کے پرنانا تھے۔ عمر ۸۶ سال سے زیادہ ہے ۱۹۵۹ء میں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ نہایت متواضع اور دیندار بزرگ ہیں۔ جامع مسجد مانسہرہ اور مسجد مٹیاں والی کے ساتھ بہت سی زمین وقف کی ہے۔ اس پر اپنے خرچ سے دوکانیں تعمیر کروا رہے ہیں تاکہ ان دوکانوں کی آمدنی سے مسجد کے اخراجات پورے ہوتے رہیں۔ ان مسجدوں کے علاوہ مانسہرہ کی پانچ اور مساجد کے بھی متولی

ہیں۔ آپ کا بیان ہے کہ:۔

میرا ننھیال بالاکوٹ میں ہے۔ میرے نانا لعل خان صاحب اور پرنانا درّصل خان صاحب تھے۔ یہ درّصل خان وہی بزرگ ہیں جنکی حویلی میں حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قیام کیا تھا۔ مجھ تک اپنی والدہ ماجدہ اور اپنے ننھیال کے بزرگوں سے حضرت سید صاحب جنکے مزار مبارک کے متعلق جو واقعات پہنچے ہیں انکی رو سے سید صاحب کی شہادت کے بعد شیر سنگھ ابن رنجیت سنگھ نے انکے مجاہدانہ انداز کی بنا پر سید صاحب کی نعش کی شناخت کروا کے بعد ازاں میدان جنگ سے اٹھوا دیا اور ان مسلمانوں کو جو بالاکوٹ میں موجود تھے جمع کر کے کہا کہ انہیں (سید صاحب کو) مسلمانوں کے طریق کے مطابق دفن کر دو۔ اسنے اپنا قیمتی دو شالہ بھی دیا کہ اسے لاش پر ڈھانپ دو۔ اسکے بعد نماز جنازہ پڑھ کر سید صاحب کی لاش کو کنہار نامی دریا کے کنارے تھوڑے فاصلے پر بالاکوٹ میں دفن کیا گیا جہاں اب بھی انکا مزار موجود ہے۔ اس واقعے کے بیسیوں شاہد تھے جن میں سے بعض میرے بچپن تک زندہ تھے۔ انکی نعش اٹھا کر لے جانے یا سر کاٹ کر دریا میں بہانے کا واقعہ قطعاً غلط ہے کہ میں اسکا ذکر بھی نہیں کرنا چاہتا۔

حاجی عبدالجبار خان ولد
ولد حاجی احمد خان

خاص شہید گاہ
۱۵ اگست ۱۹۷۰

خان غلام سرور خاں کا بیان

خان غلام سرور خاں صاحب بالاکوٹ کے خوانین میں سے ہیں۔ خان قمر خاں جنہوں نے حضرت سید صاحبؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی آپ کے پردادا تھے۔ آپ کے والد ماجد خان محمد قلیچ خان طویل

عمر پا کر ۱۹۴۵ء میں فوت ہوئے۔ خان غلام سرور خاں نہایت شریف النفس، خوش خلق اور راستباز انسان ہیں۔ جنگ بالاکوٹ کے متعلق بہت سی خاندانی روایات آپ کے حافظے میں محفوظ ہیں جن میں سے بعض کی تاریخ سے تصدیق بھی ہوتی ہے۔ حضرت سید صاحبؒ کی تدفین کے متعلق آپ کا بیان ہے کہ:-

ہمارے ایک مزارع مسمی لعل دین جو ایک قابل اعتبار آدمی تھا (اور جس نے تقریباً ۱۰۵ سال کی عمر میں آج سے تقریباً چالیس سال قبل وفات پائی) نے مرقوم مجھ کو یا میرے والد مرحوم خان محمد قلیچ خان صاحب اور بہت سے دوسرے افراد سے بیان کیا کہ جس وقت سید احمد شاہ صاحب بریلوی کی شہادت ہوئی اور جنگ ختم ہو گئی تو میں (لعل دین) پہاڑ سے اتر کر نیچے آیا اور میری موجودگی میں سید صاحب مذکور کو اسی جگہ دفن کیا گیا جہاں آج کل موجودہ قبر واقع ہے۔

لعل دین مرقوم خود میرے والد ماجد خان محمد قلیچ خان صاحب مرحوم (جنہوں نے سنہ 1945ء میں تقریباً نوے یا پچانوے سال عمر پا کر وفات پائی) نے بھی کئی بار میری موجودگی میں مختلف اصحاب کے سامنے یہ روایت بیان کی کہ حضرت سید احمد شاہ صاحب بریلوی شہید کی نماز جنازہ اہل بالاکوٹ نے پڑھی اور انہیں اسی قبر میں دفن کیا گیا جو کہ اب تک بالاکوٹ میں ان سے منسوب چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے کئی بار اس خیال کی سختی سے تردید کی کہ حضرت سید صاحب مذکور کی نعش مبارک کو قبر سے نکال کر دریا میں پھینک دیا گیا۔ اس روایت کو وہ غرضی اور سیاسی مقصد کے لئے گھڑی ہوئی بیان کرتے تھے۔

غلام سرور خان۔

۱۲ اگست سنہ ۱۹۷۱ء بالاکوٹ ۔ ضلع ہزارہ

ڈاکٹر امداد الحق صاحب کا بیان

ڈاکٹر امداد الحق صاحب بالاکوٹ کے نہایت اچھے معالج ہیں۔ بہت نیک نفس با اخلاق اور ذمہ دار شخص ہیں۔ آپ کے والد قاضی محمد یونس صاحب کا شمار بالاکوٹ کے اکابر میں ہوتا تھا۔ اپنی وفات تک قاضی شہر کے عہدہ پر فائز رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے انہی کے زیر سایہ پرورش اور تعلیم و تربیت پائی اور جنگ بالاکوٹ کے متعلق ان سے بہت سی روایات سنیں۔ سید صاحبؒ کی تدفین کے متعلق آپ کا بیان ہے کہ :۔

میرے والد مرحوم قاضی محمد یونس صاحب سے جو روایت مجھ تک پہنچی ہے اس کے مطابق حضرت سید احمد شہیدؒ کو اسی مقام پر دفن کیا گیا جہاں ان کی موجودہ زیارت ہے۔ سکھوں نے کبھی ان کی لاش مبارک کو قبر سے نکالنے کا واقعہ بیان نہیں کیا۔

میں نے ان سے یہ بھی سنا کہ شہادت کے بعد سید صاحب کا جسد مبارک اس جگہ لایا گیا جہاں آجکل گورنمنٹ ہائی سکول بالاکوٹ کی عمارت ہے۔ اسی جگہ پر ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔

میرے والد محترم کی نماز سے قبل بالعموم مزار حضرت سید احمد شہید پر حاضر ہو کر فاتحہ بھی پڑھا کرتے تھے۔ اگر ان کے خیال میں سید صاحب کے مدفن میں کوئی شک و شبہ ہوتا تو وہ اس التزام اور عقیدت و احترام سے ان کے مزار پر حاضر ہو کر فاتحہ نہ پڑھتے۔

ڈاکٹر قاضی امداد الحق

امدادیہ فارمیسی بالاکوٹ ہزارہ

12.8.70

منشی محمد حیات صاحب کا بیان

منشی محمد حیات صاحب بالاکوٹ کے سن رسیدہ اور معتبر اصحاب میں سے ہیں، ابتدائے عمر سے سید صاحبؒ اور معرکۂ بالاکوٹ کے متعلق روایات معلوم کرنے کا شوق تھا۔ بالاکوٹ کے سن رسیدہ خوانین سے تحقیقات کی۔ بالاکوٹ میں ایک جید عالم مولوی فخر الدین صاحب گذرے ہیں ۱۲۰ سال کی طویل عمر پاکر فوت ہوئے۔ منشی صاحب ان کے شاگرد ہیں اپنے استاد محترم سے بھی وقتاً فوقتاً روایات سنیں، اس پیرانہ سالی میں بھی حافظہ اچھا ہے۔ ان کی شرافت حسن اخلاق اور شرافت کو دیکھتے ہوئے ان کی روایت کی صداقت میں کوئی شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ سید صاحبؒ کی تدفین کے متعلق آپ کا بیان ہے کہ:۔

مجھے میرے استاد مولوی فخر الدین صاحب مرحوم نے جو بوقت وفات تقریباً
ایک سو بیس سال کے تھے۔ نہایت وثوق سے سنایا کہ سید احمد صاحب شہید
کو جرنیل شیر سنگھ نے اپنی نگرانی میں نہایت ہی اعزاز و اکرام کے ساتھ
دریائے کنہار کے کنارے جانب شمال مغرب اسی مقام پر دفن کیا گیا
جہاں ان کی موجودہ قبر ہے۔ شیر سنگھ نے ارشاد فرمایا تھا کہ شاہ صاحب
پر ڈال دو اور بالاکوٹ کے مسلمانوں کو جمع کرکے یہ بھی کہا کہ انہیں
اپنے طریقے کے مطابق دفن کرو اور جو خرچ خیرات وغیرہ پر ہوتا ہے
وہ مجھ سے لے لو وہ میں دوں گا۔ چنانچہ وہ اس نے دیا۔ شیر سنگھ نے
کہا یہ اپنی قوم کا بہت بڑا آدمی ہے میں یہ نہ چاہتا تھا کہ میں ان سے اس
حالت میں ملاقات کروں۔ میری خواہش تھی کہ میں ان سے زندگی میں
ملوں اور باتیں کرکے اپنے اختلافات دور کروں۔ میرے استاد محترم

نے مجھے بتایا کہ ان کی لاش قبر سے نکالنے کا واقعہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ تلہٹہ اور گڑھی حبیب اللہ میں جو مزار بنائے گئے ہیں وہ فرضی ہیں۔

محمد حیات لیفٹیننٹ مرزا

۱۲ اگست ۱۹۷۰ء

بالاکوٹ

بالاکوٹ کے ان معزز و معتبر اصحاب کے بیانات کے بعد اس حقیقت میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ حضرت سید صاحبؒ کو شہادت کے بعد بالاکوٹ میں اسی مقام پر دفن کیا گیا جہاں ان کا مزار آج بھی موجود ہے اور آپ کی نعش کو قبر سے نکالنے کا واقعہ حد درجہ لغو اور ناقابلِ اعتبار ہے۔

تلہٹہ اور گڑھی کے مزارات

اسی طرح جو اصحاب موضع تلہٹہ یا گڑھی حبیب اللہ میں سید صاحبؒ کا دفن کیا جانا بیان کرتے ہیں وہ بھی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ راقم الحروف نے خود تلہٹہ جا کر سید صاحبؒ کی قبر دریافت کرنے کی کوشش کی مگر وہاں کسی ایسی قبر کا سراغ نہ لگ سکا۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اتنے بڑے انسان کی نعش دریا سے نکال کر جس بستی میں دفن کی گئی وہاں کا ایک شخص بھی اس کے مدفن سے واقف نہ ہو۔ پھر اگر یہ روایت درست مان بھی لی جائے کہ سید صاحبؒ کی نعش دریا سے نکال کر موضع تلہٹہ میں دفن کی گئی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ نعش بغیر سر کے تھی تو تلہٹہ کے لوگوں نے کیسے معلوم کیا کہ یہ سید صاحبؒ کی نعش ہے جب کہ وہ کئی روز ایک قبر میں دفن بھی رہ چکی تھی۔ افسوس کہ حقائق پر غور کئے بغیر روایات قبول کر لی گئیں جس کے نتیجے میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہوئیں۔

یہی کیفیت گڑھی حبیب اللہ کے مزار کی ہے جہاں سید صاحبؒ کا سر دفن ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ ہمارے فاضل بزرگ مولانا غلام رسول مہرؒ فرماتے ہیں کہ :۔

"لاش دریا میں گرتے ہی تیرتی تیرتی تلہٹہ پہنچی جو بالاکوٹ سے قریباً ۹ میل جنوب میں کنہار کے مشرقی کنارے پر ایک گاؤں ہے۔ سر اور تن پہلے ہی الگ الگ تھے۔۔۔ سر بہتا بہتا گڑھی حبیب اللہ خاں کے پاس اس جگہ کے قریب پہنچ گیا جہاں آج کل پل بنا ہوا ہے۔۔۔ ایک بڑھیا پانی بھرنے کے لئے آئی۔ اس نے دیکھ کر خان کو خبر پہنچائی۔ وہ دوڑا ہوا آیا اور سر کو دریا سے نکال کر کنارے ہی پر دفن کر دیا۔"[1]

[1] سید احمد شہیدؒ ص ۴۳۹ جلد دوم

اگر یہ روایت درست ہے اور گڑھی کے خان نے سید صاحبؒ کا سر دریا سے نکال کر خود دفن کیا یا اپنی نگرانی میں دفن کرایا تو اس واقعہ کا سب سے زیادہ علم خان کے اہل خاندان خصوصاً اس کے جانشینوں کو ہونا چاہیے تھا اور یہ روایت اس وقت کے خان سے منتقل ہوتی ہوئی نسل بعد نسلاً گڑھی کے موجودہ خان تک پہنچتی مگر راقم الحروف نے گڑھی کے موجودہ خان، خان محمد نسیم خاں صاحب سے متعدد بار ملاقات کی۔ ان سے ان کے جد بزرگوار خان حبیب اللہ خاں، معرکۂ بالاکوٹ اور سید صاحبؒ کے مدفن کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی مگر انہوں نے اس روایت سے نہ صرف یہ کہ لاعلمی کا اظہار کیا بلکہ اس کی سختی سے تردید کی۔ گڑھی حبیب اللہ کے قاضی اور جامع مسجد کے خطیب قاضی فضل الرحمٰن صاحب نے بھی جو اورینٹل کالج لاہور کے فارغ التحصیل اور نہایت صاحب علم بزرگ ہیں اس روایت کو غلط قرار دیا۔ "پرسچہ" مضافات گڑھی حبیب اللہ کے ممتاز فرد اور سلطان نجف خاں (کھوڑی والا) کے خاندان کے چشم و چراغ ہدایت اللہ خاں صاحب نے بھی یہ روایت تسلیم نہیں کی۔ گڑھی حبیب اللہ کے بعض اور اصحاب نے بھی اسے فرضی اور جعلی روایت قرار دیا۔ راقم الحروف نے اس مزار کی حقیقت کے بارے میں جو تحقیق کی وہ گڑھی حبیب اللہ کے انہی معزز اور ذمہ دار اصحاب کی زبانی زیادہ مناسب معلوم ہوگی۔ ان اصحاب کا بیان ہے کہ :-

حضرت سید احمد شہید کے سر مبارک کا جو مزار گڑھی حبیب اللہ میں دریا کے کنارے پل کے قریب بتایا جاتا ہے ہماری تحقیق اور مقامی مصدقہ روایات کے مطابق یہ بالکل جعلی اور فرضی مزار ہے۔ نہ حضرت سید صاحب کا سر بہتا ہوا یہاں تک آیا اور نہ اسے نکال کر یہاں دفن کیا گیا۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے جو روایت سنی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مزار ایک بزرگ بابا قطب الدین صاحب کا ہے۔ جو منگلور بادے گڑھی حبیب اللہ آتے ہوئے راستے میں رہزنوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ یہ بزرگ گوجر قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اور نہایت پاکباز اور نیک سیرت انسان تھے۔ چونکہ اس طرح قتل ہونے والا شخص بھی حدیث نبوی کے مطابق شہید کا درجہ پاتا ہے۔ اس لئے لوگ اس بزرگ کو بابا قطب شہید اور اس مزار کو بابا قطب شہید کا مزار کہنے لگے۔ یہ وہ روایت ہے جس کی بے شمار افراد تصدیق کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک یہ مزار اسی نام سے مشہور و موسوم تھا۔ اس کے بعد بعض لوگوں نے جلب زر کی خاطر بابا قطب شہید کے مزار کو سید احمد شہید کے سر کا مزار بنا دیا۔ یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے دیکھتے دیکھتے ہوا۔ اس کے ساتھ ایک مسجد بنائی ہے۔ اس مسجد پر جو کتبہ لگا ہے اس پر

میں یہ عبارت درج ہے "مسجد بابا قطب شہید" یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ مزار بابا قطب الدین
کے نام سے مشہور تھا۔ اور اسی لئے اس مسجد کو بھی انہی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ
ان لوگوں کو نیکی کی ہدایت دے جنہوں نے صرف پیسے کی خاطر یہ دھندا کیا۔ اللہ پاک
ناواقف اور بے ضمیر لوگوں کو اس شر سے محفوظ رکھے۔

قاضی فضل الرحمن آمین

قاضی آف گڑھی حبیب اللہ

خان آف گڑھی حبیب اللہ

پٹواری [illegible] اللہ خان

آف پرسیچہ منزو گڑھی حبیب اللہ

ہمارے خیال میں اس مستند ترین بیان پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ منصف مزاج اصحاب خود نتیجہ نکال لیں گے کہ کس طرح بعض لوگوں نے خاص اغراض کے تحت ایک اور بزرگ کے مزار کو حضرت سید صاحبؒ کے سر مبارک کا مزار بنا کر نہ صرف عام لوگوں بلکہ بڑے بڑے محققوں اور مورخوں کو غلط فہمی میں مبتلا کیا۔

سیّد صاحبؒ کا دعویٰ ماموریت

گذشتہ صفحات میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی زندگی اور آپ کی تحریکِ اصلاح وجہاد کے متعلق جو معلومات پیش کی گئی ہیں وہ سنی سنائی باتوں پر مبنی نہیں بلکہ ان کتابوں سے ماخوذ ہیں جن کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے بیشتر روایات ان لوگوں کی ہیں جو سفر وحضر میں سید صاحبؒ کے رفیق وہمراز رہے اور جنہوں نے آپ کو نہایت قریب سے دیکھا۔ ان روایات کا مطالعہ کرنے کے بعد حضرت سیدؒ شہید کی جو تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے ابھرتی ہے، اس کے خدوخال اتنے نمایاں ہیں کہ ان میں کسی رنگ آمیزی کی ضرورت نہیں۔ ان کے مطالعے کے بعد ہر منصف مزاج شخص کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ رائے بریلی کا یہ سیدزادہؒ غیر معمولی دل ودماغ اور غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل تھا۔ اس نے بنجر زمین میں بیج ڈالا اور اس سے اثمارِ شیریں حاصل کئے۔ اس نے برصغیر میں ایک عظیم روحانی انقلاب پیدا کردیا اور ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھدی جو اسکی زندگی میں پروان چڑھی اور اسکے اثرات آجتک موجود ہیں بلکہ ہمیں یہ کہنے میں قطعاً باک نہیں کہ آج ہم جس سرزمین پر آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں یہ اسی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس پاکباز اور اولوالعزم سیدزادہ نے جن علاقوں کی آزادی کیلئے آہن گداز مصائب برداشت کئے اور آخرکار اپنی جانِ عزیز بھی اس مقصد کے لئے قربان کردی۔ اس کی شہادت پر سو سال سے کچھ ہی زیادہ عرصہ گزرا تھا کہ وہ سب علاقے مملکت پاکستان کا جزو بن گئے یعنی پنجاب، سرحد، کشمیر اور بنگال[1]۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ سیّدؒ شہید کی ان قربانیوں اور عظیم الشان کارناموں کا اعتراف کیا جاتا اور اسے پاکستان کا داعیٔ اوّل قرار دیا جاتا مگر ہوا یہ کہ اسکی انقلابی تحریک کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔ اسکی زندگی میں بھی اسکے خلاف سازشیں

---

[1] کشمیر کے علاقہ مظفرآباد پر سید صاحب کے مجاہدین نے اسلامی حکومت کا علم لہرا دیا تھا چنانچہ یہی مظفرآباد حکومت آزاد جموں وکشیر کا دارالسلطنت ہے اور ہمیں یقین ہے کہ انشاءاللہ سارے کشمیر پر اسلامی حکومت قائم ہو کر رہے گی کہ سید صاحبؒ پورے کشمیر کو ظالموں کے تسلط سے آزاد کرانے کی غرض سے بالاکوٹ گئے تھے۔ بنگال کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ظلم وستم سے نجات دلانے کیلئے سید صاحبؒ کے ایک جاں نثار مرید نثار علی عرف تیتو میر نے سید صاحبؒ کی زندگی ہی میں بنگالی ہندوؤں کے خلاف علمِ جہاد بلند کر دیا تھا چنانچہ آج بنگال کا یہ حصہ بھی مملکت پاکستان کا جزوِ اعظم ہے (مولف)

کی گئیں اور اسکی شہادت کے بعد بھی اسے معاف نہ کیا گیا۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں۔ دنیا میں جتنے مامور اور مجدد گزرے ان کی قوم نے ان سب کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ خود مسلمانوں میں حضرت امام ابن تیمیہؒ سے لے کر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ تک کسے معاف کیا گیا؟ چونکہ سید صاحب بھی خداوند تعالیٰ کی طرف سے تیرھویں صدی کے مجدد کے طور پر مامور کئے گئے تھے اس لئے ضروری تھا کہ انکے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا چنانچہ انہیں وہابی قرار دیا گیا ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے۔ ان سے جہاد کرنا سکھوں سے جہاد کرنے سے افضل قرار دیا گیا۔ ان کی تحریک پر اعتراضات کا سلسلہ ان کی شہادت کے بعد بھی جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا ہندوستان کے شہر بدایوں سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں سید شہیدؒ کی تحریک کو بدنام کرنے کی سعی نامبارک کی گئی ہے۔

بدایونی مولف کے اعتراضات

ہم اس کتاب کے مذہبی مباحث میں الجھنا نہیں چاہتے کیونکہ ہمیں اس حقیقت کا احساس ہے کہ اس وقت پاکستان اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گذر رہا ہے۔ ان حالات میں ان مباحث سے مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں اختلاف و انتشار کے سوائے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ مذہبی مباحث انہی لوگوں کو مبارک ہوں جو شاید پیدا ہی اسلئے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں میں افتراق پیدا کریں۔ اسی طرح ہم ولایتِ انبیاء اور ولایتِ اولیاء کے تقدم و تاخر پر بھی بحث و گفتگو نہیں کریں گے کہ یہ بھی انہی لوگوں کا کام ہے جنہیں دنیا میں کوئی کام نہ ہو۔ تصوف کی موشگافیاں بھی ہمارے دائرہ گفتگو سے خارج ہیں کہ اس افیونؔ[1] نے پہلے ہی قوم کے ذہن کو مفلوج کر دیا ہے۔ ہم کفر و اسلام کی بحث میں بھی الجھنا نہیں چاہتے کہ اس قسم کی فیکٹریاں پہلے ہی بکثرت قائم ہیں جن میں کفر کے فتوے تیار ہوتے اور اپنے مخالفین کو نہایت فراخ دلی سے عطا کئے جاتے ہیں۔ اس [illegible] کفر سازی کا خدا اور اسکے رسولؐ کی طرف سے ہمیں کوئی پروانہ بھی نہیں ملا یہ ہم ان لوگوں کو مبارک ہو جو بارگاہ الٰہی سے اس [illegible] اختیار نامہ لیکر آئے ہیں بلکہ جو ایسے پروانوں ہی سے بے نیاز ہیں۔ ہم ان صفحات میں اس کتاب کے صرف ان حصوں کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں جن کا تعلق سید صاحبؒ کی تحریک پر سنجیدہ اعتراضات سے ہے۔

اب تک سید صاحبؒ پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں یہ کتاب ان میں سب سے زیادہ تضاد کا مجموعہ اور ژولیدہ فکری و ژولیدہ بیانی کا شاہکار ہے۔ اس کتاب میں ایک طرف سید صاحب کی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے اور دوسری طرف انہیں انکے بلند مرتبہ سے گرانے کی طفلانہ کوششیں کیگئی ہیں۔ ان کے متعلق حقارت آمیز الفاظ استعمال کئے گئے ہیں مثلاً "سید احمد اینڈ کو"[2] اور "سید صاحبؒ کو جنگ بالاکوٹ میں کسی بگڑے دل ساتھی نے تلوار کے گھاٹ اتار کر دلدل میں دبا دیا"[3] کسی شخصیت سے خواہ وہ کتنی بڑی ہو ہر شخص کو اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے مگر اختلاف کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔ اگر یہ اختلاف سنجیدگی اور

---

[1] تصوف نہایت بلند اخلاقی تعلیم کا نام ہے مگر نام نہاد صوفیوں نے اس کی صورت بگاڑ کر اسے عملی زندگی کے لئے سم قاتل بنا دیا (مولف)

[2] ملاحظہ ہو بدایونی کی کتاب کا صہ ۱۵۴ (طبع سوم) [3] صہ ۱۱۹

تہذیب کے دائرے میں ہو تو اس سے فکر کے دروازے وا ہوتے ہیں، تحقیق کی راہیں کھلتی ہیں اور خود اختلاف کرنے والے کی ذہنی بلندی کا پتہ چلتا ہے مگر جب اس اختلاف میں مسخرہ پن شامل ہو جائے تو اختلاف کرنے والے کی ذہنی پستی اور علمی کم مائگی دونوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے متعلق مندرجہ بالا تضحیک آمیز الفاظ استعمال کر کے سید شہیدؒ کی عظمت کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا کہ وہ اس جیسے لوگوں کی دسترس سے باہر ہے مگر افسوس کہ اپنے سفلہ پن کا ثبوت ضرور دے دیا۔

مولف کا اعترافِ حقیقت

سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ وہ خود حضرت سید صاحبؒ کو خدا رسیدہ قرار دیتا ہے، چنانچہ اس کا بیان ہے کہ:۔ "اس میں شک نہیں کہ سید صاحب کی ہستی برگزیدہ تھی وہ اپنی کیفیات میں محو رہ کر اصلاح کرنا چاہتے تھے [1]"۔ اس کے بعد پھر سید صاحبؒ کی روحانیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:۔

"سید صاحبؒ روحانی آدمی تھے ان کی طرف مخلوق کا رجحان اسی وجہ سے تھا [2]"

ایک معمولی عقل کا آدمی بھی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے جھوٹ نہیں بولا کرتے، روحانی انسان خداوند تعالیٰ پر بہتان نہیں باندھتے مگر اس تضاد بیانی کا کیا علاج کہ ایک طرف وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کو برگزیدہ انسان قرار دیتا ہے اور ان کی روحانیت کا معترف ہے اور دوسری طرف وہ ان پر فریب کاری اور جعل سازی بلکہ صاف دروغ گوئی کا الزام لگاتا ہے۔ چنانچہ اس نے حضرت سید صاحبؒ کے دعوئ ماموریت کا انکار کر کے انہیں ایسے ہی لوگوں کی صف میں کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسے اعتراض ہے کہ:۔

"مامور من اللہ کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں، سید صاحبؒ میں وہ اوصاف نہیں تھے [3]"

بلاشبہ مصنف کو حق حاصل تھا کہ اگر وہ حضرت سید صاحبؒ کو مامور من اللہ اور مجدد وقت نہیں سمجھتا تھا تو اس کا اظہار کر دیتا مگر یہ اسی وقت ممکن تھا جب سید صاحبؒ نے اس قسم کا اعلان نہ کیا ہوتا مگر وہ خود اعلان فرماتے ہیں اور بڑی تحدی سے اعلان فرماتے ہیں کہ مجھے خدا نے اس منصب پر کھڑا کیا ہے تو پھر اس سے اختلاف کسی طرح درست نہیں کیونکہ مصنف خود اعتراف کر چکا ہے کہ "سید صاحب کی ہستی برگزیدہ تھی" ـــ اور "وہ روحانی انسان تھے"؟ سوال یہ ہے کہ کیا اللہ کے برگزیدہ بندے اور روحانی انسان جھوٹ بھی بولتے ہیں اور وہ بھی ایسا صریح کہ اور بھی کسی پر نہیں خدا پر اتہام باندھ دیں۔ ملاحظہ ہو سید صاحبؒ اپنے مقام و منصب کے بارے میں کیا فرماتے ہیں:۔

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب کا ص ۱۷۰ [2] ملاحظہ ہو کتاب کا ص ۱۷۱ [3] ملاحظہ ہو کتاب کا صفحہ ۱۶۵

سیدصاحبؒ کا دعویٰ

"اللہ تعالیٰ نے اس فقیر خاک نشین کو پہلے تو اشارات غیبی اور الہامات کے ذریعہ جو ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہیں خلافت کا اہل ہونے کی بشارت دی۔ پھر اس نے اہل اسلام کی جماعتِ کثیر اور خواص و عوام کی تالیف قلوب کی غرض سے مجھے منصبِ امارت پر سرفراز فرمایا۔ چنانچہ ۱۲ ارجمادی الثانی بروز پنجشنبہ ۱۲۴۲ھ سادات، علماء مشائخ، صاحبزادگان ذی الاحتشام اور خوانین عالی مقام نے مع مسلمان عوام و خواص کے میرے ہاتھ پر امامت کی بیعت کر کے مجھے اپنا امام قرار دیا اور میری امامت و حکومت قبول کر کے میری اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لیا۔"[1]

سیدصاحبؒ نے یہ اعلان صرف ایک بار نہیں کیا بلکہ بار بار کیا اور صوبہ سرحد سے بنگال تک عام مسلمانوں سرداروں، نوابوں، سلاطین اور علماء کو اس سے آگاہ کیا۔ چنانچہ والی ریاست ٹونک نواب وزیرالدولہ کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا کہ :۔

"یہ فقیر اپنی طرف سے ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا مگر مدت ہوئی کہ اس عاجز و خاک نشین کو پردۂ غیب سے اس منصبِ شریف سے مشرف کیا جا چکا ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اب میں اس منصبِ شریف کے اظہار کے لئے مامور ہوا ہوں اور وہ اللہ تعالیٰ جو ظاہر و باطن سے خوب باخبر ہے اس پر شاہد ہے کہ اس قادر و توانا کا یہ عاجز اور فرماں بردار بندہ خدا کی قسم (اپنے دعویٰ میں) بالکل سچا ہے۔ اس میں جھوٹ کا قطعاً شائبہ نہیں۔ وہ شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہے جو میرے اس منصب کا اقرار کرتا ہے اور جو میرے منصب کا انکار کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مردود ہے۔"[2]

پھر حاکم قلات خان خاناں غلجائی کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا کہ :۔

"اس عاجز فقیر کو بارہا پردۂ غیب سے کلامِ روحانی اور الہام ربانی کے ذریعے جہاد کے نفاذ اور کفر و فساد کے ازالے کے لئے صریح ارشادات کے ذریعے مامور کیا گیا ہے ...... بطورِ تجدید میں پھر کہتا ہوں کہ وہ خدائے پاک جو اس کائنات کے اسرار اور پوشیدہ باتوں سے خوب واقف ہے میرا گواہ ہے کہ اس دعوتِ جہاد اور ازالہ کفر و عناد کا جو جذبہ میرے دل میں جوش زن ہے وہ شیطانی وسوسہ سے پاک ہے اور خواہش نفسانی کا ذرا سا شائبہ بھی اس دعوتِ ربانی میں نہیں ہے۔"[3]

سردار سلطان محمد خاں حاکم پشاور کے نام ایک خط میں اپنے مقام و منصب کا ان الفاظ میں تعین فرمایا کہ :۔

"منکہ نائب رسول مقبول ام و بدعوتِ بندگان الٰہی ۔۔۔ میں رسول مقبول کا نائب ہوں اور شب و روز اللہ کے

---

[1] مکتوبات احمدی ص۱۹۹ [2] مکتوبات احمدی ص۲۰۱ [3] مکتوبات احمدی ص۱۸۱

را براہ راست شب و روز مشغول [1]۔" | بندوں کو راہ رست کی طرف بلانے میں مشغول ہوں"۔

مجدّدِ وقت کا انکار

یہ سید صاحبؒ کے مکتوبات کے چند مقامات کا ترجمہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دعویٰ ماموریت کے بعد انہوں نے مختلف سلاطین اور امراء و رؤسا کو جو خطوط لکھے ان میں سے شاید ہی کوئی خط ایسا ہو جس میں اپنے دعویٰ ماموریت کا ذکر نہ کیا ہو۔ اگر ہمارے اس بدایونی مصنف کو جذبۂ انصاف سے معمولی سا بھی حصہ ملا ہے تو اسے اپنے موقف پر نظرِ ثانی کرنی چاہیئے اور تسلیم کر لینا چاہیئے کہ جس شخصیت کو وہ خود برگزیدہ قرار دیتا ہے اور اس کی روحانی عظمت کا معترف ہے۔ جب وہ خود اپنے آپ کو مامور من اللہ اور اس سے بھی بڑھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب قرار دے رہا ہے تو اس کے دعوے کی تکذیب آفتابِ نصف النہار کا انکار ہے۔ سید صاحبؒ کے ان مکتوبات سے اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ امامِ وقت اور مجدّد پر ایمان لانا نہایت ضروری ہے ورنہ انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مردود قرار پاتا ہے۔ چنانچہ حضرت سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

"در سویدائے قلب ہر کہ اقرار ایں منصب میکند مقبول بارگاہ لایزال است و ہر کہ بانکار پیش می آید بے شک مطرود بارگاہِ رب ذوالجلال روزیکہ ہمہ اولین و آخرین بحضور مالک ملک مالک عالمین است بمحض کرم خود مرا منصب بخشیدہ و رو بروئے جدِ من کہ سید المرسلین است کہ بہ برکتِ اتباعش ایں منصب یافتہ مجتمع خواہند گردید رفیقانِ من کہ بایں منصب اقرار کردہ اند بکمالِ مناصب عزت و وجاہت خواہند رسید و مخالفانِ من کہ از منصبِ من انکار می دارند در مہالک ندامت خواہند کشید [2]۔"

جو شخص کہ اپنے دل میں میرے اس منصب کا اقرار کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ٹھہرتا ہے اور جو انکار سے پیش آتا ہے وہ بلا شک و شبہ اس جلال والی بارگاہ میں مردود ہے جس دن کہ میرے مالک و آقا کے حضور جو تمام جہانوں کا مالک ہے اور جس نے مجھے محض اپنے کرم سے یہ منصب عطا فرمایا ہے تمام اولین و آخرین حاضر ہوں گے اور جس دن میں اپنے جدِ امجد سید المرسلینؐ کے روبرو پیش ہوں گا جن کی اتباع کی برکت سے مجھے یہ منصب حاصل ہوا ہے تو میرے رفیقوں میں سے جن لوگوں نے میرے اس منصب کا اقرار کیا ہے ان کو مختلف انواع کے مناصب عزت و وجاہت عطا ہوں گے اور جن لوگوں نے میرا انکار کیا ہے انہیں ہلاکت خیز رسوائی حاصل ہوگی۔"

---

[1] مکتوباتِ احمدی صـ۲۴۳

[2] مکتوبات احمدی صـ۲۴۱

حضرت سید صاحبؒ کے ارشادات اور ان کے دعویٰ ماموریت سے بعض لوگوں کے اس گمراہ کن خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ مجدد اپنی زندگی میں خود کوئی دعویٰ نہیں کرتا بلکہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اپنے عظیم الشان کارناموں سے پہچانا جاتا ہے گویا ؏

جب مر گئے تو آئے ہمارے مزار پر

سید صاحبؒ نے اپنی زندگی میں اپنے منصب کا مسلسل اعلان کیا اور بار بار نہایت تحدی سے دعویٰ کیا کہ "مجھے خدا نے اصلاح فساد و بدعات اور کفار (سکھوں) سے جہاد کرنے پر مامور فرمایا ہے۔" پس ثابت ہو گیا کہ ماموراور مجدد اپنے منصب و مرتبہ کا اعلان کرتا ہے لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ اپنی اتباع کرنے والوں کو دنیا و آخرت میں عزت پانے کی اور منکروں کو دنیا و آخرت میں ہلاکت خیز رسوائی اٹھانے کی وعید سناتا ہے۔ کاش ہمارا بدایونی مولف بغض و حسد اور تعصب کی عینک اتار کر سید صاحبؒ کے دعوے پر غور کرے اور ان کے منصب کو سمجھنے کی کوشش کرے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس نے اپنی اصلاح کے دروازے اپنے ہاتھ سے بند کر لئے ہیں۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر کسی نے سید صاحبؒ کے ان فارسی مکتوبات کا مطالعہ کر کے ان کے دعوے کی تشریح کر دی تو اس کے لئے فرار کا کوئی راستہ باقی نہ رہے گا اس لئے اس نے پیش بندی کے طور پر اپنی کتاب میں یہ تاثر دینے کی ناکام اور افسوسناک کوشش کی کہ سید صاحبؒ کی طرف جو خطوط منسوب ہیں یہ ان کے نہیں نہ ان میں ایسے خطوط لکھنے کی قابلیت تھی یہ خطوط شاہ اسماعیلؒ صاحب کے لکھے ہوئے ہیں جو سید صاحب سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ اس کا بیان ہے کہ :-

"وہ (سید صاحبؒ) نہ اس قدر بلیغ وعظ کہہ سکتے تھے اور نہ اس قدر سیاسی خطوط لکھ سکتے تھے اور نہ ایسے بیانات دے سکتے تھے جو ان سے منسوب ہیں۔[1]"

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ سید صاحبؒ عام طور پر خود خطوط نہیں لکھتے تھے بلکہ اپنے کاتبوں میں سے کسی کو بلا کر ہدایات دے دیتے تھے۔ یہ کاتب خط لکھ کر انہیں سنا دیا کرتے تھے۔ اگر خط کا مضمون سید صاحبؒ کے مفہوم کے مطابق ہوتا تو آپ اس کے نیچے اپنی مہر ثبت فرما دیتے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ خطوط آپ کے علم و اطلاع کے بغیر لکھے جاتے تھے قطعاً غلط ہے۔ خصوصاً ان کے دعویٰ ماموریت امامت کے بارے میں جو خطوط اور اعلانیئے جاری کئے گئے وہ سب سید صاحبؒ کے حکم اور ہدایت پر جاری ہوئے، ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ سید صاحبؒ نے تو امام وقت اور مجدد ہونے کا سرے سے دعویٰ کیا ہی نہیں مگر یہ دعویٰ ان سے زبردستی منسوب کر دیا گیا۔ پھر غور طلب بات یہ ہے کہ جن خطوط کے ذریعے یہ دعوے نشر کیا گیا وہ معمولی لوگوں کے نام تحریر نہیں کئے گئے بلکہ

---

[1] ملاحظہ ہو بدایونی کی کتاب کا صـ ۳۷

اکثر و بیشتر سلاطین وقت علما و مشائخ اور امرا و رؤسا کے نام لکھے گئے تھے۔ ان سب سے سید صاحبؒ کی خط و کتابت تھی خصوصاً حکمرانِ ریاست ٹونک نواب وزیرالدولہ اور حاکم ریاست رامپور نواب احمد علی خاں سید صاحبؒ کے عقیدتمند اور آپ کے مرید تھے۔ اگر یہ خطوط جعلی تھے یا سید صاحبؒ کے علم و اطلاع کے بغیر لکھے گئے تھے تو ان خطوط کے جوابات موصول ہونے پر تو سید صاحبؒ کو اس جعل سازی کا علم ہو جانا چاہیئے تھا۔ اس جعل سازی کا راز طشت از بام ہونے پر سید صاحب اس کی تردید فرما دیتے (کیونکہ بدایونی مولف کے نزدیک وہ روحانی انسان تھے ملاحظہ ہو صلاے) اور ان سلاطین، امراء و رؤسا، اور علماء و مشائخ کو لکھ دیتے کہ میں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا مگر وہ از اول تا آخر اپنے اس دعویٰ پر قائم رہے۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ انہوں نے امام وقت اور مجدد و مامور ہونے کا دعویٰ کیا اور یہ دعویٰ الہام ربانی سے کیا۔

سیّد صاحبؒ کی بیعتِ عام

اس مسئلے کا ایک اور پہلو قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ کو علاقہ یوسف زئی کے سرداران و خوانین علماء و مشائخ اور عوام الناس نے ایک بڑے مجمعِ عام میں سید صاحبؒ کے ہاتھ پر امامت کی بیعت کی۔ اس موقعے پر ایک عہدنامہ ترتیب دیا گیا جس پر علاقہ یوسف زئی کے اکابر علما اور افغان سرداروں نے دستخط کئے۔ اس عہدنامہ میں بھی سید صاحبؒ کی ماموریت اور امامت کا اقرار موجود تھا۔ چنانچہ اس عہدنامہ کے یہ الفاظ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

در جمیع معاملات و مناقشات در مقدمۂ اجرائے احکام شرعیہ جناب قدسی القاب امام ہمام علیہ الصلوٰۃ والسلام یعنی سید امجد امیرالمومنین سید احمد مدظلہ را امام خود برضا و رغبت قرار دادیم و بیعتِ امامت بردست آنجناب بجا آوردیم و اطاعت آنجناب را بموجب (آیت کریمہ) اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم عین اطاعت خدا و رسولِ خدا شمردیم و بہمیں التزام بیعت و اطاعت دین اسلام خود را مکمل کردیم۔[1]

[ہم نے] اپنے جملہ کاروبار تنازعات اور احکام شرعیہ کے نفاذ میں قدسی لقب جناب امام ہمام امیرالمومنین سید احمد مدظلہ کو برضا و رغبت اپنا امام تسلیم کر لیا۔ اور آنجناب کے ہاتھ پر امامت کی بیعت کر لی اور آپ کی اطاعت کو آیت قرآنی (اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم) کے مطابق بمنزلۂ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت قرار دے دیا اور اسے ضروری سمجھتے ہوئے دینِ اسلام کی اطاعت اور اس بیعت کو مکمل کر لیا۔

---

[1] مکتوبات احمدی (ص ۲۳۶)

حیرت ہے کہ سید صاحبؒ کی امامت کا مجمع عام میں اعلان کیا جاتا ہے۔ علاقہ یوسف زئی کے افغان سردار علماء مشائخ اور عوام الناس ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور ان کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈالنے کا اعلان کرتے ہیں۔ ان کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتے ہیں اور یہ بدایونی مولف کہتا ہے کہ "سید صاحبؒ میں امامت کے اوصاف نہیں تھے" گویا انہوں نے اپنی امامت کا اعلان نہیں کیا جو کچھ ہوا سید صاحبؒ کے علم و اطلاع کے بغیر ہوا اور لوگوں نے خواہ مخواہ انہیں امام اور مجدد مشہور کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ سید صاحبؒ نے خود اپنی امامت کا اعلان کیا یا نہیں؟ ہزاروں افراد سے بنفس نفیس اپنی بیعت لی یا نہیں؟ اور برصغیر کے حکمرانوں، سرداروں اور امیروں اور علماء و مشائخ کو خطوط کے ذریعے اپنے دعوے سے مطلع کیا یا نہیں؟ اگر ان میں امامت کے اوصاف نہیں تھے تو یہ اعتراض ان پر نہیں بلکہ اس خدائے بزرگ و برتر پر وارد ہوتا ہے۔ جس نے انہیں اس منصب پر فائز کیا کیونکہ انہوں نے از خود یہ دعویٰ نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے پے بہ پے الہامات کی بنا پر کیا جن کے حوالے گذشتہ صفحات میں درج کئے جا چکے ہیں اور چونکہ ہمارا بدایونی مولف اعتراف کر چکا ہے کہ "سید صاحب روحانی آدمی تھے۔ ان کی ہستی برگزیدہ تھی" اس لئے اس غلط خیال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ سید صاحبؒ کو کبھی کوئی الہام نہیں ہوا، یہ الہامات انہوں نے خود گھڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیئے کیونکہ خداوند تعالیٰ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرنا جو اس نے نہ کہی ہوں لعنتی انسان کا کام ہے اور سید صاحبؒ مولف کے بقول روحانی اور برگزیدہ انسان تھے پس ان کے متعلق ایسا گمان بھی گناہ ہے ؂

سیّد صاحب کے عقائد

ہمارے اس بدایونی مولف نے سیّد صاحبؒ کی شخصیت اور آپ کی تحریکِ اصلاح وجہاد پر مختلف سمتوں سے حملے کئے ہیں چنانچہ اس نے سیّد صاحب کی امامت کو مشکوک بنانے کے بعد آپ کے عقائد کو مشتبہ بنانے کی کوشش کی۔ کہیں آپ کا نام لیکر اور اکثر آپ کی جماعت اور ساتھیوں کی طرف وہ عقائد منسوب کیے جن کا سیّد صاحبؒ یا آپ کے متبعین سے کوئی تعلق نہیں۔ سیّد صاحبؒ اور افغان سرداروں کے درمیان جو کشیدگی پیدا ہوئی اس کا سبب یہ مولف سیّد صاحبؒ اور افغانوں کے درمیان مذہبی عقائد کو قرار دیتا ہے۔ چنانچہ حاکم پشاور سردار یار محمد خاں اور سیّد صاحب کے مابین کش مکش کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ "ممکن ہے اس اختلاف میں مذہبی اختلاف بھی جزوِ اعظم ہو۔"[1]

پھر آگے چل کر اسی قسم کا ایک اور تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ جب سید صاحبؒ سوات اور بنیر کا دورہ فرما رہے تھے تو ان علاقوں کے عوام، سرداروں اور علماء و مشائخ نے آپ کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا۔ یہ آپ کی مقبولیت کے عروج کا دور تھا مگر اس بدایونی مولف کو یہاں بھی مذہبی اختلاف کی بو آگئی۔ چنانچہ اس نے یہ شوشہ چھوڑا کہ اس علاقے کی ایک بااثر اور دینی شخصیت اخون صاحب نے ان (سیّد صاحبؒ) کی معاونت کی مگر جب عقائد کا مسئلہ آیا تو سیّد صاحبؒ کی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی"[2]

اس کے بعد مولف مذکور نے صوبہ سرحد کے ایک اور عالم سیّد غلام صاحب المعروف آغا میر جی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ انہوں نے سید صاحبؒ کی دعوت بھی کی لیکن پھر انہوں نے بھی مذہبی و سیاسی اختلافات کی بنا پر سید صاحبؒ کی جماعت سے جدائی اختیار کر لی۔"[3]

سیّد صاحبؒ پر بہتانِ الحاد

اس طرح مولف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سید صاحبؒ کے عقائد غیر اسلامی اور سوادِ اعظم

---

[1] ملاحظہ ہو بدایونی کی کتاب کا ص۱۰۲ ، [2] بدایونی کی کتاب کا ص۱۰۶ ، [3] بدایونی کی کتاب کا ص۱۰۸

کیلئے ناقابلِ قبول تھے۔ یہاں تک کہ جب سکھوں کے ایما پر سید صاحبؒ اور آپ کے رفقاء کو الحاد و زندقہ میں مبتلا ہونے کا طعنہ دیا گیا تو اس مولف نے یہ الفاظ لکھ کر اس کی بھی تائید کر دی کہ "بوجہ اختلاف ایسی بات لکھی گئی ہے کچھ سہی مگر مسلک ان کا ضرور تھا"[1] اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۔

حالانکہ سید صاحبؒ نے ایک دفعہ نہیں بلکہ بار بار اپنے عقائد کی وضاحت کی اور اعلان کیا کہ وہ اوّل و آخر مسلمان ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ شریعتِ حقہ کی اتباع کو فرض عین جانتے ہیں۔ ان کے مکاتیب ان کے عقائد کی وضاحت سے بھرے پڑے ہیں۔ اگر ہمارے بدایونی مؤلف میں انصاف پسندی کا کچھ بھی مادہ ہوتا تو وہ ان مکاتیب ہی کا مطالعہ کر کے صحیح نتیجہ تک پہنچ سکتا تھا اور سید صاحبؒ پر عائد کئے جانے والے اعتراضات کی حمایت کرنے کی بجائے ان کی تردید کر سکتا تھا مگر یہ تو اس صورت میں ہوتا جب اس کا مقصد تلاشِ حق ہوتا۔ وہ تو مستعد ہی اس لئے ہوا تھا کہ سید صاحبؒ اور آپ کے رفقاء کو بدنام کرے ان کی تحریک کا مضحکہ اڑائے اور ان کی شخصیت کی عظمت کو لوگوں کی نگاہوں سے گرائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے چن چن کر ایسے الفاظ استعمال کئے اور ایسے پہلو زیر بحث لایا جن سے سید صاحبؒ کے عقائد کی بھیانک تصویر لوگوں کے سامنے ابھر سکے لیکن ابھی دنیا انصاف پسند لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو جھوٹے اور گمراہ کن پروپگنڈہ سے زیادہ حقائق سے متاثر ہوتے ہیں ایسے ہی لوگوں کی رہنمائی کے لئے ہم ذیل میں سید صاحبؒ کے عقائد کی وہ تشریح درج کرتے ہیں جو خود انہوں نے بیان فرمائی۔

توحید و رسالت

اسلام کی بنیاد توحید پر ہے جس نے اس کا انکار کیا یا اللہ تعالیٰ کی ذات میں کسی اور کو شریک کر لیا خواہ وہ کسی رنگ میں ہو اس کی دنیا اور آخرت دونوں غارت ہو گئیں۔ اسلام کا دوسرا بنیادی رکن رسالت ہے یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صداقت پر ایمان اور آپ کی سچی اتباع۔ اگر کوئی شخص حضورؐ کی اتباع یا آپ کی محبت کے بغیر اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ خود کو بھی فریب دیتا ہے اور دوسروں کو بھی۔ توحید اور رسالت۔ یہی اسلام کے دو بنیادی رکن ہیں جس نے انہیں سمجھ کر قبول کر لیا اس نے اسلام کی حقیقی روح کو پا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سید شہیدؒ نے توحید اور رسالت پر سب سے زیادہ زور دیا چنانچہ اپنے ایک مکتوب گرامی میں جو آپ نے عام مسلمانوں خصوصاً اپنے عقیدت مندوں کو تحریر کیا تھا۔ اسلام کی اس بنیادی تعلیم کی تشریح فرماتے ہوئے لکھا:۔

---

[1] ملاحظہ ہو بدایونی کی کتاب کا صفحہ ۱۷۹

"مشائخِ طریقت کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کی جائے اور یہ خوشنودی منحصر ہے شریعت کی پابندی پر۔ جو شخص محمد مصطفیٰؐ کی شریعت پر عمل کئے بغیر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا مدعی ہے وہ کاذب و گمراہ ہے اور اس کا یہ دعویٰ جھوٹا اور ناقابلِ سماعت ہے۔ شریعت محمدی کی بنیاد دو امور پر ہے۔ پہلی یہ کہ تمام قسم کے شرک ترک کر دے، دوسری یہ کہ تمام قسم کی بدعتیں ترک کر دے۔ شرک ترک کرنے کی حقیقت یوں ہے کہ کسی شخصیت کو چاہے وہ فرشتہ ہو یا جن، خواہ مرشد ہو یا مرید، خواہ استاد ہو یا شاگرد، خواہ ولی ہو یا نبی ان میں سے کسی کے متعلق یہ اعتقاد نہ رکھے کہ یہ مشکلات آسان کر سکتے ہیں، بلاؤں کو دور کر سکتے ہیں یا فائدہ پہنچاتے ہیں بلکہ ان سب کو اپنی طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے علم کے سامنے عاجز و کمزور یقین کرے۔ انبیاء اولیاء صلحاء اور ملائکہ سے اپنی حاجت روائی کے لئے ہرگز ان کی نذر و نیاز نہ مانے۔ البتہ اس امر پر یقین و ایمان رکھے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہیں اور ان کی مقبولیت کا ثمرہ یہی ہے کہ ان کی اتباع کی جائے تاکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔ ان حضرات کو اس راستے کا رہنما سمجھنا چاہئے لیکن انہیں حوادثِ زمانہ پر قدرت رکھنے والا اور ظاہر و پوشیدہ حالات کا دانا و بینا قرار نہیں دینا چاہئے کیونکہ ایسا عقیدہ کفر و شرک ہے"[1]

مقامِ رسالت

سید صاحبؒ کی نگاہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرتبہ کیا تھا اور انہوں نے اپنے متبعین کے قلوب پر حضورؐ کی عظمت کے نقوش ثبت کرنے کے لئے کیا تعلیم دی؟ آپ کے مندرجہ ذیل الفاظ سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

"ہمیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس امر کا حکم دیا ہے کہ ہم اپنے ہر کام کا آغاز سید المرسلین و کافۃ المسلمین کی تعریف سے کریں"[2]

اپنے ایک اور مکتوبِ گرامی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریر کیا کہ:-

"اللہ تعالیٰ پر توکل، شجاعت اور فتح و نصرت کی بشارت دینے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشیر و نذیر تھے اور کل مخلوقاتِ عالم میں آپ جیسا نہ کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ آئندہ پیدا ہوگا"[3]

---

[1] مکتوباتِ احمدی ص ۱۹۸ [2] مکتوباتِ احمدی ص ۲۲۲ [3] مکتوبات احمدی ص ۲۱۷

ترکِ بدعت

دنیا کی اقوام راہِ حق سے اس لیئے ہٹ گئیں کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی تعلیم میں آمیزش کرلی اور وہ طریقے اختیار کرلیئے جن کا انہیں ان کے انبیاء نے حکم نہیں دیا تھا۔ اس کا نتیجہ اختلاف و انتشار کی صورت میں ظاہر ہوا۔ سماجی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ دین کی صورت مسخ ہوگئی اور اقتصادی الجھنوں نے انہیں گھیر لیا۔ سید صاحبؒ نے جس عہد میں آنکھ کھولی اس عہد کے مسلمان بھی اسی مصیبتِ عظمیٰ میں گرفتار تھے۔ سب سے زیادہ غضب یہ ہوا کہ اس عہد کے مسلمانوں نے جو غلط رسوم و رواج اختیار کیں انہیں مذہب کا جزو بنا لیا گیا۔ دینِ خالص عنقا ہوگیا۔ امامِ وقت اور مجدّد زماں کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ وہ ان بدعات کا قلع قمع کرتے اور خالص دین کی حقیقی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے۔ چنانچہ آپ نے یہ فریضہ ادا کیا اور پوری قوت سے ادا کیا۔ بدعات ترک کرنے پر زور دیا اور اس کے لئے نمونہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ اور تعلیم کو قرار دیا۔ چنانچہ آپ اپنے ایک مکتوبِ گرامی میں رقمطراز ہیں کہ :۔

"بدعت کی تشریح یہ ہے کہ جملہ عبادات و معاملات اور دنیا و آخرت کے امور میں حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مقتدا اور حکم و عادل تسلیم کیا جائے ان لوگوں کی اتباع ہرگز نہیں کرنی چاہیئے جنہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نئی نئی رسوم ایجاد کیں مثال کے طور پر رسوم شادی و مرگ قبروں کی شان و شکوہ ان پر عمارتوں کی تعمیر، مجالس عرس اور تعزیہ داری اور اس قسم کی دوسری چیزوں میں روپیہ کا ضیاع۔ ان امور کی ہرگز پیروی نہیں کرنی چاہیئے اور کوشش کرنی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو ان باتوں کو دل و دماغ سے محو کردیا جائے [1]"

اپنے عقیدہ کی تشریح

جب سید صاحبؒ کو صوبہ سرحد میں مقبولیت حاصل ہونے لگی اور سکھوں نے دیکھا کہ آپ کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تو انہیں اپنے اقتدار کے لئے خطرہ پیدا ہوا۔ ادھر بعض افغان سرداروں نے محسوس کیا کہ سید صاحبؒ کا اقتدار قائم ہوجانے کی صورت میں ان کی بالادستی کا خاتمہ ہوجائے گا اور انہیں شریعت کی پابندی کی وجہ سے ان تمام لہو و لعب اور عیاشیوں سے دست کش ہونا پڑے گا جن کے وہ مدتِ مدید سے عادی تھے تو انہوں نے سید صاحبؒ کو بدنام کرنے کے لئے علماءِ سو کی خدمات حاصل کیں۔ خود رنجیت سنگھ نے اپنے ایک معتمد سردار کرتار سنگھ کے ذریعے بعض ملاؤں کو خریدا اور سید صاحبؒ کے عقائد کے متعلق جھوٹے افسانے پھیلانے شروع کئے۔ جب یہ فتنہ رونما ہوا

---

[1] مکتوباتِ احمدی ص ۱۹۸

تو آپ نے پوری شدت سے ان جھوٹے افسانوں کی تردید کی اور علمائے سرحد کے علاوہ افغان سرداروں کو خطوط لکھ کر اپنے عقائد کی وضاحت کی چنانچہ علمائے پشاور کے نام ایک خط میں اپنے عقائد کی اس طرح وضاحت فرمائی :

" مجھ پر اتہام تراشنے والوں نے جو بہتان لگائے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ نہ صرف یہ فقیر بلکہ مجاہدین کی جماعت کو ملحد و زندیق کہا جاتا ہے یعنی یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس جماعتِ مسافرین کا سرے سے کوئی مذہب ہی نہیں اور نہ یہ کسی مسلک کے پابند ہیں بلکہ یہ سب اپنی خواہشاتِ نفسانی کے بندے ہیں اور کسی نہ کسی رنگ میں لذاتِ جسمانی کی جستجو میں مصروف رہتے ہیں ۔ قطع نظر اس سے کہ وہ موافق کتاب (قرآن حکیم) ہے یا مخالفِ کتاب ۔ معاذ اللہ من ذالک ۔ پس جاننا چاہیئے کہ ہم لوگوں کو ان افعال شنیع سے نسبت دینا ایک بڑا جھوٹ اور بہتانِ صریح ہے ۔ یہ فقیر اور اس کا خاندان بلاد ہند میں گمنام نہیں ۔ اس فقیر اور اس کے اسلاف کو ہزاروں آدمی جانتے ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ میرا اور میرے آباؤ اجداد کا مذہب حنفی ہے اور اب بھی اس بندۂ ضعیف کے جملہ اقوال و افعال اصولِ حنفیہ اور حنفی قوانین کے مطابق ہیں ۔ ہم میں سے ایک فرد بھی اس اصول سے باہر نہیں اِلّا ماشا اللہ ۔ اگر ان میں سے کسی شخص سے بسببِ غفلت یا بھولے سے کوئی غلطی ہو جائے تو وہ خود اس کا اقرار کر لیتے ہیں اور راہِ راست اختیار کر لیتے ہیں [1] "

سیّد صاحبؒ کی بے نفسی و دنیا سے بیزاری

ہمارے اس بدایونی مولف نے اپنی کتاب میں جگہ بہ جگہ مجاہدین کو دنیا کا طالب اور سید صاحبؒ کو حکومت و سلطنت کا حریص ثابت کرنے کی افسوسناک کوشش کی ہے ۔ مجاہدین کی دیانت و امانت پر بھی حملے کئے ہیں ۔ چنانچہ لکھا ہے کہ :۔

" حکومتِ الٰہیہ کی آمدنی مساکین و غربا کے کام نہیں آتی تھی [2] "

ستم یہ ہے کہ یہ اعتراض بغیر کسی ثبوت اور حوالے کے عائد کیا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ مولف کو کیسے معلوم ہوا کہ سیّد صاحبؒ نے جو نظام قائم کیا تھا اس میں وصول ہونے والی آمدنی مجاہدین خود ہضم کر جاتے تھے اور مساکین و غربا کو ان کا حصہ نہیں ملتا تھا یہ اعتراض مجاہدین پر نہیں بلکہ براہِ راست سید صاحبؒ پر عائد ہوتا ہے ۔ حیرت ہے کہ اعتراض اتنا بڑا اور ثبوت سرے سے غائب ۔ اس قسم کے بے سروپا دعوے وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا علم صفر ہو اور جنہیں طرزِ استدلال کی ہوا تک نہ لگی ہو ۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

" لڑائیوں کے جو احوال لکھے گئے ہیں ان سے یہی نقشہ جمتا ہے کہ ویسی ہی لڑائیاں

---

[1] مکتوبات احمدی صہ ۱۲۳

[2] ملاحظہ ہو بدایونی کی کتاب کا صہ ۱۹۳

ہوتی تھیں جیسے جاہل عرب اسلام سے پہلے اور اسلام کے مقابل میں لڑا کرتے تھے[1]"

سید صاحبؒ اور ان کے حریفوں کے درمیان جو لڑائیاں ہوئیں ان کی تفصیلات ڈھکی چھپی نہیں بلکہ مسلم اور غیر مسلم دونوں مورخوں نے ان کی تفصیلات درج کی ہیں، یہ تفصیلات ہماری بھی نظر سے گذری ہیں ہمیں تو ان میں دنیاداروں کی جنگوں کا شائبہ تک نظر نہیں آیا بلکہ صاف نظر آتا ہے کہ مٹھی بھر بے نفس اور بے سرو سامان لوگ ہزاروں میل کا اذیت ناک سفر اختیار کر کے صرف اللہ کی رضا کے لئے میدان میں اترے اور اپنے سے کئی گنا طاقتور دشمن سے ٹکرا گئے۔ انہوں نے فتح و شکست کو معیار بنا کر کوئی جنگ نہیں لڑی بلکہ صرف اور صرف اللہ کی رضا ان کے پیشِ نظر رہی اور اس رضا کے حصول میں ان میں سے اکثر نے اپنی جانیں قربان کر دیں، کیا دنیاداروں کی جنگیں اسی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ افسوس کہ مولف کو اعتراض کرنے کا بھی سلیقہ نہ آیا، اگر اس نے اعتراض کیا ہی تھا تو ان جنگوں کے واقعات پیش کر کے بتاتا کہ فلاں جنگ کا یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ سید صاحبؒ کی ان کے دشمنوں سے جنگ حصولِ اقتدار اور ملک و مال حاصل کرنے کے لئے تھی۔ برعکس اس کے خود سید صاحبؒ جنہیں وہ "برگزیدہ اور روحانی انسان" قرار دیتا ہے۔ اپنی ذات کو دنیوی اقتدار کی خواہش سے بری ظاہر فرماتے ہیں چنانچہ عوام الناس کے نام ایک اعلان میں تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"رب ذوالجلال کے اس بندے کی حقیقتِ حال یہ ہے کہ نہ میں خود بادشاہ ہوں نہ شاہزادہ ہوں، نہ امیر ہوں نہ امیرزادہ ہوں، نہ سلطنت کا طالب ہوں نہ جویائے حکومت ہوں نہ میرے پاس سلطانی لشکر ہے نہ بادشاہی خزانہ ہے بلکہ میں فقیر ہوں اور فقیر کا بیٹا ہوں اور فقیرانہ طرزِ زندگی کو اپنی سعادت شمار کرتا ہوں۔ مجھے بادشاہوں اور خوانین کے طرز آئین سے نفرت ہے۔ نہ اس وقت میرے پاس سرمایۂ امارت ہے اور نہ آئندہ اس کے حصول کی تمنا ہے۔ میں تو صرف فریضۂ جہاد ادا کرنے، بندگانِ خدا کی خیر طلبی۔ کلمۂ دین کی سربلندی اور سید المرسلینؐ کی شریعت کی خدمت کیلئے کمربستہ ہوا ہوں۔ میرا خزانہ صرف اللہ پر توکل ہے اور میرا خرچ ہر روز مجھے میرے رب کے خزانہ سے مل جاتا ہے۔ میرے پاس امراء و سلاطین کی طرح درہم و دینار کے خزانے نہیں کیونکہ میں دنیاداروں کے آئین و قوانین سے بیزار ہوں۔ میرا طریقہ وہی ہے جو میرے جدِ بزرگ حضرت سید المرسلینؐ کا تھا۔ یعنی ایک دن نانِ خشک شکم سیر ہو کر کھاتا ہوں اور اس پر خدا تعالیٰ کا شکر بجا لاتا ہوں اور ایک روز فاقہ کرتا ہوں اور اس پر صبر کرتا ہوں[2]"

لیکن اسکے باوجود ہمارا بدایونی مولف اعتراض کرتا ہے کہ اگر سید صاحبؒ کو حکومت و سلطنت کی تمنا نہیں تھی تو:۔

[1] بدایونی کی کتاب کا صفحہ ۱۹۲ [2] مکتوبات احمدی صفحہ ۲۳

"خدا کے واسطے کوئی بتائے کہ نواب ٹونک وغیرہ کو چندہ کے لئے کیوں
لکھا اور آخر میں حکومت الہیہ کیوں بنائی"[1]۔

حیرت ہے اس شخص کی فہم و فراست پر کہ سید صاحبؒ کی ٹونک سے روانگی کے وقت والئ ٹونک ان سے درخواست کرتا ہے کہ جب بھی آپ کو امورِ جہاد کے لئے روپیہ کی ضرورت ہو تو آپ بلا تکلف مجھے لکھ دیا کیجئے۔ بعض مواقع پر آپ کو دشمن سے جنگ کرنے کی خاطر لشکر کی تیاری اور مجاہدین کی ضروریات کے لئے روپیہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ آپ والئ ٹونک کو اپنی ضرورت لکھ بھیجتے ہیں، مولف اس پر بھی معترض ہے کوئی اس سے پوچھے کہ کیا جہاد بغیر افراد اور بغیر اسلحہ کے ہوتا ہے اور مجاہدین کو روح اور جسم کا رشتہ قائم کرنے کے لئے اشیاء خورد و نوش کی ضرورت نہیں ہوتی؟ اگر اس مقصد کے لئے سید صاحبؒ نے اپنے ایک عقیدت مند حکمران سے کچھ رقم منگوالی تو اس سے کون سی قیامت آگئی۔ اسے ملک گیری کی ہوس سے کیوں کر تعبیر کیا جا سکتا ہے جہاں تک حکومت الہیہ بنانے کا تعلق ہے یہ تو سید صاحب کا مقصدِ عظیم تھا یعنی سکھ یا منافق جن علاقوں پر قبضہ کر کے مسلمان عوام کی جان و مال کو غارت کر رہے تھے انہیں ظالموں کے قبضہ و تصرف سے آزاد کرا کر وہاں اسلامی حکومت قائم کی جائے اگر انہوں نے ایسی حکومت قائم کی تو اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اس حکومت سے سید صاحبؒ نے کیا مالی فائدہ حاصل کیا۔ حد تو یہ ہے کہ پشاور پر قبضہ کرنے کے باوجود انہوں نے یہ علاقہ سردار سلطان محمد خاں کو پھر واپس کر دیا صرف اس لئے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ سید صاحبؒ حکومت و سلطنت کے حریص ہیں۔ خود بدایونی مولف نے اس کا اعتراف کیا ہے چنانچہ اس کا بیان ہے کہ:۔

"پشاور میں امارتِ شرعیہ قائم کی گئی اور اس کے انتظام کے لئے پشاور
پھر سلطان محمد خاں کے سپرد کر دیا گیا"[2]۔

کوئی سمجھائے اس عقیل و فہیم مولف کو کہ اگر سید صاحبؒ کو حکومت و سلطنت کی حرص ہوتی تو وہ فتح کیا ہوا ملک اس فراخ دلی سے واپس کر دیتے؟ ان کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ فتنہ و فساد کا قلع قمع ہو جائے اور اسلامی شہروں میں امن و امان کے ساتھ اسلامی احکام نافذ ہو جائیں۔ چنانچہ سید صاحبؒ شاہ بخارا کے نام ایک خط میں اپنا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ فقیر مال و دولت کی تحصیل اور بلاد و ممالک پر قبضہ کرنے سے کوئی غرض نہیں رکھتا۔
اگر مومن بھائیوں اور ہمعصر مخلصوں میں کوئی شخص بلادِ اسلامی کو سرکش کافروں سے آزاد

---

[1] ملاحظہ ہو بدایونی کی کتاب کا صفحہ ۱۵۰
[2] ملاحظہ ہو بدایونی کی کتاب صفحہ ۱۸۷

کراکر قوانینِ شرعیہ کے مطابق ملک کا انتظام کرے اور فیصلے کرتے وقت عدل وانصاف کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھے تو سمجھ لیجئے کہ اس فقیر کا مقصد حاصل ہوگیا۔ اس صورت میں روئے زمین پر سلاطین عادل کے تسلط کو میں اپنے تسلط سے کہیں بہتر خیال کرتا ہوں کیونکہ میں سلطنت ہفت اقلیم کو بھی خاطر میں نہیں لاتا جب تک دینِ اسلام کو فتح حاصل ہو جائے اور سرکش کافر نیست ونابود ہو جائیں تو میں سمجھوں گا کہ میری کوشش بارآور ہو گئی اور میں اپنی مراد کو پہنچ گیا[1]۔"

---

[1] مکتوبات احمدی (فارسی) ص۱۹۲

سید صاحبؒ کی افغانوں سے جنگیں

سید صاحبؒ صوبہ سرحد اور پنجاب کے مظلوم مسلمانوں کو سکھوں کے ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لئے سرحد تشریف لے گئے تھے۔ ابتداء ہیں ان کی جنگیں سکھوں ہی سے ہوئیں مگر درمیان میں ایسے اسباب پیش آ گئے کہ آپ کو مقامی سرداروں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ ہمارا بدایونی مؤلف ان جنگوں پر بھی معترض ہے۔ اسے اعتراض ہے کہ سید صاحب نے افغانوں سے جنگ کرنے کے بجائے انہیں حکمتِ عملی سے اپنا ہم نوا کیوں نہ بنایا۔ انہوں نے سکھوں سے جنگ کرنے کے بجائے مسلمانوں کی گردنیں کاٹیں اور امتِ مسلمہ میں نفاق پیدا کیا چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

(سید صاحبؒ اور مجاہدین کے) نفس کی گل کاریوں نے ہر موقعے پر بہار کا نقشہ پیش کیا — جہاد سکھوں سے تھا مگر لڑائی پٹھان لی مسلمانوں سے — دعوی نفاق دور کرنے کا تھا مگر تشدد سے نفاق میں اضافہ کیا۔ دشمن کو دوست بنانے کی بجائے دوستوں کو دشمن بنا لیا[1]۔"

اگر واقعی سید صاحبؒ نے صوبہ سرحد تشریف لے جا کر افغان سرداروں سے خود بخود جنگ کی طرح ڈالی تو بلاشبہ انہوں نے اسلامی مفادات کو سخت نقصان پہنچایا اور مسلمانوں میں خونریزی کے مرتکب ہوئے۔ لیکن اگر انہوں نے صوبہ سرحد تشریف لے جانے کے بعد وہاں کے سرداروں علماء اور عوام الناس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور آخر وقت تک یہ رشتہ استوار رکھنے کی کوشش کی تو پھر غور کرنا پڑے گا کہ یہ جنگیں کیوں پیش آئیں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ بعض افغان سرداروں کی کج روی اور سکھوں کے ساتھ ان کی سازباز نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ سید صاحبؒ کو پہلے اس فتنے کے سدِ باب کے لئے میدان میں آنا پڑا تو آپ پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا پھر تو اس صورتِ حال کی ساری ذمہ داری ان افغان سرداروں پر عاید ہو گی جو اپنی کوتاہ اندیشی اور سکھوں کے ایما سے سید صاحبؒ کے بلند اور پاکیزہ مقاصد کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو گئے۔ ذیل میں ان حالات کا نقشہ

---

[1] ملاحظہ ہو بدایونی کی کتاب کا صفحہ ۱۸۵

پیش کیا جاتا ہے جو سید صاحبؒ کے صوبہ سرحد تشریف لے جانے کے بعد پیش کیے، اس کے مطالعے سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان جنگوں کا حقیقی ذمہ دار کون تھا؛

جب سید صاحبؒ حدود افغانستان میں داخل ہوئے تو آپ نے وہاں کے حکمرانوں، علماء اور عوام سے رابطہ قائم کیا ان ملاقاتوں میں کابل قندھار اور مضافات کے سرداروں، علماء و مشائخ اور عوام آپ سے بے حد متاثر ہوئے آپ کی ربانی دعوت قبول کی اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی چنانچہ قندھاری مجاہدین کی ایک جماعت ابتداء سے لیکر معرکہ بالاکوٹ تک آپ کے ساتھ رہی اور ان میں سے بیشتر نے آپ پر سے اپنی جانیں پروانہ وار قربان کر دیں پھر انہی ملاقاتوں میں افغانستان کے سرداروں کے ساتھ آپ کا رشتہ محبت واخوت استوار ہوا جو ثبوت ہے اس بات کا کہ آپ نے افغانستان کے دورانِ قیام میں وہاں کے اہل سیاست اہل مذہب اور اہل سیف تینوں کو اپنا ہم نوا بنایا۔ صوبۂ سرحد کے دورانِ قیام میں آپ نے پشاور اور کابل کے سرداروں کو جو خطوط لکھے اور ان کی طرف سے جو جوابات موصول ہوئے وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ سید صاحبؒ نے ہر قدم نہایت تدبر سے اٹھایا اور افغان سرداروں کو اپنا ہم خیال بنانے اور سکھوں سے جہاد کرنے میں ان کی امداد حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ذیل میں کابل اور پشاور کے بعض سرداروں کے نام سید صاحبؒ کے کچھ خطوط کے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

سردار سلطان محمد خاں کے نام

سید صاحبؒ نے قیام کابل کے دوران وہاں کے جن سرداروں سے ملاقات کی اور اپنے مقصد عظیم (سکھوں سے جہاد) کے سلسلے میں انہیں اپنا ہم خیال بنایا۔ ان میں سردار سلطان محمد خاں کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے۔ جب سردار موصوف کو حاکم پشاور مقرر کیا گیا تو اس وقت سید صاحبؒ نے انہیں ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ:۔

"جس دن سے میرے اور آپ کے درمیان دار السلطنتِ کابل میں اتحاد و محبت اور خلوص کا رشتہ قائم ہوا اور دونوں طرف اس کے آثار ظاہر ہوئے اسی دن سے یہ تعلق اس ضعیف کے ساتھ پختہ ہو گیا ہے اور اس میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ بندۂ عاجز آپ کے مدارج و مراتب کی ترقی کا خواہاں اور آپ کی دینی و دنیوی فلاح کا خواستگار ہے اور آپ کے لئے شب و روز دعائے خیر میں مشغول رہتا ہے۔ اب جب کہ آپ کو پشاور کی سرداری کا منصب حاصل ہوا ہے اور آپ نے امور حکمرانی و سیاست کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں تو میرے لئے لازم ہو گیا کہ آیت کریمہ کنتم خیر امۃ الخ کے مطابق آپ سے خطاب کروں[1]"

---

[1] مکتوبات احمدی صد ۲۴۲

اس کے چند ماہ بعد سید صاحبؒ نے دوسرا خط انہی سردار سلطان محمد خاں کے نام لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ :-

"الحمد للہ کہ آپ کے سینۂ بے کینہ میں جو خزینۂ اخلاص ہے۔ دیرینہ محبت اب تک سروِ نونہال کی مانند تر و تازہ ہے حق تبارک و تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے اس شجرِ محبت کو سرسبز رکھے اور خدا کرے یہ ثمر لائے۔ آمین ۔۔۔۔ آپ نے اپنے نامۂ محبت و اخوت میں جس بڑے سردار کے متعلق تحریر کیا ہے انشاء اللہ خان مذکور کے اس کافرِ مردود کے شر سے محفوظ رہنے کے متعلق دعا کروں گا۔ حضرت ربِ کریم اپنے فضل سے میری دعا قبول فرمائے گا۔"[1]

سردار دوست محمد خاں کے نام

کابل سے واپس آکر سید صاحبؒ کو سکھوں کے ساتھ جنگوں میں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں ان کی کیفیت آپ نے سردارِ کابل سردار دوست محمد خاں کو ایک خط میں تحریر فرمائی۔ آپ کے خط کے جواب میں سردار دوست محمد خاں کا خط موصول ہوا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے سید صاحب نے تحریر فرمایا :-

"آپ کا نامۂ نامی در رقیمۂ گرامی موصول ہوا۔ اس میں آپ نے اقامتِ جہاد اور استیصالِ کفر و فساد کے علاوہ اخلاص و محبت کا جو اظہار فرمایا ہے اس سے بھی مطلع ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دین کے اس رکن یعنی نصرتِ اسلام اور کفر و فساد کا قلع قمع کرنے کا جذبہ آپ جیسی پُرجلال شخصیت کے دل میں موجزن ہے۔"[2]

یہ اور ان جیسے بعض دوسرے مکاتیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغانستان کے حکمرانوں اور پشاور کے سرداروں پر سید صاحبؒ کی شخصیت کا نہایت گہرا اثر تھا۔ وہ آپ سے اپنی کامیابی کے لئے دعاؤں کی درخواستیں کرتے تھے اور اپنے معاملات میں مشورے لیتے تھے۔ یہ اسی لئے تھا کہ سید صاحبؒ نے ان سے محبت و اخوت کا رشتہ استوار کیا تھا۔ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ آپ کے اخلاص، روحانیت اور تدبر و شجاعت کا ان افغان سلاطین اور سرداروں پر سکہ بیٹھ چکا تھا ورنہ ایک غریب الدیار اور بے سروسامان مسافر کو اس عہد کے یہ مطلق العنان حکمران کبھی اہمیت نہ دیتے۔ پھر صوبہ سرحد ہزارہ اور کشمیر کے خوانین، علماء و مشائخ اور عوام الناس تک سید صاحبؒ کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ اس کا اندازہ سید صاحب کے مکاتیب کے بعض اقتباسات سے ہوگا جو آپ نے بعض حکمرانوں اور ہندوستان میں اپنے عقیدت مندوں کو ارسال کئے۔ افسوس کہ عدم گنجائش کے پیشِ نظر ہم ان مکاتیب کی چند ہی سطور نقل کر سکتے ہیں جو احباب ان مکاتیب کی تفاصیل معلوم کرنا چاہیں وہ "مکتوباتِ احمدی" کا مطالعہ کریں۔

سلیمان شاہ بادشاہ کاشغر کے نام سید صاحبؒ نے ایک خط میں تحریر فرمایا کہ :-

[1] مکتوباتِ احمدی صفحہ ۲۰۴ [2] مکتوباتِ احمدی صفحہ ۲۰۵

بادشاہِ کاشغر کے نام

ضلع باجوڑ و پکھلی و دھمتوڑ و کھیپ و دہنی و ہزارہ و راجہائے کشمیر با ایں فقیر در مقدمۂ اعانت دینِ ربِ قدیر رفاقت محکم بربستہ اند و منتظر طلب ایں فقیر نشستہ اند[1]۔"

ضلع باجوڑ، پکھلی، دھمتوڑ، کھیپ، دہنی، ہزارہ اور کشمیر کے راجگان نے قدرتوں والے خدا کے دین کی امداد میں اس فقیر کا ساتھ دینے کا پختہ عزم کر لیا ہے اور اس فقیر کو طلب کرنے کے منتظر بیٹھے ہیں۔

اپنے ایک عقیدت مند مولوی حیدر علی رامپوری کے نام ایک مکتوب میں لکھا کہ:۔

احوال ایں حدود بہ کرم ربِ معبود سراسر مستوجب حمد و شکر است کہ الوف الوف انام بلکہ جماہیر اہل اسلام از سکنۂ ایں دیار و اقطار در اقامتِ جہاد و ازالۂ کفر و فساد رفاقتِ ایں خاکسار و ذرۂ بے مقدار بمحض قدرت خدا در اختیار نمودہ اند و در صرف جان و مال بہ تحصیل رضائے ربِ ذوالجلال مستعد گردیدہ سبحان اللہ کہ بہ تسخیرِ آں ربِ قدیر رؤساء اقوام آفریدی و مہمند و خلیل و یوسف زئی کہ از مرور دہور پیشۂ بغی و استکبار بر سلاطین ذوی الاقتدار میداشتند ربقۂ اطاعت ایں بندۂ عاجز و نحیف در گردن خود انداختہ و ریاست ایں فقیر را بر سرِ خود ہا مسلم داشتہ چہ قدر شاداں و فرحاں اند کہ از حیطۂ تحریر و تقریر بیرون است[2]۔"

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس علاقے کے حالات سراسر حمد و شکر کے قابل ہیں کہ ہزارہا افراد بلکہ ان علاقوں کے جملہ مسلمانوں نے اقامتِ جہاد اور کفر و فساد کے استیصال میں اس عاجز و خاکسار کی حمایت و رفاقت کی، یہ محض اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ یہ لوگ اپنے جلال والے رب کی رضا حاصل کرنے کی خاطر جان و مال کی قربانی کرنے پر مستعد ہو گئے ہیں۔ سبحان اللہ کہ رب قدیر نے اقوام آفریدی و مہمند و خلیل اور یوسف زئی کے سرداروں کے دلوں کو مسخر کر دیا اور ان لوگوں نے جو زمانۂ قدیم سے بڑے بڑے طاقتور بادشاہوں کے خلاف بھی بغاوت کرتے رہے اس بندۂ عاجز و ناتواں کی اعانت کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا اور اس فقیر کی امارت کو بہ دل و جان قبول کر لیا اور اس پر اس قدر شاداں و فرحاں اور مسرور ہیں کہ ان کی کیفیت کا اندازہ تحریر و تقریر کی حدود سے باہر ہے۔

۱؎ مکتوبات احمدی صـ۲۱۴

۲؎ مکتوباتِ احمدی صـ۲۰

سیّد صاحبؒ سے افغان عوام کا سلوک

انہی ایام میں سید صاحب نے ایک خط ریاست ٹونک کے حکمران نواب وزیر الدولہ کے نام لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ:۔

"اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان علاقوں کے جملہ سردار اور عوام اعلائے کلمۃ الحق اور سید المرسلینؐ کی سنّت کے احیا یعنی اقامتِ جہاد کے کام میں اس عاجز کا ساتھ دینے میں بڑے مستعد اور ہوشیار ہیں کہ ان کی مشارکتِ جہاد کی خوبیاں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ہندوستان سے آئے ہوئے رفیقوں نے اس فقیر کے ساتھ جس محبت و اخلاص کا مظاہرہ کیا ہے اس سے کہیں زیادہ حسنِ سلوک میرے ساتھ جملہ افغان قوموں نے کیا۔ خصوصاً یوسف زئی قوم کے لوگوں کا سلوک تو حدِ تصوّر سے باہر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی جان کو شرکتِ جہاد میں جَو کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے۔ البتہ مال و دولت کی قربانی دینے سے معذور ہیں کیونکہ ان کے مالی حالات اس قابل نہیں[1]"

سید صاحبؒ کے ان مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں صوبہ سرحد کے افغان سرداروں اور افغان عوام دونوں نے آپ کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا حتیٰ کہ افغانستان کے حکمران بھی آپ کے ساتھ نہایت اعزاز و اکرام سے پیش آئے۔ آپ سے تعلق قائم رکھنا اپنے لئے باعثِ سعادت و کامیابی سمجھا خصوصاً اکوڑہ اور حضرو کی جنگوں میں مجاہدین کے ہاتھوں سکھوں کو جو نقصانِ عظیم برداشت کرنا پڑا اس نے افغانستان کے حکمرانوں، صوبہ سرحد کے سرداروں اور عوام سب کو متاثر کیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی تائید سید صاحبؒ کے ساتھ ہے اور وہ غیر معمولی انسان ہیں لیکن اس کے بعد حالات میں تغیر شروع ہُوا۔ اس تغیر کے صحیح اسباب نہ سمجھنے کی وجہ سے سید صاحب کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ تنگ نظر اور متعصب افراد نے ان غلط فہمیوں میں رنگ آمیزی کر کے رائی کا پہاڑ بنایا اور حالات کی تصویر بالکل مسخ کر دی۔

سردارانِ پشاور کی روش

سید صاحبؒ کی تحریک صوبہ سرحد میں بار آور ہو رہی تھی۔ افغان عوام جوق در جوق آپ کی بیعت کر رہے تھے اور آپ کا اثر و نفوذ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ سید صاحبؒ کی یہ مقبولیت سکھ حکومت کے لئے سخت تشویش کا باعث تھی اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ اگر سیّد صاحبؒ نے طاقت حاصل کر لی تو وہ ایک نہ ایک دن ضرور سکھوں سے ٹکر لیں گے اور اگر افغان منظم ہو جائیں اور انہیں اچھا جرنیل بھی مل جائے تو تاریخ شہادت دیتی ہے کہ

---

[1] مکتوباتِ احمدی صد ۲۴۱

ان سے زیادہ جنگجو قوم روئے زمین پر اور کوئی نہیں۔ سبکتگین اور محمود غزنوی سے لیکر شیر شاہ سوری اور احمد شاہ ابدالی تک جتنے ترک یا افغان فاتح گزرے ہیں ان کی عظیم الشان فتوحات اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ سکھ میدانِ جنگ میں مجاہدین کی ایمانی طاقت اور شجاعت و استقلال کا مظاہرہ دیکھ چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے عاجز ہو کر حکمت عملی سے کام لیا افغان سرداروں کو سید صاحب کے خلاف ورغلایا علماء سوء کو خریدا اور صوبہ سرحد میں خوفناک سازش کا جال بچھا دیا۔ اس مرحلے پر ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ پشاور سے لیکر ہزارہ کے دور افتادہ علاقوں تک افغان عوام سید صاحبؒ کے "عقیدت مند اور فدائی" تھے لیکن افسوس ہے سردارانِ پشاور پر جنہوں نے سکھوں کی ترغیب و تحریص میں آکر اور کچھ اپنے ناروا افعال کا محاسبہ ہوتے دیکھ کر وہ شرمناک ڈرامہ کھیلا جس نے ایک طرف سید صاحبؒ کے بلند عزائم پر پانی پھیر دیا اور دوسری طرف خود سردارانِ پشاور کی دنیا اور عقبیٰ دونوں برباد ہو گئیں۔ انہیں پہلے تو سالہا سال سکھوں کی غلامی قبول کرنی پڑی اور پھر کم و بیش ایک صدی انگریزوں کی اطاعت کا جوا اپنے کندھوں پر رکھنا پڑا۔ اگر وہ سید صاحبؒ سے غداری نہ کرتے تو آج ان کی پیشانی کلنک کے اس ٹیکے سے پاک ہوتی اور وہ پاکستان جو ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا ایک صدی قبل معرض وجود میں آجاتا۔ اس مرحلے پر پہنچکر ہر مورخ بجا طور پر سوچتا ہے کہ جس شخصیت نے پشاور، علاقہ یوسف زئی اور مردان سے لے کر ریاست امب تک ہزاروں مربع میل علاقے سکھوں کے تسلط سے آزاد کرا کر ان پر اسلامی حکومت کا علم لہرا دیا اور چار سال تک ان علاقوں پر اس کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔ آخر وہ یک بیک زوال کیسے ہو گیا؟ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ اول سردارانِ پشاور اور دوئم شکم پرست علماء سوء اس صورتِ حال کے ذمہ دار ہیں۔

سید صاحبؒ سے سردارانِ پشاور کی پہلی غداری

جن لوگوں نے سید صاحبؒ کو سردارانِ پشاور کے ساتھ جنگ و جدل کا ذمہ دار قرار دیا ہے وہ بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ "جنگِ شیدو" تک سید صاحبؒ نے سردارانِ پشاور کے خلاف نہ کوئی جنگ لڑی تھی نہ انہیں جنگ کی دھمکی دی تھی بلکہ آپ ان سرداروں سے محبت آمیز سلوک فرماتے تھے۔ جنگِ شیدو سے قبل جب سید صاحبؒ نے امامت جہاد کی بیعت لی تو سردارانِ پشاور خصوصاً سردار سلطان محمد خاں نے بذریعۂ خط آپ کی بیعت کر لی۔ بعد میں یار محمد خاں نے بھی اطاعت کا عریضہ لکھا لیکن جب شیدو کے مقام پر سکھوں اور مجاہدین میں معرکہ کارزار گرم ہوا تو یہی سردارانِ پشاور تھے جنہوں نے سب سے پہلے میدان جنگ سے پیٹھ پھیری اور اپنے آدمیوں کے ذریعے "شکست شکست" کا آوازہ بلند کرایا تاکہ دوسرے مجاہدین بھی حوصلہ ہار دیں اور جیتی ہوئی جنگ شکست میں بدل جائے اور ہوا بھی یہی۔ سید صاحبؒ کے مخالفین خصوصاً ہمارا بدایونی مولف کہتا ہے:

جنگوں کے حالات اور ان کے اسباب کامیابی و ناکامیابی کو سید صاحبؒ کے تذکرہ نگاروں نے غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ ہم اس مرحلے پر ہم سید صاحبؒ کے کسی عقیدت مند تذکرہ نگار کی رائے درج نہیں کرینگے بلکہ ایک غیر جانبدار مصنف کا بیان پیش کریں گے۔ یہ بیان فیصلہ کردے گا کہ سید صاحبؒ نے سردارانِ پشاور کو اپنی شخصیت اور مجاہدین سے بدظن کیا یا سردارانِ پشاور کی غداری نے سید صاحبؒ کو بدظن کرکے حالات کو خراب کیا۔ اب ذیل میں اس غیر جانبدار مصنف کی رائے درج کی جاتی ہے۔

"بدھ سنگھ نے درانی سرداروں کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم سیدؒ (صاحب) کی امداد سے دست کش ہوگئے تو تمہارے علاقوں پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ خود رنجیت سنگھ بھی آرہا ہے اگر تم نے سید (صاحب) کی اعانت کی اور لڑائی میں شریک ہوگئے تو تمہارا حشر بہت خراب ہوگا۔ سردارانِ پشاور خصوصاً اس کے سرغنہ یار محمد خاں اس تنبیہہ سے مرعوب ہوگئے اور جنگ کے آغاز ہی میں درانی سردار میدان سے فرار ہوگئے۔ فرار ہونے والوں میں سب سے آگے بھی یار محمد خاں تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو شکست ہوگئی[1]"

اس غیر جانبدار مورخ کے بیان نے فیصلہ کردیا کہ جنگِ شیدو سے قبل تک سید صاحبؒ سردارانِ پشاور کی عزت کرتے تھے کیونکہ انہوں نے سید صاحبؒ کی بیعت کرلی تھی اور سکھوں کی تسلط سے اسلامی شہروں کے آزاد کرانے میں سید صاحبؒ کی اعانت کا وعدہ کیا تھا یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک سردارانِ پشاور کے ساتھ سید صاحب کے نہایت خوشگوار تعلقات تھے لیکن جب شیدو کے مقام پر مجاہدین اور سکھوں میں لڑائی شروع ہوئی تو سردار سلطان محمد خاں اور سردار یار محمد خاں نے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق اپنے لشکروں کے ہمراہ بے تحاشا بھاگنا شروع کردیا اور ان کے آدمیوں نے "شکست شکست" کے نعرے مارنے شروع کردئے اس طرح ان کی غداری سے نہ صرف اسلامی لشکر کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا بلکہ بہت بڑے پیمانے پر ہندوستانی مجاہدین اور افغانی مجاہدین کو جو سید صاحبؒ کے سچے جان نثار تھے سخت جانی نقصان اٹھانا پڑا۔

ہمارا بے بصیرت اور ضدی بدایونی مولف کہتا ہے کہ سید صاحبؒ کا "جہاد سکھوں سے تھا مگر لڑائی پٹھان ہی مسلمانوں سے۔ اگر سرحدی پٹھانوں کو صحیح تعلیم دی جاتی تو وہ اپنی جہالت پر قائم نہیں رہتے[2]" ہم نے ایک غیر جانبدار مورخ کی رائے پیش کردی ہے جو نہ وہابی ہے نہ دیوبندی بلکہ سرے سے مسلمان ہی نہیں نہ اسے سید صاحب سے عقیدت ہے نہ بدایونی مولف کے ہم عقیدہ لوگوں سے کوئی دلچسپی ہے۔ اس کا بیان موجود ہے۔ اسے دیکھ کر ہر مصنف مزاج قاری خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ سید صاحبؒ نے تو سرحد کے طول و عرض میں دورے کرکے اور اپنے داعی بھیجکر افغانوں کی تربیت کی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے مگر سردارانِ پشاور نے اپنی حکومت بچانے کی خاطر سید صاحبؒ سے غداری کی اور ان سرداروں کی وجہ سے سیکڑوں بے گناہ مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ گیا۔ اس کے بعد بدایونی مولف کا یہ کہنا

---

[1] پشاور گزیٹیر صہ ۶۶

[2] ملاحظہ ہو بدایونی مولف کی کتاب کا صہ ۱۹۲

کہ سید صاحبؒ کو حکمت عملی سے کام لینا چاہیئے۔ تھا اور سردارانِ پشاور کو اپنا دشمن نہیں بنانا چاہئے تھا۔ پرلے درجے کی ہٹ دھرمی ہے کیونکہ سردارانِ پشاور نے غداری کر کے خود سید صاحب کو اپنا دشمن بنایا۔ سید صاحب تو آخر تک ان کے دوست بنے رہے۔ کیا اس کے بعد سید صاحبؒ کے لئے ضروری نہیں ہو گیا تھا کہ پہلے یار محمد خاں اور خادے خاں جیسے فتنہ پرداز اور سکھوں کے کاسہ لیس سرداروں کا خاتمہ کریں تاکہ ان کے اصل مقصد و مدعا (سکھوں سے جہاد) کی راہ کی رکاوٹیں دور ہو سکیں۔ پھر اگر آپ نے پنجتار، ہنڈ اور مہیار میں ان افغان سرداروں سے لڑ کر ان کا خاتمہ کیا تو ان پر کیسے الزام عائد ہو سکتا ہے۔ کیا وہ جنگ شیدو میں لشکر اسلام کی شکست اور اسے ضعف پہنچانے کے ذمہ دار نہ تھے؟ کیا ان کی وجہ سے سینکڑوں بے گناہ مسلمانوں کو سکھوں کی تلواروں کا نشانہ نہیں بننا پڑا؟ کیا ایسے فتنہ پرداز لوگوں سے پھر خطرہ نہیں تھا کہ جب بھی سید صاحبؒ سکھوں سے جہاد شروع کریں گے یہ خود مجاہدین کو جنگ میں الجھا کر اصل مقصد سے ہٹا دیں گے اور پھر اسلام کی شکست کا باعث بنیں گے۔ ایسی صورت میں ان سے جنگ کئے بغیر سکھوں سے جہاد کرنا سخت نادانی تھی اس لئے سید صاحبؒ نے ان افغان سرداروں کو شکست دے کر تدبر و دور اندیشی کا ثبوت دیا۔ ان لوگوں سے جتنی لڑائیاں ہوئیں ان کے ذمہ دار یہ خود تھے۔ سید صاحبؒ پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔

درانیوں کی فتنہ انگیزی کا ایک اور ثبوت

شاید ہمارے بدایونی مولف نے تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا خصوصاً صوبہ سرحد اور افغانستان کے تاریخی حالات سے وہ بالکل نابلد معلوم ہوتا ہے۔ اگر اسے درانی سرداروں کی شرشت کا علم ہوتا تو وہ سید صاحبؒ پر کبھی ایسے بے سروپا الزامات عائد نہ کرتا۔ شاید اسے معلوم نہیں کہ ان لوگوں نے اپنے حقیقی بھائیوں فتح خاں اور عظیم خاں کو بھی دھوکا دیا اور انہیں ایسی زک پہنچائی کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ پھر یہی سردارانِ پشاور تھے جنہوں نے اپنے پڑوسی ملک قلات میں دخل اندازی کی اور حکمرانِ قلات کے لئے سخت مصیبت کا موجب بنے۔ چنانچہ حاکم قلات نے سید صاحبؒ کے نام جو خط لکھا تھا اس کے جواب میں آپ نے خان قلات کو جو مکتوب گرامی تحریر فرمایا اس کے مطالعہ سے درانی سرداروں کی سرشت اور ان کی فتنہ آرائی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"آپ کا مکتوب گرامی موصول ہوا۔ اس میں آپ نے اخلاص و محبت اور خاص طور پر اقامتِ جہاد اور رفع بغاوت و فساد کی بابت جو امور تحریر فرمائے ہیں انہیں پڑھ کر قلب کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا۔ آپ نے اپنے علوئے ہمت سے اضلاع ہزدواہان کے علاقوں سے کفر اور فتنہ و فساد کا قلع قمع کرنے کی نسبت جو کچھ تحریر فرمایا ہے بے شک یہ امر بھی ہمارے مقاصد کا ایک حصہ ہے لیکن

اگر اس مقصد کے لئے آپ خود آگے بڑھیں گے تو منافق اور مفسد فتنہ آرائی کریں گے، اس لئے میرے خیال میں مناسب یہ ہوگا اور مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ سب سے پہلے منافقوں کے خاتمے کی پوری کوشش فرمائی جائے اور جب آپ کے اطراف و جوانب میں بدکردار منافقوں کا خاتمہ ہو جائے تو پھر اطمینان قلب کے ساتھ حقیقی مقصد کی طرف توجہ فرمائیں..... آپ اپنے لشکر اور اہل قبیلہ کو لیکر خود غزنی کے نواح میں منافقوں پر حملہ شروع کریں اور اپنے بعض معتمدین کو لشکر کثیر دے کر نواح کابل میں مامور فرمائیں تاکہ یہ لوگ منافقین پر شب خون مار کر ان مقامات سے ان کا قلع قمع کر دیں۔ ادھر سے میں بھی منافقینِ پشاور کی سرکوبی کرتا ہوں[1]۔"

سیدِ صاحبؒ کے اس مکتوب گرامی سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ سردارانِ پشاور اور کابل کے حاکم دونوں مسلمانوں کے لئے سخت فتنہ کا باعث بنے ہوئے تھے، ان لوگوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے قلات میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جو حاکم قلات کے اقتدار کو چیلنج کر رہا تھا اور اس کے بعض اضلاع میں فتنہ و فساد برپا کر رہا تھا۔ حاکم قلات نے ان کے ہاتھوں تنگ آکر سید صاحبؒ سے رجوع کیا اور مشورہ طلب کیا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔ سید صاحبؒ نے رائے دی کہ پہلے اپنے علاقے سے مفسدین اور منافقین کا قلع قمع کر دو پھر غزنی اور کابل کے نواح کی طرف پیش قدمی کرو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مفسدوں کے مراکز کتنی دور تک قائم تھے اور یہ مراکز انہی سردارانِ پشاور کے زیر تسلط تھے۔ گویا پشاور سے کابل و غزنوی اور قلات تک کا سارا اسلامی علاقہ درانیوں کی فتنہ آرائی کی جولان گاہ بنا ہوا تھا۔ حیرت ہے کہ ہمارے بدایونی مولف کی رائے میں ایسے مفسد اور فتنہ پرور لوگ تو بے گناہ تھے اور سید صاحبؒ جیسا نیک نفس انسان جو فتنہ و فساد کا قلع قمع کر کے ان علاقوں کے مسلمانوں کو منظم کرنا چاہتا تھا وہ "فتنوں کو دراز کرنے والا تھا"۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اگر بدایونی مولف کے بقول سید صاحبؒ سے افغان سردار اس لئے باغی ہو گئے کہ دونوں کے مذہبی عقائد میں اختلاف تھا تو اسے سوچنا چاہیئے کہ سردارانِ پشاور اور ان کے بھائیوں فتح خاں اور عظیم خاں میں تو کوئی مذہبی اختلاف نہیں تھا پھر انہوں نے اس اسلامی مملکت میں دخل اندازی کر کے صورتِ حال کو اس حد تک کیوں خراب کر دیا کہ خان موصوف کو ان سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ فطرتاً مفسد اور خود غرض تھے اور ان کا مقصود و مدعا اس کے سوائے اور کچھ نہ تھا جس طرح ہو اپنا اقتدار مضبوط کیا جائے۔ حدودِ مملکت میں توسیع کی جائے اور مال و دولت کے ذخائر میں اضافہ کیا جائے خواہ اس کے لئے انہیں اپنے ہی بھائیوں کا خون بہانا پڑے اور اسلامی مفادات کو کتنا ہی نقصان پہنچے۔ ایسے لوگوں سے بھلائی کی کیا توقع ہو سکتی تھی۔

---

[1] مکتوباتِ احمدی ص ۱۸۰

سیّد صاحب کو زہر دینے کی سازش

انتہا یہ ہے کہ ان لوگوں نے سکھوں کا آلہ کار بن کر اس پاک وجود کا رشتۂ حیات منقطع کر دینے میں بھی تامل نہ کیا جس کے سینے میں وہ مقدس دل دھڑک رہا تھا جو اسلام کی سربلندی کے لئے بے قرار رہتا تھا چنانچہ خود سیّد صاحب نے اس واقعے کی تصدیق کی ہے۔ اپنے مشہور اعلام نامے میں سردارِ پشاور کی غداری اور اس کے ہاتھوں مسلمانانِ سرحد کے مصائب کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"علاوہ ازیں اس (سردارِ پشاور) نے اس عاجز کی ہلاکت و بربادی میں کوئی کمی باقی نہ چھوڑی اور "آخر الامر نوبت بدادن زہر جگر سوز رسانید" آخر کار جگر کو جلا دینے والا زہر دینے کا اقدام کیا۔"[1]

ہمارا بدایونی مولف سید صاحبؒ کو زہر دینے کا واقعہ تسلیم نہیں کرتا۔ اس کا خیال ہے کہ سید صاحبؒ نے سردارِ پشاور کو بدنام کرنے اور اس کے خلاف جنگ کا جواز تلاش کرنے کے لئے یہ الزام لگایا۔ اس مولف سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ کیا اللہ کے مقدس بندے اور روحانی انسان کذب بیانی اور افترا پردازی بھی کرتے ہیں۔ اور اپنے مخالفین سے انتقام لینے کے لئے ان کے خلاف ایسے گھناؤنے الزام لگایا کرتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ایک طرف تو وہ تسلیم کرتا ہے کہ "سید صاحب برگزیدہ اور روحانی انسان تھے" اور دوسری طرف انہیں کذب بیانی افترا پردازی اور مسلمانوں کا خون بہانے کا مجرم قرار دیتا ہے۔ سچ ہے جب انسان تعصب سے مغلوب ہو جاتا ہے تو اس کی عقل اسی طرح ماری جاتی ہے۔

بدایونی مولف نے اس معاملے کو مشکوک بنانے کی جو کوشش کی ہے شاید وہ کامیاب ہو جاتی مگر اس کا کیا علاج کہ غیر جانبدار بلکہ سید صاحبؒ کے مخالف مصنف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سردارانِ پشاور نے آپ کو زہر دے کر ہلاک کرنے کا شرمناک اقدام کیا چنانچہ ولیم ہنٹر جس نے سید صاحبؒ کے خلاف ایک پوری کتاب لکھ ماری ہے بہ امر مجبوری تسلیم کرتا ہے کہ سید صاحبؒ کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ اس کا بیان ہے کہ:۔

"آخر کار وہاں (پشاور) کے سردار نے اس جنگی صورتِ حال کو ختم کرنے کی غرض سے اس رہنما (سید صاحب) کو دھوکہ سے کام لے کر زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی۔"[2]

---

[1] مکتوبات احمدی صہ ۱۷۶

[2] دی انڈین مسلمانز صہ مطبوعہ دی پریمیئر بک ہاؤس کچہری روڈ لاہور

اگر عام حالات میں سید صاحبؒ کو زہر دیا جاتا تو ان کی رحم دلی سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ مجرموں کو معاف کر دیتے۔ مگر یہ حالات عام نہ تھے اور نہ سید صاحبؒ عام انسان تھے۔ ان کی حیثیت مسلمانوں کے نجات دہندہ کی تھی۔ وہ تحریک جہاد کے امام تھے اور اس مقصد کے لئے اللہ تعالےٰ کی طرف سے مامور کئے گئے تھے۔ عین اس وقت جب کفار سے جنگ شروع ہونے والی تھی ان کو زہر دینے کا مقصد صرف انہیں ہلاک کرنا نہیں تھا بلکہ اس تحریک کو برباد کرنا اور اسلامی شہروں کو سکھوں کے تسلط و تصرف میں دینا تھا گویا معاملہ سید صاحب کی ذات کا نہیں تھا بلکہ اسلامی لشکر کی فتح و شکست اور مسلمانوں کی کامیابی و ناکامی کا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں سردارانِ پشاور کو معاف کر دینے اور ان سے چشم پوشی کرنے کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہوتا کہ وہ دلیر ہو کر سید صاحبؒ پر ایک بھرپور حملہ کرتے اور ان کا اور ان کی تحریک کا خاتمہ کر دیتے یا سید صاحب وہاں سے اپنے مجاہدین کو لے کر ہندوستان واپس چلے آتے۔ یہ دوسری صورت ان کے مقاصد کو اپنے ہاتھ سے برباد کرنے کے مترادف تھی۔ اس لئے آپ کو مجبوراً سردارانِ پشاور اور ان کے حلیفوں کے خلاف میدان میں آنا پڑا تاکہ اس فتنہ کا قلع قمع کر کے یکسوئی سے سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری کی جا سکے۔ ٭

پشاور سے سید صاحبؒ کی ہجرت کے اسباب

سید صاحبؒ نے اپنے تدبر ایمانی و روحانی طاقت اور اپنی شجاعت و اولوالعزمی سے اپنے راستے کی ایک ایک رکاوٹ دور کردی۔ پشاور سے لے کر علاقہ یوسف زئی، مردان اور ہزارہ کے دور افتادہ علاقوں تک اسلامی حکومت کا علم لہرانے لگا اور سید صاحبؒ کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ بہ ظاہر حالات پوری طرح سازگار ہوچکے تھے اور وہ دن قریب نظر آرہا تھا جب آپ فتح و نصرت کا پرچم لہراتے کشمیر اور پھر پنجاب کو سکھوں کے مظالم سے نجات دلاکر ان علاقوں پر بھی اسلامی حکومت کا علم لہرادیں گے کہ اچانک حالات نے ایک نئی کروٹ لی اور سید صاحبؒ کی کامیابی ناکامی میں تبدیل ہوگئی اس کے متعدد اسباب تھے۔

افغان سرداروں کی خود غرضی

اس ناکامی کا سب سے بڑا سبب افغان سرداروں کی کوتاہ اندیشی اور خود غرضی تھی جس وقت سید صاحبؒ صوبہ سرحد تشریف لائے تو ابتدا میں ان علاقوں کے سرداروں نے سید صاحبؒ آمد کو امداد غیبی خیال کیا کیونکہ سکھوں کے تباہ کن حملوں کی وجہ سے صوبہ سرحد میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی اور عوام کی جان و مال کے علاوہ خود ان افغان سرداروں کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا تھا۔ یہ لوگ بظاہر "خان" اور سردار تھے مگر درحقیقت سکھوں کے تابع فرمان ہوچکے تھے۔ چنانچہ ایک انگریز مورخ کا بیان ہے کہ:-

> "۱۸۲۷ء میں جب سیدؒ پشاور پہنچا تو وہ یار محمد خاں بارک زئی گورنر کی وجہ سے پریشان ہوا اس نے یار محمد خاں کے دل کو شبہات سے لبریز پایا۔ یار محمد خاں دو مرتبہ رنجیت سنگھ کی وفاداری کا اعلان بھی کرچکا تھا[1]"

ایک دوسرا انگریز مورخ بھی اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ بعض افغان سردار سکھوں کے مطیع ہوچکے تھے اس کا بیان ہے کہ:-

---

[1] دی پٹھانز ص ۳۰۳ مولفہ اولف کیرو

"پنجتار کا باوقار قبیلہ یوسف زئی یار محمد خاں کے عزائم سے خائف تھا
کیونکہ یار محمد خاں سکھوں پر انحصار رکھتا تھا[1]"

ان سرداروں نے جو سکھوں کے ہاتھوں مغلوب ہو چکے تھے، سید صاحب کے ساتھ اسلئے تعاون پر آمادگی ظاہر کی کہ اس طرح سید صاحبؒ کے ذریعے انہیں سکھوں کے غلبے سے نجات مل جائے گی اور وہ پھر آزادی سے حکومت کر سکیں گے۔ واقعات شہادت دیتے ہیں کہ سید صاحبؒ سے ان کا تعاون اس غرض سے نہ تھا کہ یہ علاقے سکھوں کے تسلط سے آزاد ہو کر اسلامی زندگی کا گہوارہ بن جائیں اور یہاں اسلامی نظام حکومت قائم ہو جائے ادھر سید صاحبؒ مسلمانوں کو سکھوں کے ظلم و ستم سے نجات دلانے کے ساتھ ساتھ انکی زندگیاں اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے اور ان برائیوں کا بھی سدباب کرنا چاہتے تھے جو اسلامی معاشرہ کو گھن کی طرح کھائے جا رہی تھیں سید صاحبؒ اور افغان سرداروں کے انہی متضاد مقاصد نے دونوں کے درمیان تصادم کی صورت پیدا کر دی اور سید صاحبؒ کی تحریک ناکام ہو گئی۔

تواریخ ہزارہ کی مصنف کی شہادت

چنانچہ تواریخ ہزارہ کے مصنف کا بیان ہے کہ افغان سرداروں نے سید صاحبؒ کی اطاعت اس لئے اختیار کی تھی کہ

"انہیں یقین تھا کہ اگر اسکی اطاعت نہیں کرتے تو چند روز میں سرکار سکھاں غلبہ کر کے ہمارے ملک پر قابض ہو جائیں گے اور وہ ایک تو غیر مذہب ہیں دوسرے وہ معاملہ (مالیہ) پورا وصول کریں گے (سید صاحبؒ) جب چاہیں گے (یعنی کبھی کبھی) عشر لیویں گے اور یہ عشر بھی برائے نام ہوگا اختیار ہمارا ہوگا جس قدر چاہیں گے دیویں گے اور احکام شرعی معمولی جاری ہوں گے۔ ان میں کچھ سختی نہیں ہوگی اور انکی اطاعت نہایت آسان تصور کرتے تھے۔ اسی واسطے نہایت ہی جلدی سب علاقہ مطیع ہوا اور خوشی سے عشر دینا منظور کر لیا ...... (لیکن جب سید صاحبؒ نے) عشر ملک سے لے لیا تو ہر گاؤں میں ایک انبار غلہ عشر کا ہو گیا اور جمعیت بھی قریب ۶ ہزار آدمی سلاح بند کے ہو گئے مگر ایک فصل کے عشر دینے سے دراصل سب لوگ تنگ ہو گئے کیونکہ دیہات میں جابجا محصل مقرر ہو گئے، وہ ایک خوشہ بھی زمینداروں کو بغیر عشر لینے کے نہیں توڑنے دیتے تھے[2]"

---

[1] ہسٹری آف دی سکھس صہ ۱۹۲ مولفہ جوزف ڈیوی کننگھم (مطبوعہ لندن ۱۸۵۳ء)

[2] تواریخ ہزارہ صہ ۲۳۳ مولفہ مرزا اعظم بیگ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع ہزارہ

غیر اسلامی رسوم کے خلاف سید صاحب کا جہاد

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغان سرداروں نے سید صاحبؒ کے متعلق جو اندازہ لگایا تھا وہ غلط ثابت ہوا ان کا خیال تھا کہ یہ عام درویشوں کی طرح فقیر آدمی ہیں جو نذر و نیاز لیکر دعائیں کر دیتے ہیں چونکہ انکے ساتھ لشکر بھی ہے اسلئے یہ ہماری امداد کریں گے اور اپنی ضرورت کے مطابق عشر لے لیں گے. شرعی احکام برائے نام ہوں گے. اختیار و اقتدار ہمارا ہوگا جب اور جتنا جی چاہے گا غلہ انہیں دے دیں گے مگر سید صاحبؒ نے وہاں تشریف لے جاکر باقاعدہ شرعی نظام جاری کر دیا اور اس پر پوری سختی سے عمل درآمد کروایا. یہ صورت حال افغان سرداروں کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوئی اور ایک فصل کا عشر دینے کے بعد انکے دل تنگ ہو گئے اسکے بعد جب سید صاحبؒ نے انکی مروجہ غیر اسلامی رسوم میں مداخلت کی اور چاہا کہ ان زنجیروں سے انہیں نجات مل جائے تو یہ لوگ اور بھی دل برداشتہ ہو کر سید صاحبؒ کے خلاف ہو گئے اور سکھوں نے انہیں شہ دی اور یہ لوگ سکھوں کے ایماء سے سید صاحبؒ کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے چنانچہ تواریخ ہزارہ کا مصنف لکھتا ہے کہ:-

" سردارانِ پشاور کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ شخص غیر ملک کا ہمارے ملک افغانستان میں خیمہ زن ہو کر ہماری پرانی رسوم کو دور کرنے لگا ہے اور حکومت کرتا ہے اور سرکارِ لاہور (سکھ حکومت) سے بھی اس کو ایما ملی کہ علاقہ یوسف زئی بھی تم کو عطا ہوگا تم خلیفہ سید احمد کو مار ڈالو اور قبضہ یوسف زئی پر کر لو (چنانچہ) اول سردارانِ پشاور نے اس کو خط لکھا کہ تم نکل جاؤ "[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشر وصول کرنے کے علاوہ افغان سرداروں کو سید صاحبؒ کا جو دوسرا اقدام ناگوار گذرا وہ تھا غیر اسلامی رسوم کا خاتمہ. جب سکھوں نے انہیں شہ دی اور مال دینے کا وعدہ کیا تو وہ فوراً سید صاحبؒ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے تاکہ اس طرح باقاعدگی سے عشر ادا کرنے سے نجات مل جائے اور سید صاحبؒ نے ان کے خود ساختہ مذہب (غیر اسلامی رسوم) میں مداخلت کر کے جو صورتِ حال پیدا کر دی ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے اور وہ آزادی سے لہو و لعب اور کمزوروں پر ظلم و ستم کا عمل جاری رکھ سکیں۔

رسومِ شادی کی اصلاح

تواریخ ہزارہ کے مصنف نے افغانوں کی جن رسوم کا ذکر کیا ہے ان میں ایک رسم یہ تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں کے نکاح بہت دیر میں کرتے تھے اور اس وقت رخصت کرتے تھے جب لڑکے والے ایک مقررہ رقم ادا کر دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کتنی ہی لڑکیاں مطلوبہ رقم کے انتظار میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتی تھیں. سید صاحبؒ نے اس

---

[1] تواریخ ہزارہ صـ ۲۲۶

غیر اسلامی بلکہ غیر انسانی رسم کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کی یہ کوشش بھی افغان سرداروں کو ناگوار گذری اور انہوں نے اسے اپنے نجی معاملات میں مداخلت تصور کیا حالانکہ مسئلہ نجی معاملات میں مداخلت کا نہیں بلکہ انسانیت کا تھا۔ چنانچہ تواریخ ہزارہ کا مصنف کا بیان ہے کہ :۔

"بغیر چھوٹا بڑے آدمی کے اس ملک میں ایک رسم تھی کہ نکاح عورت کا بعد بلوغت کے دیر میں ہوتا تھا وجہ یہ تھی کہ پٹھان لوگ نکاح ہر لڑکی اپنی پر ایک سو سے زیادہ ایک ہزار تک بلکہ خاص جگہ اس سے بھی زیادہ روپیہ فرزند والے سے لیا کرتے تھے، اور جس لڑکی کے نکاح پر زیادہ روپیہ لیویں اسکی عزت فرزند والے کے گھر میں و نیز اپنے گھر میں زیادہ زیادہ سمجھتے تھے پس جب تک روپیہ موجود نہ ہووے نکاح نہیں ہوتا تھا اور ہزارہا لڑکیاں جوان بلکہ بعض ایسی تھیں جن کے سروں میں بال سفید آگئے تھے بغیر نکاح کے اپنے والدین کے گھروں میں اور روپیہ کی قید میں بیٹھی تھیں، خلیفہ سید احمد نے اس رسم کو دور کرنا چاہا اور ہمیشہ مذمت اس کی کرنے لگے اور جہاں تک ہو سکا برخلاف رسم اس ملک کے نکاح بھی ہونا شروع ہوئے مگر اس رسم کا دور ہونا اس ملک کے لوگوں کو نہایت ناگوار تھا اور خوشی سے اس کو ترک نہیں کرتے تھے، خلیفہ سید احمد بھی اس میں کچھ زور کرنے لگے اور پٹھان دراصل دل سے کچھ ناراض ہونے شروع ہو گئے[۱]"

ہمارا بدایونی مولف سید صاحبؒ کے اس خالص انسانی اور اسلامی اقدام پر بھی معترض ہے وہ الزام عائد کرتا ہے کہ سید صاحبؒ نے افغانوں کے نجی معاملات میں کیوں مداخلت کی پھر وہ دوسرا الزام یہ عائد کرتا ہے کہ سید صاحبؒ نے افغانوں کی بیٹیاں اپنے مجاہدین سے نامزد کر دیں جو سالہا سال سے بغیر بیویوں کے زندگی گذار رہے تھے اگر سید صاحبؒ نے واقعی ایسا کیا ہوتا تو "تواریخ ہزارہ" کا مصنف ضرور اس کا ذکر کرتا جس نے سید صاحب کا قریبی زمانہ پایا تھا یعنی اس نے اپنی کتاب ۱۸۷۳ء میں مکمل کی جب کہ سید صاحبؒ کے واقعہ شہادت پر صرف ۴۲ سال گذر رہے تھے۔ پھر یہ مصنف سید صاحب کا عقیدت مند بھی نہیں تھا بلکہ ان کا ذکر بعض جگہ بہت تحقیر کے رنگ میں کرتا ہے۔ چنانچہ جب سید صاحب نے افغان سرداروں سے عشر وصول کرنے کا معاہدہ کیا اور علماء نے ان سے مطالبہ کیا کہ اس میں سے ہمیں بھی حصہ ملنا چاہیئے تو ان کے اس مطالبے کے جواب میں سید صاحبؒ نے جو ارشاد فرمایا یہ مصنف اس پر یوں تبصرہ کرتا ہے کہ :۔

"خلیفہ سید احمدؒ نے جھوٹا جواب یہ دیا کہ تم سب تندرست ہو اور اکثر اراضی بیری وغیرہ بھی تمہارے قبضہ میں ہے اگر تم بھی جہاد کرو تو تم کو اس عشر میں سے کچھ مل سکتا ہے[۲]"

ظاہر ہے کہ جو مصنف سید صاحبؒ کے جواب کو جھوٹا قرار دے وہ آپ کا معتقد نہیں بلکہ شدید معاند ہی ہوگا۔

۱؎ تواریخ ہزارہ صفحہ ۲۶۷

۲؎ تواریخ ہزارہ صفحہ ۲۴۷

سید صاحبؒ کے اس معاند مصنف کی تحریر سے بھی ہمارے بدایونی مولف کے اس اعتراض کی تائید نہیں ہوتی کہ سیدؒ صاحب نے پٹھانوں کی لڑکیاں اپنے مجاہدین کے لئے نامزد کردی تھیں بلکہ اس نے اگر کچھ لکھا تو یہ کہ :-

"اسی (انہی) ایام میں (سید صاحبؒ نے) نہایت تندی سے رسم نکاح کر دیتے بے روپیہ کے جاری کردی۔ اکثر عورتوں کے نکاح ہوگئے اور یہاں تک شہرت ہوئی اگر اگر کچھ عورتیں بچ گئیں تو لشکر والوں کے ساتھ ان کے نکاح کر دیے جائیں گے[۱]۔"

اس غیر جانبدار بلکہ سیدؒ صاحب کے مخالف مصنف کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ سیدؒ صاحب کی کوشش سے افغان لڑکیوں میں سے اکثر کے نکاح نوافغان نوجوانوں سے ہوگئے۔ کچھ عورتیں باقی رہ گئی تھیں مصنف مذکور لکھتا ہے کہ ان کے متعلق یہ افواہ مشہور ہوگئی تھی کہ اگر ان کے نکاح بھی نہ کئے گئے تو ان کی شادیاں سیدؒ صاحب کے لشکر والوں سے کر دی جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ یہ مصنف کا خیال یا رائے نہیں بلکہ اس افواہ کا ذکر ہے جو مشہور کی گئی تھی اور یہ افواہ وہی افغان سردار مشہور کر سکتے تھے جن کی رسوم کے خلاف سید صاحبؒ نے پٹھان عورتوں کے نکاح بغیر روپیہ کے کروا دیئے تھے۔

ایک ہندو مورخ کی رائے

اب ذیل میں ایک ہندو مورخ منشی مہتاب سنگھ کا بیان درج کیا جاتا ہے جس نے اس علاقے میں تیس سال گزارے اور بہت سے واقعات اور جنگوں کے حالات کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ اس کا بیان ہے کہ :-

"تمام افغانانِ ملک یوسف زئیؒ از دستِ خلیفہ سید احمد تنگ آمدند باعث ایں کہ در افغاناں رسم است کہ گاہ دختر کسے کہ در افغاناں بعد بلوغ اورا بہ یک شخص کہ ہم کف و کفو و ہم مشرب خود باشد نامزد کنند داماد تا کہ یک صد ہشتاد روپیہ پیدا کردہ نیارد شادی نمی شود۔ خلیفہ سید احمد ایں را بدعت انگاشتہ در تمام ملک یوسف زئیؒ منادی کردہ کہ ہر کس شیر بہا

علاقہ یوسف زئیؒ کے تمام افغان خلیفہ سید احمد کے ہاتھوں تنگ آگئے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ افغانوں میں رسم تھی کہ جب ان میں سے کسی کی لڑکی بالغ ہو جاتی وہ اپنے خاندان اور برادری میں سے ایک شخص کے ساتھ اس کی منگنی کر دیتے لیکن جب تک وہ ایک سو اسّی روپے مہیا کر کے لڑکی والوں کو نہ دے دیتا تھا اس وقت تک لڑکی کی شادی نہیں کی جاتی تھی۔ خلیفہ سید احمد نے اسے بدعت قرار دیا اور تمام ملک یوسف زئیؒ میں منادی کرا دی کہ اپنی لڑکی کی شادی کا روپیہ قبول کرنا حرام ہے۔ صرف نکاح

---

[۱] تواریخ ہزارہ ص ۲۹۷

دختر خود خواہد گرفت برو حرام است صرف ملا نکاح خوانندہ را پنج آنہ دادہ نکاح بستانند و عورت بر خانۂ خود بیارد۔ چنانچہ صدہا دختر افغاناں کہ نامزد بودند بہ شرط عدم پیدا شدن مباخاتث بے شادی بخانۂ پدر نشستہ بودند کہ شوہراں آنہا پنج پنج آنہ نکاحانہ دادہ شادی نمودند و بخانہ خود بردند۔ اگرچہ ایں کار نیک خواہی خلائق بود اما براں کہ افغانان خوش نیامد کہ کسے زنِ افغانان بطریق طعنہ گفت کہ مالا قیمت پنج آنہ مقرر شدہ است این معنیٰ با افغانان بسیار سخت و گراں معلوم شد با خود مستورات مئودند کہ خلیفہ سید احمد شاہ در ملک باذ در حاکم شدہ پنج آنہ قیمت افغانی مقرر نمودہ ، از یں زندگی مُردن بہتر است[1]"

پڑھنے والے ملاں کو پانچ آنے دے کر نکاح پڑھوالے اور اپنی بیوی کو اپنے گھر لے آئے۔ چنانچہ اس طرح افغانوں کی سیکڑوں لڑکیاں جن کی منگنی ہو چکی تھی اور روپیہ نہ مہیا ہونے کی وجہ سے اپنے والدین کے گھر بیٹھی ہوئی تھیں ان کے شوہروں نے پانچ پانچ آنے دیکر نکاح پڑھوائے اور اپنی بیویوں کو اپنے گھر لے آئے اگرچہ مخلوق خدا کے ساتھ نیکی کا ایک کام تھا لیکن افغان لوگ اس پر ناراض ہو گئے" اور ایک افغان کی بیوی نے اسے طعنہ دیا کہ ہماری قیمت اب پانچ آنے مقرر ہوئی ہے یہ بات افغان قوم کو بہت سخت معلوم ہوئی اور وہ اپنی عورتوں سے بہ طور رنج و تاسف کہتے تھے کہ خلیفہ سید احمد شاہ ہمارے ملک میں آگیا ہے اور ہم پر حاکم بن گیا ہے۔ اس نے ہماری لڑکیوں کی قیمت پانچ آنے افغانی مقرر کی ہے ، اس زندگی سے تو موت بہتر ہے۔

ہمارے اس مسلمان بدایونی مولّف سے تو یہ ہندو مصنف زیادہ منصف مزاج ثابت ہوا جس نے نہایت فراخ دلی سے اس حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ سید صاحبؒ نے ملک یوسف زئی میں تشریف لے جا کر ایک غیر انسانی رسم کا خاتمہ کیا اس طرح انہوں نے خلق خدا کے ساتھ خیر خواہی کا فریضہ سرانجام دیا اور ایک نیک کام کیا۔ اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ سید صاحب کی کوشش سے جن افغان عورتوں کی شادیاں کرائی گئیں وہ سب افغان مردوں کے گھروں ہی گئیں، اس مصنف نے کسی ایک ایسی افغان عورت کا ذکر نہیں کیا جسے سید صاحبؒ کے حکم سے کسی ہندوستانی مجاہد یا آپ کے لشکر کے کسی قندھاری سپاہی کے حوالے کیا گیا ہو۔ اگر ایسا ایک واقعہ بھی پیش آیا تو ناممکن تھا کہ سکھ دربار کا یہ مورخ اس کا ذکر نہ کرتا۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ افواہ

---

[1] تاریخ منشی مہتاب سنگھ (قلمی) صہ ۸۹ تا صہ ۹۰

سید صاحب کو بدنام کرنے کے لئے مشہور کی گئی ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ سید صاحبؒ کی یہ معاشرتی اصلاح اس علاقے کے لوگوں کو ناگوار گذری اور اس کی وجہ سے بھی ان کے خلاف بعض افغانوں میں غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔ سرداران پشاور نے اس سے فائدہ اٹھایا اور طرح طرح کی افواہیں مشہور کر کے افغان عوام کے جذبات مشتعل کئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بقول مصنف "تواریخ ہزارہ" یہ رسم بے روپیہ نکاح کر دینے کی اس ملک کے پٹھانوں کو ناگوار ہوئی اور اندر سے دل ہر ایک کا ان سے بالکل پھر گیا اور منتظر وقت کے رہے[1]۔"

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت کی افغان قوم اپنے جاہلانہ رسوم و رواج میں کتنی سخت تھی کہ سید صاحبؒ اس کی فلاح و بہبود میں کوشاں تھے۔ اس کو غیر انسانی رسوم کی زنجیروں سے آزاد کر رہے تھے اور یہ قوم آپ کی ممنون ہونے کی بجائے آپ کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔

علما کی مخالفت

سید صاحبؒ کی مخالفت اور ناکامی کی تیسری وجہ علمائے سوء کی افسوسناک روش تھی۔ سید صاحب کے صوبہ سرحد تشریف لے جانے سے قبل وہاں ملاؤں کی اجارہ داری قائم تھی اور صرف طلب زر کی خاطر وہ ہزاروں امر کو بھی جائز قرار دے دیتے تھے۔ اس طرح ان کی اجارہ داری کو بھی نقصان نہ پہنچتا تھا اور افغان سرداروں کو بھی مذہب کی آڑ میں من مانی کاروائیاں کرنے کی پوری آزادی تھی۔ اس طرح "باہمی اشتراک" سے دونوں کا کام چل رہا تھا۔

جب سید صاحبؒ نے صوبۂ سرحد تشریف لے جا کر ان قبیح رسوم کا قلع قمع کیا اور خالص اسلامی نظام رائج کیا تو جہاں افغان سرداروں کی عیش و عشرت اور خلافِ اسلام حرکات پر پابندی لگ گئی وہاں ملاؤں کی اجارہ داری بھی ختم ہو گئی۔ اس صورتِ حال سے وہ سخت دل برداشتہ ہوئے اور آپ کے خلاف افغانوں کو گمراہ کرنے لگے چنانچہ ایک مصنف کا بیان ہے کہ:۔

"جب خلیفہ سید احمدؒ نے بیت المال قائم کر دیا اور اس میں غلہ جمع ہونے لگا تو علما خلیفہ سید احمد کے پاس آئے اور بیان کیا کہ یہ عشر ہمارا حق ہے ہم کو ملے کیونکہ ہم سب ان عشر دینے والوں کو رسوم اسلام کے سکھاتے ہیں اور لڑکا تولد ہوتا ہے تو اذان اس کے کان میں دیتے ہیں جب بالغ ہو جاتا ہے تو نماز روزہ سکھاتے ہیں۔ نکاح ان کے کرتے ہیں۔ مرجاتا ہے تو جنازہ کفن دفن ان کا

---

[1] تواریخ ہزارہ صہ۲۹۷

مطابق احکام شرعی کے کرتے ہیں۔ خلیفہ سید احمدؒ نے جواب یہ دیا کہ تم سب تندرست ہو اور محنت کر سکتے ہو اور اکثر اراضی سیری وغیرہ بھی تمہارے قبضے میں ہیں۔ اگر تم بھی جہاد کرو تو تم کو اس عشر سے کچھ مل سکتا ہے۔ علماء نے جواب دیا کہ ہم جہاد اکبر کر رہے ہیں۔ مساجد میں بیٹھ کر علم کی تعلیم کرتے ہیں اور لوگوں کو دین سکھاتے ہیں۔ اپنا نفس مارتے ہیں سوائے شغلِ علم کے سب لذات دنیا کے ترک کئے ہوئے ہیں یہ جہاد ظاہری جہاد سے بڑا ہے۔ اس کا جواب بھی خلیفہ سید احمد نے وہی دیا کہ جب تک ظاہری جہاد نہ کرو کچھ نہ ملے گا۔ چونکہ اس وقت غلبہ سید احمد کا ہو گیا تھا، علماء کو سوائے خاموشی کے اور کوئی چارہ نہ ہوا گو زبان تو خاموش رہی مگر دل سینوں میں بول گیا اور منتظرِ وقت ہو بیٹھے اور اندر اندر پشاور و صوابھ (سوات) اور دور دور تک اس نارضامندی سے دل کی شہرت ہو گئی[2]"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری بدایونی مولف نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور علماء کے درمیان جس مذہبی اختلاف کا ذکر کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ کے غلط عقائد کی وجہ سے صوبہ سرحد کا مذہبی طبقہ آپ کے خلاف ہو گیا تھا ان کی حقیقت مذہبی ہرگز نہ تھی بلکہ یہ اختلاف "پیٹ" کی خاطر تھا۔ علماء سید صاحب سے عشر میں اپنا حصہ مانگتے تھے۔ سید صاحبؒ انہیں یہ حصہ دینے کو تیار تھے مگر آپ کی طرف سے شرط یہ تھی کہ صرف مسجد میں بیٹھ کر لوگوں کو مسائل سکھانے پر اکتفا نہ کرو بلکہ مردِ میدان بن کر نکلو اور جہاد میں حصہ لو۔ علماء کہتے تھے کہ ہم اس سے بڑے جہاد کر رہے ہیں، اس جہاد کی انہوں نے جو تشریح کی وہ یہ تھی کہ بچہ کی پیدائش کے وقت اس کے کان میں اذان دینا جب بچہ بلوغت کو پہنچ جائے تو اسے دینی مسائل سکھانا، شادی کے وقت نکاح کی رسم ادا کرنا اور جب جسم اور روح کا رشتہ منقطع ہو جائے تو مردے کو غسل و کفن دے کر قبر میں اتار دینا یہ تھا وہ "جہادِ اکبر" جس کا معاوضہ وہ سید صاحبؒ سے طلب کر رہے تھے، اگر سید صاحبؒ انہیں ان امور کا معاوضہ ادا کر دیتے تو ان کے اور علماء کے درمیان کوئی اختلاف رونما نہ ہوتا، لیکن سوال یہ ہے کہ جو شخص خود میدانِ عمل میں اترا تھا اس کے ساتھیوں میں علمائے سرحد سے کہیں زیادہ بڑے پایے کے علماء تھے مگر ان میں سے کوئی کان میں اذان دینے یا مردوں کی تجہیز و تکفین کا معاوضہ وصول نہیں کرتا تھا بلکہ وہ سب اسلام کی سربلندی کی خاطر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اور سر سے کفن باندھ کر میدانِ کارزار میں کھڑے تھے، ان لوگوں سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی تھی کہ وہ مُردوں کے نہلانے کا معاوضہ ادا کرتے اور اس قسم کی خدمات کی وجہ سے علماء کو عملی خدمات سے مستثنیٰ کر دیتے۔ سید صاحبؒ کی رائے میں اسلامی معاشرہ میں ایسے کسی طبقے کا وجود نہیں جو چند

---

[1] یہاں مصنف نے سید احمد صاحبؒ کے جواب کے ساتھ لفظ "جھوٹا" استعمال کیا ہے (مولف)

[2] تواریخ ہزارہ صد ۲۷

اسلامی مسائل کے علاوہ کوئی عملی کام نہ کرے اور عشر میں سے حصہ طلب کرے۔ پھر وہ عام حالات بھی نہ تھے کہ علماء مساجد میں بیٹھے درس دیتے رہتے اور گھر بیٹھے انہیں دونوں وقت کی روٹی پہنچتی رہتی۔ یہ عرصہ جنگ تھا۔ ایک ظالم اور مسلم کش حکومت سے مقابلہ درپیش تھا۔ سید صاحبؒ چاہتے تھے کہ اس وقت ہر مسلمان تلوار لے کر میدانِ کارزار میں نکل آئے اور پوری طاقت سے دشمن پر حملہ کر دے تاکہ اسلام کو غلبہ نصیب ہو اور اسلامی شہر سکھوں کے تسلط سے آزاد ہو جائیں۔ مگر علماء نے سید صاحب کی یہ دعوت قبول نہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ سید صاحبؒ اور علماء کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا جسے بدایونی مولف نے عقائد کے اختلاف کا نام دیا ہے۔ ان علماء نے سید صاحبؒ کے غلبہ کی وجہ سے بظاہر تو کوئی قدم نہ اٹھایا مگر پوشیدہ طور پر آپ کی مخالفت شروع کر دی۔ آپ سے وہ عقائد منسوب کئے جن سے آپ کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ پشاور سے سوات تک علماء میں ناراضگی پیدا ہو گئی اور اس کی دور دور تک شہرت ہو گئی۔ انہی لوگوں نے سکھوں کے ایما اور سردارانِ پشاور کی شہ پر آپ کے خلاف کفر کے فتوے دیئے۔ یہ فتوے پشاور سے بالاکوٹ اور کاغان تک تقسیم کئے گئے۔ ان فتووں نے صوبہ سرحد کے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو آپ کے خلاف مشتعل کر دیا۔

خلاصۂ واقعات

گویا سید صاحبؒ کی ناکامی کے تین بڑے سبب تھے اول یہ کہ سردارانِ پشاور اور ان کے حلیف سرداروں نے محسوس کیا کہ آپ کے جاری کردہ شرعی نظام میں ان کی آزادی پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ ان کی خود ساختہ رسم و رواج میں مداخلت کی گئی ہے۔ ان کی تعیش پسندانہ زندگی پر پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں ان سے اسلام کے مقرر کردہ اصول کے مطابق عشر وصول کیا جا رہا ہے جب کہ اس سے قبل وہ اپنی مرضی کے مطابق جتنا غلہ چاہتے تھے علماء کو دے دیتے تھے اور اسے صدقہ و خیرات سمجھتے تھے۔ دوسری طرف سکھوں نے ان پر دباؤ ڈالا کہ سید صاحب کو قتل کر دو اور علاقہ یوسف زئی پر قبضہ کر لو۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آپ کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی اور سردارانِ پشاور سکھوں کے آلۂ کار بن گئے۔

سید صاحبؒ کی مخالفت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ نے افغانوں کی ایک دیرینہ رسم کا خاتمہ کر دیا جس کے تحت کوئی لڑکی اس وقت تک رخصت نہیں کی جاتی تھی جب تک کہ اس کا ہونے والا شوہر ایک مقررہ رقم لڑکی والوں کو ادا نہیں کر دیتا تھا۔ اس غیر انسانی رسم کے خاتمے نے سید صاحبؒ کے خلاف بے اطمینانی اور ناراضگی کی فضا پیدا کر دی اور افغان سرداروں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر افغان عوام کے

جذبات کو مشتعل کیا۔

آپ کی مخالفت کی تیسری وجہ علماء سو کی افسوسناک روش تھی جنہوں نے محض پیٹ کی خاطر پٹھانوں کو گمراہ کیا۔ آپ کے خلاف کفر کے فتوے دیئے اور ان کے دلوں میں سید صاحبؒ کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات ابھارے۔ ان اسباب نے مل کر ایسی افسوسناک صورت پیدا کردی کہ سید صاحبؒ کی تحریک ناکام ہوگئی آپ کے سیکڑوں ساتھی شہید ہوگئے اور آخر کا خود آپ بھی اپنے وطن سے ہزاروں میل دور بالاکوٹ کی سرزمین کو اپنے خون سے لالہ زار بنا کر ابدی نیند سو گئے۔

سیّد صاحبؒ کا رُخِ جہاد

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرت سیّد احمد شہیدؒ نے سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر نہایت سوز مظالم کی لرزہ خیز داستانیں سن کر اس ظالم اور درندہ صفت حکومت کے خلاف جہاد کا عزم فرمایا . . . .
اور رائے بریلی سے روانہ ہو کر ہزاروں میل کا فاصلہ طے کرتے ہوئے علاقہ یوسف زئی میں تشریف لے گئے اور عمر کا بقیہ حصہ اسی سعئ بلیغ میں صرف کر دیا کہ ان علاقوں کے مظلوم مسلمانوں کو سکھوں کے ظلم وستم سے نجات مل جائے۔ اس کوشش میں آپ نے اپنی اور اپنے سیکڑوں رفقاء کی جانیں تک قربان کر دیں۔ یہ ایسی صداقت ہے جس کا اعتراف مسلم اور غیر مسلم دونوں نے کیا۔ اور آپ کی حیات سے لے کر آپ کی شہادت تک بلکہ اس کے بعد سال ہا سال تک کسی نے اشارۃً بھی اس حقیقت سے اختلاف نہیں کیا۔ چنانچہ سر سید احمد خاں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو زبان میں سب سے پہلے حضرت سیّد صاحبؒ کی شخصیت اور آپ کے کارناموں پر اظہار خیال کیا۔

سر سیّد کی رائے

سیّد صاحبؒ کے اس سب سے پہلے تذکرہ نگار نے جس کا زمانہ بھی نسبتاً سید صاحبؒ کے زمانے سے قریب کا تھا آپ کے رُخِ جہاد کا تعین کرتے ہوئے واضح الفاظ میں لکھا کہ :۔

> "جو اطلاع سیّد احمدؒ صاحب نے مسلمانوں کو دی تھی وہ صرف اس بات کی تھی کہ وہ سکھوں پر جہاد کرنے کے لئے آمادہ ہوں"[1]

سر سیّد نے یہ تحریر نومبر ۱۸۷۱ء میں لکھی تھی یعنی ابھی سیّد صاحبؒ کے واقعہ شہادت پر صرف چالیس سال کا زمانہ گزرا تھا۔ سر سید مرحوم کے قریبی زمانے میں فارسی زبان کے ایک مصنف و مورخ پیر غلام حسن نے اپنی کتاب "تاریخ حسن" میں بھی سیّد صاحبؒ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس فاضل مصنف نے بھی سید صاحبؒ کے

---

[1] مقالاتِ سر سید ص ۱۶۷ جلد نہم

جہاد کا رخ صرف سکھوں کی طرف قرار دیا چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

پیر غلام حسن کی رائے

"فوجِ کثیر فراہم آوردند بہ نیتِ غزا با فوجِ رنجیت سنگھ در حدودِ پشاور و ڈیرہ غازی خاں و ہزارہ بارہا مقابلہ نمودند عاقبت ہمہ ہا در بالاکوٹ حدودِ پشاور مقتول شدند"[1]

(سید صاحبؒ نے) رنجیت سنگھ کی فوج سے جنگ کرنے کی نیت سے بہت بڑی فوج جمع کی اور پشاور ڈیرہ غازی خاں اور ہزارہ کی حدود میں (رنجیت سنگھ کی فوج سے) متعدد بار مقابلہ کیا۔ آخر کار حدودِ پشاور کے مقام بالاکوٹ میں جاں بحق ہوئے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد نصف صدی تک نہ صرف عام لوگوں بلکہ برصغیر کے بڑے بڑے مصنفوں اور مورخوں کی تحقیق بھی یہی تھی کہ سید صاحبؒ کے جہاد کا رخ صرف اور صرف سکھوں کی طرف تھا اور انہی کے استیصال کے لئے آپ نے ہزاروں میل کا سفرِ دور دراز اختیار کر کے آہن گداز مصائب برداشت کئے لیکن افسوس کہ بعد میں بعض سیاسی مقاصد کے تحت سید صاحبؒ کی مساعی کا رخ اس جانب موڑ دیا گیا جو سمت آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس بدعت کا آغاز اس وقت ہوا جب برصغیر میں آزادی کی تحریکوں نے جنم لیا۔ سیاسی رہنماؤں نے عوام میں عزت و تکریم حاصل کی اور انگریزوں کے خلاف بغاوت میں حصہ لینا عظمت کا سبب ٹھہرا۔ یہ دیکھ کر ہمارے بعض تذکرہ نگاروں اور مورخوں نے حضرت سید احمد صاحب کی عظمت کو چمکانے کے لئے آپ کو بھی اسی صف میں لا کھڑا کیا اور سید صاحب کو انگریزوں کا مدِمقابل ثابت کرنے کے لئے ایسے بعید از قیاس دلائل پیش کئے کہ اہلِ نظر انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان محترم حضرات نے یہ موقف اختیار کیا کہ سید صاحب دراصل انگریزوں سے جنگ کرنا چاہتے تھے سکھ تو یونہی درمیان میں آ گئے۔

اگر واقعہ یہی ہوتا اور سید صاحبؒ نے انگریزوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا ہوتا تو ہم اس کا کبھی انکار نہ کرتے کیونکہ تاریخی حقائق کا انکار کرنا بہت بڑا اور ناقابلِ معافی جرم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ کہنے کی بھی اجازت چاہیں گے کہ بالکل اسی طرح تاریخ کا چہرہ مسخ کرنا بھی جرم اور ناقابلِ معافی جرم ہے کسی شخصیت کی حقیقی عظمت یہی ہے کہ اس سے وہی کارنامے منسوب کئے جائیں جو اس نے سرانجام دیئے ہوں لیکن یہ امر اس کی عظمت کو داغدار کرنے کا موجب ہوتا ہے کہ اس کی دستارِ عظمت میں وہ گہر ٹانک دیئے جائیں جو اس کا حصہ نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی حقیقی عظمت بھی اس مبالغہ آرائی کے ہاتھوں مشکوک ہو جاتی ہے۔ افسوس کہ سید صاحبؒ کے

---

[1] تاریخ حسن جلد ۲ ص ۲۱۰ حصہ اول مرتبہ پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ سابق اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ پبلی ڈیپارٹمنٹ حکومت جموں حال پرنسپل پی ۔ ایف کالج پشاور

ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا اور انہیں انگریزوں کا مدمقابل ثابت کرنے کی کوشش میں غلط نگاری اور مبالغہ آرائی دونوں کا سہارا لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے ایک مخالف و متعصب ناقد کو آپ پر یہ پھبتی کسنے کا موقع مل گیا کہ:

"سید صاحبؒ کے جہاد کا رُخ نگاہِ نازنین کی طرح ہر طرف ہے۔"

حالانکہ سید صاحب کے جہاد کا رخ نگاہِ نازنین کی طرح ہر طرف نہیں بلکہ ایک مردِ میدان کی طرح صرف ایک طرف تھا اور وہ سمت تھی سکھوں کی ظالمانہ و مسلم کش حکومت۔ سب سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ سید صاحبؒ کو انگریزوں کا مدمقابل ثابت کرنے والوں نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ اگر آپ نے انگریز کے خلاف جہاد کرنے کا منصوبہ بنایا ہوتا تو یہ ہوشیار اور چالاک قوم کبھی اس سے بے خبر نہ رہتی اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ سید صاحبؒ نے اپنے منصوبہ کو انتہائی احتیاط سے پوشیدہ رکھا تو آپ کی شہادت کے بعد آپ کا یہ منصوبہ انگریزوں سے پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا جب کہ آپ کے بعض عقیدت مند انگریز سے مصالحت کر چکے تھے اور بعض حضرات جیسے مولوی محبوب علی انگریز سے جہاد کرنے کے خلاف فتویٰ بھی دے چکے تھے۔ اگر سید صاحبؒ کا منصوبہ انگریز سے جہاد کرنے کا ہوتا تو ان اصحاب سے انگریزوں کو آپ کے منصوبہ کا علم ہو جاتا اور آپ کے بعد کے انگریز مورخ و مصنف اس منصوبہ سے آگاہ ہو کر ضرور اپنی کتابوں میں اس کا تذکرہ کرتے مگر یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ انگریز مصنفوں کی تاریخیں انگریزوں کے خلاف سید صاحبؒ کے اس منصوبے کے ذکر سے قطعاً خالی ہیں۔

ولیم۔ ولسن۔ ہنٹر کی رائے

ولیم۔ ولسن ہنٹر بنگال کا بہت مشہور آئی سی ایس افسر تھا۔ "دی انڈین مسلمانز" اس کی مشہور کتاب ہے اس کتاب میں اس انگریز افسر نے سارا زور حضرت سید صاحبؒ کی تحریک کی مخالفت پر صرف کر دیا ہے۔ اس نے آپ کو وہابی کا خطاب دیا اور آپ کی تحریک کو وہابیت سے موسوم کیا۔ سید صاحبؒ کو ڈاکو، لٹیرا، چالباز غرض ہر اس خطاب سے نوازا جس سے ایک "بُرے" آدمی کو نوازا جا سکتا ہے۔ اس نے سید صاحبؒ کی پیدائش سے لیکر آپ کی تعلیم، نواب امیر خاں سے وابستگی، آپ کی تحریکِ اصلاح و جہاد، سکھوں اور افغانوں سے جنگیں اور آپ کی شہادت تک ہر قابلِ ذکر واقعہ کا ذکر کیا ہے اور ان واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ کے مرتبہ کو جس قدر گرا سکتا تھا گرایا مگر اس نے اپنی اس کتاب میں اشارۃً بھی سید صاحبؒ کے جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف قرار نہیں دیا۔ حالانکہ اس کی کتاب کی تصنیف کا اصل مقصد ہی حکومت برطانیہ اور اس کے دوستوں کو اس خطرے سے باخبر کرنا تھا جو شمال مغربی صوبہ سرحد پر ان باغیوں کی صورت میں ابھر رہا تھا جن کے متعلق ہنٹر کہتا ہے کہ یہ سید صاحبؒ کے بقیۃ السیف

مجاہد ہیں۔ اس صورت میں تو اس کے لئے اور بھی ضروری تھا کہ وہ پہلے سید صاحبؒ کو انگریزوں کا مخالف ظاہر کرتا اور دلائل سے ثابت کرتا کہ ان کا منصوبہ دراصل انگریزوں سے جہاد کرنے کا تھا سکھ تو اتفاقاً میدان میں آگئے۔ اس کے بعد سرحد (ستھانہ اور امبیلا) کے باغی مسلمانوں کے متعلق یہ ثابت کرنا آسان تھا کہ وہ اپنے مذہبی عقیدہ اور اپنے امام (حضرت سید صاحبؒ) کی تعلیم کے مطابق انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کو فرضِ عین سمجھتے ہیں۔ سید صاحبؒ کو انگریزوں کا مدمقابل ثابت کرنے کے بعد اس کے لئے یہ امر نہایت آسان ہو جاتا کہ وہ ہندوستان میں مقیم لاکھوں مسلمانوں کو بھی جو سید صاحبؒ کے عقیدت مند تھے انگریزوں کی نگاہ میں حکومت کا باغی ثابت کر دیتا مگر اپنی تمام کوشش کے باوجود اسے انگریزوں کے خلاف سید صاحبؒ کے کسی منصوبہ کا سراغ نہ مل سکا۔ حالانکہ تمام سرکاری رپورٹیں، سراغ رسانوں کی اطلاعات مختلف اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں، کمشنروں اور متعدد مقدمات کی نگرانی کرنے والے انگریز افسروں کی جملہ دستاویزات اس کے سامنے تھیں ان سب سے اس نے استفادہ کیا۔ ہزاروں صفحات کے مطالعے اور طویل چھان بین کے باوجود اسے سید صاحبؒ کے اس منصوبے کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا جو آج کے بعض مورخ و محقق پیش کر رہے ہیں حالانکہ اس کا زمانہ سید صاحبؒ کے زمانے سے نسبتاً قریب کا ہے یعنی سید صاحبؒ کی شہادت پر ۴۰ سال گزرے تھے جب اس نے (۲۳ جون ۱۸۷۱ء کو) اپنی کتاب مکمل کی۔ ظاہر ہے کہ ۱۰، ۸ سال اس نے چھان بین میں صرف کئے ہوں گے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس نے سید صاحبؒ کی شہادت کے کم و بیش ۳۰ سال بعد اپنے تحقیقی کام کا آغاز کیا جب کہ ابھی ایسے بہت سے لوگ بقیدِ حیات تھے جنہوں نے براہ راست سید صاحب سے بیعت کی تھی اور بعض ایسے لوگ بھی زندہ تھے جو سید صاحبؒ کے ساتھ متعدد جنگوں میں شریک رہے مگر ان مستند ذرائع معلومات کے باوجود ہنٹر جو کچھ لکھ سکا وہ یہ ہے :-

"۱۸۲۴ء میں (سید صاحبؒ) سرحد پشاور کے غیر مہذب کوہستانی قبائل میں نمودار ہوئے۔ اس علاقے میں پہنچ کر انہوں نے سکھ حکومت کے خلاف مقدس جنگ (جہاد) کی تلقین شروع کی۔ پٹھان قبائل میں ان کی دعوت کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ انہوں نے پہاڑی قبائل کے سوجھ بوجھ رکھنے والے سرداروں کو اس خطرے کے سدباب کی طرف متوجہ کیا جو ان کے پڑوس میں سکھ طاقت کی صورت میں روز بروز بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے ایک فرمان جاری کیا۔ اس فرمان میں کہا گیا تھا کہ "سکھ قوم ایک عرصے سے لاہور اور دوسرے متعدد علاقوں پر قابض ہے۔ ان کا ظلم و ستم حد سے تجاوز کر چکا ہے۔ ہزارہا بے گناہ مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا جا چکا ہے۔ ہزاروں کو بے عزت اور رسوا کیا گیا ہے۔ مساجد میں اذان دینا ممنوع ہے۔ گاؤ کشی قطعی طور پر روک دی گئی ہے۔ آخر ان کے ظلم و ستم کو مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت پا کر سید احمد نے اسلام کی حفاظت و

سربلندی کی خاطر مخلصین کی مختصر سی جماعت کے ہمراہ کابل اور پشاور کا سفر اختیار کیا اور وہاں کے مسلمانوں کو جو خواب غفلت میں مدہوش پڑے تھے جنجھوڑا۔ اس مقصد میں انہیں کامیابی ہوئی اور یہاں کے مسلمانوں میں جذبہ ہمت وجرأ بیدار ہو گیا۔ ہزار ہا مسلمان ان کی دعوت پر اٹھ کھڑے ہوئے اور راہ خدا میں اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ واضح ہو کہ ۲۱ر دسمبر ۱۸۲۶ء (مطابق ۲۰ر جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ) کو جہاد کا آغاز کر دیا جائے گا۔[۱]

یہ سارا بیان بلکہ ہنٹر کی ساری کتاب پڑھ جائیے، اس میں کہیں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ ہنٹر سید صاحب کو انگریزوں کا مدمقابل سمجھتا تھا۔ اگر وہ کسی نتیجے تک پہنچا تو وہ صرف یہ تھا کہ سید صاحب نے تعلیم اور عسکری تربیت کے مرحلے طے کر کے ملک گیر دورے کئے، مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کی، انہیں سکھوں سے جہاد کے لئے آمادہ کیا اور پھر مختصر سی جمعیت لے کر صوبہ سرحد روانہ ہو گئے پشاور کی حدود میں پہنچ کر انہوں نے افغانوں میں جہاد کی تحریک کی، انہیں ان کے پڑوس میں ابھرتی ہوئی زبردست سکھ طاقت کے خطرے سے آگاہ کیا اور پھر باقی ساری عمر سکھوں کا قلع قمع کرنے کی کوشش میں گزار دی۔

یہ ہے اس انگریز کی تحقیق کا نچوڑ جس نے سید صاحبؒ کا قریبی زمانہ پایا تھا اور جو ان کا سب سے پہلا غیر ملکی ناقد اور تذکرہ نگار تھا۔ ہر منصف مزاج شخص اس کا بیان پڑھ کر یہی نتیجہ نکالے گا کہ سید صاحب کا شدید مخالف ہوتے ہوئے اور انہیں مختلف طریقوں سے بدنام کرنے کے باوجود وہ سید صاحبؒ کو انگریزوں کا مدِمقابل ثابت نہ کر سکا بلکہ اس کے ذہن کے کسی گوشہ میں یہ خیال تک نہ آیا۔

اولف کیرو کی رائے

سید صاحبؒ کا دوسرا انگریز تذکرہ نگار سر اولف کیرو ہے جو عرصہ تک صوبہ سرحد کا گورنر رہا اور جس نے طویل تحقیق کے بعد افغانوں کے قبائل ان کی تہذیب و تمدن اور ان کی جنگوں پر "دی پٹھانز" کے نام سے ایک مبسوط کتاب سپردِ قلم کی۔ اپنی اس تحقیقی کتاب میں اس نے ایک باب سید صاحب کے متعلق بھی لکھا ہے جس کا عنوان ہے۔ "سید احمد بریلوی اینڈ دی سکھس" اس باب میں اس نے سید صاحبؒ اور ان کی تحریک کے عروج و زوال کی داستان قلمبند کی ہے مگر اس نے بھی سید صاحبؒ کے کسی ایسے منصوبہ کا تذکرہ نہیں کیا جس کا مقصد انگریزوں سے جہاد کرنا تھا۔ اولف کیرو نے ان کی تحریک کا جائزہ لے کر جو نتیجہ نکالا وہ یہی تھا کہ سید صاحبؒ کا جہاد سکھوں کے خلاف تھا۔ چنانچہ اس کا بیان ہے کہ:۔

---

[۱] دی انڈین مسلمانز صہ ۳ مصنفہ ولیم ولسن، ہنٹر مطبوعہ دی پریمئر بک ہاؤس کچہری روڈ لاہور

"اب جو مصلح ظاہر ہوا وہ سکھوں کی نئی قائم شدہ طاقت کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا اور وہ اس قابل تھا کہ ظالم کے ماتحت زندگی گزارنے والے مظلوم مومنوں کو متحد کر کے ان کافروں کے خلاف صف آرا کر دے۔ اس مجاہد کا نام سید احمد شاہ تھا۔"[1]

اگر اس انگریز مصنف کو ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا کہ سید صاحبؒ کی تحریک کا اصل مقصد انگریزوں سے جہاد کرنا تھا تو ناممکن تھا کہ وہ اس کا تذکرہ نہ کرتا۔ اس خاصے طویل باب میں اس نے سید صاحبؒ کی تحریک کے ہر پہلو کا جائزہ لیا مگر اس طرف خفیف سا اشارہ بھی نہ کیا کہ سید صاحب کے جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف تھا بلکہ اگر کچھ لکھا تو یہ کہ سید احمد شاہ نے سکھوں کی ظالمانہ حکومت کے تحت اذیت ناک زندگی گذارنے والے مومنوں کو متحد کر کے ان کافروں کے خلاف صف آرا کیا۔

مولانا جعفر تھانیسری کی شخصیت

حضرت سید صاحبؒ کے عقیدت مندوں میں مولانا محمد جعفر تھانیسری بڑے پائے کے شخص گذرے ہیں۔ اردو زبان میں سید صاحب پر سب سے پہلی مستقل کتاب "سوانح احمدی" انہی جعفر تھانیسری کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اور اس کے مستند ہونے کا اندازہ لگانے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ بعد کے مصنفوں اور سید صاحبؒ کے تذکرہ نگاروں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس نے مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب "سوانح احمدی" سے استفادہ نہ کیا ہو۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ان کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو مصنف کے زمانے میں موجود تھیں مگر اب کمیاب ہیں یا بالکل ناپید ہو چکی ہیں۔ مولانا جعفر تھانیسری نے اپنی کتاب میں بیسیوں مقامات پر اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ سید صاحبؒ کا جہاد سکھوں سے تھا۔ انگریزوں سے نہ صرف یہ کہ ان کا جہاد نہیں تھا بلکہ ان کے خلاف جہاد کرنے کو وہ بلوہ قرار دیتے تھے اور اسے کتاب و سنت کے منافی سمجھتے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اس فاضل اور معتبر ترین مورخ کے ان بیانات کے بعد یہ حقیقت تسلیم کر لی جاتی کہ سید صاحبؒ انگریزوں سے نہیں بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کا عزم لے کر اٹھے تھے مگر ہوا یہ کہ ہمارے بعض فاضل مہربانوں نے سرے سے مولانا جعفر تھانیسری کی مستند حیثیت ہی کو مشتبہ قرار دیدیا اور ان پر تحریف کا الزام عاید کیا۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ مولانا تھانیسری کے حقیقت پر مبنی بیانات ان فاضل محققوں کے مفروضات کے خلاف جا رہے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے ایسی جسارت کسی نے نہ کی اور مولانا جعفر تھانیسری کو نہ صرف سید صاحبؒ کا مستند تذکرہ نگار بلکہ ان کا عاشق صادق اور فدائی قرار دیا گیا۔ چنانچہ ہمارے زمانے کے ایک فاضل مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنی ایک معرکتہ الآرا کتاب میں

---

[1] "دی پٹھانز" صفحہ ۳۰۱ مولفہ اولف کیرو۔ مطبوعہ لندن ۱۹۶۲ء

مولانا جعفر تھانیسری کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا :۔

"منشی محمد جعفر تھانیسری عمر ۲۸ سال (یہ عمر اس وقت تھی جب ان پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا تھا) ساکن تھانیسر ضلع انبالہ تمام اسیران بلا میں یہ سب سے زیادہ ہوشیار اور معاملہ فہم تھے۔ پورے مقدمے کے دوران میں انہوں نے کوئی وکیل نہیں مقرر کیا اور بڑی قابلیت کے ساتھ گواہوں پر جرح کی۔ مولوی عبدالرحیم صاحب کے ساتھ یہ بھی رہا ہوئے اور ایک عرصہ آزاد رہ کر ۱۹۰۵ء میں رحلت کی۔ سید صاحبؒ کی قائم کی ہوئی جماعت میں یہی ایک ذمہ دار آدمی ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کی"[1]

پھر آگے چل کر فاضل مولف نے مولانا جعفر تھانیسری کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ان پانچ بزرگوں میں سے تھے جو :۔

"تمام ابتلاء و آزمائش میں ثابت قدم رہے اور اپنی
ثابت قدمی سے عہدِ صحابہ کی یاد تازہ کردی"[2]

غور کرنے کا مقام ہے اور کتنے ستم کی بات ہے کہ "سید صاحبؒ کی قائم کی ہوئی جماعت کے ایک ذمہ دار رکن" اور "عہد صحابہ کی یاد تازہ کرنے والے بزرگ" کو جعل ساز قرار دیا گیا اور اس پر تحریف کا الزام عاید کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ثباتِ قدم اسی کا نام ہے، صحابہ ایسے ہی ہوتے تھے اور ان کے عہد کی یاد اسی قسم کے لوگوں سے عبارت ہے جو شخص آہن گداز مصائب و آلام میں بھی ثابت قدم رہا۔ وہ کسی مصلحت یا ذاتی مفاد کی خاطر اپنے امام و مرشد کی تحریروں میں تحریف کا کیسے مرتکب ہو سکتا تھا۔

ہمارے عہد کے ایک فاضل مولف جناب محمد ایوب قادری مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب "تواریخ عجیب" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد جعفر (جماعت مجاہدین) کے خاص رازدار تھے جس کے نتیجے میں انہوں نے خوفناک تکلیفیں اٹھائیں، گھر بار لٹایا، ہزاروں کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد سے محروم ہوئے، بیوی بچوں کو چھوڑا، عزت و دولت سے محروم ہوئے، زندگی کے بہترین اٹھارہ سال جنگلوں اور پہاڑوں (جزائر انڈمان) میں قیدی کی حیثیت سے گذارے"[3]

---

[1] ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص۱۴۱ مولفہ مولانا مسعود عالم ندوی۔ مطبوعہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن

[2] ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص۱۴۳ [3] تواریخ عجیب ص۵۲-۵۱ مرتبہ محمد ایوب قادری

اس کے بعد ہمارے فاضل دوست کا یہ کہنا کہ مولانا جعفر تھانیسری نے پولیس کی نگرانیوں سے گھبرا کر اپنے (ذاتی) مقصد کے حصول کے لئے سید احمد شہیدؒ کے بعض مکاتیب کی عبارتیں بدل دیں اتنی بڑی زیادتی اور بے انصافی ہے کہ اس پر سوائے انا للہ پڑھنے کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ جس شخص نے خوفناک تکلیفیں اٹھائیں۔ گھر بار لٹا یا۔ ہزاروں کی منقولہ وغیر منقولہ جائداد سے ہاتھ دھوئے۔ بیوی بچوں کو چھوڑا۔ عزت و دولت سے محروم ہوا اور اپنی زندگی کے بہترین اٹھارہ سال انڈمان کے جنگلوں میں قیدی کی حیثیت سے گذار دیئے مگر اس کے پائے ثبات میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی لیکن جب وہ اس بھٹی سے کندن بن کر نکل آیا اور سارے مصائب و آلام کا خاتمہ ہو گیا تو صرف پولیس کی نگرانی کے خوف سے اس نے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا۔ کیا کوئی عقلمند یہ بعید از عقل بات تسلیم کرے گا۔

جعفر تھانیسری کی انگریز دشمنی

یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا جعفر تھانیسری انگریزی حکومت کی پالیسی سے متفق نہ تھے۔ اسی اختلاف نے انہیں حکومت کے خلاف وہ اقدام کرنے پر مجبور کیا جس نے انہیں پھانسی کی کوٹھری میں پہنچا دیا۔ واپسی پر انہوں نے دو ایسی کتابیں لکھیں جن میں انگریزوں کو جارح اور ظالم قرار دیا۔ اگر انہیں حکومت کی خوشنودی حاصل کرنی ہوتی تو ایسی سخت قید کاٹنے کے بعد وہ اپنا رویہ تبدیل کر لیتے اور بقیہ ساری زندگی حکومت کے گن گانے میں گذار دیتے مگر انہوں نے اس کے برعکس روش اختیار کی چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب "تواریخ عجیب" کا آغاز جن الفاظ سے کیا وہ یہ ہیں:۔

"اخیر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲۸۰ھ ہجری میں سرحد ہند پر ملک یاغستان میں خود سرکار انگریزی کی زبردستی سے ایک جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جنرل چیمبرلین صاحب اس جنگ کے سپہ سالار تھے۔ امبیلے کی گھاٹی میں جا کر فوج سرکار کو بہت تکلیف ہوئی۔ بیگانے ملک میں سرکار کی مداخلت بے جا کے سبب ملا عبدالغفور صاحب اخوند سوات بھی اپنے بہت سے مریدوں کو ساتھ لے کر آموجود ہوئے۔ ملکی خوانین اور افغان چاروں طرف سے اپنے بچاؤ کے واسطے مقابلہ سرکار پر ٹوٹ پڑے۔ قافلہ مجاہدین جن کی سرکوبی اور نیست و نابود کرنے کو ہماری سرکار چڑھی تھی الگ رہ گیا مگر بدعوی حفاظت خود اختیاری ہر کس و ناکس سرکار کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ مجاہدوں نے بھی بہ تمنائے حصول شہادت داد شجاعت دے کر اپنے جوہر دکھلائے۔ غرض دو تین مہینے تک خوب جنگ ہوتی رہی۔ خود جنرل چیمبرلین صاحب

مجروح شدید ہوئے۔ قریب سات ہزار کے کشت وخون کی نوبت پہنچی۔ تمام پنجاب کی چھاؤنیوں کی فوج کھینچ کر سرحد پر بھیجی گئی۔

ادھر یہ گرما گرمی تھی، اُدھر لارڈ ایلجن صاحب وائسرائے ہند چمبہ کے پہاڑی پر اپنی اس حرکت اور زبردستی چھیڑ چھاڑ پر نادم ہو کر یک بیک مر گئے۔[1]

اپنی دوسری کتاب "سوانح احمدی" میں مولانا جعفر تھانیسری نے برطانوی حکومت کی جارحانہ پالیسی پر نہ صرف تنقید کی بلکہ اسے چنگیز اور ہلاکو سے تشبیہہ دی۔ چنانچہ ان کے یہ الفاظ خاص طور سے قابل ذکر ہیں:۔

"سکھوں کی آمد کی علامت آگ کے شعلے اور دھواں ہوتا تھا۔ جس جس قدر وہ بڑھتے تھے گاؤں اور بستیوں کو پھونکتے اور مسجدوں اور مدرسوں کو گراتے چلے جاتے تھے۔ چنگیز خاں، ہلاکو اور تیمور لنگ وغیرہ پرانے ظالموں کی راہ کی علامت بھی مورخوں نے یہی آگ اور دھواں لکھی ہے اور ہماری "مہذب سرکار" نے بھی ملک یاغستان کے واسطے وہی چنگیز خانی قاعدہ آتش زنی کا اختیار کر رکھا ہے۔ اللھم زد فزد"[2]

ہم نے یہ دونوں حوالے بے کم وکاست نقل کر دیئے ہیں کیا ان کی خط کشیدہ عبارتیں پڑھنے کے بعد صاف طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ مولانا جعفر تھانیسری انگریزی حکومت کو جلی کٹی سنا رہے ہیں۔ اسے ظالم جابر اور چنگیز و ہلاکو کا ساتھی قرار دے رہے ہیں، مجاہدین کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ انگریزی فوج کے نقصان پر خوش ہیں، حتیٰ کہ وائسرائے ہند کی اچانک موت کا ذکر نہایت خوشی کے رنگ میں کرتے ہیں۔ اگر انہیں انگریزوں سے کچھ فوائد حاصل کرنے ہوتے اور عمر قید سے رہائی کے بعد باقی زندگی آرام سے گذارنے کی آرزو ہوتی تو کیا وہ اپنی کتابوں میں انگریزوں کا ذکر اس اہانت آمیز طریقے سے کرتے انہیں یوں بدنام کر کے خود کو ان کی نظر میں معتوب بناتے؟ کیا اس سے ثابت نہیں ہو جاتا کہ گرفتاری سے پہلے بھی وہ انگریزوں کے مخالف تھے اور رہائی کے بعد بھی ان کی روش میں فرق نہ آیا اور انہیں جہاں موقع ملا انگریز کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ ایسے صاف گو اور جرأت مند شخص کے متعلق یہ کہنا کتنا بڑا ظلم ہے کہ اس نے ذاتی مصلحت کی خاطر سید صاحبؒ کو انگریزوں کا حامی ثابت کیا اور قید سے رہائی کے بعد انگریزوں کا ہوا خواہ بن گیا۔

مولانا جعفر تھانیسری کے ہوش ربا مصائب

اب ہم ذیل میں مولانا جعفر تھانیسری کی اسیری کی خود نوشت داستان کے کچھ اقتباسات درج کرتے

---

[1] تواریخ عجیب صد ۶۲ تا صد ۶۴ مصنفہ مولانا جعفر تھانیسری [2] سوانح احمدی صد ۱۱۱، صد ۱۱۱

ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوسکے گا کہ انہیں اپنے موقف کی خاطر کن ہوشربا مصائب کا سامنا کرنا پڑا مگر اس کے باوجود ان کے پائے ثبات و استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری کو دسمبر ۱۸۶۳ء میں علی گڑھ سے گرفتار کیا گیا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف یاغستان کے علاقے میں جو باغی کیمپ قائم تھا اس کی امداد کے لئے ہندوستان سے آدمی اور روپیہ ان کے ذریعے سے بھیجا جاتا تھا۔ انہیں گرفتار کرنے کے بعد ان سے اقبالِ جرم کرانے کے لئے ان پر جو سختیاں کی گئیں ان کی تفصیل وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :۔

"دوسرے دن فجر کے وقت پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ اور میجر ونکفیل صاحب ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس اور کپتان ٹائی صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ مثل یا جوج ماجوج کے میری کوٹھڑی میں آئے اور مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمہ کا سب حال بتادو۔ تمہارے واسطے بہتر ہوگا۔ میں نے کہا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اس وقت پارسن صاحب نے مجھ کو پہلے بہت دھمکایا اور پھر مارنا شروع کیا۔ جب میری مار حد کو پہنچی اور میں گر پڑا تو ٹائی صاحب اور ونکفیل صاحب کوٹھڑی سے باہر کھڑے ہوگئے اور جب اس قدر مار پر بھی میں نے کچھ نہ بتلایا تو وہ سب کے سب اس دن مایوس ہو کر چلے گئے۔ میں نے جب یہ کیفیت ظلم و تعدی کی دیکھی تو مجھ کو یقین ہوگیا کہ اب مجھ کو یہ لوگ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمے کچھ رمضان کے روزے باقی تھے دوسرے دن سے میں نے ان کی قضا رکھنی شروع کردی۔

دوسرے دن جب میں روزے سے تھا علی الصباح پارسن صاحب پھر آیا اور وہی کارروائی شروع کی مگر تھوڑی زدوکوب کے بعد مجھ کو اپنی بگھی میں بٹھلا کر ٹائی صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لے گیا جہاں پر وہ دونوں صاحب یعنی ٹائی صاحب اور میجر ونکفیل صاحب بھی موجود تھے۔ اس دن انہوں نے میری بڑی چاپلوسی کی اور کہا کہ ہم تحریری عہد کرتے ہیں کہ اگر تم دوسرے شرکا اور معاونین جہاد کو بتلا دو تو تم کو سرکاری گواہ کر کے رہا کر دینے کے سوا بڑا عہدہ بھی دلویں گے اور بصورت نہ بتلانے کے تم کو پھانسی ہوگی۔ میں نے اس چاپلوسی پر بھی انکار کیا۔

پھر پارسن صاحب ان دونوں سے انگریزی میں کچھ باتیں کر کے مجھ کو الگ کمرے میں لے گیا جہاں لیجا کر پھر مارنا شروع کیا۔ میں کہاں تک لکھوں آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو لیکن بفضلِ الٰہی میں سب کچھ سہار گیا مگر اپنے رب سے ہر دم یہ دعا کرتا جاتا تھا کہ اے رب یہی وقت امتحان کا ہے تو مجھ کو ثابت قدم رکھیو[۱]"

---

[۱] تواریخِ عجیب ص۶۶ و ص۶۷ مطبوعہ سلیمان اکیڈمی۔ کراچی

سزائے موت پر اظہارِ مسرت

۲؍ مئی ۱۸۶۴ء کو اس مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا۔ فیصلہ سنانے کی روداد لکھتے ہوئے مولانا جعفر تھانیسری رقم طراز ہیں :-

"پھر سب سے پہلے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم بہت عقلمند اور ذی علم اور قانون دان اور اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس ہو۔ تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا۔ تمہارے ذریعہ سے آدمی اور روپیہ سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا۔ تم نے سوائے انکارِ بحث کے کچھ جیلتاً بھی خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا اور باوجود فہمائش کے اس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی۔ اس واسطے تم کو پھانسی کی سزا دی جائے گی اور تمہاری کُل جائداد ضبطِ سرکار ہو گی اور تمہاری لاش بھی تمہارے وارثوں کو نہ دی جائے گی بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ گورستانِ جیل میں گاڑی جاوے گی اور اخیر میں یہ کلمہ بھی فرمایا کہ میں تم کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا...... مجھ کو اپنی اس وقت کی کیفیت خوب یاد ہے کہ میں اس حکم پھانسی کو سن کر ایسا خوش ہوا تھا کہ شاید ہفت اقلیم کی سلطنت ملنے سے بھی اس قدر مسرور نہ ہوتا۔ اس حکم کے سننے سے میری وہ کیفیت ہوئی کہ گویا جنت فردوس اور حوریں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگ گئی تھیں"[1]

اس فیصلہ کے خلاف چیف کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔ ۱۶؍ ستمبر ۱۸۶۴ء کو ڈپٹی کمشنر انبالہ پھانسی گھروں میں گئے اور :-

"چیف کورٹ کا حکم ہم کو پڑھ کر سنا دیا کہ تم لوگ پھانسی پڑنے کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو اس واسطے سرکار تمہاری دل چاہتی سزا تم کو نہیں دیوے گی تمہاری پھانسی سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدل گئی۔"[2]

مصائب میں اور اضافہ

اس کے بعد مولانا جعفر تھانیسری کو انبالہ جیل سے دہلی۔ دہلی سے لاہور اور لاہور سے کراچی لے جایا گیا کراچی سے جہاز پر سوار کرا کر بمبئی کے راستے جزائر انڈمان بھیج دیا گیا۔ اس قید وبند اور سفر میں انہیں جن صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا ان کی چند جھلکیاں انہی کی زبانی سنیئے۔ علی گڑھ میں گرفتار کرنے کے بعد ان کے ہاتھوں میں

---

[1] تواریخ عجیب ص ۹۸ و ص ۹۹

[2] تواریخ عجیب ص ۱۰۶ و ص ۱۰۷

ہتھکڑی اور پیروں میں بیڑی اور گلے میں وزنی طوق پہنایا گیا تھا۔ لاہور سنٹرل جیل میں پہنچ کر اس میں کچھ اور اضافہ ہوا۔

"اس کے بعد ڈاکٹر گرے صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل رونق افروز ہوئے۔ انہوں نے سب سے اوّل ہم لوگوں کا ملاحظہ کیا اور بڑے غصے سے حکم دیا کہ ایک ایک آڑا ڈنڈا بھی ان لوگوں کے پاؤں میں ڈال دو۔ چنانچہ بمجرد صدور اس حکم کے لوہار ڈنڈے آہنی لے کر حاضر ہو گئے اور ہمارے دونوں پاؤں کے دونوں کڑوں کے درمیان سے ایک ایک آڑا ڈنڈا جو ایک فٹ (۵ گرہ) سے زیادہ لمبا نہ تھا ڈال دیا گیا۔ یہ حکم ازراہِ تعصب فقط ہم ہی لوگوں کے واسطے تھا اور تمام جیل بھر میں ہم نے کسی اور قیدی کے پاؤں میں یہ ڈنڈا نہیں دیکھا۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہو گیا اور رات کو پاؤں پسار کر سونا بھی محال تھا۔[1]"

لاہور سنٹرل جیل سے مولانا جعفر کو مع ان کے ساتھیوں کے ملتان لے جایا گیا:

"دو روز بعد وہاں سے لے جا کر ایک پتن یا گھاٹ دریائے سندھ پر جو ملتان سے قریب پانچ کوس ہے ہم کو اگن بوٹ پر سوار کرایا۔ سوار کرانے کے بعد ہم سب کو قطار قطار کر کے اس پر بٹھلا دیا اور سوائے بیڑی اور ہتھکڑی اور ڈنڈے کے جو پہلے سے زیب تن تھے یہاں ایک بڑی موٹی زنجیر آہنی بھی ہماری بیڑیوں کے بیچ میں پھنسا دی گئی کہ جس سے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے پاخانہ پیشاب کرتے رہے۔ اس وقت قریب آدھا آدھا من کے لوہا ہمارے جسم پر تھا۔ باوجود اس قدر کثرت پانی کے دریائے سندھ ہمارے زیر پا تھا ہم پڑے پڑے تیمم سے نماز پڑھتے تھے۔[2]"

مولانا جعفر تھانیسری کی گرفتاری، اقبالِ جرم کرانے کے لئے ان پر قیامت خیز سختی اور اثنائے سفر کے ہوش ربا مصائب کی داستان پڑھنے کے بعد جو نتائج نکلتے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) دسمبر ۱۸۶۳ء میں انہیں علی گڑھ سے گرفتار کیا گیا۔ اس کے بعد ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا جس میں پھانسی کے مجرم بند کئے جاتے ہیں۔

(۲) دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ پولیس، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈپٹی کمشنر انبالہ جیل میں آئے، پہلے انہیں ترغیب و تحریص کے ذریعہ اور پھر ڈرا دھمکا کر اقبالِ جرم پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی، جب یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی تو پھر مار پڑنی شروع ہوئی اور اتنا مارا گیا کہ وہ نڈھال ہو کر گر پڑے۔

(۳) دوسرے دن پھر وہی عمل شروع ہوا جب اس سخت مار پیٹ کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا تو انہیں بگھی میں بٹھا کر

---

[1] تواریخ عجیب ص ۱۱۹ [2] تواریخ عجیب ص ۱۲۲ و ص ۱۲۳

ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لے جایا گیا۔ وہاں دوسرا نسخہ استعمال کیا گیا۔ پہلے ان کی چاپلوسی کی گئی، پھر انہیں یہ لالچ دیا گیا کہ ہم تم سے تحریری وعدہ کرتے ہیں کہ اگر اپنے دوسرے ساتھیوں کے نام بتا دو گے تو نہ صرف تم کو رہا کر دیا جائے گا بلکہ بڑا عہدہ بھی دیا جائے گا۔ بصورت دیگر تم کو پھانسی کی سزا دی جائے گی۔

(۴) جب مولانا جعفر نے یہ پیش کش بھی قبول نہ کی تو پھر ان پر مار پڑنی شروع ہوئی اور صبح آٹھ بجے سے شام کے آٹھ بجے تک اس قدر مار پڑی کہ شاید ہی کسی پر پڑی ہو۔

ہر منصف مزاج قاری فیصلہ کر سکتا ہے کہ اگر مولانا جعفر تھانیسری کو دنیا اور اس کی آسائش و آرام عزیز ہوتی تو وہ حکام کی یہ پیش کش قبول کر لیتے اور نہ صرف پھانسی پانے کے بظاہر یقینی خطرے سے بچ جاتے بلکہ باقی ساری زندگی نہایت آرام و آسائش سے گزارتے۔ مگر واقعات شہادت دیتے ہیں کہ انہوں نے اس قسم کی ہر پیش کش کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ انہوں نے صبح سے شام تک ایسی سخت مار کھائی کہ شاید ہی کسی نے کھائی ہو مگر ان کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی۔ انہیں پھانسی کی سزا کا حکم سنایا گیا مگر ان کی پیشانی پر بل نہ آیا بلکہ اتنے خوش ہوئے جیسے کوئی اپنی دلی مراد کو پہنچ جاتا ہے۔ انہوں نے طوق و سلاسل زیب گلو کئے، آدھ من لوہا اٹھائے اٹھائے پھرے، بھوکے اور پیاسے رہے مگر اپنے اصولوں کا سودا گوارا نہ کیا۔ ان کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط کر لی گئی۔ بیوی بچے چھوٹ گئے۔ گھر بار لٹ گیا اور اپنی زندگی کے بہترین اٹھارہ سال انڈمان کے جنگلوں میں قیدی کی حیثیت سے گذار دیئے، مگر افسوس کہ آج انہیں ان کی قربانیوں کا یہ صلہ دیا جا رہا ہے کہ انہیں انگریزوں کا خوشامدی جعل ساز اور اپنے امام و مرشد کی تحریروں میں تحریف کا مجرم ثابت کرنے کی مکروہ کوشش کی جا رہی ہے۔ شاید ہی کسی محسنِ قوم کو یہ ایسا بدترین صلہ دیا گیا ہو جیسا مولانا جعفر تھانیسری کو دیا گیا۔ لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مومنانہ فراست عطا فرمائی ہے اور جنہیں دولتِ عدل و انصاف سے بھی حصہ ملا ہے وہ بجا طور پر یہی فیصلہ کریں گے کہ جس شخص نے اپنے اصولوں کی خاطر جان سی عزیز شے بھی قربان کرنی گوارا کر لی اور مصائب و آلام کے روح فرسا مرحلوں سے گذر کر وطن واپس آ گیا وہ بقیہ چند روزہ زندگی کی خاطر کبھی جعل سازی جیسے مکروہ جرم کا مرتکب نہ ہو سکتا تھا۔

مولانا تھانیسری اور سید صاحبؒ کا نظریۂ جہاد

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ مولانا جعفری تھانیسری نہایت بے خوف، حق گو اور با اصول انسان تھے ذیل میں حضرت سید صاحبؒ کے رخِ جہاد کے متعلق ان کی رائے درج کی جاتی ہے۔ خیال رہے کہ انہوں نے یہ کتاب جس کا اقتباس درج کیا جا رہا ہے بیسیوں نادر اور مستند کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھی۔ اسکے

راویوں میں بکثرت لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنی عمرِ عزیز کا بڑا حصہ سید صاحبؒ کی رفاقت میں گذار دیا۔ مولانا جعفر لکھتے ہیں :۔

"یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپؒ سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں پر جہاد کرنے کو کیوں جاتے ہو۔ انگریز اس ملک پر حاکم ہیں اور دین اسلام سے کیا منکر نہیں ہیں۔ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو۔ یہاں لاکھوں آدمی آپ کا شریک اور مددگار ہو جاوے گا کیونکہ سیکڑوں کوس سفر کر کے سکھوں کے ملک سے پار ہو کر افغانستان میں جانا اور وہاں برسوں رہ کر سکھوں سے لڑنا یہ ایک ایسا امرِ محال ہے جس کو ہم لوگ نہیں کر سکتے[1]۔"

سیدؒ صاحبؒ نے جواب دیا کہ :۔

"کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے۔ نہ انگریزوں کا نہ سکھوں کا ملک لینا ہمارا مقصد ہے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکاتِ مستوجبِ جہاد سے باز آجائیں گے تو ہم کو ان سے لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی اور سرکار انگریزی گو منکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرض مذہبی اور عبادات لازمی سے روکتی ہے ہم ان کے ملک میں اعلانیہ وعظ کہتے اور ترویجِ مذہب کرتے ہیں وہ کبھی مانع اور مزاحم نہیں ہوتی بلکہ اگر ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اس کو سزا دینے کو تیار ہیں ہمارا اصل کام اشاعتِ توحیدِ الٰہی اور احیاءِ سننِ المرسلین ہے سو ہم بلا روک ٹوک اس ملک میں کرتے ہیں پھر ہم سرکارِ انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور خلافِ اصولِ مذہب طرفین کا خون بلا سبب گرادیں[2]۔"

سید صاحبؒ کے اس ارشاد کا یہ حصہ خاص طور سے قابلِ مطالعہ ہے اور یہی اس ارشاد کی جان اور انبیاء و مامورین کے مقاصد کے مطابق ہے کہ "ہمارا اصل کام اشاعتِ توحیدِ الٰہی اور احیاءِ سننِ المرسلین ہے۔"

دنیا میں جتنے بھی انبیاء اور صلحاء آئے ان سب نے اپنا مقصدِ وحید یہی قرار دیا کہ انسانیت کے گم کردہ راہ قافلے کو اس کی منزلِ مقصود پر گامزن کرنا۔ اللہ کے بندوں کو جو اس سے دور ہو چکے تھے اسکے قریب لانا دکھی انسانیت کو آرام پہنچانا اور مذہبِ خالص کو گرد و غبار سے پاک و صاف کر کے اس کا حقیقی اور تابناک چہرہ دنیا کے سامنے پیش کرنا۔

---

[1] سوانح احمدی صـ۱۷۱

[2] سوانح احمدی صـ۱۷۱

جنگیں لڑنا اور دوسروں کے دیار و امصار پر قبضہ کرنا انبیاء وصلحانے کبھی اپنا مقصد مدعا قرار نہیں دیا یہ الگ بات کہ انہیں ان کے دشمنوں نے جنگ و پیکار پر مجبور کیا ۔ اس صورت میں انہیں دفاعی جنگ لڑنی پڑی لیکن ان کا اصل مقصد یہی رہا کہ بندوں کو خدا کے قریب کریں اور ان کے اخلاق و کردار میں پاکیزگی پیدا کریں جب تک کوئی ان کے کام میں مزاحم نہیں ہوا انہوں نے کسی سے تعرض نہیں کیا لیکن جب ان پر اور ان کے متبعین پر ظلم وستم کیا گیا اور انہیں دین حق کی تبلیغ سے روکا گیا تو انہوں نے اس ملک میں فتنہ و فساد کا باعث بننے کی بجائے ہجرت اختیار کی اور اللہ کی وسیع زمین میں کہیں اور جا کر اپنا مرکز قائم کر لیا حضرت سید صاحبؒ بھی صلحائے اُمت میں سے تھے ۔ وہ اپنے زمانے کے امام اور وقت کے مجدد تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بھی صلحائے سابق اور مجددین گذشتہ کے اسوہ کے مطابق اپنا اصل مقصد" اشاعتِ توحیدِ الٰہی اور احیائے سنن المرسلین" قرار دیا ۔ چونکہ انگریز ان کے اس اصل اور بنیادی کام میں مزاحم نہیں ہو رہے تھے اور آپ انگریزوں کی سلطنت میں دہلی سے کلکتہ تک بے روک ٹوک آزادانہ تبلیغ و تلقین کر رہے تھے اس لئے آپ نے ان سے جہاد کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی ۔ پھر یہاں ہر مسلمان کو اذان دینے اللہ کی عبادت کرنے، قربانی دینے اور اپنے مذہب کے جملہ احکام پر عمل پیرا ہونے کی آزادی تھی ۔ اس لئے بھی سید صاحبؒ نے یہاں علم جہاد بلند کرنا جائز و مناسب نہ سمجھا ۔ البتہ چونکہ پنجاب اور سرحد میں مسلمانوں پر سخت مظالم ہو رہے تھے ۔ ان کی مسجدیں اصطبل بنا دی گئیں تھیں ۔ اذان کہنے ، نماز پڑھنے اور قربانی دینے کی ممانعت تھی ۔ ان کی جان و مال حتیٰ کہ ان کی عورتوں کی عصمتیں تک محفوظ نہیں تھیں انسان کا خون آزادانہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا اس لئے سید صاحبؒ ان علاقوں کے مسلمانوں کو سکھ حکومت کے انسانیت سوز مظالم سے نجات دلانے تشریف لے گئے

مولانا غلام رسول مہر کی تائید

ہمارے زمانے کے ایک فاضل بزرگ اور مورخ و محقق مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب" سید احمد شہیدؒ" میں حضرت سید صاحبؒ کی ایک تقریر درج فرمائی ہے ۔ اس تقریر میں آپ نے جہاد کی فضیلت بیان فرمانے کے بعد اہل مجلس کو بتایا کہ مجھے جناب باری سے جہاد فی سبیل اللہ کا فریضہ انجام دینے کا حکم ہوا ہے ۔

"کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اسی ملک میں (یعنی ہندوستان میں) جہاد کرو ۔ جو کچھ مال خزانہ سلاح وغیرہ درکار ہو ہم دیں گے ۔ مجھ کو منظور نہ ہوا اس لئے کہ جہاد موافق سنت کے چاہیئے بلوا کرنا منظور نہیں [1]"

مولانا غلام رسول مہر راقم الحروف کے ذاتی مہربان اور اس کے لئے بے حد قابل احترام ہیں ۔ موصوف بھی ان

---

[1] سید احمد شہید صہ ۹۰ جلد دوم

اصحاب ہیں شامل ہیں جن کا خیال ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کا رُخِ جہاد انگریزوں کی طرف تھا۔ بلاشبہ مولانا نے بڑی قابلیت سے اپنا موقف درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ایک کمزور اور بے جان مقدمہ کو دنیا کا قابل سے قابل وکیل بھی نہیں جیت سکتا یہی صورت اس معاملے کی ہے۔ مولانا کی قابلیت اور تبحرِ علمی سے انکار گناہ ہے لیکن انہوں نے جس مقدمہ کی پیروی کی ہے وہ مقدمہ ہی بے جان ہے اس لئے ان کے علم و فضل پر ہرگز کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ وہ مشین ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ جس کا کوئی پرزہ درست نہیں، اس کی مثال وہی ہے کہ اگر سر چھپاؤ تو پیر کھل جاتے ہیں اور اگر پیر چھپاؤ تو سر کھل جاتا ہے۔ مولانا مہرؔ نے سید صاحبؒ کے جہاد کا رُخ انگریزوں کی طرف ثابت کرنے میں اپنی تمام قابلیت صرف کردی۔ مگر چونکہ یہ مقدمہ ہی کمزور تھا اس لئے اس کی کمزوریاں چھپ نہ سکیں۔ سطور بالا میں ہم نے حضرت سید صاحبؒ کی جو تقریر درج کی ہے اور جس کے ناقل ہمارے بزرگ مولانا مہرؔ ہیں، وہ بآوازِ بلند اعلان کر رہی ہے کہ سید صاحبؒ کا رُخِ جہاد ہرگز انگریزوں کی طرف نہ تھا۔ ان کے یہ الفاظ کہ "جہاد موافقِ سنت ہونا چاہئے بلوا کرنا منظور نہیں"۔ صاف بتا رہے ہیں کہ ان کے خیال میں انگریزوں سے جہاد کرنا بلوہ تھا جہاد نہ تھا۔ اور سید صاحبؒ کو بلوہ کرنا منظور نہیں تھا۔ آخر کوئی بتلائے کہ جب ہندوستان میں ان کے عقیدت مندوں نے جن کی تعداد لاکھوں تھی انہیں دعوت دی کہ آپ ہندوستان میں بیٹھ کر انگریزوں سے جہاد کریں، وہ آپ کو خزانہ، اسلحہ اور افراد سب کچھ دے رہے تھے۔ پھر آپ نے یہ دعوت کیوں قبول نہ کی۔ جہاد کے لئے انہی تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ روپیہ، اسلحہ اور جنگجو افراد یہ تینوں چیزیں موجود تھیں۔ پھر روہیلکھنڈ جنگجو افغانوں کا مشہور علاقہ ہے اور اس علاقے میں لاکھوں پٹھان آپ کے مرید تھے جن کی عمریں دادِ شجاعت دیتے گذر گئی تھیں۔ ان سب باتوں کے باوجود آپ نے یہ درخواست قبول نہ کی۔ اس سے صریح طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا جعفر تھانیسری نے سید صاحبؒ سے جو تقریر منسوب کی ہے وہ سو فی صد درست ہے اور مولانا غلام رسول مہرؔ کی مندرجہ بالا روایت سے اس کی پوری تائید ہوتی ہے یعنی انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا حضرت سید صاحبؒ کے نزدیک بلوہ کرنے کے مترادف تھا اور حضرت سید صاحب اسے پسند نہ فرماتے تھے بلکہ خلافِ سنت سمجھتے تھے۔

نواب صدیق حسن خان کی رائے

نواب صدیق حسن خاں اپنے زمانے کے جید عالم گذرے ہیں جنہیں علمی اور دنیوی دونوں وجاہتیں حاصل تھیں۔ ان کے والد ماجد علامہ اولاد حسن قنوج کے رئیس اور نہایت صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ سے تعلیم حاصل کی حضرت سید احمد شہیدؒ

کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس لحاظ سے نواب صدیق حسن خاں کو حضرت سید صاحبؒ کے کارناموں اور آپ کے عقاید و نظریات کا ہمارے زمانے کے بڑے سے بڑے عالم اور مورخ و محقق سے کہیں زیادہ علم تھا کہ ان کے والد ماجد سید صاحبؒ کے مرید تھے اور گھر میں شب و روز آپ کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں کا زمانہ بھی سید صاحبؒ کے زمانہ کے بہت قریب کا تھا۔ اس لئے ان کی روایت بعد کے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قابلِ قبول اور معتبر سمجھی جائے گی۔ وہ ذاتی طور پر نہایت نیک نفس، راست باز اور دین دار انسان تھے۔ ان کے متعلق یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی دنیوی مصلحت کی وجہ سے انہوں نے کذب بیانی اور جعل سازی سے کام لیا ہوگا۔ نواب صاحب موصوف سید صاحبؒ کی شخصیت اور ان کے کارنامۂ جہاد پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"سید احمد شاہ ساکن نصیر آباد در لئے بریلی میں ایک شخص تھے جنہوں نے بہت خلق کو نماز روزے پر قائم کیا اور گناہوں اور فساد کے کاموں سے روکا اور پھر وہ ہندوستان سے چلے گئے، اطرافِ پنجاب میں سکھوں سے لڑتے ان کو فضلِ رسول بدایونی نے وہابی ٹھہرایا اور سرکار کا دشمن بتلایا حالانکہ وہ کلکتہ تک گئے تھے اور ہزاروں مسلمان فوج انگریزی کے ان کے مرید ہوئے تھے مگر انہوں نے کبھی یہ ارادہ ساتھ سرکار انگریزی کے ظاہر نہیں کیا اور نہ سرکار نے ان سے کچھ تعرض فرمایا[۱]۔"

اس کے بعد نواب صدیق حسن خاں نے اسی کتاب میں پھر سید صاحبؒ کا تذکرہ کیا ہے اور اس خیال کی سختی سے تردید فرمائی ہے کہ آپ کے جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف تھا چنانچہ نواب صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"سید احمد شاہ بریلوی اور ان کے طریقے کے (لوگوں) نے تو کبھی نام بھی
جہاد کا گورنمنٹ سے ہندوستان کی سرحد میں نہیں لیا[۲]۔"

نواب صدیق حسن خاں کو حضرت سید صاحبؒ سے غیر معمولی عقیدت و محبت تھی اس لئے انہوں نے اپنی متعدد کتابوں میں جگہ بجگہ ان کا ذکر کیا ہے۔ "ترجمانِ وہابیہ" میں انہوں نے واقعاتی اعتبار سے اس خیال کی تردید کی ہے کہ سید صاحبؒ کا ارادہ انگریزوں سے جنگ کرنے کا تھا مگر اپنی دوسری کتاب "تقصار جیود الاحرار" میں انہوں نے اس مسئلے کو علمی رنگ میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

چوں اتفاق مراجعت از حرمین شریفین ہوائی جہاد سرایشاں افتاد۔ در ہند ایں معرکہ	جب آپ حرمین شریفین سے واپس ہوئے تو آپ کو جہاد کا شوق ہوا مگر ہندوستان میں شرعی قواعد کی رو سے

۱؎ ترجمانِ وہابیہ صفحہ ۲۵ و صفحہ ۲۶ مولفہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم (مطبع مفید عام آگرہ سنہ ۱۳۱۲ھ) ۲؎ ترجمانِ وہابیہ صفحہ ۳ مولفہ نواب صدیق حسن خاں

بحسب قواعد شرعیہ راست نمی آمد[1] ؛ — اس کا موقع صحیح طور پر میسر نہ آسکتا تھا۔

اس لئے آپ نے اوّل لوگوں کو جہاد کی ترغیب دلائی اور زبان و تحریر سے یہ مسئلہ اس موثر طریقے سے بیان کیا کہ لوگ گروہ در گروہ اپنے گھر بار چھوڑ کر آپ کے ہمراہ جانے کے لئے بجوشی تیار ہو گئے۔

"دمیکہ جمعیت بہم رسید ازیں دیار ہجرت نمودہ بحدودِ افغانستان پیوستند و قتال و جدال را در دیار ہند کہ زیرِ حکومتِ دولتِ انگلشیہ بود جہاد ندیدند[2]"

جب ایک جماعت فراہم ہو گئی تو اس ملک (ہندوستان) سے ہجرت کرکے حدودِ افغانستان میں چلے گئے اور ملک ہندوستان میں جو انگریزی حکومت کے ماتحت تھا آپ جنگ و جدال کو جہاد نہیں سمجھتے تھے۔

آگے چل کر نواب صاحب لکھتے ہیں کہ جب ہندوستان کے قبر پرستوں نے دیکھا کہ سید صاحب افغانوں کے سرحدی حدود میں جہاد کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے آپ کو محمد بن عبدالوہاب نجدی کے دامن سے وابستہ قرار دے دیا اور آپ کے خلاف ناروا باتیں کہیں، حالانکہ حاشا و کلا آپ کو محمد بن عبدالوہاب نجدی سے ظاہری یا باطنی کوئی بھی تعلق نہیں۔

"جہاد نہ ایجادِ شیخ نجد بود بلکہ ایں مسئلہ در جملہ کتبِ اسلام از کتاب و سنت و فقہ و خبر آں مرقوم است امّا تا شروط و قیود آں موجود نگردد روا نیست و لہٰذا سید احمدؒ در ہند جہاد نہ کردد با دولتِ برطانیہ طرف نشد ہجرت نمود بیرون ازیں معمورہ میدانِ صف با سکھاں و افغاناں آراست[3]"

جہاد کوئی شیخ نجد کی ایجاد نہیں بلکہ یہ مسئلہ تو کتاب و سنت اور فقہ کی تمام اسلامی کتب میں لکھا ہوا موجود ہے البتہ جب تک اس جہاد کے لئے اس کی شروط و قیود موجود نہ ہوں جہاد جائز نہیں۔ اس لئے سید احمد صاحبؒ نے ہندوستان میں جہاد نہ کیا اور حکومت برطانیہ کے مدمقابل نہ ہوئے (اسے چھوڑ کر اس کے قلمرو سے باہر چلے گئے اور سکھوں اور افغانوں سے جا صف آرا ہوئے۔

ہمارے خیال میں نواب صدیق حسن خاں صاحب کی اس واضح تحریر پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ مولانا جعفر تھانیسری کی طرح نواب صاحب موصوف پر آج تک کسی ایک شخص نے بھی جعل سازی اور سید صاحبؒ کے موقف میں تحریف کا الزام نہیں لگایا بلکہ انہیں نہایت ثقہ و معتبر قرار دیا۔ ان کی

---

[1] تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار ص۱۰۹ مولفہ نواب صدیق حسن خاں طبع فی المطبع الشاہجہانی بھوپال ۱۲۹۸ھ۔

[2] تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار ص۱۰۹ [3] تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار ص۱۱۰

مندرجہ بالا تحریر کا مطالعہ کرنے کے بعد مولانا جعفر تھانیسری کا وہ بیان پڑھئے جس میں انہوں نے سید صاحبؒ سے یہ الفاظ منسوب کئے ہیں کہ :۔

"کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے نہ انگریزوں کا ملک لینا ہمارا مقصد ہے ۔۔۔ ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور خلافِ اصولِ مذہب طرفین کا خون بلا سبب گرائیں[1]۔"

اور اسی کے ساتھ مولانا غلام رسول مہر کی وہ روایت پڑھیئے جو موصوف نے سید صاحبؒ سے منسوب کی ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ آپؒ کو ہندوستان کے لوگوں نے انگریزوں سے جہاد کرنے کے لئے مال، خزانہ، اسلحہ اور افراد کی پیش کش کی اور عرض کیا کہ آپ ہندوستان میں انگریز سے جہاد کریں مگر آپ نے فرمایا کہ :۔

"مجھ کو منظور نہ ہوا، اس لئے کہ جہاد موافق سنّت کے چاہیئے بلوا کرنا منظور نہیں[2]۔"

کیا ان تینوں تحریروں سے ایک ہی مفہوم ظاہر نہیں ہوتا اور کیا نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی اس رائے کی تائید نہیں ہوتی کہ سید صاحبؒ از روئے شرع انگریزی حکومت سے جنگ کرنے کو جہاد نہیں سمجھتے تھے۔ اسے بلوا قرار دیتے تھے۔ ان کے خیال میں انگریزوں سے جنگ کرنا اصولِ مذہب کے خلاف بلا سبب طرفین کا خون بہانا تھا کیونکہ انگریزوں سے جنگ کرنے کے لئے جن قیود و شروط کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں موجود نہ تھیں۔

جہاد با دراز مویاں

ہمارا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی توفیق سے ہم نے عقلی اور نقلی دونوں قسم کے دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کے جہاد کا رخ صرف اور صرف سکھوں کی طرف تھا۔ ان کی شہادت کے بعد ایک صدی تک ان کے رُخِ جہاد کے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہوئی۔ البتہ بعد کے لوگوں نے ہوا کا رخ دیکھ کر سید صاحبؒ کو بھی اسی زمرے میں لا کھڑا کیا جس میں ملک کے عام اور دنیا دار سیاست داں شامل تھے۔ اب حضرت سید صاحبؒ کے بعض ارشادات پیش کرتے ہیں جن سے آفتاب نصف النہار کی طرح ثابت ہو جائے گا کہ ان کا جہاد صرف سکھوں کے ساتھ تھا۔

سید صاحبؒ نے علاقہ یوسف زئی پہنچ کر ہندوستان کے اکابر اپنے عقیدت مندوں اور افغان سرداروں کو متعدد مکتوبات لکھے۔ ان مکتوبات میں آپ نے نہایت وضاحت سے تحریر کیا کہ انہیں سکھوں سے جہاد کرنے پر مامور کیا گیا ہے اور سکھوں کے مظالم سے پنجاب و سرحد کے مسلمانوں کو نجات دلانا وقت کی اہم ضرورت اور اسلام کی بہت بڑی خدمت ہے۔ چنانچہ آپ اپنے ایک عقیدت مند نواب فقیر محمد خاں لکھنوی کو لکھتے ہیں کہ :۔

---

[1] سوانح احمدی صہ۱۳۹ [2] سید احمد شہیدؒ صہ۹۰ جلد دوم مولفہ مولانا غلام رسول مہر

میرے معاملے کو شعرا کی خیال آرائی اور فصحا کی فصاحت و بلاغت پر محمول نہ کرو۔ جو عبارت کی سجاوٹ اور پُر شکوہ الفاظ سے کلماتِ لطیفہ ترتیب دیتے ہیں اور پھر اس نازک خیالی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میرا کلام وحی و الہام کا لب لباب ہے۔

"اما بیان الہام پس از فقیر از پردۂ غیب بہ بشارتِ ربانی باستیصالی کفارِ دراز مویاں (لمبے بالوں والے مراد سکھ) ماموراست [۱]"

وہ الہام یہ ہے کہ اس فقیر کو غیب سے لمبے بالوں والے کافروں (سکھوں) سے جہاد کرنے اور ان کا خاتمہ کرنے پر ربانی بشارتوں کے ذریعہ مامور کیا گیا ہے، یہ ایسی بشارات ہیں جن میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔

سید صاحبؒ کا دوسرا خط فیض اللہ خاں مہمند مشیر و دبیر والیٔ پشاور کے نام ہے جس میں آپ نے پھر اس امر کی وضاحت کی ہے کہ "مجھے سکھوں سے جہاد کرنے پر مامور کیا گیا ہے"۔ آپ فرماتے ہیں:-

"بر رائے فطانت پیرائے ایشاں معاملۂ ایں خاکسار کالشمس فی رابعۃ النہار ہویدا و آشکارا است کہ بجہاد اہل عناد قوم سکھ ماموروم [۲]"

اس عاجز کا معاملہ آپ کی ذہانت و فراست پر آفتاب نیم روز کی مانند ظاہر ہے کہ میں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) سکھ قوم کے ساتھ جو مسلمانوں کی دشمن ہے جہاد کرنے پر مامور کیا گیا ہوں۔

حضرت سید صاحبؒ کے یہ وہ مکتوبات ہیں جن کے متعلق آج تک کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ ان میں بھی تحریف کی گئی ہے۔ ہم نے ان مکاتیب کی اصل عبارتیں پیش کر دی ہیں اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا ہے کہ سید صاحب کا جہاد سکھوں سے تھا یا انگریزوں سے؟ ان کے سارے مکتوبات پڑھ جائیے بلکہ ان کے تمام نسخے دیکھ لیجیے، کسی جگہ ایک فقرہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ آپ کو انگریزوں سے جہاد کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ ہم سید صاحبؒ کے متعلق مداہنت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انگریزوں کے استیصال اور ان سے جہاد پر مامور کیا جاتا تو ناممکن تھا کہ وہ اس کا اظہار نہ فرماتے۔ پس سید صاحبؒ کے ان دو مکاتیبِ گرامی نے فیصلہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو صرف اور صرف سکھوں سے جہاد کرنے پر مامور فرمایا تھا اور یہی آپ کا اصل مقصد و مدعا تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ آپ سے منسوب کیا گیا ہے وہ آپ پر اتہام ہے۔ یہ تاریخ کو مسخ کرنے اور آپ کی دعوتِ ربانی کی غلط تصویر پیش کرنے کے مترادف ہے۔

---

[۱] مکتوبات احمدی صفحہ ۱۸ [۲] مکتوبات احمدی صفحہ ۳۶ مطبوعہ صوفی پنڈی بہاؤالدین ضلع گجرات

ایک احمقانہ اعتراض

یہ تو تھے سید صاحبؒ کے وہ نادان دوست جنہوں نے زمانہ کا رنگ دیکھ کر سید صاحبؒ کے موقف اور آپ کی تحریک کو اپنی خواہشات کے سانچے میں ڈھالنا چاہا۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو سید صاحبؒ کا مرتبہ گھٹانے اور آپ کی مقدس مہم یعنی تحریکِ جہاد کو داغ دار کرنے کے لیے یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپؒ نے انگریزوں سے ساز باز کیا تھا اور انگریزوں کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں کی رائے میں سید صاحبؒ کی تحریکِ جہاد کی بنیاد جذبۂ ایمانی اور حمیتِ اسلامی پر نہ تھی بلکہ یہ تحریک انگریزوں کے اشارے پر شروع کی گئی تھی۔ اس کے لئے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آپ نے انگریزوں سے جنگ نہیں کی اور انگریزوں نے آپ سے کوئی تعرض نہ کیا۔ افسوس کہ ان کم فہم لوگوں نے جن میں ہمارا بدایونی مولف بھی شامل ہے اس سادہ سی حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ کسی طاقت سے جنگ نہ کرنا اور بات ہے اور اس کا ایجنٹ ہونا بالکل دوسری بات۔ دونوں میں ذرہ برابر بھی تعلق نہیں۔ ہمیں کوئی بتائے کہ حضرت مولانا فضل رسول صاحب بدایونیؒ، حضرت مولانا احمد رضاخاں صاحب بریلوی۔ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری اور اس قبیل کے بعض دیگر علما، سجادہ نشینوں اور پیروں نے انگریزوں سے جہاد کرنے کے لیے اپنے مریدوں میں سے کتنی فوجیں بھرتی کیں ؟ کتنے جہاد کئے؟ کتنی تلواریں توڑیں ؟ کتنے انگریز مارے ؟ اور کتنے معرکے سر کیئے ؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی اس قسم کا کوئی اقدام نہیں کیا۔ کیا اس سے یہ ثابت ہوگا کہ یہ سب انگریزوں کے ایجنٹ تھے ؟ ظاہر ہے کہ کوئی ذی فہم شخص ان حضرات کو اس وجہ سے انگریزوں کا ایجنٹ قرار نہیں دے سکتا کہ انہوں نے انگریزوں سے جہاد نہیں کیا۔ پھر سید صاحبؒ کو صرف اس لئے انگریزوں کا ایجنٹ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سکھوں سے جہاد کیا، انگریزوں سے نہیں کیا۔

افسوس کہ ان نادانوں نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ جب کوئی طاقت کسی شخص یا جماعت کو اپنے ایجنٹ کے طور پر استعمال کرتی ہے تو اس کی پوری امداد بھی کرتی ہے۔ اگر سید صاحبؒ انگریزوں

لہ یہ سید صاحبؒ کے سب سے پہلے مخالف اور ناقد تھے اور ایک کتاب "سیف الجبار" کے مصنف بھی۔ لطیفہ یہ ہے کہ جس وقت سید صاحبؒ بالاکوٹ میں سکھ لشکر کے مقابلے میں دادِ شجاعت دے رہے تھے اس وقت یہ بزرگ بدایوں کی تحصیل سہسوان میں عدالتِ انگریزی میں سررشتہ داری فرما رہے تھے۔ ؏

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

سید صاحبؒ کو بھی کیسے کیسے مخالف اور ناقد ملے۔ (مولف)

کے ایجنٹ تھے اور ان کے اشارے پر سکھوں سے جنگ کرنے تشریف لے گئے تھے تو ہمیں بتایا جائے کہ انہوں نے سید صاحبؒ کی کیا امداد کی؟ کتنا روپیہ دیا؟ کتنا اسلحہ دیا؟ کتنے لشکر بھیجے؟ حالانکہ اس وقت ہزاروں روہیلے افغان انگریزوں کی فوج میں شامل تھے۔ ان میں سے بہت سے سید صاحبؒ کے مرید بھی تھے۔ اگر انگریز سید صاحبؒ کو ایجنٹ کے طور پر استعمال کر رہے تھے تو وہ ان روہیلوں ہی کو آپ کی امداد کے لئے روانہ کر دیتے۔ جن راستوں سے سید صاحبؒ صوبہ سرحد میں داخل ہوئے تھے انہی راستوں سے روہیلہ فوجیں، توپ خانہ، دوسرے آتشیں ہتھیار اور روپیہ سید صاحبؒ کی امداد کے لئے بھیجا جا سکتا تھا۔ یہ بات یقینی ہے کہ اگر آپ انگریزوں کے ایجنٹ ہوتے تو انگریز ضرور آپ کی امداد کرتے۔ اگر وہ اپنی تربیت یافتہ فوج کے دس بیس ہزار سپاہی اور افسر سید صاحبؒ کی کمان میں دیدیتے۔ اعلیٰ درجہ کا توپ خانہ اور اس زمانے کے مطابق جدید ہتھیار اور سامان رسد کے لئے روپیہ بھیج دیتے تو سکھ حکومت چند ماہ تو کیا چند روز بھی سید صاحب کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکتی۔ جب آپ نے اپنے ناکافی وسائل سے سکھ حکومت کو سال ہا سال پریشان کئے رکھا اور سکھ لشکر کو متعدد بار شکستیں دیں۔ انہی قلیل وسائل سے کام لے کر پشاور پر قبضہ کر لیا تو جب انگریزی فوج کے تربیت یافتہ سپاہی، افسر اور اعلیٰ درجے کا آتشیں اسلحہ آپ کی امداد کے لئے پہنچ جاتا تو ایک معمولی فہم کا شخص بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ سکھوں کا حشر کتنا عبرت ناک ہوتا۔

کیا انگریزوں نے سید صاحبؒ کو کسی قسم کی فوجی یا مالی امداد دی؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ملے گا۔ سید صاحبؒ کا بڑے سے بڑا معترض آج تک یہ ثابت نہیں کر سکا بلکہ اس کا الزام تک نہیں لگا سکا کہ انگریزوں سے فلاں موقع پر سید صاحبؒ کی امداد کے لئے اتنی فوج روانہ کی۔ فلاں موقع پر اتنا اسلحہ بھیجا اور فلاں موقع پر اتنا روپیہ دیا۔ بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ سید صاحبؒ روز اول سے اپنی زندگی کے آخری دن تک انہی چند ہزار ہندوستانی، بنگالی، پنجابی، سندھی، مجاہدوں اور وفادار افغانوں کی معیت میں مخالف طاقتوں سے جنگ و جہاد کرتے رہے جو شروع میں آپ کے ساتھ تھے یا بعد میں وقتاً فوقتاً آپ کے جھنڈے تلے جمع ہوئے بعض لوگوں نے تو آپ کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی قرار دی ہے کہ آپ کے پاس لشکر قلیل اور اسلحہ ناکافی تھا۔ انتہا یہ ہے کہ جس وقت آپ بالاکوٹ میں اپنی زندگی کا آخری معرکہ لڑ رہے تھے۔ اس روز آپ کے پاس ہندوستانی مجاہدین اور افغان دستے ملا کر کل تعداد گیارہ سو تھی جب کہ سکھ لشکر کی تعداد آٹھ ہزار سے دس ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ پس سید صاحبؒ کے لشکر کی قلت اور اسلحہ کا ناکافی ہونا یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ انگریزوں کی

طاقت آپ کی پشت پر ہرگز نہ تھی۔ آپ صرف اپنے قلیل وسائل اور حمیتِ اسلامی کی بنا پر دشمن سے برسرِ پیکار تھے۔

سید صاحبؒ کا اصل مقصد

بات دراصل یہ ہے کہ سید صاحبؒ کے نادان دوستوں اور آپ کے متعصب دشمنوں دونوں نے سید صاحبؒ کے حقیقی مقصد کو سمجھنے میں سخت غلطی کی اور اسی وجہ سے یہ ساری الجھنیں پیدا ہوئیں۔ سید صاحبؒ کا اصل مقصد دین کی تبلیغ اور مسلمانوں کو حقیقی معنی میں مسلمان بنانا تھا چونکہ انگریز اس مقصد کے حصول میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر رہے تھے اور سید صاحبؒ نہایت آزادی سے مظفر نگر سے لے کر الہ آباد اور کلکتہ تک انگریزوں کی حکومت میں اپنا دینی فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اس لئے انگریزوں کے ساتھ آپ کا تصادم نہیں ہوا۔ سکھ چونکہ پنجاب و سرحد کے مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم کر رہے تھے اور ان علاقوں کے مسلمان سکھ حکومت کے پنجۂ استبداد میں تڑپ رہے تھے۔ اس لئے سید صاحب مسلمانوں کی امداد کے لئے میدان میں آگئے اور ان کا سکھوں سے تصادم ہوا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر سکھ حکومت پنجاب و سرحد کے مسلمانوں سے روادارانہ سلوک کر رہی ہوتی یہاں کے مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو کوئی خطرہ نہ ہوتا۔ ان کی مساجد سکھوں کی دست برد سے محفوظ ہوتیں اور ان کو مذہبی آزادی حاصل ہوتی تو سید صاحبؒ سکھوں سے جہاد کرنے کے لئے کبھی میدان میں نہ نکلتے کیونکہ جہاد مذہب کے نام پر بلاوجہ خون بہانے اور دوسروں کے دیار و امصار فتح کرنے کا نام نہیں بلکہ جہاد اس حکومت کے خلاف کیا جاتا ہے جس کے تحت رہنے والے مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو۔ ان کا بلاوجہ خون بہایا جا رہا ہو۔ انہیں عبادت کرنے اور ان کی مذہبی رسوم ادا کرنے سے روک دیا گیا ہو جس حکومت میں مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہو۔ انہیں تبلیغ کرنے کی آزادی ہو۔ اپنے مذہبی اصولوں کے مطابق زندگی گذارنے کی آزادی ہو۔ اپنی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کی آزادی ہو۔ ایسی حکومت پر حملہ آور ہونا جہاد نہیں کہلاتا۔ یہی وجہ ہے کہ سید صاحبؒ انگریزوں سے نبرد آزما نہیں ہوئے بلکہ سکھوں سے جہاد کیا۔ ہمیں اس امر کا بھی یقین ہے کہ اگر انگریز سکھوں کی طرح ہندوستان کی پر امن مسلم آبادی پر ظلم کر رہے ہوتے۔ ان کا بلاوجہ خون بہا رہے ہوتے۔ ان کی مساجد کی بے حرمتی کر رہے ہوتے۔ اذان دینے، نماز پڑھنے اور قربانی کرنے کی ممانعت کر دیتے اور ان کی عورتوں کی عصمتیں لوٹ رہے ہوتے تو بلاشبہ سید صاحبؒ انگریزوں

کے خلاف بھی علمِ جہاد لہرانے میں ہرگز تامل نہ کرتے۔ مگر چونکہ انگریزوں نے ہمارے سیاسی مخالف ہونے کے باوجود اپنی حدودِ مملکت میں بسنے والے مسلمانوں بلکہ ہر مذہب و ملت کے باشندوں کے دینی و مذہبی معاملات میں قطعاً مداخلت نہ کی، نہ پرامن شہریوں کا خون بہایا، نہ ان کی مذہبی عمارات کی ہتک کی، نہ ان کی عورتوں پر سکھوں کی طرح دست درازی کی، اس لئے سید صاحبؒ نے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جہاد نہیں کیا۔ اسی طرح چونکہ سید صاحبؒ نے انگریزوں کی حدودِ سلطنت میں کوئی مخالفانہ اقدام نہیں کیا بلکہ سکھوں سے جہاد کی تیاری کی، اس لئے انگریزوں نے بھی ان سے کوئی تعرض نہ کیا کیونکہ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ سید صاحبؒ سے انہیں کوئی خطرہ نہیں ؛؛

سیّد صاحبؒ، نواب امیر خاں اور انگریز

نواب امیر خاں وسط ہند کے مسلمان سرداروں میں بڑا جی دار سردار تھا۔ اس کی شجاعت، بے خوفی اور اولوالعزمی کے واقعات سے تاریخ کے صفحات مزین ہیں مگر افسوس کہ اسے حالات نہایت ناساز گار ملے جنہیں ساز گار بنانا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ اس میں بعض خامیاں بھی تھیں۔ مثلاً کشادہ دستی اعتدال سے زیادہ تھی۔ روپیہ پس انداز کرنا اور اسے احتیاط سے خرچ کرنا اسے آتا ہی نہ تھا۔ لوٹ مار یا خراج میں جو کچھ ملتا اہل لشکر میں تقسیم کر دیتا اور جلد ہی خالی ہاتھ ہو جاتا۔ اس نے کبھی مستقل خزانے کے قیام کی طرف قطعاً توجہ نہ دی۔ یہی اس کی سب سے بڑی خامی تھی جس نے اسے بے دست و پا کر دیا۔ اس کی اس کوتاہی کی وجہ سے کئی کئی ماہ فوج کو تنخواہ بھی نہ ملتی تھی اور جب لشکری سختی سے رقم کا مطالبہ کرتے تو وہ کسی ریاست پر دھاوا بول دیتا۔ اس طرح جو روپیہ ہاتھ لگتا بے حساب اہل لشکر میں تقسیم کر دیتا۔ اس طرزِ عمل کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے تعلقات ریاستوں سے ہمیشہ کشیدہ رہے اور کسی ریاست کا حکمران ایسا نہ تھا جو دشمن سے جنگ کے وقت اس کی حمایت پر آمادہ ہوتا۔ ادھر وسط ہند کی سیاسی حالت بے حد خراب تھی۔ پنڈاروں اور مرہٹوں نے ہر طرف تباہی مچا رکھی تھی۔ امن و امان کے نام کی کسی چیز کا اس علاقے میں وجود نہ تھا۔ کسی کی عزت و آبرو اور جان و مال محفوظ نہ تھے۔ عوام اور شرفا اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھے۔ یہ حالات انگریزوں کے لئے سب سے زیادہ پریشان کن تھے اور وہ اس صورتِ حال کو جلد سے جلد ختم کر دینا چاہتے تھے تاکہ امن و سکون کی فضا پیدا ہو اور ان کی حکمرانی کے لئے کوئی خطرہ باقی نہ رہے چنانچہ انہوں نے وسطِ ہند کی ریاستوں کے حکمرانوں سے سلسلہ جنبانی شروع کی اور جے پور، جودھ پور، اودے پور، کوٹہ بوندی اور کشن گڑھ کے حکمرانوں نے انگریزوں سے معاہدات کر لیے۔ ان میں سندھیا سب سے زیادہ طاقتور حکمران تھا۔ انگریزوں نے اسے بھی شیشہ میں اتار لیا۔ اس طرح وسط ہند میں ایک ایک کر کے سارے حکمران انگریزوں کے سایۂ عاطفت میں آ گئے۔ صرف پنڈارے اور امیر خاں باقی رہ گئے۔ اس کے بعد انگریزوں نے

پنڈاروں کی سرکوبی کا آغاز کیا اور دوسری طرف امیر خاں کے لشکر کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ ان حالات میں کہ امیر خاں کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا نہ روپیہ تھا نہ اسلحہ جو انگریزی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی ہوتا اس کے لئے صلح کے سوائے اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تھا، چنانچہ اس نے یہی راستہ اختیار کیا اور انگریزوں کی پیش کش منظور کر لی۔ بعض مورخوں نے امیر خاں کے اس طرز عمل پر تنقید کی ہے اور اس عہد کے حالات کو قطعی طور پر نظر انداز کر کے آج ڈیڑھ سو سال کے بعد اس پر دوں ہمتی کا الزام لگایا ہے۔

سیّد صاحبؒ پر اتہام

ان حضرات کا خیال ہے کہ امیر خاں کو انگریزوں سے صلح نہیں بلکہ جنگ کرنی چاہیے تھی چونکہ سید صاحبؒ بھی نواب سے وابستہ تھے اس لئے ان حضرات کو خیال گذرا کہ کہیں ان پر کوئی الزام نہ آئے اور یہ نہ کہا جائے کہ سید صاحبؒ نے صلح کیوں ہونے دی انہوں نے کیوں مخالفت نہ کی۔ اس الزام سے سید صاحبؒ کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ موقف اختیار کیا گیا کہ سید صاحبؒ بھی یہی چاہتے تھے کہ نواب انگریزوں سے صلح نہ کرنے پائے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے امیر خاں کو بار بار منع کیا اور یہی مشورہ دیا کہ آپ جنگ کریں۔ اگر ایک بار صلح کر لی اور انگریزوں کے دامِ فریب میں آ گئے تو کبھی ان سے گلو خلاصی نہ ہو سکے گی حالانکہ معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ دشمن سے جنگ جاری رکھنے کے لئے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جمعیت، اسلحہ، روپیہ اور مددگار، جب ان میں سے کوئی چیز نہ ہو تو جنگ کیسے جاری رہ سکتی ہے۔ سید صاحبؒ نہایت ذہین و فریس انسان تھے۔ وہ سات سال نواب امیر خاں کے لشکر میں رہ کر فنونِ جنگ میں بھی پوری طرح مہارت حاصل کر چکے تھے۔ انہیں جنگ کا عملی تجربہ بھی تھا۔ نواب امیر خاں کے لشکر کے اندرونی حالات اور اس کی طاقت سے بھی انہیں مکمل آگاہی تھی انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہر طرف سازش کا جال بچھ چکا ہے چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں۔ ساری ریاستوں کے حکمران انگریزوں کی اطاعت قبول کر چکے ہیں باہر سے کسی امداد کی نہ صرف یہ کہ توقع نہیں بلکہ یہ ممکن ہی نہیں۔ ان حالات میں ان کا امیر خاں کو یہ مشورہ دینا کہ آپ جنگ جاری رکھیں سید صاحبؒ جیسے عقیل و فہیم اور سیاسی و عسکری معاملات کا تجربہ رکھنے والے کا بزرگ کا مشورہ نہیں ہو سکتا خصوصاً ان حالات میں جنگ کا مشورہ سید صاحبؒ جیسا ذی فہم کبھی نہ دے سکتا تھا جب کہ خود نواب امیر خاں کے لشکر کے بعض سردار بھی اس سے باغی ہو کر انگریزوں سے جا ملے تھے، چنانچہ مولانا غلام رسول مہر کا بیان ہے کہ :۔

"امیر خاں کے مختلف سرداروں کو لالچ دے کر انگریزوں نے توڑ لیا چنانچہ انگریزی فوج کی پیشقدمی کے ساتھ ہی فیض اللہ خاں بنگش اپنا رسالہ لے کر انگریزوں سے مل گیا سخت اندیشہ

پیدا ہوگیا کہ دوسرے سردار امیر خاں کو اچانک گرفتار کر کے انعام کی حرص میں انگریزوں کے حوالے نہ کر دیں "

حیرت ہے کہ جب امیر لشکر ہی کے جان کے لالے پڑ جائیں اور خطرہ پیدا ہو جائے کہ اسے پکڑ کر دشمن کے حوالے نہ کر دیا جائے ان حالات میں اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے حریف سے جنگ جاری رکھتا پرلے درجے کی نادانی اور کوتاہ فہمی ہے اور اس مشورے کو سید صاحبؒ سے منسوب کرنا ان کے فہم و فراست کا دامن بھی داغدار کرنا ہے۔

مولانا جعفر تھانیسری کی روایت

ان حالات میں سید صاحبؒ کی دانشمندی کا تقاضا یہی ہونا چاہئے تھا کہ وہ نواب امیر خاں کو ایسا مشورہ دیتے جس کے نتیجے میں وہ بھی ہلاکت سے محفوظ ہو جاتا اور وسطِ ہند میں مسلمانوں کی ایک پناہ گاہ بھی قائم ہو جاتی۔ چنانچہ انہوں نے نواب مذکور کو ایسا ہی مشورہ دیا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ خود انگریزوں کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ امیر خاں سے صلح کر لیں۔ اس طرح انہیں ایک ریاست دلوا کر مستقل حکمران بنوا دیا۔ چنانچہ مولانا جعفر تھانیسری کا بیان ہے کہ :۔

" ایک روز کا ذکر ہے کہ لشکر نواب امیر خاں مرحوم سرکار انگریزی سے لڑ رہا تھا دونوں طرف سے توپ اور بندوق چل رہی تھیں۔ اس وقت سید صاحبؒ اپنے خیمے میں تشریف رکھتے تھے آپ نے اپنا گھوڑا تیار کروایا اور اس پر سوار ہو کر مثل ہوا کے دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سپہ سالار فوج انگریزی کا مع اپنے مصاحبوں کے کھڑا تھا۔ بس وہاں سے اس سپہ سالار کو ساتھ لیکر پھر دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اپنے خیمے تک چلے آئے۔ یہاں آکر تھوڑی سی بات چیت کے بعد سپہ سالار مذکور نے عہد کر لیا کہ میں اسی دم اپنے لشکر کو مقابلہ نواب امیر خاں صاحب سے واپس لے جاؤں گا اور پھر مقابلہ کو نہ آؤں گا بلکہ جہاں تک ممکن ہوگا اپنی سرکار کو اس بات پر مجبور کروں گا کہ نواب امیر خاں صاحب سے صلح کرے۔ اس واقعہ کے بعد پھر سرکار انگریزی اور نواب امیر خاں میں جنگ نہیں ہوئی بلکہ صلح کی بات چیت اور رسل و رسائل شروع ہو گئے اور بہ عہد لارڈ ہیسٹنگ صاحب بہادر وائسرائے ہند" ٹونک کا کل ملک نواب صاحب کو دے کر صلح ہوگئی [۲]"

یہ ایک نہایت معتبر تذکرہ نگار کا بیان ہے جس کی حریت پسندی، بے خوفی اور ثبات و استقلال کی داستان گذشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہے اس کے مندرجہ بالا بیان سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ سید صاحبؒ نے

---

[۱] سید احمد شہید صد ۱۰۶ [۲] تواریخ عجیبہ صد ۱۴۷ و صد ۱۵۱

حالات کا جائزہ لینے کے بعد امیر خاں کو تباہی سے بچانے کے لئے جو راستہ تجویز کیا وہ یہی تھا کہ ان کی انگریزوں سے صلح کرادی جائے چنانچہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر وہ خود انگریزی فوج میں گئے اور انگریز کمانڈر کو اپنے خیمے میں لاکر اسے نواب امیر خاں سے صلح پر آمادہ کرلیا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ قدم نواب امیر خاں سے مشورہ کرنے کے بعد ہی اٹھایا ہوگا ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ نواب کو تو علم ہی نہ ہوتا اور سید صاحبؒ ازخود جاکر انگریزی فوج کے کمانڈر سے صلح کی گفتگو شروع کردیتے۔

نواب وزیرالدولہ کی شہادت

یہ تو بیان تھا مولانا جعفر تھانیسری کا، اب ایک ایسی شخصیت کی شہادت ملاحظہ کیجئے جس سے زیادہ وقیع شہادت نہ کسی بڑے سے بڑے عالم کی ہوسکتی ہے نہ بڑے سے بڑے مورخ کی۔ ہماری مراد نواب وزیرالدولہ مرحوم سے ہے جو نواب امیر خاں بانی ریاست ٹونک کے فرزند تھے اور ان کے انتقال کے بعد ٹونک کے حکمران ہوئے۔ یہ وہ نواب وزیرالدولہ ہیں جنہیں نواب امیر خاں نے اس وقت سید صاحبؒ کے سپرد کیا تھا جب آپ نواب سے رخصت ہوکر اور صلح کی بات چیت مکمل کرکے دہلی واپس جارہے تھے، چنانچہ نواب وزیرالدولہ سید صاحبؒ کے ہمراہ آئے اور دہلی میں حوض قاضی کے قریب ایک عالی شان حویلی میں ان کے قیام کا انتظام کیا گیا۔ عرصے تک وہ سید صاحبؒ اور خاندان ولی اللّٰہی کے اکابر علماء و فضلا کی صحبت میں رہے اور تعلیم و تربیت پاتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ممتاز شخص کی گواہی جسے سید صاحب کا نہایت قرب حاصل تھا سب سے زیادہ معتبر ہوگی چنانچہ نواب وزیرالدولہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ "جس زمانے میں حضرت سید احمد صاحبؒ میرے والد بزرگوار کے لشکر سے وابستہ تھے اور لشکر کو بڑی فتوحات ہورہی تھیں۔ اور اس کی دلاوری کی شہرت دور دور تک پہنچ رہی تھیں۔ اسی دوران میں انگریزوں نے میرے باپ پر لشکرکشی کی۔ اس وقت لوگوں میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہورہی تھیں، انہی دنوں میں حضرت مرشد (سید صاحبؒ) نے ایک روز مولوی سید نور صاحب سے جو آپ کے رازداں تھے فرمایا کہ خوب یاد رکھو کہ یہ لوگ اس امیر کے متعلق جو باتیں کررہے ہیں یہ اس طرح نہیں"

"بروری روزگار آمدنی بالہام یزدانی بشما میگویم کہ انشاءاللہ تعالیٰ پس از درستی راہ و رسم دوستی آں واں شہر خواہد یافت و فلاں و فلاں بلدہ زیر فرماں

جو کچھ دنیا کے سامنے ظاہر ہونا ہے وہ میں تمہیں الہام ربانی سے بتاتا ہوں انشاءاللہ (انگریزوں کے ساتھ) تعلقات کی درستی اور دوستی قائم ہونے کے بعد فلاں فلاں شہر اور فلاں فلاں علاقے امیر موصوف کے

خواہد ساخت و پس از گذشتن زمانی من بیاری حضرت کرد گاری و دستگیری جناب پروردگاری عزو علی علم خجستہ نہاد جہاد و درفش خوش کامی عزا فرخ بنیاد افراشتہ در کشور ایں سرور اسلام سر بسر گذر خواہم کرد بسر نوشت ایزدی و داداری جل ملکہ ہمہ کارہای آشتی پدرم و فرماں روائی بر ہماں شہرہا و آمدن حضرت مرشد ما با ہزاراں فرخندگی و شادمانی و بے شماراں فرخی و کامرانی در کشور فرماں روائی پدرم ہمچناں شد کہ فرمودہ بود وچوں بفرمان جناب کیہاں باں رفع امرہ حضرت شیخ ما د مرشد ما برابر فرمودۂ خود دلہ لشکر و کشور پدرم آبرو افزاد و رہنمائی ما ہمہ باشند از مولوی سید نور مذکور کہ دراں زماں بکار افتاء لشکر خوش سروکاری داشت پرساں آنچہ استاں باستاں شدند مفتی موصوف بے شمار آفریں بر راستی دانش درونی آندست حضرت یزدانی نمود[۱]

زیرِ فرمان آئیں گے اور کچھ عرصہ گذرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے میں علم جہاد لئے ہوئے اس اسلامی مملکت سے گذروں گا میرے والد کے متعلق حضرت مرشد (سید صاحبؒ) نے جو باتیں فرمائی تھیں تقدیر الٰہی سے وہ سب پوری ہوئیں، انہی شہروں پر میرے والد کی حکومت قائم ہوئی جن کی آپ نے نشاندہی کی تھی اور مرشدِ محترم (حضرت سید صاحبؒ) اس علاقے سے گذرے:-

یہ باتیں سید نور صاحب سے تحقیق کر کے لکھی گئی ہیں جو میرے والد کے لشکر میں مفتی کے عہدے پر فائز تھے جن کی راست بازی اور دانش مندی پر ہزار آفریں۔

نواب وزیر الدولہ کے مندرجہ بالا بیان سے صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ:-

(۱) حضرت سید صاحبؒ نے اللہ تعالیٰ سے الہام پا کر بشارت دی کہ نواب امیر خاں کی انگریزوں سے صلح ہو جائے گی اور صلح کے بعد انگریز انہیں کچھ علاقے دیں گے جن پر ان کی باقاعدہ حکومت قائم ہوگی، آپ نے ان علاقوں کی نشاندہی بھی فرمادی ——— (۲) آپ نے یہ بھی پیشگوئی کی کہ ایک زمانہ آئے گا جب میں نواب امیر خاں کے (اس بیٹے) ملک میں سے جہاد کرنے کی غرض سے لشکر لے کر گذروں گا۔"

---

[۱] وصایا الوزیر صفحہ ۱۲۹ نصف ثانی مصنفہ نواب وزیر الدولہ بہادر حکمران ریاست ٹونک

(۳) حضرت سید صاحبؒ نے جیسا فرمایا تھا من وعن ویسا ہی ظہور پذیر ہوا۔ نواب امیر خاں اور انگریزوں کے درمیان دوستی کے تعلقات قائم ہو گئے۔ انگریزوں نے انہیں کچھ علاقے دیئے جن پر نواب موصوف کی باقاعدہ حکومت قائم ہو گئی اور انگریزوں نے یہ حکومت تسلیم کر لی۔ انہیں وہی علاقے ملے جن کی سید صاحبؒ نے نشاندہی کی تھی۔

(۴) یہ روایت نواب وزیر الدولہ نے تحقیق کرنے کے بعد اپنی کتاب میں درج کی۔ اس کے راوی (مولوی سید نور صاحب) نواب موصوف کے بیان کے مطابق نہایت ذمہ دار بزرگ تھے۔ حضرت سید صاحبؒ کے خاص رازداں اور نہایت راستباز و دانشمند انسان تھے۔ نواب امیر خاں کے لشکر میں مفتی کے عہدے پر فائز تھے۔

نواب امیر خاں اور انگریزوں کے درمیان صلح میں سید صاحبؒ کی شرکت کے متعلق اب تک جتنی غلط فہمیاں پیدا کی گئیں اور غلط بیانیاں کی گئیں نواب وزیر الدولہ کے اس بیان نے ان سب کا پردہ چاک کر دیا اور اس سے ثابت ہو گیا کہ سید صاحبؒ نواب امیر خاںؒ اور انگریزوں کے درمیان صلح سے نہ صرف یہ کہ نہایت خوش تھے بلکہ آپ نے اس صلح کو مبارک بھی قرار دیا۔ اس کی بشارت دی اگر آپ اس صلح سے ناراض ہوتے تو اس رنگ میں اس کا ذکر کبھی نہ فرماتے۔ آپ کے یہ الفاظ کہ "انشاء اللہ (انگریزوں کے ساتھ) نواب امیر خاں کے تعلقات کی درستی اور دوستی کے بعد فلاں فلاں شہر انہیں ملیں گے"۔ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یہ صلح منجانب اللہ تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ "انشاء اللہ" کے الفاظ کبھی استعمال نہ فرماتے۔ گویا حضرت سید صاحب کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے چاہا تھا کہ نواب امیر خاں اور انگریزوں کے مابین صلح ہو جائے اور جس کام کو اللہ تعالیٰ چاہے اور پسند کرے اسے ناپسندیدہ قرار دینا مومن کی شان سے بعید ہے۔ نواب وزیر الدولہ کے اس بیان نے مولانا جعفر تھانیسری کی اس روایت کی بھی تصدیق کر دی جس کے مطابق سید صاحبؒ نے انگریزوں کی فوج میں جا کر ان کے کمانڈر کو ساتھ لیا اور اپنے خیمے میں آکر اس سے صلح کی بابت گفتگو کی۔ افسوس کہ اس حقیقت کی طرف غور نہیں کیا گیا کہ دراصل سید صاحبؒ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے وسطِ ہند کے ایک شمشیر آزما کو جس کی طاقت لوٹ مار اور قتل و غارت میں ضائع ہو رہی تھی اور جس کی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی جو اس وقت سخت مشکلات میں گرفتار ہو کر ہلاکت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نہ صرف اسے ہلاکت سے بچا لیا بلکہ قزاقوں کے زمرے سے نکال کر ایک مستقل ریاست کا حکمران بنا دیا۔ اس طرح ان کی کوشش سے وسطِ ہند میں مسلمانوں کی ایک ایسی ریاست قائم ہو گئی جو ان

کے لئے پناہ گاہ ثابت ہوئی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے علماء و فضلاء کا مسکن بنی اور جس کے حکمرانوں نے علم و ادب کی سرپرستی اور ترویج و اشاعت میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ اس کے ذریعے سے ہزاروں مسلمانوں کو روزگار کے وسائل میسر آگئے اور وہ نہ صرف اس علاقہ کے غیر مسلموں بلکہ قرب و جوار کے غیر مسلموں کے مظالم سے بھی محفوظ ہوگئے۔ یہی وہ ریاست ہے جس کے حکمران نے سید صاحبؒ کی عقیدت کا جوا اپنے کندھے پر رکھا اور اس نے اور اس کے عوام نے بعد میں سید صاحبؒ کے مقصدِ جہاد کے حصول میں ان کے ساتھ امکان بھر تعاون کیا۔

ان حالات و کوائف کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد ان روایات کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی جو یہ ثابت کرنے کے لئے وضع کی گئی ہیں کہ سید صاحبؒ نواب امیر خاں اور انگریزوں کی صلح سے خوش نہ تھے کیونکہ یہ روایات، واقعات اور حقائق کے خلاف ہیں۔ اس سلسلہ میں سید صاحبؒ کے ایک خط کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے جس کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے امیر خاں کے لشکر سے روانہ ہونے سے کچھ عرصہ قبل حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور اس میں لکھا تھا کہ یہاں کے معاملات بگڑ گئے ہیں اور امیر خاں نے انگریزوں سے صلح کر لی ہے۔ سید صاحبؒ تو سید صاحب تھے جعل سازوں نے تو ہمارے آقا و مولا آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت سی جھوٹی روایات منسوب کر دیں، حضرت علیؓ سے بیسیوں جھوٹے خطبے اور فرامین منسوب کر دیئے۔ انہی دفاترِ مکر و فریب ہی میں سید صاحبؒ کا یہ خط بھی شامل ہے۔ اگر سید صاحبؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو اس قسم کا کوئی خط لکھا تھا تو وہ اصل خط پیش کیا جائے۔ جب تک آپ کا اپنے قلم سے لکھا ہوا خط پیش نہیں کیا جاتا اس وقت تک اس روایت کی حیثیت افسانے سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

مخزنِ احمدی کی تائید

اس مرحلے پر ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کر دینا بے محل نہ ہوگا اور وہ یہ کہ سیّد صاحبؒ کے حالات پر سب سے پہلی اور مستند کتاب "مخزنِ احمدی" ہے جو سید صاحبؒ کے ہمشیرزادہ مولانا سید محمد علی صاحب مرحوم کی تصنیف ہے۔ سید محمد علی صاحب مولانا کے ہمسن بھی تھے اور سفر و حضر کے رفیق بھی۔ گو اس سفر (ٹونک) میں وہ سید صاحبؒ کے ساتھ نہ تھے مگر انہوں نے اپنی کتاب میں سید صاحبؒ کی زندگی کے اس دور کا ذکر کیا ہے اور ان کی امیر خاں سے وابستگی کے زمانے کے بعض واقعات بھی بیان کئے ہیں جو انہیں خود سید صاحبؒ نے سنائے تھے لیکن انہوں نے اس واقعے کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا کہ نواب امیر خاں نے سید صاحبؒ کا مشورہ رد کر کے انگریزوں سے صلح کر لی اور سید صاحبؒ اس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو کر واپس چلے آئے۔ یہ معمولی واقعہ نہ تھا سید صاحبؒ کو اس کا سب سے زیادہ دکھ ہونا چاہیئے تھا کیونکہ اگر ایسا تھا تو

ان کی ساری آرزوئیں خاک میں مل گئی تھیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ سید صاحبؒ کی زندگی کا بہت بڑا سانحہ تھا اگر ایسا ہوتا تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اس سانحہ عظیم کا سید صاحبؒ اپنے ہمشیر زادہ سے ذکر نہ کرتے۔ پس اس روایت پر جس رُخ سے غور کیا جائے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ایک فرضی داستان ہے جو ایک خاص مقصد کے لئے وضع کی گئی ورنہ سید صاحبؒ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ نواب امیر خاں نے ان کے مشورے کے مطابق قدم اٹھایا اور سید صاحب ہی کی کوشش سے انگریزوں اور نواب میں صلح ہو کر ہندوستان کی اسلامی ریاست ٹونک معرض وجود میں آئی۔

سیّد صاحبؒ کی علمی استعداد

سید صاحبؒ کسی درسگاہ کے فارغ التحصیل اور سند یافتہ نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار جید علماء میں نہیں کیا گیا مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ جاہل محض تھے پرلے درجے کی نادانی ہے۔ اگر وہ علوم سے بالکل کورے ہوتے اور ان میں عربی و فارسی کی ذراسی بھی لیاقت نہ ہوتی جیسا کہ سیّد صاحبؒ کے بعض مخالفوں نے بیان کیا ہے" تو اس زمانے کے فضلائے یگانہ ان کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے انہیں اپنا ہادی و مرشد کبھی نہ بناتے۔ ان لوگوں میں مولانا عبدالحئی اور شاہ اسماعیلؒ جیسے متبحر علما بھی شامل تھے جن کے علم و فضل اور ذہانت و فراست کا اکنافِ ہندوستان میں ڈنکا بج رہا تھا اور ان میں سے ایک یعنی شاہ اسماعیلؒ تو سید صاحبؒ کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ پس ایسی جلیل القدر شخصیتوں کا سیّد صاحبؒ کے زمرۂ خدام میں شامل ہو جانا یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ آپ کسی درسگاہ کے فارغ التحصیل نہ سہی مگر علوم دین میں غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالقادرؒ کی شاگردی

روایات میں آتا ہے کہ جب آپ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حصولِ علم کے لئے حاضر ہوئے تو حضرت شاہ صاحبؒ نے سید صاحبؒ کو اپنے نامور اور فاضل بھائی حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے سپرد کر دیا اور جس شخص کے ساتھ انہیں شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے پاس بھیجا اسے یہ پیغام بھی دیا کہ یہ مہمان مجھے نہایت عزیز ہے۔ اس کی قدر کرو۔ اس کی خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہونے پائے۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے سید صاحبؒ کی تعلیم و تربیت میں نہایت دلچسپی لی اور وہ سید صاحبؒ جن کا ذہن حصولِ علم کی طرف مائل ہی نہ ہوتا تھا حضرت شاہ عبدالقادرؒ کی صحبت اور تربیت سے اب اس قدر جلا پا گیا کہ قرآن حکیم کے اسرار و رموز ان پر منکشف ہونے لگے۔

نواب صدّیق حسن خاں کی شہادت

قرآن حکیم کے علاوہ آپ نے عربی زبان سیکھنے کی طرف بھی توجہ دی اور صرف ونحو کا باقاعدہ مطالعہ کیا عربی زبان کی کتابیں بھی پڑھیں، چنانچہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں کہ:۔

"آپ (سید صاحبؒ) اوائل حال میں حصولِ علم کی خاطر دہلی میں آئے اور مسجد اکبر آبادی میں شاہ عبدالقادر ولد شاہ ولی اللہ دہلوی کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہہ کئے اور کسی قدر علم صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی بعض کتابیں مسائل کی مثلاً حصن حصین وغیرہ بھی پڑھیں[1]"

میاں جی محمدیؒ کی شہادت

حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے علاوہ آپ نے مولانا محمد اسحاقؒ سے بھی علم حاصل کیا چنانچہ میزان و کافیہ اور مشکوٰۃ کے اسباق مولانا محمد اسحاق صاحبؒ ہی نے آپ کو پڑھائے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے بھی آپ کی تعلیم و تربیت میں حصہ لیا اور مسائل دینیہ میں سید صاحب کی رہنمائی فرمائی۔ مسلکِ تصوف کی تعلیم بھی آپ نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے حاصل کی۔ اس دور کے ایک فاضل بزرگ میاں جی محمدیؒ کا بیان ہے کہ:

"میں نے مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب سے کافیہ شروع کیا تھا اور سید صاحبؒ جب تشریف لائے تو انہوں نے شاہ اسحاق صاحب سے میزان شروع کی تھی اور اتنی جلدی ترقی کی کہ نصف سے آگے مجھے کافیہ میں پکڑ لیا اور کافیہ ہی پڑھتے ہوئے انہوں نے مشکوٰۃ بھی شاہ صاحبؒ سے شروع کر دی اور کوئی کتاب شاہ اسماعیلؒ سے بھی پڑھتے تھے[2]"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ کی اُمیت کی داستانیں اور کتابی علم سے آخر تک نفرت کے قصے سب باطل ہیں۔ ابتدا میں ضرور انہیں حصول علم سے دلچسپی نہ تھی مگر جب انہوں نے اس طرف توجہ دی تو اپنے بہت سے ہم سبق طلبہ سے کہیں آگے نکل گئے۔ جیسا کہ آپ کے ایک ہم درس میاں جی محمدیؒ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ کے بیان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے صرف و نحو کا بھی علم حاصل کیا اور حصن حصین وغیرہ کتابیں بھی پڑھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب علم دین صرف عربی زبان میں تھا، سارے ہندوستان میں قرآن حکیم کے صرف دو اردو ترجمے ہوئے تھے۔ ایک حضرت شاہ

---

[1] تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار صد ۱۰۹ [2] ارواحِ ثلاثہ صد ۱۲۶ شائع کردہ کتب خانہ امداد الغربا سہارنپور

رفیع الدینؒ صاحب نے کیا تھا اور دوسرا حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے۔ حدیث یا علم دین کی کسی کتاب کے اردو ترجمے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اگر سید صاحب عربی نہیں جانتے تھے تو انہوں نے حصن حصین، میزان کافیہ اور مشکوٰۃ وغیرہ کتابیں کیسے پڑھیں کیونکہ اس وقت یہ ساری کتابیں عربی میں تھیں۔ پھر آپ نے یہ کتابیں اس سرعت سے پڑھیں کہ میاں جی محمدیؒ کے بقول سید صاحبؒ بعد میں تشریف لائے مگر اس کے باوجود انوں نے نصف سے آگے میاں جی محمدیؒ صاحب کو کافیہ میں پکڑ لیا اور کافیہ پڑھتے ہوئے مشکوٰۃ بھی شروع کر دی۔ مدارجِ علم میں اتنی سرعت سے ترقی وہی شخص کر سکتا ہے جسے حصولِ علم کا خداداد ذوق و شوق ملا ہو اور جس نے ذہن بھی نہایت تیز پایا ہو۔

مولوی جعفر نقوی کی شہادت

سید صاحبؒ کے کاتب خاص مولانا جعفر علی نقوی کا بیان ہے کہ جب سید صاحبؒ کی طلبی پر حضرت شاہ اسماعیلؒ موضع "سچہ" میں حاضر ہوئے تو:

"دوسرے روز کے بعد سے حضرت امیر المومنین کی تجویز سے مشکوٰۃ کا درس شروع ہو گیا۔ فجر کے وقت مولانا اسماعیلؒ چند احادیث کا ترجمہ حضرت امیر المومنینؒ کی مجلس خاص میں بیان فرماتے تھے جہاں بہت سے لوگ موجود ہوتے تھے اور سید صاحب مشکوٰۃ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اکثر اوقات مطالعہ کرتے تھے کبھی کبھی کسی مقام کا مفہوم پاس سے گزرنے والے (کسی عالم) شخص سے دریافت فرما لیتے تھے۔ خود حضرت امیر المومنین بھی بعض احادیث کے اسرار و رموز بیان فرماتے تھے۔ حاضرین اس سے بہت بہرہ اندوز ہوتے تھے۔"[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ کو عربی زبان پر پورا عبور حاصل تھا کیونکہ مشکوٰۃ کا مطالعہ وہی شخص کر سکتا ہے جو عربی بخوبی جانتا ہو۔ احادیث کے اسرار و رموز بھی وہی شخص بیان کر سکتا ہے جو عربی زبان اور علمِ حدیث دونوں سے واقفیت رکھتا ہو۔

مولوی عبدالرحیم صادق پوری کی شہادت

اب آخر میں ایک اور روایت درج کی جاتی ہے جس کے مطالعے سے اندازہ ہو گا کہ سید صاحبؒ کا پایۂ علمِ دین میں کتنا بلند تھا اور آپ اسرارِ روحانی کے کتنے بڑے رموز داں تھے۔ افسوس کہ سید صاحبؒ کے

---

[1] منظورۃ السعدا صفحہ ۱۱۶۴

کسی سوانح نگار نے اس روایت کی طرف توجہ نہیں کی۔ یا ان حضرات کی نظر سے یہ روایت نہیں گزری۔

"الدر المنثور"[1] کے مصنف کا بیان ہے کہ جب سید صاحبؒ اپنے تبلیغی دورے کے سلسلے میں لکھنؤ تشریف لے گئے تو ان دنوں مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے استادِ محترم حضرت مولانا محمد اشرف صاحبؒ جو اپنے عہد کے نہایت جید عالم اور معقول و منقول میں یگانۂ عصر تھے لکھنؤ میں مقیم تھے اور درس و تدریس کا فریضہ ادا کر رہے تھے۔ جب سید صاحبؒ کی تشریف آوری کی شہرت ہوئی تو ایک روز آپ کو خیال گزرا کہ مولانا عبد الحیؒ اور مولانا اسماعیلؒ جیسے اکابر نے سید صاحبؒ کو اپنا ہادی و مرشد بنا لیا ہے۔ آخر ان میں ایسی کون سی بات ہے؟ یہ سوچ کر انہوں نے اپنے شاگرد رشید مولانا ولایت علی عظیم آبادی کو طلب کیا اور انہیں یہ پیغام دے کر سید صاحبؒ کی خدمت میں بھیجا کہ میں آپ سے تنہائی میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔

"سید صاحبؒ نے فوراً دوسرے روز عصر کا وقت تخلیے کے لئے متعین فرما دیا۔ چنانچہ دوسرے روز مولوی محمد اشرف صاحب مع اپنے شاگرد رشید مولوی ولایت علی صاحب کے خدمتِ بابرکت میں تشریف لائے اور مولوی صاحب نے بعد مزاج پرسی "وما ارسلنك الا رحمة للعلمين" کی تشریح چاہی۔ سید صاحبؒ نے اسی تخلیے میں دو گھنٹہ کامل اس موثر انداز سے وضاحت فرمائی کہ دونوں مولویوں کی روتے روتے داڑھیاں تر ہو گئیں اور ملاقاتِ تخلیہ کی بے ادبی کی معذرت کر کے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔"

مولوی جعفر تھانیسریؒ کی شہادت

اسی قسم کا ایک واقعہ مولانا جعفر تھانیسریؒ نے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب سید صاحبؒ کلکتہ تشریف لے گئے تو مولوی راشد صاحب جنھوں نے "ہدایہ" کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ مولوی معظم حسین صاحب اور ایک اور عالم کے ساتھ جن کا نام راوی کو یاد نہیں رہا، سید صاحبؒ سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گئے اور تخلیہ میں بغرضِ امتحانِ علم و کمال سورہ فاتحہ کی تفسیر بیان کرنے کی فرمائش کی۔ سید صاحبؒ نے اس خوبی اور وضاحت سے اس سورہ کی تفسیر بیان کی کہ تینوں عالم دنگ رہ گئے اور اسی وقت سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر کے تخلیہ میں ملاقات کرنے اور اپنے سوئے ظن کی معذرت کی۔

سید صاحبؒ کے ان محتاط تذکرہ نگاروں کی روایات سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کو علومِ دینیہ خصوصاً قرآن و حدیث پر کامل عبور تھا۔ اگر آپ عربی اور دینی علوم سے نابلد ہوتے تو اس عہد کے جید علماء کے سامنے قرآن حکیم کی صرف ایک آیت کی دو دو گھنٹے تک تفسیر بیان نہیں کر سکتے تھے۔ یہ کمال اسی شخص سے ظاہر ہو سکتا ہے

---

[1] الدر المنثور ص ۱۱۱ مصنفہ مولانا عبد الرحیم عظیم آبادی مطبوعہ در مطبع یونانی دواخانہ الہ آباد

جو عربی اور قرآن دونوں علوم کی باریکیوں سے واقف ہو۔ پھر آپ کے طرزِ بیان میں ایسی دلکشی اور زبان میں اتنی تاثیر تھی کہ ان لوگوں کی بھی روتے روتے داڑھیاں تر ہو جاتی تھیں جو آپ سے عقیدت رکھنا تو کجا آپ کا امتحان لینے آتے تھے۔ چونکہ ذکر سید صاحبؒ کی علمی استعداد کا ہو رہا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی حدیث دانی کا بھی ایک واقعہ درج کر دیا جائے۔ یہ واقعہ صاحبِ "سوانح احمدی" نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے ان کا بیان ہے کہ:

سید صاحبؒ کی حدیث دانی

"ایک دن آپ نے مولوی وحید الدین صاحب سے فرمایا کہ تم مجھ سے کوئی علمی بات نہیں پوچھتے۔ انہوں نے عرض کیا کہ جو مجھ کو مشکل ہوتی ہے اپنے استاد مولوی محمد اسماعیل صاحبؒ سے دریافت کر لیتا ہوں اور میرا کیا حوصلہ اور لیاقت جو آپ سے پوچھوں۔ آپ نے باصرار تمام ارشاد فرمایا کہ کچھ تو دریافت کرو۔ اس وقت بہ مجبوری مولوی وحید الدین صاحب نے عرض کیا کہ غسل کے مقدمہ میں دو حدیثیں آپس میں متعارض (متضاد) آئی ہیں۔ پہلی حدیث انما الماءُ من الماء (یعنی انزال سے غسل واجب ہوتا ہے (صرف دخول کے بعد غسل ضروری نہیں)) اور دوسری حدیث اذا جاوز الختان الختان فوجب الغسل (یعنی جب مرد کی شرم گاہ عورت کی شرم گاہ میں داخل ہو (خواہ انزال ہو یا نہ ہو) غسل واجب ہو گیا) ان دونوں حدیثوں میں توفیق کس طرح ہے۔ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ ان کی توفیق تو بہت آسان ہے کیونکہ پہلی حدیث خواب سے تعلق رکھتی ہے یعنی جب خواب میں انزال ہو تب غسل واجب ہوتا ہے نہ صرف دخول دیکھنے سے اور دوسری حدیث بیداری سے تعلق رکھتی ہے اور دونوں حدیثوں کا مطلب صحیح ہے[1]۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ نے احادیث کا مطالعہ بڑی دقتِ نظر سے کیا تھا اور اس علم میں ایسا کمال حاصل کر لیا تھا کہ متضاد حدیثوں میں بھی تطابق فرما کر سائل کی تسلی فرما دیا کرتے تھے۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ میں اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی بھی لگن اور تڑپ تھی اور لوگوں سے کہہ کہہ کر اُن کے علم میں اضافہ فرمانے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ یہ جذبہ بھی اسی شخص میں پیدا ہو سکتا ہے جسے علوم سے حصۂ وافر ملا ہو اور جسے اپنے علم و فضل پر پورا اعتماد ہو ورنہ ایک جاہل یا کم علم شخص تو علمی گفتگو

---

[1] سوانح احمدی صفحہ ۱۱

کرنے سے گریز کرتا ہے مگر یہاں سید صاحبؒ خود اہل علم سے کہتے ہیں کہ مجھ سے کچھ پوچھو۔

سید صاحبؒ کی شعلہ بیانی

بعض لوگوں نے سید صاحبؒ پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ آپ تقریر کے فن سے نابلد تھے۔ بعض نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ آپ کی زبان صاف نہ تھی۔ چنانچہ ہمارے عہد کا ایک بدایونی مؤلف لکھتا ہے کہ:

"سید صاحب غریب نہ وعظ فرما سکتے تھے اور نہ تقریر ہی کر سکتے تھے[1]"

یہ اعتراض وہی شخص کر سکتا ہے جو یا تو بالکل جاہل ہو یا تعصب نے اسے اندھا کر دیا ہو۔ اس کتاب میں سید صاحبؒ کی متعدد تقریریں درج کی جا چکی ہیں جو اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ آپ نہ صرف مقرر تھے بلکہ نہایت پُر اثر اور دلنشیں تقریر فرماتے تھے جسے سُن کر عوام تو کیا بڑے بڑے عالم دنگ رہ جاتے تھے اور بعض کی روتے روتے داڑھیاں تر ہو جاتی تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ سید صاحبؒ کے عقیدت مند تذکرہ نگاروں کی مبالغہ آرائی ہے اور اس بدایونی مؤلف کا بھی خیال ہے۔ شاید لوگ اس کی رائے سے اتفاق کر لیتے لیکن جن لوگوں نے سید صاحبؒ کے غیر مسلم تذکرہ نگاروں اور متعصب ناقدوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ آپ کے بدترین مخالف بھی آپ کی شعلہ بیانی اور سحر گفتاری کا اعتراف کرتے ہیں۔ ولیم ہنٹر سید صاحبؒ کے انہی بے رحم ناقدوں میں سے تھا جس نے آپ کے کردار سے لے کر آپ کی علمیت غرض ہر پہلو پر شدید حملے کئے ہیں۔ مگر اپنے تمام تر تعصب کے باوجود وہ بھی اس صداقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ:

"سید صاحب نہایت آتش بیاں مقرر تھے اور یہی ان کا اصل جوہر تھا[2]"

اس کے علاوہ بھی ہنٹر جگہ بہ جگہ سید صاحبؒ کی تقریروں کا ذکر کرتا ہے اور یہاں تک لکھتا ہے کہ ان کی مجالسِ وعظ میں لوگوں کی اس قدر کثرت ہوتی تھی کہ بعض دفعہ ہر شخص سے انفرادی بیعت لینے کی بجائے انہیں مجمع میں اپنی پگڑی پھیلانی پڑتی تھی۔ لوگ اسے پکڑ لیتے تھے اور ان کی بیعت کر لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو ٹھیک سے بات بھی نہ کرنی آتی ہو، جس کی زبان صاف نہ ہو، جس میں تقریر کا جوہر نہ ہو اس کی مجالسِ وعظ میں کون شریک ہوگا اور لوگ اس کے چند جملے سن کر ہی اٹھ جائیں گے۔ گویا ہمارے اس بدایونی مسلمان مصنف سے تو یہ متعصب غیر مسلم مصنف زیادہ دیانت دار نکلا جس نے سید صاحبؒ پر بے سر و پا اعتراضات کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بعض کمالات کا بھی اعتراف کیا۔

گزشتہ صفحات میں جو تصریحات پیش کی گئی ہیں ان سے ثابت ہو جاتا ہے کہ سید صاحبؒ بہت بڑے

---

[1] بدایونی کی کتاب کا ص۹ [2] دی انڈین مسلمانز ص۲

روحانی پیشوا اور آتش بیاں مقرر تھے۔ وہ جید عالم تو نہ تھے مگر انھوں نے عربی، فارسی، قرآن اور حدیث کی تعلیم اپنے زمانے کے جید علماء سے ضرور حاصل کی۔ ان میں مطالعہ کا بھی ذوق تھا اور جب وقت ملتا وہ احادیث یا علومِ دینیہ کی دیگر کتب کا مطالعہ فرماتے رہتے۔ اگر کوئی مشکل مقام آجاتا تو کسی عالم سے یہ مشکل حل کرا لیتے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے اضافۂ علم کے جذبہ کی تسکین و تکمیل کی خاطر کسی سے پوچھنے میں وہ قطعاً شرم محسوس نہ کرتے تھے اور بلاشبہ یہ ان کا بڑا وصف تھا۔ اس وصف، طلب علم کے شوق، ان کی ذہانت اور ذکاوتِ طبع نے انہیں اپنے بہت سے ہم درس اصحاب سے کہیں آگے بڑھا دیا۔ اور ان میں یہ کمال پیدا ہو گیا کہ بڑے بڑے علماء ان سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد ان کی خداداد صلاحیتوں اور ان کی وسعتِ علم و نظر کے نہ صرف معترف ہو گئے بلکہ ان کے حلقۂ خدام میں شمولیت اختیار کر لی۔ پھر انہیں ماحول ایسا ملا تھا جس نے ان کے فطری جوہر دن کو اور بھی چمکا دیا۔ چنانچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بیان کے مطابق "آپ ہر وقت علماء، مفسرین، محدثین اور فقہا کی صحبت میں رہتے تھے جہاں ہر وقت علم کا چرچا رہتا تھا اور جہاں کی تفریح بھی درس تھی۔ وہاں کی ہوا بھی علم پرور تھی اور وہاں کے بچے بھی دین کی سمجھ اور شریعت سے واقفیت رکھتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا شریعت کدہ ہندوستان میں بالاتفاق علم کا سب سے بڑا مرکز تھا جس میں منتخب علماء و فضلاء حاضر ہوتے تھے۔ ایک وقت میں صرف اس خاندان میں ائمہ عصر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ، شاہ رفیع الدین صاحبؒ، مولانا عبدالحئی صاحبؒ، مولانا اسماعیل صاحبؒ، مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ اور مولانا یعقوب صاحبؒ موجود تھے اور سید صاحبؒ کی صحبت انہی حضرات سے تھی۔ ترجمانِ قرآن حضرت شاہ عبدالقادرؒ کی توجہ اور صحبت نے اس کو جلا دی۔"[۱]

۱۔ سیرتِ سید احمد شہیدؒ ص۸۲ و ص۸۳ مولفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔

سیّد صاحبؒ کی شخصیّت

جو شخص جتنا بڑا ہوتا ہے وہ اتنا ہی اعتراضات کا ہدف بنتا ہے۔ سید صاحبؒ بڑے انسان تھے اس لئے ان کے خلاف بھی اعتراضات کا طومار باندھ دیا گیا۔ ہندوؤں، سکھوں، انگریزوں حتیٰ کہ مسلمانوں کے ایک طبقے نے بھی انہیں طرح طرح سے متہم کیا لیکن ان کی عظمت کو ان میں سے کوئی بھی کم نہ کر سکا بلکہ ان پر جس قدر اعتراضات کئے گئے ان کی شخصیت اسی قدر ہیرے کی طرح تاباں و درخشاں ہوتی چلی گئی۔ پنجابی زبان کی ایک ضرب المثل ہے اور خوب ہے کہ "حسن وہ ہے جس کا اعتراف سوکن کو بھی ہو" سید صاحبؒ کے یہی معترضین آپ کی تنقیص کرتے ہوئے آپ کی عظمت کا اعتراف کرنے پر بھی مجبور ہو گئے۔ ولیم، ولسن، ہنٹر سید صاحبؒ اور آپ کی تحریک کا بڑا سخت ناقد ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل الفاظ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ سید صاحبؒ کو کس نظر سے دیکھتا تھا اور آپ کی عظمت کو کم کرنے میں کس درجہ کوشاں رہتا تھا چنانچہ وہ آپ کی شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"سید احمد قزاق اور جعلساز تھا۔ اس کے مریدوں نے بھی اس کے بعد یہی پیشہ اپنائے رکھا"[1]

لیکن سید صاحبؒ کو قزاق اور جعلساز قرار دینے والا یہی متعصب انگریز مصنف آپ کی زندگی اور کارناموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے بادلِ ناخواستہ آپ کی عظمت کا اقرار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ذیل میں اس متعصب مورخ کی کتاب سے بعض اقتباسات درج کئے جاتے ہیں، جن کے مطالعے سے سید صاحبؒ کی شخصی عظمت کا اندازہ ہو سکے گا۔

ہنٹر کا اعترافِ عظمت

"سید احمد اُن صاحبِ ہمت اور دلیر نوجوانوں میں سے تھے جو نصف صدی قبل پنڈاریوں کی طاقت کے خاتمے کے بعد ہندوستان کے طول عرض میں منتشر ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز ایک مشہور نواب امیر خاں بانیٔ ریاست ٹونک کے لشکر میں شامل ہو کر ایک سوار کی حیثیت سے کیا مگر اسی زمانے میں رنجیت سنگھ کی مذہبی

---

[1] دی انڈین مسلمانز مطبوعہ دی پریمیئر بک ہاؤس کچہری روڈ لاہور

عصبیت نے شمالی ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی جوش کو مشتعل کر دیا۔ چنانچہ سید احمد نے نہایت عقل و دانش سے کام لے کر اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لیا۔ انہوں نے اپنا پہلا پیشہ[1] ترک کر دیا اور دہلی جاکر ایک متبحر عالم (شاہ عبدالعزیزؒ) کی شاگردی اختیار کر لی۔ انہوں نے یہاں تین سال طالب علمانہ زندگی گزاری۔ اس کے بعد مبلغ بن کر نہایت سرگرمی سے ان بدعتوں کے خلاف جد وجہد کا آغاز کیا جو ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد میں داخل ہوگئی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے جوشیلے اور باحوصلہ لوگ ان کے مرید بن گئے۔ انہوں نے سب سے پہلے روہیلہ قوم کو اپنی تبلیغی جدوجہد کا مرکز بنایا۔ یہ وہی قوم ہے جسے تباہ و برباد کرنے کے لئے صرف دولت کی ہوس میں ہم نے اپنی فوجوں سے دوسروں کی مدد کی اور تاریخ کا یہ افسوس ناک واقعہ وارن ہیسٹنگز کے دامن حیات کا ایسا داغ ہے جو کبھی نہ مٹ سکیگا۔ غرض سنہ ۱۸۲۰ء میں اس مصلح (سید صاحبؒ) نے اپنی اصلاحی و تبلیغی جدوجہد کا دائرہ جنوبی ہندوستان کی طرف پھیلانا شروع کر دیا۔ اس کے مریدوں پر اس کی روحانی برتری کا اتنا اثر تھا کہ بڑے بڑے عالم اور صاحب اقتدار لوگ بہت ذوق وشوق سے اس کی ہر خدمت بجا لاتے اور اس کی پالکی کے ساتھ عام خدمت گاروں کی طرح ننگے پاؤں دوڑنے میں اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ اس مصلح (سید صاحب) نے پٹنہ میں عرصہ تک قیام کیا۔ اس زمانے میں ان کے مریدوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوا کہ انہیں ایک نظام تشکیل دینا پڑا۔ انہوں نے اپنے داعی مقرر کئے جو تجارتی راستوں پر واقع شہروں کے تاجروں سے ان کے تجارتی منافع پر ٹیکس وصول کرتے تھے۔ بعدازاں انہوں نے اپنے چار خلفاء کا تقرر کیا جنہیں ان کے روحانی نائب کہنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ایک قاضی القضاۃ مقرر کیا اور اس کے لئے اسی طرح کا ایک فرمان جاری کیا جیسا کہ مسلمان حکمراں اپنے صوبوں میں گورنروں کا تقرر کرتے وقت فرمانوں کا اجراء کیا کرتے تھے۔ پٹنہ میں ایک مستقل مرکز قائم کرنے کے بعد انہوں نے دریائے گنگا کے کنارے کنارے کلکتہ کی طرف سفر شروع کیا۔ راستے کے شہروں میں لوگ ان کے مریدوں کے زمرے میں شامل ہوتے جاتے تھے۔ اس راستے میں جو بڑے بڑے شہر واقع تھے ان میں سید احمد اپنے نائب مقرر کرتے چلے گئے۔ کلکتہ میں ان کے عقیدت مندوں کا اس قدر اژدھام ہو گیا کہ ان سے بیعت لینے کے لئے ہر شخص کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا ان کے لئے ممکن نہ رہا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے اپنی پگڑی اتار کر پھیلا دی اور یہ اعلان کر دیا کہ جو شخص اس کو چھوئے گا وہ ان کے مریدوں میں شامل ہو جائے گا۔

۱۸۲۲ء میں انہوں نے سفرِ حج کیا اور مکہ جاکر اپنی گذشتہ قزاقانہ[2] زندگی کو حاجی کے تقدس آمیز لباس میں چھپا لیا۔ دوسرے سال یعنی اکتوبر ۱۸۲۳ء میں وہ بمبئی پہنچے۔ یہاں بھی وہ اسی طرح کامیاب ہوئے۔ جس طرح کلکتہ میں کامیاب ہوئے تھے۔ وطن واپس آکر انہوں نے اپنے ضلع رائے بریلی میں بہت سے سرکش افراد کو اپنے مریدوں میں شامل کر لیا۔

---

[1] یہاں ہنٹر نے ازراہ تعصب سید صاحبؒ کو قزاق کے نام سے یاد کیا ہے (مؤلف)

[2] ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہنٹر سید صاحبؒ کا کتنا مخالف اور ان کی اہانت کے درپے تھا۔ (مؤلف)

اور پھر ۱۸۲۴ء میں پشاور کی سرحد پر غیر مہذب پہاڑی قبائل میں نمودار ہوئے۔ اس علاقے میں پہنچ کر انہوں نے سکھ حکومت کے خلاف مذہبی جنگ (جہاد) کی تبلیغ و تلقین شروع کر دی۔ پٹھان قبائل میں ان کی دعوت کا نہایت پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ انہوں نے پٹھانوں کے ذہن میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا کہ اس جنگ میں جو شخص زندہ بچ رہے گا وہ مالِ غنیمت سے مالا مال ہو جائے گا اور جو مارا جائے گا اس کا مقام جنت ہوگا اور اسے شہید کا درجہ ملے گا۔ انہوں نے کابل اور قندھار کے دورے کئے اور جہاں بھی گئے لوگوں میں جہاد کی تبلیغ کی اور انہیں اپنا ہمنوا بنا لیا۔ انہوں نے اپنی طاقت میں استحکام پیدا کرنے کے لئے قبائل (کی پرانی دشمنیاں ختم کرکے ان) میں اتحاد و اتفاق قائم کیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ میں کفار و مشرکین کی جڑیں کاٹنے کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا گیا ہوں۔ انہوں نے پہاڑی قبائل کے سوجھ بوجھ رکھنے والے سرداروں کو اس خطرے کے سدباب کی طرف متوجہ کیا جو ان کے پڑوس میں سکھ طاقت کی صورت میں روز بروز بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جب اس مذہبی منشور کی کامیابی کے لئے فضا سازگار ہو گئی تو انہوں نے ایک فرمان جاری کیا جسے خدا کی طرف منسوب کیا گیا تھا اور جس میں تمام مخلص مسلمانوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ جہاد میں شریک ہوں۔

اس دوران میں اس راہنما کے داعیوں کے ذریعے یہ اعلان ان تمام لوگوں تک پہنچا دیا گیا جو شمالی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ان کے مرید ہو چکے تھے۔ یہ اعلان "ترغیب الجہاد" نامی ایک رسالے سے ماخوذ تھا جو اودھ کے ایک شہر قنوج کے ایک عالم نے شائع کیا تھا۔ اس اعلان اور تیاری کے بعد سکھوں کے خلاف جہاد شروع ہو گیا جس میں کبھی ایک فریق کو فتح حاصل ہوئی کبھی دوسرے کو۔ دونوں جانب سے بے شمار لوگ قتل ہوئے۔ مجاہدین میں وہ فوجی تربیت نہ تھی جو سکھوں کی منظم فوج میں موجود تھی۔ اسلئے وہ باقاعدہ لڑائیوں میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود ۱۸۲۷ء میں اس رہنما (سید صاحبؒ) نے اپنے مرید قبائل کی معیت میں سکھوں کی ایک چھاؤنی پر حملہ کر دیا۔ جس کے ارد گرد خندق کھود کر اسے حملوں سے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ اس لئے انہیں جانی نقصان اٹھانا پڑا مگر اس کے باوجود سکھ جرنیل کو ان کا ایسا تعاقب کرنے کی جرأت نہ ہو سکی جسے فتح سے تعبیر کیا جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور دور تک ان کی فتح مندی کی شہرت ہو گئی اور صورتِ حال (سکھوں کے حق میں) اس قدر خراب ہو گئی کہ سکھ حکمران ان پہاڑی قبائل کو جو سکھوں پر حملے کرنے میں سب سے آگے تھے رشوت دے کر اپنے ساتھ ملانے پر مجبور ہو گیا۔ ۱۸۲۹ء میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور پر بھی اس رہنما (سید صاحبؒ) کا قبضہ نہ ہو جائے۔ آخر وہاں کے (افغان) گورنر نے اس جنگی صورتِ حال کو ختم کرنے کی غرض سے اس رہنما کو دھوکے سے کام لے کر زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ جب یہ خبر پہاڑوں میں آباد مسلمان قبائل تک پہنچی تو وہ غضبناک ہو کر زبردست جوش و خروش سے میدانی علاقے پر حملہ آور ہوئے۔ اس جنگ میں انہوں نے کفار کی ساری فوج کو قتل کر ڈالا اور اس کے سپہ سالار کو مہلک زخم لگائے۔ ان (سید صاحبؒ) کے حامی قبائل کی دست برد سے صرف پشاور ہی محفوظ رہ سکا جس کی حفاظت شہزادہ شیر سنگھ

اور جرنل ونٹورا کر رہے تھے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اس رہنما (سید صاحبؒ) کا دائرۂ اقتدار وسیع ہوتے ہوتے کشمیر تک پہنچ گیا تھا۔ شمالی ہندوستان کے ایسے بہت سے شہزادے جو اپنے حالات سے مطمئن نہ تھے اس رہنما کی امداد کے لئے فوجیں بھیجنے لگے۔ یہ دیکھ کر رنجیت سنگھ نے ایک زبردست لشکر ان کا مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اس لشکر کی قیادت سکھ فوج کے بہترین اور قابل جرنیل کر رہے تھے۔ باوجودیکہ ۱۸۳۰ء میں اس فوج کے مقابلے میں انہیں شکست ہوئی مگر جلد ہی انہوں (سید صاحبؒ) نے بہت بڑی طاقت فراہم کر کے میدانی علاقوں پر اپنی فتح کا پرچم لہرا دیا اور ۱۸۳۰ء کا سال ختم ہونے سے پہلے ہی پشاور پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ یہ شہر پنجاب کا مغربی دارالحکومت تھا۔ یہ اس مذہبی رہنما کے اقتدار کا انتہائی شاندار دور تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ خلیفۂ اسلام ہیں انہوں نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کیا جن پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

"احمد العادل جو محافظ ہے اسلام کا اور جس کی تلوار کی آب و تاب موت کا پیغام ہے کافروں کے لیے"[1]

سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ان کی تحریک نے بنگال، بہار اور خصوصاً شمال مغربی سرحدی صوبہ میں جو اقتدار حاصل کیا اسے ہنٹر نے فتنۂ عظیم قرار دیا ہے اور پھر اس پر یوں اظہار خیال کیا ہے۔

"خواہ کچھ ہو اس تعجب خیز اقتدار کی بنا فتنہ و فساد کا سرچشمہ نہ تھا بلکہ سید احمد کی روحانی زندگی انہی دو اصولوں کی تشریح و اشاعت پر مبنی تھی جن سے تمام روحانی داعی کام لیتے ہیں یعنی ایک توحید اور دوسرا مساوات۔ انہیں ایک ایسا یقین حاصل تھا جسے الہامی کہنا چاہیئے اور اسی یقین سے کام لے کر انہوں نے مسلمان عوام کی دینی غیرت کو بیدار کیا جو ان کے برادران وطن میں مردہ ہو چکی تھی۔ سینکڑوں سال تک ہندوؤں کے ساتھ رسم و راہ رکھنے کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت سی بدعتوں نے جڑ پکڑ لی تھی ان (سید صاحبؒ) پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ اسلام کی سچی تعلیم کو بت پرستانہ رسوم نے چھپا لیا ہے۔"

اس کے بعد ہنٹر حسب عادت سید صاحبؒ کو جعلساز اور لٹیر اقرار دیتا ہے اور پھر لکھتا ہے کہ :۔

"اس کے باوجود میں اپنے اس یقین کے اظہار کے سوائے اور کوئی چارہ نہیں پاتا کہ سید احمد کی زندگی میں ایک دور ضرور ایسا آیا جب ان کا دل اپنے ہم مذہب بھائیوں کی نجات کے لئے ہر وقت تڑپتا رہتا تھا۔ ان کا رجوع ہر وقت خدا تعالیٰ کی طرف رہتا تھا۔ ان کی طبیعت میں بے قراری رہتی تھی۔ وہ نہایت جوشیلے انسان تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ عصبی المزاج بھی تھے۔ گو ان کے ظاہری اطمینان کی کیفیت سے ان کی اندرونی بے قراری ظاہر نہیں ہو پاتی تھی۔ ایک وجدانی جذب و کیف ان کے دل و دماغ کا احاطہ کر لیتا تھا۔ اس روحانی حالت کے لئے ہنٹر ازراہ تحقیر مرگی[2] کا

---

[1] دی انڈین مسلمانز از صہ۳ تا مہ۵ مصنفہ ولیم ولسن ہنٹر مطبوعہ دی پریمیئر بک ہاؤس کچہری روڈ لاہور [2] یہ بھی سید صاحبؒ کی صداقت کی دلیل ہے کہ ہر زمانے میں مامورین اور مجددین کو ان کے مخالفوں نے مجنون، فاترالعقل اور مرگی یا مالیخولیا کا مریض قرار دیا۔ مولف

لفظ استعمال کرتا ہے مولف) ایشیا میں یہ کیفیت نہایت مقدس سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس حالت میں انسان کا خدا تعالیٰ سے براہِ راست رابطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس روحانی حالت میں ان (سید صاحبؒ) میں گذشتہ انبیا کی بصیرت پیدا ہو جاتی تھی اور وہ عالمِ کشف میں ہندوستان کے گذشتہ دور روحانی پیشواؤں سے مسلسل رابطہ قائم رکھتے تھے۔ انہوں نے ۲۴ سال کی عمر میں اپنی تبلیغی مہم کا آغاز کیا۔ یہ ۱۸۲۰ء کا واقعہ ہے۔ ان کا قد نہ بہت دراز تھا اور نہ کوتاہ۔ داڑھی سینے تک کم گو اور خوش خلق تھے۔ گو وہ بہت متبحر عالم نہ تھے مگر آتش بیاں مقرر ضرور تھے اور یہ ان کا سب سے بڑا جوہر تھا۔ انہوں نے اپنے ہم مذہب بھائیوں کی عملی زندگی کی اصلاح کے لئے وعظ و تلقین کا سلسلہ شروع کیا مگر اصولی بحث و تمحیص سے دامن بچایا۔"[1]

کننگھم کا اعترافِ عظمت

سید صاحبؒ کا دوسرا انگریز تذکرہ نگار جوزف، ڈیوی، کننگھم ہے جس نے سکھوں کی نہایت مبسوط تاریخ لکھی ہے اور سکھ قوم کا بہت بڑا قصیدہ خواں ہے۔ اس انگریز مورخ نے بھی جہاں موقع ملا ہے سید صاحبؒ پر اقتدار کا حریص اور ناعاقبت اندیش ہونے کا اعتراض کیا ہے۔ کہیں ان کے حملوں کو بے ہنگم کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے مگر اپنے تمام تر تعصب باوجود وہ بھی سید صاحبؒ کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:-

"اسی دوران میں ایک شخص نے جس کی طرف توجہ نہیں دی گئی تھی غیر متوقع طور پر پشاور کے نواح میں ایک خوفناک بغاوت منظم کر لی۔ اس بغاوت کا بانی شمالی ہند کے شہر بریلی کے ایک سید خاندان کا ایک مسلمان فرد احمد شاہ تھا جو ایک غرض پرست رہنما امیر خان سے وابستہ تھا لیکن جب مرہٹہ اور پنڈاری طاقتوں کے خلاف جنگ کے کامیاب خاتمے پر اس (سید صاحبؒ) کے امیر کی فوجی طاقت ٹوٹ گئی اور انگریزوں نے امیر خان کو اپنا وظیفہ خوار والئی ریاست تسلیم کر لیا تو یہ سید دہلی چلا گیا جہاں اس شہر کے ایک عالم (شاہ) عبدالعزیز نے احمد کی بزرگی کا اعلان کر دیا۔ اس کی شہرت میں اضافہ ہوا اور مولوی اسماعیل اور عبدالحی جو کسی حد تک اہلِ علم تھے لیکن مشکوک عقائد کے حامل تھے سید صاحبؒ کے منکسر مرید اور فدائی پیروکار بن گئے۔"[2]

اس کے بعد کننگھم سید صاحبؒ کے سفرِ حج، حج سے واپسی اور دعوتِ جہاد کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ:-

"۱۸۲۶ء میں شاید پانچ سو رضاکاروں سمیت وہ دہلی سے روانہ ہوا اور یہ انتظام کیا گیا کہ وقفہ وقفہ کے بعد مزید جتھے دوسرے امیروں کے ماتحت اس کے پیچھے آئیں گے۔ اس نے ٹونک میں بھی تھوڑا قیام کیا، جو اس کے پرانے آقا امیر خان کی قیامگاہ تھا۔ اس سردار کا بیٹا موجودہ نواب اس نئے بزرگ کے مریدوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے اس نوجوان مرید سے

---

[1] دی انڈین مسلمانز ص ۲۲ و ص ۲۳۔ [2] ہسٹری آف دی سکھس ص ۱۹۰ مولفہ جوزف، ڈیوی، کننگھم۔ مطبوعہ لندن ۱۸۵۳ء۔

روپے کی شکل میں کافی امداد حاصل کی وہ صحرا سے گزرتا ہوا سندھ میں خیرپور پہنچا جہاں (کے حاکم) میر رستم خان نے اس کا نہایت عمدہ استقبال کیا۔ یہاں ٹھہر کر اس نے ان مجاہدوں کا انتظار کیا جو اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ اس کے بعد احمد نے قندھار کی طرف کوچ کیا۔[1] لیکن اس کے عزائم پر بداعتمادی کی گئی۔ بارک زئی حکمرانوں نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ وہ غل زئی علاقے سے ہوتا ہوا شمال کی طرف بڑھ گیا اور ۱۸۲۶ء کے آغاز میں دریائے کابل عبور کر کے یوسف زئی قبائل کی پہاڑیوں میں پنجتار کے مقام پر پہنچا جو پشاور اور دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے۔ یہاں سید اور اسکے غازیوں کا نجات دہندگان کے طور پر خیر مقدم کیا گیا اور عام طور پر سید کی امارت یا بالادستی تسلیم کر لی گئی۔ اس کے بعد اس نے اپنے ناکافی طور پر مسلح اور غیر منظم گروہ کو سکھوں کے ایک لشکر پر حملہ کرنے کے لئے بڑھایا جو مہاراجہ (رنجیت سنگھ) کے خاندان کے بدھ سنگھ سندھیانوالہ کی قیادت میں اٹک سے چند میل اوپر اکوڑہ کی طرف بھیجا گیا تھا۔ سکھ جرنیل نے خندقیں سنبھال لیں اور کوہستانیوں کے بے ہنگم حملے کو نقصان پہنچا کر پیچھے ہٹا دیا۔ لیکن اپنی کامیابی کے بعد چونکہ وہ سید کے لشکر کا تعاقب نہ کر سکا اس لئے سید کی طاقت اور شہرت ترقی پاتی رہی (اور صورتِ حال یہ ہوگئی کہ) یار محمد خاں (گورنر پشاور) نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ سید سے ایک ایسا معاہدہ کر لیا جائے کہ وہ علاقہ یوسف زئی سے آگے پیش قدمی نہ کر سکے۔ اس کے بعد پشاور کے بے بس حاکم پر سید کو زہر دے کر ختم کرنے کی ناپاک کوشش کا الزام عائد کیا گیا۔[2]

"اس کے بعد سید اور سردار یار محمد خاں میں جنگ ہوئی جس میں یار محمد خاں نے شکست کھائی۔ اسے مہلک زخم آئے اور پشاور شاید اس کے بھائی سلطان محمد خاں کے لئے بچ گیا جس کی امداد کے لئے سکھ فوج شہزادہ شیر سنگھ اور جنرل ونٹورا کی قیادت میں موجود تھی۔ آخر سکھ دستے دریائے سندھ کی طرف پیچھے ہٹ گئے اور سلطان محمد خاں اور اس کے بھائیوں کو اپنے علاقوں کی ممکن حد تک حفاظت کے لئے چھوڑ گئے۔ سید احمد کا رسوخ بڑھتے بڑھتے کشمیر تک پہنچ گیا۔ احمد نے جون ۱۸۳۰ء میں دریا کو عبور کیا اور ہری سنگھ نلوہ اور جنرل ایلارڈ کے ماتحت سکھ فوج پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن سید کو دریا کے مغربی کنارے کی طرف پیچھے ہٹنا پڑا۔ چند ماہ بعد اس نے پھر طاقت فراہم کر لی اور (حاکم پشاور) سلطان محمد خاں بارک زئی پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں بارک زئی کو شکست ہوئی اور پشاور پر سید اور اس کے غازیوں کا قبضہ ہوگیا۔

اس (سید صاحب) کی حوصلہ مندی اور کامیابی ایک دوسرے کے ہم رکاب رہی۔ لیکن اوائل نومبر ۱۸۳۰ء میں وہ پشاور کو ایک مقررہ خراج کے عوض سردار سلطان محمد خان کے حوالے کرنے پر مجبور ہوگیا اور دریائے سندھ کی بائیں طرف سکھوں سے جنگ کرنے روانہ ہوا۔ اگرچہ اس کے یوسف زئی حلیف اب کم ہوگئے تھے اور شیر سنگھ اور گورنر کشمیر کی کوشش سے مظفر آباد کے سردار اور کوہستانی خانوں کو مطیع کر لیا گیا تھا مگر اس کے باوجود بھی (سید) احمد نے جنگ جاری رکھی اور سنگلاخ پہاڑوں کے اندر لڑی جانے والی جنگوں میں غیر مسلسل طور پر کامیابی ایک مدت تک اس کے ہم رکاب رہی۔"[3]

---

[1] ہسٹری آف دی سکھس ص ۱۹۱ ۔ [2] ہسٹری آف دی سکھس ص ۱۹۲ ۔ [3] ہسٹری آف دی سکھس ص ۱۹۴

اولف کیرو کا اعترافِ عظمت

سید صاحبؒ کا تیسرا تذکرہ نگار سر اولف کیرو ہے۔ اس انگریز مصنف کا دلی لگاؤ افغانوں کے ساتھ ہے جن کے بعض سردار سید صاحبؒ کے حریف تھے لیکن اس کے باوجود وہ بھی سید صاحبؒ کی مقبولیت، لوگوں کو متاثر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت اور آپ کی جنگ جویانہ قابلیت و مہارت کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

" جو مصلح اب ظاہر ہوا وہ سکھوں کی نئی قائم شدہ طاقت کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا اور وہ اس قابل تھا کہ ظالم کے تحت زندگی گزارنے والے مظلوم مومنوں کو متحد کر کے بت پرست کافر کے خلاف صف آرا کر دے۔ وہ ایک شدید قسم کی ناقدانہ تحریک کی تبلیغ کرتا تھا جسے اس کے معترضین " وہابیت " کہتے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ جن میں سے اکثر راسخ العقیدہ بھی تھے اسے سچا مجاہد تسلیم کرتے تھے۔ اسے ایک ایسا رہنما قرار دیتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک صدی میں صرف ایک بار دین کی وضاحت کرنے اور مومنین کو ہدایت کے راستے پر چلانے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اس مجاہد کا نام سید احمد شاہ تھا۔ احمد بریلی میں پیدا ہوا تھا اس لئے سوانح نگار اسے سید احمد بریلوی کہتے ہیں۔ اس کے مذہبی جوش اور پاکیزگی نے فدائیوں کے ایک گروہ کو اس کا پیرو بنا لیا جن میں سے بعض تعلیم یافتہ بھی تھے۔ وہ توحید پر بہت زور دیتا تھا اور مذہب کے ان طور طریقوں کو رد کرتا تھا جو اس زمانے میں مروج تھے۔ بہت سے عالموں نے اس کا اتباع کیا۔ غربا میں اس کے بہت سے مداح پیدا ہو گئے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے نصائح اتنے موثر ہوتے تھے کہ دہلی کے درزی بھی پرہیزگاری کے خیال سے اپنے گاہکوں کا فالتو کپڑا انہیں واپس کر دیتے تھے۔ اس کے دعویٰ کی اجنبیت صرف یہی تھی کہ وہ ایسا دعویٰ کرتا تھا جس کی وضاحت ایک مجاہد ہی کر سکتا ہے۔ یہ بحث مدرسین کی ہے اور طے نہیں ہو سکتی لیکن احمد کے عقائد خواہ کچھ بھی ہوں اس کی تبلیغ کا مینہ زرخیز زمین پر برسا۔ وہ قبائل جو گھمنڈ کرتے تھے کہ وہ خواب و خیال میں بھی سوائے برائے نام اور عارضی طور پر مغلوں اور درانیوں کے بھی مطیع نہیں ہوئے تھے فوری طور پر اس کے پرجوش حامی بن گئے۔ پہلی نظر میں احمد کی قبائلیوں اور بالخصوص جنگجو یوسف زئیوں پر اثر ڈالنے کی قابلیت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ آخر وہ میدانی علاقے کا فرد تھا جنہیں پٹھان حقارت سے " ہندکی " کہتے ہیں یعنی ہندوستان یا پنجاب کا مسلمان۔ یہ غیر یقینی معلوم ہوتا تھا کہ اسے وحشی کوہستانی قبول کر لیں گے۔ اس کی مقبولیت میں ستھانہ کے سید اکبر کی خیر خواہی کو بھی دخل ہے جو قبائلی جنگوں کا سرخیل اور پیر بابا کے گھرانے کا سید ہونے کی وجہ سے ان قبائل کا پیرِ خانہ تھا۔ احمد اپنی نیکی اور جوش کی شہرت ساتھ لے کر آیا تھا۔ سید اکبر اس کے خلوص سے ضرور متاثر ہوا ہو گا۔ اکبر اور اس کا خونی رشتہ نہیں تھا لیکن کوئی وصف ضرور ہو گا جو دونوں کو ایک دوسرے میں نظر آیا یعنی بے غرضی جو انسانوں کو ایک مقصد کے لئے متحد کر دیتی ہے۔ سید اکبر اور اس کا چھوٹا بھائی عمر شاہ جو قبائل میں، بڑے معزز تھے بنی ساری وجاہت

ترک کر کے اس کے نائبوں کی حیثیت سے اس کے جھنڈے تلے کھڑے ہونے کو تیار تھے وہ کافی باوقار تھے مگر اپنے آپ کو اس (سید احمد صاحبؒ) کی اطاعت اور وفاداری کے لئے پیش کرتے تھے وہ اپنے مریدوں کو بھی ساتھ لاتے تھے اور اس کی پیروی کرنے پر خوش تھے ———— سمہ کے درمیان سے ابھرتی ہوئی چیل کے درختوں سے ڈھکی ہوئی (پنجتار) اکیلی پہاڑی ہے جو مردان کی گائیڈز میس کی چوڑی سڑک میں سے دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ ایک مقدس مقام ہے (یہ مقام عرصہ تک سید صاحبؒ کا مرکز رہا) اور مومنین کے لئے وہاں سے ایک چھوٹی سی شاخ کاٹنا بھی گناہ ہے اس لئے یہ چوٹی ہمیشہ درختوں سے ڈھکی رہتی ہے۔[1]

بدایونی مؤلف کا اعتراف

یہ ہے حضرت سید احمد شہیدؒ کی وہ اثر انگیز شخصیت جس کا اعتراف ان کے غیر مسلم تذکرہ نگاروں نے بھی کیا اور ان کی عظمت سے متاثر ہو کر انہیں خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ وہ سید احمد شہیدؒ ہیں جنہیں ہمارا بدایونی مؤلف جاہل، نا اہل اور ان تمام کمالات سے عاری قرار دیتا ہے جبکہ یہ غیر مسلم مورخ بھی اعتراف کرتے ہیں اور انہیں اپنے زمانے کا نہایت اولوالعزم، باحوصلہ شجاع، جنگجو اور خواص سے لیکر عوام تک سب پر یکساں اثر ڈالنے والا قرار دیتے ہیں۔۔

بدایونی مؤلف کہتا ہے کہ سید صاحبؒ اور ان کے مجاہدین کی بہادری اور جنگ جویانہ صلاحیت کی داستانیں عقیدت مند تذکرہ نگاروں کی مبالغہ آرائی کا نتیجہ ہیں لیکن گذشتہ صفحات میں جن مورخین نے سید صاحبؒ کی اعلیٰ صلاحیتوں، شجاعانہ کارناموں اور آپ کے کمالات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ ان میں سے ایک بھی آپ کا عقیدت مند نہ تھا۔ یہ سب سید صاحبؒ کے غیر مسلم اور غیر ملکی تنقید نگار تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود ہمارا یہ بدایونی مؤلف بھی نادانستہ طور پر اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ آپ کی پامردی واستقلال اور سکھوں پر آپ کے شدید حملوں نے رنجیت سنگھ کو اس حد تک عاجز کر دیا کہ وہ ایک حصہ ملک دیکر سید صاحبؒ سے صلح کرنے پر آمادہ ہو گیا چنانچہ یہ بدایونی مؤلف اعتراف کرتا ہے کہ:۔

"رنجیت سنگھ نے وزیر سنگھ اور حکیم عزیز الدین کو پیغام صلح دیکر بھیجا کہ اتنا حصہ ملک انہیں دیا جا سکتا ہے۔

جواب میں سید صاحبؒ نے مولوی خیر الدین شیر کوٹی کی معرفت سفارت بھیجی جو بجائے رنجیت سنگھ سے ونٹورا سے ملاقات کر کے واپس آئی۔ سکھوں کے شرائط انہوں نے قبول نہیں کئے۔"[2]

سید صاحبؒ کی عظمت کا یہ سب سے بڑا اعتراف ہے جو ان کے ایک انتہائی متعصب ناقد نے کیا۔ اس اعترافِ عظمت کو دیکھ کر ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ تھی کہ ایک وسیع سلطنت کا حاکم جس سے اس عہد

---

[1] دی پٹھانز صفحہ ۳۰۱ تا صفحہ ۳۰۶ مولفہ اولف کیرو، مطبوعہ لندن ۱۹۶۲ء

[2] ملاحظہ ہو بدایونی کی کتاب کا صفحہ ۱۸۵

کی سب سے بڑی طاقت (انگریزی حکومت) بھی خم کھاتی تھی سید صاحبؒ سے صلح کا طالب ہوا اور اپنے ملک کا ایک حصہ دے کر ان کی سیادت تسلیم کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ سید صاحبؒ نے اپنی پاکیزہ زندگی پرکشش شخصیت، اپنے مقصد کی صداقت، بے لوث خدمت اور اسلام کی سربلندی کے لئے غیر معمولی لگن سے ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں کو متاثر کیا اور ان میں ایسی روح پھونک دی کہ وہ ان کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہوگئے انہوں نے اپنے حریفوں کو پے در پے شکستیں دیں اور سکھ حکمراں پر اپنی شخصیت اور شجاعت کا ایسا نقش مرتسم کردیا کہ وہ ان کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوگیا۔

سید صاحبؒ کی شجاعت

سید صاحبؒ کے جن اوصاف وکمالات نے آپ کے تمام تذکرہ نگاروں کو آپ کے حضور میں خراج عقیدت ادا کرنے پر مجبور کردیا۔ ان میں سے سب سے بڑا کمال سید صاحبؒ کی غیر معمولی شجاعت تھی۔ وہ گولیوں کی بارش میں بھی نہایت استقلال اور بے خوفی سے اپنے مقام پر چٹان کی طرح ڈٹے رہتے اور جنگ کی شدت اور ہولناکی ان کے چہرہ پر معمولی سا تغیر بھی پیدا نہ کرتی تھی چنانچہ نواب وزیر الدولہ کا بیان ہے کہ:۔

> "سید صاحبؒ نے شیر کا دل پایا تھا اور کفار ومشرکین کے ساتھ جہاد کے وقت جبکہ توپوں سے بارش کی طرح گولے برس رہے ہوتے تھے اور تلواروں کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہورہی ہوتی تھیں اسوقت آپ نہایت بشاشت اور نہایت متبسم ہونٹوں کے ساتھ وعظ وتلقین فرماتے تھے اس سخت جنگ وقتال میں جب کہ شیروں کا زہرہ بھی آب ہوجاتا ہے اور بڑے بڑے دل گردے کے لوگ بھی گھبرا جاتے ہیں آپ کے چہرہ پر ذرا سی بھی پریشانی یا گھبراہٹ کے آثار ظاہر نہیں ہوتے تھے[1]۔"

سید صاحبؒ کی حکمتِ عملی

سید صاحبؒ کی شخصیت کا باب نامکمل رہ جائے گا اگر ان کی طرزِ سیاست اور حکمتِ عملی کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ وہ عام طور پر ایک مردِ درویش، شعلہ بیان خطیب، دینی مصلح اور جرنیل کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان میں ایک اعلیٰ پایہ کے سیاستدان کے اوصاف وکمالات بھی موجود تھے۔ وہ اس نکتے سے پوری طرح باخبر تھے کہ کسی علاقے پر تسلط قائم کرنے کے بعد اس میں امن وامان برقرار رکھنے اور اس کے باشندوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انہی میں سے قابلِ اعتماد، اہل اور عوام میں مقبول افراد کو ایسے عہدوں پر مامور کرنا

---

[1] وصایا الوزیر وصیت ۲۵ ص۵۰ نصف ثانی مولفہ ہزہائی نس نواب وزیر الدولہ سابق فرماں روائے ریاست ٹونک

چاہیئے جو انتظامی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں اور لوگوں میں یہ تاثر پیدا نہ ہو کہ ایک یا چند اشخاص نے باہر سے آکر ان کے حقوق غصب کر لئے ہیں اور انہیں اپنا محکوم بنا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید صاحبؒ نے جن علاقوں پر اپنی فتح کا علم لہرایا ان علاقوں کے ذی اثر اہل علم اور قابلِ اعتماد افراد کو اہم عہدوں پر فائز کیا چنانچہ جب آپ نے "سچہ" بھوگڑ منگ، ضلع ہزارہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو اس علاقے کے سردار حسن علی خان کو اپنا نائب اور سچہ کا حاکم مقرر کیا۔ انہیں مالیہ کی تحصیل اور مقدمات کے فیصلے کرنے کی ذمہ داریاں تفویض کیں اور داخلی معاملات میں مکمل خود مختاری عطا فرمائی۔

اسی طرح ریاست امب پر قبضہ کرنے کے بعد یہ ثابت ہو جانے پر کہ عبدالغفور خاں اور کمال خاں نامی سرداران امب کے بعض علاقوں کے اصل حکمران ہیں ان دونوں کو ان کے آبائی علاقوں کا حاکم مقرر کیا اور ان سے عہد لیا کہ وہ شریعت کا اتباع کریں گے۔ اس موقع پر آپ نے جو فرمان جاری کیا اسے "مکتوبات مولوی" کے مولف نے اپنے مجموعہ مکاتیب میں درج کیا ہے۔ یہ فرمان یوں شروع ہوتا ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اعطار نامہ بتاریخ دوئم ذیقعد ۱۲۴۵ھ بنام عالی جاہ عبدالغفور خاں و کمال خاں بنا بر ملک آبائی و خانی و سرداری بسبب اتباعِ شریعت نوشتہ دادہ خواہد شد۔ بمقام امب[1]۔

اسی طرح ضلع مردان پر قبضہ کرنے کے بعد سید صاحبؒ نے علاقہ ٹوپی کے ایک عالم اور ذی اثر فرد ملا عین الدین کو اس علاقے کا قاضی اور کوتوال مقرر کیا اور انہیں مکمل اختیارات عطا فرمانے کے علاوہ یہ علاقہ انہیں تفویض کر دیا۔ اس موقع پر آپ نے مندرجہ ذیل فرمان جاری کیا:۔

"بتاریخ پنجم ماہ شوال ۱۲۴۵ھ روز پنجشنبہ، فضیلت مآب ملا عین الدین ساکن قریہ ٹوپی ضلع صدر را بمنصب قضا در دیہات متعلقہ فیض اللہ خاں مشرف گردانیدند و فصلِ خصومات و قطع منازعات و اقامت حدود و تعزیرات و احتساب اہلِ فسق و فساد و اقامت جمع و اعیاد و در دیہات مذکورہ بایشان تفویض یافت[2]"

سید صاحبؒ نے مختلف علاقوں کے باشندوں میں سے قابل اور دیانت افراد کو انتظامی عہدوں پر فائز کرنے کے سسے میں جو فرامین جاری کئے ان میں سے نمونہ کے طور پر صرف دو فرمان نقل کئے گئے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے جن علاقوں پر تسلط قائم کیا ان میں سے ایک ضلع یا ریاست ایسی نہیں جس کے انتظام و انصرام کے لئے مقامی باشندوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ان کے معزز افراد کو اپنا دست و بازو نہ بنایا ہو۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ سیاست اور امورِ جہاں بانی کے باریک در باریک نکات سے بھی بخوبی واقف تھے۔

---

[1] مکتوبات مولوی (قلمی) صـ۱۲۲ [2] مکتوبات مولوی (قلمی) صـ۸۲

سید صاحبؒ کی علمی خدمات

سید صاحبؒ نے جس وادیٔ خارزار میں قدم رکھا تھا اور آپ نے جو ہنگامہ خیز زندگی گزاری اس میں بظاہر علمی کاموں کے لئے قطعاً گنجائش نہ تھی مگر آپ کو علم سے جو دلی لگاؤ تھا اس نے توپوں کی گرج اور تلواروں کی خوفناک جھنکاروں میں بھی آپ کو خدمتِ علم سے بے نیاز نہ رہنے دیا۔ آپ کی اس علمی خدمت کے دو حصے ہیں۔ ایک خالص علم دین سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا زبانِ اُردو کی خدمت سے۔ عام طور پر مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے آپ کی چار تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

(۱) صراطِ مستقیم ۔ یہ سید صاحبؒ کی سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے اور اس میں اسلام کی حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ان عقائد کا بُطلان کیا گیا ہے جو غیر اسلامی اثرات کی وجہ سے عام مسلمانوں نے اختیار کر لئے تھے۔ اس کتاب کی عبارتیں حضرت مولانا عبدالحئیؒ اور حضرت شاہ اسماعیلؒ کی ہیں مگر مفہوم سید صاحبؒ کا۔ آپ اپنا مفہوم ان دونوں بزرگوں کے سامنے بیان کرتے جاتے تھے اور یہ اسے قلمبند کرتے جاتے تھے۔ لکھنے کے بعد سید صاحبؒ کو سناتے تھے۔ اگر عبارتیں آپ کے مفہوم کے مطابق نہ ہوتی تھیں تو آپ ان میں تبدیلی کرواتے تھے۔ بعض عبارتیں پانچ پانچ مرتبہ تبدیل کی گئیں اور جب سید صاحبؒ کو اطمینان ہو گیا تو آپ نے انہیں کتاب میں درج کرنے کی اجازت دی۔

(۲) آپ کی دوسری تصنیف "تنبیہ الغافلین" ہے۔ یہ فارسی میں ہے اس کا اُردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

(۳) سید صاحبؒ کی تیسری تصنیف "رسالہ در نماز و عبادت" ہے۔ یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اور فارسی میں ہے۔

(۴) آپ کی چوتھی تصنیف "رسالہ در نکاحِ بیوگان" ہے۔ یہ بھی فارسی میں ہے اور اس میں "نکاحِ بیوگاں" کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ بھی ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

ان چار تصانیف کے علاوہ سید صاحبؒ کی دو اور تصانیف ہیں اور یہ دونوں اردو میں ہیں۔ ان کے متعلق سید صاحبؒ کے کسی سوانح نگار نے اپنی کسی کتاب میں اشارہ تک نہیں کیا۔ ماہنامہ "فاران" کراچی میں مولوی عبدالحلیم صاحب چشتی نے اپنے مضمون "حضرت سید احمد شہیدؒ کی اردو تصانیف" کے زیرِ عنوان سب سے پہلے سید صاحبؒ کے ان دو نادر رسالوں سے قارئین کا تعارف کرایا۔ ذیل میں ہم اسی مضمون کے حوالے سے ان رسالوں پر اظہارِ خیال کریں گے۔

(۵) اس سلسلے کا پہلا رسالہ حقیقت الصلوٰۃ ہے۔

(۶) دوسرا رسالہ تفسیر سورۂ فاتحہ ہے۔

یہ دونوں رسالے سید صاحبؒ کی زندگی ہی میں کلکتہ سے شائع ہوئے تھے اور اس کے بعد کئی بار مختلف شہروں سے شائع ہوئے۔ ان دونوں تصانیف کی پہلی اشاعت ۲۲ جمادی الاول ۱۲۳۷ھ کو ہوئی۔ اٹھارہ انیس برس کے بعد

یہ دونوں رسالے ایک ہی جلد میں محمد مصطفیٰ خاں بن محمد روشن خان حنفی المتوفی ۱۲۶۹ھ نے مطبع مصطفائی لکھنؤ سے ۱۲۵۵ھ میں شائع کئے۔ ان کا سائز متوسط ہے۔ صفحات کی تعداد ۵۴ ہے۔ ابتدائی ۲۵ صفحات "حقیقت الصلوٰۃ" کے لئے وقف ہیں اور باقی ۲۹ صفحات پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر پھیلی ہوئی ہے۔ خاتمۂ کتاب کی عبارت کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

"الحمد للہ کہ چند نکتۂ تفسیر سورہ فاتحہ کی ہندی زبان میں جو حضرت رئیس المومنین، امام العارفین، سید المسلمین، قدوۃ السالکین سید احمد قدس سرہ نے آپ اپنی زبان ہدایت ترجمان سے ارشاد فرما کے جامع علوم ظاہری و باطنی جناب مولانا عبد الحئی مغفور سے تحریر کروائے تھے اور واسطے فیض عام رسانی کے یہ رسالہ کلکتہ میں سیسہ کے حرفوں سے ۱۲۳۷ھ میں چھاپا گیا تھا۔"

ان دونوں رسالوں کے خاتمے کی یہ عبارت ان کے پہلے ایڈیشن سے نقل کی گئی ہے جو حضرت سید صاحبؒ کی زندگی میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ نے ان دونوں رسالوں کی عبارتیں اردو زبان میں املا کرائیں اور آپ کے مرید خاص مولانا عبد الحئی صاحب نے قلمبند کیں۔ اس لحاظ سے یہ رسالے سید صاحبؒ کی زبان اور آپ کے اپنے الفاظ میں ہیں۔ ذیل میں ان میں سے "حقیقت الصلوٰۃ" نامی رسالے کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ سید صاحبؒ دینی مسائل کے اظہار کے لئے کس قسم کی زبان استعمال فرماتے تھے۔

سیدِ صاحبؒ کی نثر کے نمونے

"الٰہی شکر تیرے احسان کا کہ تو نے ہمارے دل کو روشن اور زبان کو گویا کیا اور ایسے نبی مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خلق اللہ کی ہدایت کے واسطے بھیجا کہ جس کی ادنیٰ شفاعت سے دونوں جہان کی نعمت پاویں اور اس کی رہنمائی سے عرفان کی لذت اٹھاویں۔ پس درود اس نبی مختارؐ اور اس کے آل اطہار اور اصحاب کبار پر ہو جیو کہ جس نے بشر کو ضلالت اور گمراہی سے باز رکھا اور علماء و فضلاء کو زیورِ علم سے آراستہ کیا۔"

"پیچھے حمدِ خدا اور نعتِ رسولؐ کے اربابِ دانش پر ظاہر ہو جیو کہ مسلمان پر لازم ہے کہ اپنے رب کو پہچاننے اور اس کی صفات جاننے اور اس کے حکم کو معلوم کرے اور مرضی و نامرضی اس کی تحقیق کرے کہ بغیر اس کے بندگی نہیں اور جو بندگی نہ بجالاوے بندہ نہیں اور بڑی بندگی نماز ہے کہ بدوں اس کے کوئی بندگی قبول نہیں کیونکہ سر اسب بندگیوں اور بُرے کاموں سے بچنے کا یہی ہے۔"

اس کے بعد سید صاحبؒ نماز کے ارکان، ان کا فلسفہ اور نماز میں پڑھی جانے والی دعاؤں کی تفسیر و تشریح کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"اب بندۂ مومن کو چاہیئے کہ اپنے دل کی طرف ذرا انصاف سے رجوع کرے کہ یہ سب اقرار جو حضور کے وقت میں سامنے اپنے مالک کے کرے اور موافق اس اقرار کے عمل میں نہ لادے، پھر روزِ جزا کے کون سامنہ لگا کے اس قہار کے سامنے جاوے گا۔ ایمان نام فقط اقرار ہی کا نہیں ہے بلکہ اقرار ساتھ یقین کے چاہیئے کہ تم اس کا عمل ہے اور عوام جو اس بات سے بے خبر ہیں خواص کو واجب ہے کہ ان کو آگاہ کریں کہ جو منہ سے اقرار کریں اس کو عمل میں لادیں۔"

سیّد صاحبؒ کی خدمتِ اُردو

حضرت سید صاحبؒ کی علمی خدمات کا دوسرا پہلو زبانِ اُردو کی خدمت ہے۔ سطورِ بالا میں آپ کے رسالہ "حقیقت الصلوٰۃ" سے جو اقتباسات درج کئے گئے ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ آپ نے جو اندازِ بیان اختیار فرمایا تھا وہ نہایت عام فہم اور سادہ تھا جس زمانے میں مقفّٰی اردو لکھنے کا رواج تھا اور بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرنا ہی انشا کا کمال سمجھا جاتا تھا اس زمانے میں سید صاحبؒ نے اس روش سے ہٹ کر ایسا طرز اختیار کیا جس نے اُردو کو عوامی زبان بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور سید صاحبؒ کے یہ رسالے دیکھ کر برصغیر کے متعدد اہلِ علم کو اُردو زبان میں علمی اور دینی مسائل پر اظہارِ خیال کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ چنانچہ "تاریخ ادبِ اُردو" کے مولف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے بھی اعتراف کیا ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اور آپ کے عقیدت مند علماء نے اردو زبان کی خدمت میں نمایاں اور قابلِ قدر حصہ لیا۔ موصوف لکھتے ہیں۔

"مولوی اسماعیل صاحب کا مشہور رسالہ تقویت الایمان اور نیز دیگر مریدانِ مولوی سید احمد کی تصانیف مثلاً ترغیب الجہاد، ہدایت المسلمین، نصیحۃ المومنین والمسلمین، موضح الکبائر والبدعات، مائۃ مسائل وغیرہ ان سب سے زبانِ اُردو کو بھی تقویت پہنچی۔"[۱]

آگے چل کر ایک اور مقام پر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ سیّد صاحبؒ کی خدمتِ زبانِ اُردو کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک بہت بڑی تحریک جو ہر چند ادبی نوعیت نہیں رکھتی مگر اس سے بلاشبہ نثرِ اُردو کو بہت فائدہ پہنچا اور اس کی تقویت کا باعث ہوئی مولوی سید احمد بریلوی اور ان کے استادوں کے زمانے میں رونما ہوئی جس کی وجہ سے تبلیغ دین کی غرض سے مختلف کتب و رسائل عوام الناس کے فائدے کے واسطے صاف اور سہل زبان میں لکھے گئے۔"

آخر میں ہم ڈاکٹر سکسینہ کی کتاب سے ایک اور اقتباس نقل کر کے یہ باب ختم کرتے ہیں۔ ہمارے بدایونی مؤلف

---

[۱] تاریخ زبانِ اُردو حصہ نثر صـ۲۴۲

نے اپنی کتاب میں جگہ بہ جگہ سید صاحبؒ کی قابلیت و اہلیت کا مضحکہ اڑایا ہے اور لکھا ہے کہ "سید صاحب غریب میں ایسے فصیح وعظ کہنے کی قابلیت تھی اور نہ ایسے خطوط لکھنے کی"۔ گویا اس کے خیال میں یہ حاشیہ آرائی ان کے معتقدین نے کی اور انہیں آسمان پر چڑھا دیا۔ لیکن ڈاکٹر رام بابو سید صاحبؒ کا معتقد تھا نہ ہم مذہب، وہ زبان اردو کا محقق و مورخ تھا۔ اسے مذہبی مباحث سے کوئی سروکار نہ تھا اس لئے اس کی رائے غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہوگی۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :۔

"سید صاحبؒ چونکہ بڑے قابل اور فصیح شخص تھے لہٰذا ان کی تقریریں اور وعظ سن کر لوگ بکثرت ان کے مرید ہو گئے تھے"[۱]

---

[۱] تاریخ ادب اردو حصہ نثر ۲۵

حیات شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ

مؤلفہ :۔ پیام شاہجہانپوری

(زیر تصنیف)

امیرالمؤمنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے دست راست اپنے عہد کے عظیم جرنیل ۔ جید عالم اور سماجی مصلح حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ہنگامہ خیز زندگی، آپ کی سیرت و کردار ، آپ کے عقائد و نظریات ، آپ کی دینی و سماجی اصلاح کی تحریک اور آپ کے مجاہدانہ کارناموں کی مستند تاریخ ۔

طباعت سرورق : کیکسٹن پرنٹنگ پریس ۔ لاہور